۲۰۰

سہروردی کی سیاست بیتی

محمد ایچ آر تلکدار

مترجم: وجاہت مسعود

سہروردی کی سیاست بیتی

مرتب : محمد ایچ آر تلک دار

مترجم : وجاہت مسعود

Ebook By

Anis ul Hassah Shah

https://web.facebook.com/Shah.AnisulHassan/

https://wa.me/message/923142893816

اکیسویں صدی کے تقاضوں سے ہم آہنگ

ہر عمر اور ہر ذوق کے قارئین کے لئے

خوبصورت اور معیاری مطبوعات

ناشر ...... میر شکیل الرحمٰن

اشاعت اول : ستمبر 1992ء

تعداد : ایک ہزار (1000)

قیمت : 175 روپے

زیر اہتمام وادارت : مظفر محمد علی

پبلشر : جنگ پبلشرز

(جنگ انٹرپرائز لمیٹڈ کا ذیلی ادارہ)

پرنٹر : جنگ پبلشرز

13- سر آغا خاں روڈ، لاہور

انتساب

محترم والدین کی یادِ مہربان کے نام

پروڈکشن	:	احسان بزمی
سرورق	:	انیس یعقوب
کاپی پیسٹر	:	نوید احمد
کمپوزنگ	:	سجاد محمود بٹ۔ اسد حسین

مشمولات

پیش لفظ

یہ نامکمل یادداشتیں حسین شہید سہروردی کی زندگی کے آخری برس یعنی 1963ء میں ضبطِ تحریر میں لائی گئی تھیں۔ یہ مسوّدہ دراصل کہیں زیادہ ضخیم کتاب کا ابتدائی خاکہ تھا۔ 40 برس پر محیط سیاسی زندگی کے دوران برصغیر میں وقوع پذیر ہونے والے اہم واقعات میں حسین شہید سہروردی کی سرگرم شرکت کے پیشِ نظر انکی سوانح حیات کو ایسا ہی ہونا چاہئے تھا۔ درحقیقت مجھے ستمبر 1963ء میں حسین شہید سہرودی کے ساتھ لندن میں اپنی ملاقات یاد آرہی ہے جب انہوں نے مجھے ان یادداشتوں کے ابتدائی ایک سو کے لگ بھگ صفحات پڑھنے کے لئے دیئے تھے اور وضاحت کی تھی کہ یہ محض ایک ابتدائی مسودہ ہے جسے مختلف تفصیلات کے اضافے کے ساتھ ایک بھرپور تصنیف کی شکل دی جائے گی۔

اس کتاب کو پڑھتے وقت دو اہم پہلوؤں کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ زیرِ نظر یادداشتیں نامکمل ہیں اور دوسرے یہ کہ انہیں روایتی خود نوشت سوانح کے زمرے میں نہیں رکھا جاسکتا روایتی طور پر خودنوشت سوانح اس وقت قلم بند کی جاتی ہیں جب لکھنے والا اپنی جہدِ حیات مکمل کر چکا ہو اور گوشۂ فراغت میں بیٹھ کر اپنے حافظے کی خوشہ چینی کرے۔

1963ء میں حسین شہید سہروردی کا کام ابھی مکمل نہیں ہوا تھا اور کُنجِ فراغت کی عیاشی بھی انہیں میتسر نہیں تھی۔ انہیں اپنی سیاسی زندگی کے دوران 1962ء میں پہلی بار قیدوبند کا مزا چکھنا پڑا۔ اپنی رہائی کے بعد انہوں نے بحالیٔ جمہوریت کے لئے ایک زوردار تحریک چلانا شروع کی۔ اس دوران میں انہیں دل کا ایک شدید دورہ پڑا۔ وہ علاج کے لئے بیرونِ ملک چلے گئے۔ علاج کے بعد وہ بحالیٔ صحت کی غرض

سے آرام کر رہے تھے کہ انہیں جلاوطنی کی حالت میں موت نے آلیا۔ ڈھاکہ میں انکے جسدِ خاکی کی وصولیابی کے لئے اتنا بڑا ہجوم تھا کہ غالباً ڈھاکہ میں اس وقت تک اس سے بڑا اجتماع دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔ لاکھوں کی تعداد میں عوام اپنے احترام اور محبت کا خاموش مگر متاثر کن مظاہرہ کرتے ہوئے دورافتادہ دیہات سے بسوں، ریلوں اور کشتیوں کے ذریعے یا پھر پیدل ہی دارالحکومت پہنچے۔ عوام کو ان پر جو غیر متزلزل اعتماد تھا اور انہیں آخری دم تک عوام کے دل ودماغ پر جو حکمرانی حاصل تھی اس کی اس سے زیادہ فیصلہ کن شہادت پیش نہیں کی جاسکتی تھی۔

سہروردی کی کامیابیاں بھی کچھ ایسی غیر اہم نہیں تھیں۔ وہ متحدہ بنگال کے وزیرِ اعلیٰ اور پاکستان کے وزیرِاعظم رہے۔ انہوں نے 1946ء کے انتخابات میں تاریخی کامیابی کے لئے اپنی پارٹی (مسلم لیگ) کی قیادت کی چنانچہ انہیں پاکستان کے بانیوں میں سے ایک ہونے کا اعزاز ملا۔ تاہم پاکستان کے ابتدائی سالوں میں وہ کسی عہدے پر فائز نہیں تھے بلکہ مہاتما گاندھی کی ہم رکابی میں ہندوستان میں ہندو مسلم فسادات سے متاثرہ علاقوں میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی بحالی کے لئے جدوجہد کر رہے تھے۔ پاکستان واپس آکر انہوں نے مسلم لیگ کے خلاف جمہوری حزبِ اختلاف کے قیام میں اہم کردار ادا کیا کیونکہ مسلم لیگ عوام دشمنی کی راہ پر چل نکلی تھی اور اسکے کردار میں آمرانہ روّیوں کا اظہار ہونے لگا تھا۔ عوامی اتحاد کے علمبردار حسین شہید سہروردی متحدہ محاذ کے معماروں میں سے ایک تھے۔ اسی متحدہ محاذ نے 1954ء میں مشرقی بنگال کے انتخابات میں مسلم لیگ کا ڈھرن تختہ کیا تھا۔ عوامی لیگ اسی موقع پر پہلی بار ایک اہم سیاسی قوت کے طور پر ابھری تھی۔ وہ 1956ء میں محض تیرہ مہینوں کے لئے وزیرِاعظم بنے۔ حیاتِ مستعار کا باقی ماندہ حصہ انہوں نے 1958ء میں پاکستان پر مسلّط ہونے والی فوجی آمریت کو للکارتے ہوئے اور قیامِ جمہوریت کیلئے مسلسل جدوجہد کرتے ہوئے گزارا۔

ان کی خود نوشت سوانح حیات کی طرح ان کا سیاسی کام بھی مکمل نہ ہو سکا۔ ان کی سیاست کی بنیاد جمہوریت سے وفاداری بشرطِ استواری اور عوام کی اس صلاحیت میں گہرے ایقان پر تھی کہ وہ اپنی مساعی سے اپنی تقدیر کا فیصلہ کرسکتے ہیں۔ زندگی کے آخری چند برسوں میں حسین شہید سہروردی کی جدوجہد ان کے اسی ایمان اور فوجی آمریت کے مابین ناقابل عبور تفاوت سے عبارت تھی اور یہی انکی خود نوشت سوانح کا نقطۂ انعطاف بھی ہے۔ جب انہوں نے انتقال کیا تو پاکستان پر ابھی تک ایک فیلڈ مارشل حکمرانی کر رہا تھا (اگرچہ اس نے سویلین نقاب اوڑھ لیا تھا) اور جمہوریت کا محمل ابھی نظروں سے دور تھا۔

ابتدائی صفحات میں انہوں نے اس وقت کی صورتحال پر روشنی ڈالی ہے مگر ان کے الفاظ آج کی صورتحال پر بھی منطبق ہوتے ہیں "......... جہاں کہیں عوام نے سر توڑ کشاکش کے بعد بظاہر جمہوریت بحال کروا بھی لی ہے، وہ پوری طرح فوج کی بالادستی سے آزاد نہیں ہو سکے کیونکہ جب فوج کے منہ کو خون لگ جائے تو وہ اپنے طبقاتی اور نوزائیدہ مفادات کی بہتری اسی میں سمجھتی ہے کہ سول حکمرانوں کو دبا کے رکھا جائے۔ چھوٹے بڑے فوجی افسران کو سول انتظامیہ میں ایسے عہدے سونپے گئے جن کے لئے ان کے

پاس مطلوبہ اہلیت تھی اور نہ تربیت .... صرف ریٹائرڈ فوجی افسران ہی نہیں بلکہ حاضر سروس جونیئر اور سینئر فوجی ملازمین اور انکے اہلِ خانہ پر ملازمتیں ' زمینیں اور لائسنس نچھاور کئے گئے۔ ان افراد کو عہدے اور خاندانی رسوخ کی مناسبت سے پرمٹوں اور دیگر مالی فوائد سے نوازا گیا۔ چنانچہ فوج من حیث المجموع ایسے نظام کا تسلسل چاہتی ہے، جو اس کے لئے اس قدر منفعت بخش ثابت ہوتا ہے اور یوں تربیت یافتہ افراد پر مشتمل ایک منظّم ادارہ اپنے مفادات اور مراعات کے تحفّظ کی خاطر ہر ممکن سعی کے لئے تیّار ہو جاتا ہے ...... چنانچہ تجربہ بتاتا ہے اور اس ضمن میں مثالوں کی بھی کوئی قلّت نہیں کہ فوج جب ایک بار اقتدار پر قابض ہو جائے تو پھر خفیہ طور پر یا کھلے عام اپنے اقتدار کو دوام دیئے رکھتی ہے"

حسین شہید سہروردی نچلی سطح پر عوامی تنظیموں کی تشکیل میں جو دلچسپی لیتے تھے' اس سے عوام پر انکے اعتماد کا اظہار ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنی سیاست کا آغاز بھی کلکتہ اور اسکے اردگرد شہری محنت کشوں' پٹ سن اور کپڑے کے کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں' رکشا کھینچنے والوں اور ہوٹلوں کے ملازمین کی تنظیمیں بنا کر کیا تھا۔ بنگال میں مسلم لیگ کو دور افتادہ دیہات میں عوام تک پہنچانے کے لئے بھی انہوں نے یہی طریقہء کار اختیار کیا۔

اپنے تمام تر اجمال کے باوجود یہ یادداشتیں حسین شہید سہروردی کی شخصیت اور سیاست کے بعض پوشیدہ گوشوں پر بے حد قابلِ قدر روشنی ڈالتی ہیں۔ دیش بندھو چترنجن داس کو انہوں نے جو خراجِ تحسین پیش کیا ہے وہ ان کی اپنی سیاسی اقدار کے بارے میں بھی بصیرت بہم پہنچاتا ہے "ابتدائی برسوں میں میں نے کانگرس کے ساتھ ڈھیلی ڈھالی وابستگی اختیار کر رکھی تھی۔ میں کلکتہ کا ڈپٹی میئر تھا اور دیش بندھو سی آر داس میئر تھے۔ دیش بندھو عظیم ترین بنگالی تھے' بلکہ شاید جن لوگوں سے مجھے ملاقات کا اعزاز نصیب ہوا ہے وہ ان میں عظیم ترین ہندوستانی تھے۔ ان کا مرتبہ کسی صورت مہاتما گاندھی سے کم نہیں تھا۔

وہ صاحبِ بصیرت تھے، مکمل طور پر فرقہ پرستی کی لعنت سے ماورا تھے، فیاضی کی حد تک فیاض تھے' جراتمند تھے اور ملک وقوم کے لئے قربانی دینے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے ان کی دانشورانہ استعداد اور پیش بینی کی صلاحیت نہایت اعلیٰ درجے کی تھی۔ وکیل کے طور پر وہ گراں قدر معاوضہ طلب کرتے تھے اور ساری کمائی وطن پر نچھاور کر دیتے تھے۔ زندگی کے آخری ایّام میں انہوں نے وکالت ترک کر کے خود کو پوری طرح ملک وقوم کی خدمت کے لئے وقف کر دیا اور جب ان کا انتقال ہوا تو وہ بری طرح قرض کے بوجھ تلے دب چکے تھے۔ بہت سوں کی طرح مجھے بھی یقین ہے کہ اگر وہ زندہ رہتے تو انہوں نے ہندوستانی قوم کی رہنمائی اس طور سے کی ہوتی کہ ہندو مسلم تعلقات کو مکدّر کرنے والے اختلافات اور تلخیاں دور ہو جاتیں۔ یہ ان اختلافات کو بروقت اور منصفانہ طور پر طے نہ کرنے کا نتیجہ تھا کہ ہندوستان تقسیم ہوا اور پاکستان معرضِ وجود میں آیا۔ "

حسین شہید سہروردی کو ابھرتی ہوئی سیاسی قوتوں کے بارے میں جو ادراک حاصل تھا اس کا ثبوت انکے قریب ترین معتمد مجیب الرحمن سے ان کی گفتگو کے احوال سے بھی ملتا ہے۔

"خاص طور پر مجیب الرحمٰن بہت جزبز ہو رہا ہے۔ وہ پاکستان میں جمہوریت کی بحالی کو واحد مقصد کے طور پر قبول کرنے کے لئے تیار ہے۔ وہ یہ بھی محسوس کرتا ہے کہ فی الحال صرف میں ہی وہ واحد شخص ہوں جو مشرقی پاکستان میں عوام کو متحرک کر سکتا ہے اور انہیں قیادت فراہم کر سکتا ہے لہٰذا میری قیادت میں سیاسی جدوجہد کرنا زیادہ قرینِ مصلحت ہو گا لیکن اسے اس ضمن میں خاصے شکوک و شبہات ہیں کہ قومی اتحاد اور قومی یکجہتی سے مشرقی پاکستان کے مسائل حل ہو سکیں گے"

اس آخری جملے میں پیش آمدہ سیاست کی تصویر پوشیدہ ہے یعنی چھ نکات پر مبنی مطالبۂ خود مختاری' بنگالی قوم پرستی کا فروغ اور بالآخر خود مختار اور آزاد بنگلہ دیش کا قیام۔

ایک اور مقام پر متحدہ پاکستان کے ڈھانچے میں رہتے ہوئے عوامی خواہشات کی تکمیل کے لئے اپنی مساعی کا ذکر کرتے ہوئے حسین شہید سہروردی نے بنگالیوں کی بڑھتی ہوئی بیگانگی کی طرف اشارہ کیا ہے اور خدشہ ظاہر کیا ہے کہ اگر پرامن تبدیلی کی راہیں بدستور مسدود رہیں تو تشدّد آمیز شورش ناگزیر ہو جائے گی۔ "کسی بھی پہلو سے معاملات پر نظر ڈالئے' سیاسی جمود مجموعی فضا کا احاطہ کئے ہوئے ہے اور یہ سوال منہ کھولے کھڑا ہے کہ اس جمود کو کیسے توڑا جائے؟ یہ ایک مسلّمہ قاعدہ ہے کہ جب آئینی راستے بند کر دیئے جائیں تو بستی میں گریبانوں کے ڈھیر لگ جایا کرتے ہیں یعنی عوام غیر آئینی ہتھکنڈے اختیار کرنے لگتے ہیں۔ فی الوقت اس سوال کا حتمی جواب نہیں دیا جا سکتا کہ آیا مسلح افواج اور عوام کی قوّت کے درمیان واضح تفاوت کی موجودگی میں اس قسم کا انقلاب کامیاب ہو سکے گا یا نہیں۔ ایک امکان یہ ہے کہ مشرقی پاکستان کے عوام مغربی پاکستان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے اور فوج' مغربی پاکستان کے صنعت کاروں اور غیر بنگالی پناہ گزینوں سمیت کوئی بھی ان کے غیظ و غضب سے محفوظ نہیں رہے گا۔ ایسی صورت میں خونریز فسادات ہوں گے' قتل و غارت گری ہو گی جس کی بنیاد محض نفرت پر ہو گی۔ میں نے ابھی تک اس رجحان کے سامنے بند باندھے رکھا ہے لیکن یہ دیکھنا ابھی باقی ہے کہ یہ آگ مکمل طور پر بجھ چکی ہے یا اس خاکستر میں کوئی چنگاری ابھی سلگ رہی ہے۔ اگر ایسا ہوا تو مایوسی جن شعلوں کو ہوا دے گی عین ممکن ہے میں خود بھی ان کی زد میں آ کر حرفِ غلط کی طرح مٹ جاؤں۔"

حسین شہید سہروردی اس الاؤ کو دیکھنے کے لئے زندہ نہ رہے، جو انہی سلگتی ہوئی چنگاریوں سے بھڑکا تھا یعنی 1971ء کا طوفانِ بلاخیز جس کی طرف انہوں نے ان یادداشتوں کی اختتامی سطروں میں بصیرت افروز اشارہ کیا تھا۔

بنگالی عوام آج بھی آزادی اور انصاف کے حصول کے لئے مصروفِ پیکار ہیں۔ بنگالی عوام آج بھی جمہوریت اور عوامی حاکمیت کے ان اصولوں کے لئے لڑ رہے ہیں جن کی طرف پہلے حسین شہید سہروردی اور پھر بنگلہ بندھو شیخ مجیب الرحمٰن نے ان کی رہنمائی کی تھی۔ یہ خواب ابھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوئے اور اس منزل کی طرف سفر کے دوران حسین شہید سہروردی کی یہ یادداشتیں ایک نور مینارے کا کام دیں گی۔

کمال حسین

19 / جولائی 1987ء

یادش بخیر

5 دسمبر 1963ء کا دن تھا۔ صبح کے پانچ بجے تھے۔ لندن میں میری قیام گاہ کے فون کی گھنٹی یکایک بج اٹھی۔ فون کی گھنٹی میں بد شگونی کا شائبہ سا محسوس ہوا۔ میں ابھی تک جاگ رہا تھا کیونکہ لندن یونیورسٹی سے بی اے کے فائنل امتحان میں چند ماہ باقی رہ گئے تھے اور مجھے سخت محنت سے تین سال کا نصاب اسی مختصر مدّت میں تیاّر کرنا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ اس وقت فون کا آنا یقیناً کسی ہنگامی خبر کا پیش خیمہ ہو گا کیونکہ طالب ِعلمی کے بے فکرے دن ہی کیوں نہ ہوں، کوئی صبح پانچ بجے محض گپ شپ کے لئے فون کرنے سے تو رہا۔ خبر بے حد ناخوشگوار تھی اگرچہ سچ پوچھئے تو کچھ ایسی غیر متوقع نہیں تھی۔ بیروت سے ہمارے خاندان کے ایک پرانے دوست فرانسوا جیبرے یہ بتانے کے لئے فون کر رہے تھے کہ میرے والد کا انتقال ہو گیا ہے۔

عارضۂ قلب کے دو شدید حملوں کے بعد میرے والد نے گزشتہ چھ ماہ اسی مکان میں بسر کئے تھے جہاں میں برطانوی یونیورسٹیوں میں زیرِ تعلیم کچھ پاکستانی طالبِ علموں کے ساتھ قیام پذیر تھا۔ چھ مہینے کا یہ عرصہ ہمارے باہمی تعلقات میں غالباً بار آور ترین زمانہ تھا اور یہ بات تو یقینی ہے کہ اس سے قبل ہم کبھی اتنی دیر تک مسلسل اکٹھے نہیں رہے تھے کیونکہ تقسیمِ ہند سے قبل قیام کلکتہ کے دنوں میں تو میں بہت کم سن تھا۔ مجھے اس عرصے میں ان کی پہلودار شخصیت کو بھرپور طور پر دیکھنے کا موقع ملا۔ میں نے انہیں عارضۂ قلب کے اذیت ناک حملوں کا پامردی سے مقابلہ کرتے ہوئے دیکھا۔ ہر بار یہ خوف مجھے آ لیتا کہ یہ حملہ جان لیوا ثابت ہو گا مگر والدِ محترم ایسے مواقع پر بھی اپنے مزاحیہ جملوں سے حزن و ملال کو قریب نہ پھٹکنے دیتے۔ ایک

روز برج کھیلتے ہوئے انہیں دورہ پڑا میں اور میرے دوست انہیں ہاتھوں میں اٹھا کر بستر کی طرف لے جا رہے تھے۔ انہوں نے تکلیف کی شدت سے دانت بھینچ رکھے تھے۔ اچانک انکے ہونٹوں کو جنبش ہوئی اور انہوں نے بمشکل سنائی دینے والی آواز میں کہا "لعنت ہو۔ میرے پتّے ایسے شاندار تھے کہ میں نے تمہیں یقینی مات دی ہوتی" دوسرے مواقع پر جب وہ بستر پر استراحت کر رہے ہوتے یا ان یادداشتوں پر کام کر رہے ہوتے تو سرہانے رکھے فون کی گھنٹی بجتی۔ وہ ریسور اٹھاتے' اگر میرا یا میرے ساتھ قیام پذیر کسی طالبِ علم کا فون ہوتا تو وہ ہمارے سیکرٹری کے طور پر اپنا تعارف کرواتے اور اپنے نفیس خطِ تحریر میں پیغام لکھ لیتے۔ متعلقہ دوست کے نام کے ہجے بڑی احتیاط سے لکھتے اور پیغام کے ضمن میں خیال رکھتے کہ کوئی ابہام نہ رہ جائے۔ اگر فون کے دوسری طرف نسوانی آواز ہوتی تو وہ بیس منٹ یا کبھی نصف گھنٹے تک محوِ گفتگو رہتے اور اپنا تعارف کروائے بغیر فریقِ مخالف کو اپنی لچھے دار باتوں میں لگائے رکھتے۔ مجھے اور میرے دوستوں کو کبھی یہ تشویش نہ ہوئی کہ ہماری دوست لڑکیاں میرے والد سے بات کرنے کے بعد ہمارے ہاتھ سے نکل جائیں گی۔

وہ عمر میں ہم لوگوں سے بہت بڑے تھے لیکن میرے دوستوں کو ان سے ذہنی رابطہ کرنے میں کبھی دقت پیش نہ آئی۔ میرے دوست جو کم و بیش میرے ہم عمر تھے' بڑے مزے سے والد محترم کے ساتھ بحث مباحثہ کرتے کہ وہ ہمارے استدلال کو بڑے تحمل سے سنتے' فروگذاشتوں کی تصحیح کرتے' حقائق کی عدم صحت کی نشاندہی کرتے' نوجوانی کی خودپسندی اور ناتجربہ کاری سے پیدا ہونے والے تعصّبات پر ہماری سرزنش کرتے۔ اس طور پر ہماری تربیت کے دوران کبھی میرے یا میرے دوستوں کے دل میں خیال تک نہیں گزرا کہ وہ مجھ سے کوئی خاص برتاؤ روا رکھتے تھے۔

مجھے ایک واقعہ یاد آ رہا ہے۔ میرے سبھی دوستوں کا تعلق مغربی پاکستان سے تھا۔ ایک روز ہم ملک کے دونوں حصّوں کے درمیان پائی جانے والی معاشی عدم مساوات اور مغربی پاکستان کے ہاتھوں مشرقی پاکستان کے معاشی استحصال کے بارے میں اپنی مزمّن بحث میں الجھ گئے۔ میں اپنے نقطۂ نظر کو مرعوب کن اعداد و شمار کی مدد سے واضح کر رہا تھا۔ زرِ مبادلہ میں مشرقی پاکستان کا حصہ' ماہی گیری اور پٹ سن کی صنعتوں میں ترقیاتی بجٹ کی غیر مناسب کمی اور نا جانے کیا کیا الابلا۔ میری دھواں دھار تقریر کے دوران والد صاحب چپکے سے کمرے میں داخل ہو گئے اور خاموشی سے مجھے دیکھتے رہے۔ ان کی موجودگی اور اپنے استدلال کی قوّت کی رو میں آ کر میں کچھ اور تندی سے رواں ہو گیا اور میں نے اپنے دوستوں پر ایسی خطیبانہ یلغار کی کہ اگر وہ باتیں پلٹن میدان میں کی جاتیں تو لاکھوں کا مجمع مطیع ہو گیا ہوتا۔ میرے دوست مبہوت ہو کر رہ گئے۔ آخر ایک دوست نے والد صاحب سے پوچھا کہ میں جو کچھ کہہ رہا تھا کیا وہ صحیح تھا۔ انہوں نے بڑے رسان سے جواب دیا "کچھ ایسا صحیح بھی نہیں" اور پھر اسی پر سکون مگر بے حد معقول طریقے سے' چند فقروں میں میرے دلائل کے بخیے ادھیڑ کر رکھ دیئے۔ منطق اور اعداد و شمار کی وادی میں مجھے خوار کر کے وہ تاریخ اور ارتقاء کے میدان میں نکل گئے۔ انہیں میرے نقطۂ نظر کے نفس الامر سے اختلافات نہیں تھا لیکن

انہوں نے بڑے بلیغ انداز میں حقیقت کو صحیح پس منظر بخش دیا۔ میرے طریقِ بیان میں وہی جوش ' خطیبانہ غلغلہ ' تعصب اور جہالت تھی جس کے باعث بنگالی عوام برسوں تک مغربی پاکستان کے ہاتھوں استحصال کے خلاف اپنی نفرت اور اپنے شکوک وشبہات کو واضح رخ دینے میں ناکام رہے تھے بلکہ بسا اوقات تو تیسرے فریق کو یہ احساس ہونے لگتا تھا کہ مغربی پاکستان ' مشرقی پاکستان کے بارے میں شائستہ ' منصفانہ اور نیک نیتی پر مبنی جذبات رکھتا ہے لیکن مشرقی پاکستان کے رہنے والے جوشِ تعصب میں اندھے ہو رہے ہیں۔

میرے ساتھ انکے قیام کے دوران ان گنت بنگالی اور پاکستانی برطانیہ کے کونے کونے سے انکے ساتھ ملاقات کے لئے آئے۔ ہیمپ سٹید کے قدامت پسند مکینوں کے لئے یہ ایک اچنبھے کی بات تھی کیونکہ یہ لوگ تو برصغیر کے باشندوں کو صرف ہوٹلوں میں بیرہ گیری کے حوالے سے جانتے تھے۔

میری موجودگی ہی میں ایوب خاں کا خصوصی ایلچی والدِ محترم سے ملنے آیا۔ ایوب خاں نے انہیں نائب صدارت کی پیشکش کی تھی اور وعدہ کیا تھا کہ اس پیشکش کی پذیرائی کی صورت میں جمہوریت کی مکمل بحالی کے لئے اقدامات کئے جائیں گے۔ والدِ محترم نے جواب دیا کہ اگر ایوب نے تین سال پہلے یہ پیشکش کی ہوتی تو اس پر غور کیا جاسکتا تھا لیکن 1963ء تک پلوں کے نیچے سے اس قدر خون بہہ چکا ہے اور ایوب کی ذاتی شہرت اس قدر داغدار ہوچکی ہے کہ اس پیشکش کو قبول نہیں کیا جاسکتا۔

شیخ مجیب الرحمٰن بھی میری موجودگی میں ان سے ملنے آئے۔ وہ چاہتے تھے کہ عوامی لیگ کو جلد از جلد دوبارہ متحرک کیا جائے کیونکہ کچھ دیگر سیاسی جماعتیں فعال ہو رہی تھیں اور شیخ صاحب کو خدشہ تھا کہ اگر عوامی لیگ بدستور غیر فعال رہی تو اس کی سیاسی حیثیت خطرے میں پڑ جائے گی۔ انہوں نے شیخ مجیب کی درخواست یہ کہہ کر مسترد کر دی کہ وہ این ڈی ایف (نیشنل ڈیموکریٹک فرنٹ) کے دیگر رہنماؤں سے وعدہ کر چکے ہیں کہ انہیں اعتماد میں لئے بغیر عوامی لیگ کو دوبارہ متحرک نہیں کریں گے۔ چند ماہ بعد ڈھاکہ میں مانک میاں کی رہائش گاہ پر عوامی لیگ کے ایک اعلیٰ سطحی اجلاس میں مجھے یہی نقطۂ نظر دہرانا پڑا۔ اس وقت والدِ محترم کا انتقال ہوچکا تھا اور شیخ مجیب کی اسی تجویز پر زور وشور سے بحث کی جارہی تھی۔

لندن میں والد صاحب کے قیام کے دوران میرا زیادہ وقت زیرِ نظر یادداشتوں کی تدوین میں ان کا ہاتھ بٹانے میں گزرا۔ میرے ساتھ قیام کے اختتام تک انہوں نے ابتدائی مسودہ مکمل کر لیا تھا جس میں ہاتھ سے کی گئی بہت سی ترامیم بھی شامل تھیں۔ اب یہی مسودہ اپنی مکمل حالت میں اس کتاب میں شامل کیا جارہا ہے۔ ان مختصر صفحات میں انہوں نے قیامِ پاکستان سے لیکر اپنی وفات تک پاکستان کی سیاست میں اپنے کردار کا تجزیہ کیا ہے اور معروضی حالات پر نہایت بلیغ تبصرہ کیا ہے۔ ان یادداشتوں میں ایسے بے شمار حقائق پر سے پردہ اٹھایا گیا ہے جو اس وقت تک عوام کے علم میں نہیں تھے بلکہ زیادہ تعجب انگیز امر تو یہ ہے کہ ان کے بعد بھی کسی نے انہیں بیان کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ یہ سوچ کر نہایت افسوس ہوتا ہے کہ اگر وہ زندہ رہے ہوتے اور انہیں اس تصنیف پر مزید کام کرنے کا موقع ملا ہوتا تو ہماری تاریخ کی کس قدر

گراں مایہ دستاویز منصۂ شہود پر آتی۔ اگر انہیں معروضی تنقید سے مستفید ہونے کا موقع ملتا اور اس کی روشنی میں وہ دوسرا، تیسرا اور پھر چوتھا مسودہ بھی تیار کرتے تو اس خودنوشت سوانح کی کمیّت اور کیفیت میں کس قدر اضافہ ہو گیا ہوتا۔ بایں ہمہ موجودہ سیاسی منظرنامے کے حوالے سے یہ سیاسی تجزیہ آج بھی اس قدر موزوں ہے کہ اسے پڑھتے ہوئے یہ احساس ہوتا ہے گویا کسی نے مستقبل کی پیش بینی کرنے کی بجائے ماضی کا احوال بیان کیا ہے۔

میرا خیال ہے کہ اسے پڑھتے ہوئے بہت سے لوگوں کو کچھ مایوسی ہو گی بلکہ جھنجھلاہٹ ہو گی کہ حسین شہید سہروردی نے تقسیمِ ہند کی طرف لے جانے والے طوفانی، ہنگامہ خیز لیکن تاریخی طور پر مسخ شدہ برسوں کو زیادہ تفصیل سے بیان نہیں کیا۔ انہوں نے اس عرصے میں بنگالی مسلم لیگ کے کردار اور اپنے انفرادی کردار پر بھی زیادہ روشنی نہیں ڈالی۔ حالانکہ یہ تاریخ کے وہ گوشے ہیں جنہیں ہندوستانی حکومت کے زیرِ اہتمام شائع ہونے والی نام نہاد عمیق اور عالمانہ تاریخوں نیز فلموں اور ٹیلی ویژن کی دستاویزی فلموں کے ذریعے جی بھر کر مسخ کیا گیا ہے۔ تاریخ نویسی کے ان شاہکاروں میں نہرو اور ماونٹ بیٹن عدل اور اصول پرستی کے مجسّمے بن کر سامنے آتے ہیں اور تقسیمِ ہند کی ذمہ داری ہندوستان کے مسلمانوں خاص طور پر بنگالی مسلمانوں پر ڈالی جاتی ہے۔

انہوں نے جان بوجھ کر قیامِ پاکستان کے بعد پیش آنے والے واقعات اور حالات پر زیادہ توجّہ مرکوز کی کیونکہ اس وقت کے سیاسی حالات کا تقاضا تھا کہ ہم عصر تاریخی حقائق کو بے نقاب کیا جائے اگر زیرِ نظر تصنیف بروقت منظرِ عام پر آجاتی تو ایوب خان کا وہ پارسا تصوّر کجلا کر رہ جاتا جو اس کے ذہین کارندوں نے بڑی جانفشانی سے تخلیق کیا تھا۔

گوناگوں وجوہات کی بنا پر یہ کاغذات ایک طویل وقفے کے بعد دوبارہ میری دسترس میں آسکے۔ اتنی دیر میں ملک کی سیاسی بساط تلپٹ ہو چکی تھی۔ بھارت کے ساتھ جنگ نے حکومت کو ہلا ڈالا تھا اور ایوب کے بظاہر ناقابلِ تسخیر اقتدار میں دراڑیں پڑنے لگی تھیں۔ میں نے جن برطانوی ناشروں سے رابطہ کیا ان کا خیال تھا کہ ان یادداشتوں کی بنا پر پاکستان کی ایک ضخیم تر تاریخ مرتب ہونی چاہیے یا پھر حسین شہید سہروردی کی ایک مبسوط سوانحِ حیات مدوّن کی جائے لیکن ان خودنوشت یادداشتوں کو یوں سیاق سباق سے مبرا حالت میں شائع کرنا سودمند نہیں ہو گا۔ یہ کہنا تولاحاصل ہو گا کہ اس وقت کوئی پاکستانی ناشر یا اخبار ان یادداشتوں کو چھونے کے لئے بھی تیار نہیں تھا۔

جب محمد ایچ آر تلک دار نے مجھ سے رابطہ کیا اور ان یادداشتوں کی بنا پر میرے والد کی مختصر سوانح حیات مرتب کرنے کی اجازت چاہی تو مجھے پھر سے اس معاملے میں دلچسپی پیدا ہو گئی۔ مجھے یہ خیال نہایت مناسب معلوم ہوا کہ ان یادداشتوں کے ساتھ ہمارے خاندانی پس منظر اور والدِ مرحوم کی سیاسی زندگی کے جملہ ادوار کا احوال شامل کر دیا جائے۔ مسٹر تلک دار کا کام زیادہ عمیق اور جامع نہیں ہے تاہم اس سے میرے والد کی زندگی کے اہم خدوخال پر معلومات افزا روشنی ضرور پڑی ہے۔ محمد ایچ آر تلک دار کی طرح

مجھے بھی یقین ہے کہ اس کتاب سے حوصلہ افزائی پاکر مزید مورخین آگے بڑھیں گے اور تاریخی ماخذوں اور دیگر حوالہ جات کی مدد سے جن کا بہت بڑا ذخیرہ ہندوستان میں محفوظ ہے اس صدی کے اہم سیاست دانوں میں سے ایک کے کارناموں کو صحیح تر پس منظر میں بیان کرسکیں گے۔ اور آئندہ نسلیں یہ جان سکیں گی کہ برصغیر پاک وہند کی تاریخ میں حسین شہید سہروردی نے کیا کردار ادا کیا تھا۔

راشد سہروردی
30 ر اپریل 1987ء

دیباچہ

حسین شہید سہروردی (1892ء تا 1963ء) کی زندگی اور کارناموں کا جامع بیان قریب قریب ناممکن کام ہے اور میں نے اس کے لئے کوشش بھی نہیں کی۔ میرے مدِّنظر تو صرف یہ خیال تھا کہ ان کے عہد میں صورت پذیر ہونے والے سیاسی واقعات بیان کئے جائیں اور یہ دیکھا جائے کہ حسین شہید سہروردی کس طور سے ان واقعات پر اثرانداز ہوئے نیز یہ کہ ان کی خودنوشت یادداشتوں میں گم شدہ کڑیاں تلاش کی جائیں کہ اس اہم سیاسی دستاویز کے خدوخال نکھر آئیں۔ یہ یادداشتیں پوری ایمانداری کے ساتھ اس کتاب کے حصّہ سوم میں شامل کر دی گئی ہیں۔ جب حسین شہید سہروردی کا انتقال ہوا تو یہ خودنوشت سوانح ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی۔ انہیں پڑھتے وقت اس حقیقت کا خیال رکھنا بے حد ضروری ہے۔

سہروردی کی یادداشتوں کی ایک نقل اس وقت میرے ہاتھ لگی جب میں کراچی میں تھا اور حکومتِ پاکستان کے لئے جدوجہدِ آزادی کے مجاہدوں پر پمفلٹ تحریر کر رہا تھا۔ مجھے اس ضمن میں کئی بار حسین شہید سہروردی کی اکلوتی بیٹی بیگم اختر جہاں اور انکے شوہر شاہ احمد سلیمان کی قیام گاہ، لکھم ہاؤس جانے کا موقع ملا۔ بیگم سلیمان نے مجھے کئی نادر دستاویزات مہیّا کیں جن میں انکے نامور والد حسین شہید سہروردی کی یادداشتیں بھی تھیں۔ سہروردی صاحب نے ان صفحات میں برطانوی راج کے آخری مرحلے میں ہونے والی جدوجہدِ آزادی میں اپنا کردار بیان کیا تھا۔ ان یادداشتوں میں ان کی اس انتھک جدوجہد کی روداد بھی ملتی ہے جو انہوں نے پاکستان میں بحالیٔ جمہوریت اور قانون کی بالادستی کے لئے جاری رکھی۔

بایں ہمہ یہ یادداشتیں اپنی اجمالی صورت میں بھی نامکمل تھیں۔ اس دستاویز کے نامکمل صفحات نے مجھے انگیخت دینا شروع کی کہ کسی طور ان یادداشتوں کا مکمل مسوّدہ حاصل کیا جائے تاہم بیگم سلیمان نے مجھے صاف صاف بتادیا تھا کہ فی الحال وہ ایسا کرنے سے معذور تھیں۔ ادھر 1971ء میں قیامِ بنگلادیش کے بعد میں پاکستان چھوڑنے کا فیصلہ کرچکا تھا چنانچہ میں نے وقت کی کمی کے باعث نامکمل یادداشتوں کو ہی شائع کرنے کا ارادہ کرلیا۔

حسنِ اتفاق سے، جب میں نے ڈاکٹر کمال حسین سے ان یادداشتوں کا پیش لفظ لکھنے کی درخواست کی تو انہوں نے مجھے اس دستاویز کی ایک توسیع شدہ نقل فراہم کردی۔ اس نسخے میں اس دستاویز سے کہیں زیادہ تفاصیل موجود تھیں جو میں نے سہروردی کی بیٹی سے حاصل کی تھی۔ تاہم ڈاکٹر کمال حسین نے مجھے ہدایت کی کہ میں سہروردی کے بیٹے راشد سہروردی سے اسے شائع کرنے کی اجازت حاصل کرلوں اور میں نے ایسا ہی کیا۔ میں ڈاکٹر کمال حسین کا تہہِ دل سے شکر گزار ہوں کہ انہوں نے کمال مہربانی سے مجھے اس نادر دستاویز کی نقل عنایت کی اور اس تصنیف کے لئے پیش لفظ بھی تحریر کیا۔

راشد سہروردی نے مجھے کتاب کی اشاعت کے لئے اشیرباد دیتے ہوئے ان یادداشتوں سے متعلق کچھ حقائق بیان کئے جو ہماری توجّہ کے مستحق ہیں، انکے اپنے الفاظ میں "بیروت میں والدِ محترم کی وفات کے فوراً بعد حکومتِ پاکستان نے ہدایت جاری کی کہ انکے کاغذات پر قبضہ کرلیا جائے۔ دراصل حکومت کو اپنے ذرائع سے سن گن مل گئی تھی کہ مرحوم رہنما اپنی یادداشتیں مرتب کررہے تھے اور ان میں ایسا مواد تھا جس سے ایوب صاحب کی شہرت اور نیک نامی پر حرف آنے کا اندیشہ تھا۔ بیروت میں مقیم ہمارے ایک خاندانی دوست فرانسوا جیبرے نے مجھے لندن فون کرکے والدِ محترم کی وفات کی روح فرسا خبر سنائی اور مشورہ دیا کہ میں بیروت کے حکام کو فون پر ہدایت کروں کہ میرے بیروت پہنچنے تک کسی کو میرے والد کے کاغذات وغیرہ تک رسائی نہ کرنے دیں۔ میں نے ایسا ہی کیا اور یوں پاکستانی حکام کے منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے۔ میں نے والدِ محترم کے جسدِ خاکی کو پاکستان لے جاتے وقت یہ تمام کاغذات اور دیگر سامان جیبرے صاحب کے پاس رکھ چھوڑا اور لندن واپس جاتے ہوئے انہیں دوبارہ حاصل کرلیا۔ 1975ء میں، میں نے ان یادداشتوں کی ایک نقل ڈاکٹر کمال حسین کے سپرد کی اور درخواست کی کہ اگر ممکن ہو تو انہیں شائع کروادیا جائے یا پھر کسی باصلاحیت محقق کے سپرد کردیا جائے۔"

ڈھاکہ یونیورسٹی کے استاد، پروفیسر صلاح الدین احمد اور یونیورسٹی پریس لمیٹڈ ڈھاکہ کے مینجنگ ڈائریکٹر محی الدین احمد کی مسلسل حوصلہ افزائی اور اخلاقی اعانت کے بغیر اس کتاب کی اشاعت ممکن نہ تھی۔ پروفیسر احمد میرے محبوب اساتذہ میں سے ایک ہیں۔ ایک دفعہ تو وہ ڈھاکہ سے جوئے دیب پور میں میرے گھر تک تشریف بھی لائے۔ میرے مسودات ملاحظہ کئے اور ان کی اشاعت کے بارے میں دیر تک گفتگو فرماتے رہے۔ انہوں نے زیرِ نظر کتاب کے مسودے پر نظرِ ثانی کی اور قیمتی تجاویز سے نوازا جنہیں میں نے بصد تشکّر قبول کیا۔ میں اس اعانت اور حوصلہ افزائی پر ان کا ممنون ہوں۔

راشد سہروردی نے بھی کتاب کا آخری مسوّدہ پڑھا۔ "یادش بخیر" کے عنوان سے اپنی یادیں عنایت کیں اور پھر اس مکتوب کی نقل فراہم کی جو انکے نامور والد مرحوم نے جیل سے صدر ایوب کے نام ارسال کیا تھا (ضمیمہ 1) اے ایم اے محیط نے اس خط کا اصل مسوّدہ بہم پہنچایا جو راشد سہروردی نے بنگلادیش کی عبوری حکومت کے نام تحریر کیا تھا، جس میں تحریک آزادی کی حمایت کی گئی تھی۔ (ضمیمہ) بیگم اختر سلیمان کی واحد بیٹی، شاہدہ، ان دنوں قانون کی طالبہ تھی۔ اس کے پاس بھی اپنے نانا سے متعلق دستاویزات کا ایک ذخیرہ تھا خاص طور پر مسئلہ کشمیر کے بارے میں اقوامِ متحدہ کی بحث اور امریکہ سے پاکستان کے فوجی معاہدوں پر غیر ملکی اخبارات کے تجزیئے۔ میں ان تمام گراں قدر دستاویزات کی فراہمی پر متعلقہ حضرات کا شکر گزار ہوں۔

تعارف کے لئے میں نے سہروردی پر اتفاق ایڈیشن سے زیادہ مدد لی ہے، جو کہ سہروردی کی پارلیمانی اور عوامی تقاریر نیز دیگر تحاریر کا نادر مجموعہ ہے۔ میں شمس العالم پی ایچ ڈی اور ایم اے ودود کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جنھوں نے سہرودی کے بارے میں اپنے ذخیرۂ کتب سے استفادہ کرنے کی اجازت دی۔ میں ان گنت دوستوں اور خیر خواہوں کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔

ڈھاکہ رائس ریسرچ انسٹیٹیوٹ کے ڈائریکٹر جنرل، ایم اے منان میرے افسرِ بالا ہیں انہوں نے مجھے اس کتاب کو مکمل کرنے کے لئے تین ماہ کی رخصت عنایت فرمائی۔ وہ بھی میرے شکریے کے مستحق ہیں۔

میرے رفیقِ کار، چارلس، ٹی، برنکبنی، اس کتاب کی تدوین کے دوران مجھے اپنے قیمتی مشوروں سے نوازتے رہے۔ میں ان کا تہہِ دل سے ممنوں ہوں۔ منوج منڈول اور نور النہار نے کتاب کے پروف پڑھے۔ اشرف الدین اور ایم اے بیٹن نے بڑی احتیاط سے تمام مسوّدے کو ٹائپ کیا۔ میں ان تمام دوستوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

اور سب سے آخر میں مگر بہت سوں سے زیادہ میں اپنی بیوی، لیلیٰ رحمٰن اور اپنے بچوں خوقان، شاپون، رتنا اور بابو کا ممنوں ہوں۔ ان سب کی حوصلہ افزائی اور صبرو برداشت کے بغیر میرا کام مکمل نہیں ہو سکتا تھا۔

محمد۔ ایچ۔ آر۔ تلک دار

حصہ اول

زندگی اور کارنامے

خاندانی پس منظر

حسین شہید سہروردی 8 ستمبر 1892ء کو مغربی بنگال (بھارت) کے شہر مدناپور کے ایک ممتاز مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئے۔ اس خاندان کا آبائی وطن عراق کا شہر سہرورد تھا اور اسی نسبت سے انہیں سہروردی کہا جاتا تھا۔[1] عراق میں اس خاندان کے جدِ امجد[2] کا اسمِ گرامی شیخ شہاب الدین عمر بن محمد السہروردی (1235ھ۔ 1145ھ) تھا۔ اس کا شمار غوث الاعظم حضرت عبدالقادر جیلانی کے قریبی مریدین میں ہوتا تھا۔[3] آپ خود بھی بلند پایہ عالم اور صاحبِ فکر انسان تھے۔ ان کی تصنیف اعراف المعارف کو علومِ اسلامیہ میں شاہکار کا درجہ حاصل ہے۔

خاندانی روایت کے مطابق شیخ شہاب الدین سہروردی کا سلسلہ نسب اپنے والد کی طرف سے خلیفۂ اوّل حضرت ابو بکر صدیقؓ سے جاملتا تھا جبکہ والدہ کی طرف سے ان کا شجرۂ نسب حضرت علی بن ابو طالبؓ اور حضرت بی بی فاطمہ تک جا پہنچتا تھا۔ حضرت علیؓ، نبی پاک صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے داماد اور چوتھے خلیفہ راشد تھے چنانچہ شیخ شہاب الدین سہروردی صدیقی بھی تھے اور سیّد بھی۔[4]

سلسلہ سہروردیہ

شیخ شہاب الدین سہروردی نے تصّوف کے سلسلۂ سہروردیہ کی بنیاد بھی رکھی۔ انہوں نے اپنے بیٹوں اور مریدین کو اسلام کی تبلیغ کے لئے ایران، توران، ترکستان، ہندوستان، سندھ[6] اور بنگال روانہ کیا۔[5] شیوخِ چشتیہ کی آمد سے بہت پہلے مبلغین سہروردیہ برصغیر میں پہنچ چکے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ سلطان

علاؤالدین محمد شاہ خلجی (1316ء۔ 1296ء) نے اپنے امراء اور اہلِ دربار سمیت شیخ بہاؤالدین زکریا ملتانی کے پوتے مولانا رکن الدین سہروردی کا دہلی دروازے پر گھوڑے سے نیچے اتر کر استقبال کیا تھا اور انکی قدم بوسی کی تھی۔[8] شیخ شہاب الدین سہروردی کی دو بیٹیاں دہلی کے چشتیہ قبرستان میں آسودۂ خاک ہیں۔ ان کے اسمائے گرامی بی نور اور بی بی نور تھے اور انکے مزار کو بی نور کی درگاہ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ شمس العارفین المعروف ترکمان شاہ بھی شیخ شہاب الدین کے فرزند تھے۔ قدیم دہلی میں ترکمان دروازہ انہی کے نامِ نامی سے موسوم ہے۔ اسی خاندان کے ایک اور خلف الصدق نے دہلی میں خاندانِ لودھی کے بانی، سلطان بہلول لودھی کی لختِ جگر سے عقد کیا تھا۔[9] حیدر آباد دکن میں خاندانِ نظام شاہی کے بانی 'نظام الملک آصف جنگ کو بھی اسی خاندان کا چشم وچراغ قرار دیا جاتا ہے۔[10]

مزید بر آں، مغربی بنگال میں مانیر شریف، بہار شریف، گور اور پانڈوا کے صوفیاء سلسلۂ سہروردیہ سے تعلق رکھتے تھے۔[11] شیخ شرف الدین بہاری جنہوں نے سونار گاؤں میں تعلیم پائی تھی، اسی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ بنگال میں مسلم حکومت کے دنوں میں سونار گاؤں، ڈھاکہ کے قریب بنگال کا صدر مقام تھا۔ ایچ ای سٹیپل سٹون کے مطابق حضرت شاہ جلال بھی اسی خانوادے سے تعلق رکھتے تھے۔[12] وہ گورم، پانڈوا، رنگ پور، دیناج پور، سلہٹ اور بنگلا دیش کے بہت سے قصبوں میں تبلیغ اسلام کی غرض سے اپنے 360 مریدین کے ہمراہ سلہٹ تشریف لائے تھے۔ شیخ شہاب الدین سہروردی نے خود کو تبلیغِ دین میں اس درجہ مستغرق کر رکھا تھا کہ ان کے زہدوتقویٰ کی بازگشت آج بھی روسی ترکستان کے کچھ حصّوں میں سنائی دیتی ہے۔[13] شیخ زین الدین سہرودی کی خانقاہ آج بھی روسی ازبکستان کے صدر مقام تاشقند کے نواح میں موجود ہے۔

بنگال میں تحریک نشاۃ ثانیہ

مدنا پور (مغربی بنگال) کے سہروردی خاندان نے بنگال میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی بنیاد رکھی۔[14] اس ضمن میں مولانا عبید اللہ العبیدی سہروردی کا نام سرفہرست ہے۔ اور ایک ہمہ جہت عبقری اور ماہرِ لسانیات تھے۔ انہوں نے 1834ء سے لیکر 1886ء تک حیات پائی اور اس سارے عرصے میں ان کا ثانی پیدا نہ ہوسکا۔ انہیں اپنے تبحرِ علمی کی بنا پر بحر العلوم کہا جاتا تھا۔[15] مولانا العبیدی نے ابتدائی طور پر عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی پھر انگریزی میں استعداد حاصل کی اور خود کو مسلمان نوجوانوں میں انگریزی اور علومِ جدیدہ کی ترویج کے لئے وقف کر دیا۔[16] 1864ء میں انہیں اپنے مقالے بعنوان "اسلامی اور یورپی تہذیبوں کا ایک دوسرے پر اثر" پر انعام ملا۔[17] چارلس ٹریولین نے اپنے ہاتھ سے انعام عنایت کیا۔ یہ مقالہ پہلی بار 1865ء میں زیورِ اشاعت سے آراستہ ہوا اور اسے 1877ء میں دوسری بار شائع کیا گیا۔ مولانا العبیدی کی پہلی سرکاری ملازمت، وائسرائے کی مجلسِ قانون ساز کے شعبۂ ترجمہ میں بطور میر منشی کے تقرری تھی۔ پھر انہیں ہگلی کالج میں اینگلو عریبک پروفیسر مقرر کیا گیا۔ سید امیر علی جو بعد ازاں

برٹش پریوی کونسل کے رکن اور نامور تاریخ دان بنے، انکے چہیتے شاگرد تھے۔ سید امیر علی نے اپنی یادداشتوں میں لکھا ہے۔ "ہر اتوار کی صبح میں اور فارسی کے استاد مولوی عبید اللہ' سید صاحب (سرسید احمد خاں' علی گڑھ) کے ساتھ ناشتہ کرتے اور شاذ ہی کبھی ایسا ہوا کہ ہم دوپہر ایک بجے سے پہلے رخصت ہوئے ہوں۔ اس دوران گفتگو میں مشرقی تاریخ اور فلسفے کے تمام پہلوؤں کا احاطہ ہوتا۔ مولوی عبید اللہ انگریزی میں مہارت رکھنے والے صاحبِ علم تھے۔[18] 1867ء میں مولوی عبید اللہ اور سید امیر علی نے مشترکہ طور پر سید کرامت علی کی تصنیف "ماخذ العلوم" کا ترجمہ شائع کیا۔[19] ہگلی میں قیام کے دوران مولانا عبید اللہ نے 1873ء میں عربی' انگریزی کی گرامر بھی تصنیف کی تاکہ کلکتہ یونیورسٹی سے ملحقہ کالجوں کے طلبہ بھی استفادہ کر سکیں۔ مولانا عبید اللہ نے دستور فارسی آموز کے نام سے فارسی گرامر بھی لکھی جسے یورپی زبانوں کے قواعد کے تتبع میں مرتب کیا گیا تھا۔ انکی شاعری کا مجموعہ دیوانِ عبیدی کے نام سے 1886ء میں شائع ہوا۔ شیراز کے کسی شاعر نے مولانا کے بارے میں لکھا کہ وہ اہلِ ایران میں سے تو نہیں ہیں لیکن فارسی زبان پر ان کا عبور اہلِ شیراز سے کسی طرح کم نہیں ہے۔[20] ڈھاکہ کی شان میں انکے قصائد کو بہترین فارسی شاعری کے مقابلے میں رکھا جا سکتا ہے۔

جب 16 مارچ 1874ء کو مدرسۂ عالیہ' ڈھاکہ کا قیام عمل میں آیا تو مولانا عبید اللہ العبیدی سہروردی کو اس کا پہلا منتظمِ اعلیٰ مقرر کیا گیا۔[21] وہ مسلسل بارہ برس یعنی اپنی موت تک اس عہدے پر فائز رہے۔ یہ مدرسہ ان تین تعلیمی اداروں میں سے ایک تھا جو اب عبداللطیف کے اس مطالبے پر قائم کئے گئے تھے کہ مسلمان نوجوانوں کے لئے جدید تعلیم کے دروازے کھولے جائیں۔[22] ان تعلیمی اداروں کے قیام کے لئے مطلوبہ مالی اخراجات محسن فنڈ میں سے فراہم کئے گئے تھے۔ مدرسۂ عالیہ' ڈھاکہ' مشرقی بنگال میں مسلمان طالبِ علموں کو انگریزی تعلیم فراہم کرنے والا واحد تعلیمی ادارہ تھا۔

مولانا ترقی پسند خیالات کے حامل تھے اور دل وجان سے سر سید احمد خان کی تحریکِ روشن خیالی کے حامی تھے۔[23] سید صاحب بھی ہندوستان کے مشرق بعید میں اپنے خیالات کا پرجوش حامی پا کر بے حد مسرور تھے۔ مولانا عبید اللہ العبیدی تہذیب و اخلاق کے باقاعدہ لکھنے والوں میں سے ایک تھے۔ یہ رسالہ سر سید احمد خان نے اپنے ترقی پسند خیالات کی ترویج کے لئے جاری کیا تھا۔[24] مولانا محمڈن اینگلو عربک کالج علی گڑھ کے ابتدائی ڈائریکٹروں میں بھی شامل تھے۔[25]

مولانا عبید اللہ العبیدی نے مشرقی بنگال میں تحریکِ نشاۃِ ثانیہ کی بھرپور حمایت کی۔[26] 1863ء میں نواب عبداللطیف نے مسلمانوں میں جدید تعلیم کے فروغ کے لئے محمڈن لٹریری سوسائٹی' کلکتہ کی بنیاد رکھی۔[27] 1877ء میں سید امیر علی نے سنٹرل نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن قائم کی تو اس کا صدر دفتر بھی کلکتہ میں واقع تھا۔[28] ڈھاکہ میں ایسی تنظیم کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے مولانا عبید اللہ العبیدی نے 13 دسمبر 1879ء کو بنگالی مسلمانوں کی بہبود کے لئے فرینڈز ایسوسی ایشن کی بنیاد رکھی۔[29] انہیں اس ایسوسی ایشن کا پہلا سیکرٹری بننے کا اعزاز حاصل ہوا۔ اس ایسوسی ایشن کا زیادہ تذکرہ نہیں ملتا البتہ ایسٹ بنگال پریس کے

مجلّے نواپنجیکا کے 10 مارچ 1880ء کے شمارے میں اس کا سرسری ذکر کیا گیا ہے۔[30]

-- اس ایسوسی ایشن کے قیام کے علاوہ مولانا العبیدی نے ڈھاکہ کالج کے چند سرگرم اشخاص کی طرف سے 24 فروری 1883ء کو ڈھاکہ محمڈن فرینڈز ایسوسی ایشن کے قیام میں بھی بھرپور تعاون کیا۔[31] انہیں اس کا سرپرستِ اعلیٰ مقرر کیا گیا۔ درحقیقت انہی کے پرجوش تعاون کے باعث اس تنظیم کا قیام ممکن ہوسکا۔ 1886ء کے ابتدائی مہینوں میں ان کی وفات تک تنظیم کے باقاعدہ جلسے ڈھاکہ مدرسۂ عالیہ کی عمارت میں منعقد ہوتے تھے، جہاں وہ منتظمِ اعلیٰ تھے۔ اس تنظیم کا مقصد بنگال کی مسلم معاشرت کی فلاح اور مسلمان خواتین و حضرات میں انگریزی تعلیم کا فروغ تھا۔ مالی مشکلات کے باعث ابتدائی برسوں میں تنظیم نے خود کو صرف مسلمان عورتوں کی تعلیم کے لئے وقف کئے رکھا۔ تنظیم کا ہر رکن ماہانہ دو آنے کا چندہ ادا کرنے کا پابند تھا۔ قیام کے بعد تین برس کے اندر اندر تنظیم کی رکنیت 23 سے بڑھ کر 162ء ہو گئی۔ مسلمان لڑکیوں میں تعلیم کے فروغ کے لئے ایسوسی ایشن نے نصاب تیاّر کیا اور پانچویں درجے تک امتحانات کے انعقاد کا اہتمام کیا۔ طالبات کو بنگالی یا اردو میں سوالات کے جوابات تحریر کرنا ہوتے تھے۔ امتحان اپنے بزرگوں کی نگرانی میں اپنے گھر پر بھی دیا جاسکتا تھا اور طالبات کے والدین زبانی امتحان کے لئے ممتحن کی سفارش بھی کر سکتے تھے۔ یہ ایسوسی ایشن 1887ء تک متحرک رہی۔ اس مختصر عرصے میں اس نے بنگالی مسلمانوں کی فلاح کے لئے جو خدمات سرانجام دیں ان کا اندازہ 1887ء میں سیکرٹری کی سالانہ رپورٹ سے ہوتا ہے۔[32]

مولانا عبیداللہ العبیدی نے بنگالی مسلمانوں کے اجتماعی شعور کی بیداری میں اہم کردار ادا کیا۔ ایک صدی سے زیادہ عرصہ قبل انہوں نے 1865ء میں لکھا تھا "اگر جدید علمی حقائق اور ہماری دینی کتب میں کوئی تضاد پایا جائے تو ہمیں مقدس کتب کو اپنی اخروی نجات اور اخلاقی رہنمائی کے لئے استعمال کرنا چاہئے تاکہ علمی تحقیق کے لئے"[33] سرکاری مدارس میں اصلاحات کی حمایت کرتے ہوئے انہوں نے لکھا "سرکاری مدارس میں نصابِ تعلیم کو ازسرنو تشکیل دینا چاہئے۔ عربی کی تعلیم کو عملی اور ابتدائی تدریس تک محدود کرکے تفاسیر اور لفظی خیال آرائیوں پر مشتمل حواشی کو ترک کر دینا چاہئے تاکہ مابعد الطبیعاتی نوعیت کے سوالات میں مغزپاشی سے طلبہ کا وقت ضائع نہ ہو کیونکہ اب ان امور کی عملی اہمیت از کار رفتہ ہو چکی ہے بہتر ہو گا کہ اس کی بجائے طالبِ علموں کو بزبانِ انگریزی علومِ جدیدہ کی تعلیم کے مواقع فراہم کئے جائیں۔[34]

مولانا عبیداللہ العبیدی نے 1886ء میں بحالت سجدا اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کی اور شاہی مسجد کے نزدیک لال باغ قلعہ میں مدفون ہیں۔

مولانا العبیدی حسین شہید سہروردی کے نانا تھے۔ شہید سہروردی کے دادا ایک ممتاز قانون دان، بھاگلپور (بہار) کے صدرِ اعلیٰ اور مولانا عبیداللہ العبیدی کے برادرِ حقیقی تھے۔ ان کے والد گرامی کا اسم شریف امین الدین سہروردی تھا۔ خود حسین شہید سہروردی کے والدِ محترم، زاہد الرحمٰن، زاہد المعروف

بیرسٹر زاہد سہروردی کلکتہ ہائی کورٹ کے جج تھے۔ تاہم انہوں نے عملی زندگی کا آغاز چوبیس پرگنہ (مغربی بنگال) کی ضلع کچہری میں وکیل کی حیثیت سے کیا تھا۔ چار سال تک قانونی پریکٹس کے بعد انہیں کلکتہ ہائیکورٹ کے اپلیٹ ڈویژن میں ایڈووکیٹ مقرر کیا گیا۔ اس زمانے میں ان حضرت کے لئے لندن انز آف کورٹ میں داخلے کی شرائط نرم کی جاسکتی تھیں جو ہندوستان کی کسی ہائیکورٹ میں قانونی پریکٹس کرچکے ہوں۔ زاہد سہروردی نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور قانون کی اعلیٰ تعلیم کے لئے لندن چلے گئے جہاں انہوں نے امتیازی حیثیت سے کامیابی حاصل کی[35]۔ وطن واپسی کے بعد انہوں نے کلکتہ ہائیکورٹ بار میں شمولیت اختیار کرلی لیکن انہیں معمولی مقدمات کی عدالت میں بطور منصف تقرری مل گئی۔ بعدازاں وہ استعفیٰ دیکر بنگال کی مجلس قانون ساز کے رکن بن گئے۔ بار سے ریٹائرمنٹ کے بعد انہیں سر کے خطاب سے نوازا گیا۔[36]

سہروردی کی والدہ بیگم خجستہ اختر بانو نے اپنے والد مولانا عبید اللہ العبیدی سے عربی، اردو اور انگریزی کی تعلیم حاصل کر رکھی تھی۔ وہ پہلی مسلمان خاتون تھیں جنہوں نے سینئر کیمبرج کا امتحان پاس کیا۔[37] انہوں نے ہندوستان نظامت امتحانات سے فارسی ادب میں بی اے آنرز بھی کیا۔ بعدازاں کلکتہ یونیورسٹی نے انہیں اردو ادب کی ممتحن مقرر کردیا۔[38] وہ واحد ہندوستانی خاتون تھیں جنہیں یہ اعزاز ملا۔[39] پردے کی پابندی کے باوجود خجستہ اختر بانو تعلیم نسواں کی پرجوش حامی اور سرگرم سماجی کارکن تھیں۔ انہوں نے ''آئینۂ عبرت'' کے نام سے تعلیم نسواں پر ایک قابل قدر کتاب بھی تصنیف کی۔ کلکتہ یونیورسٹی نے یہ کتاب ملحقہ کالجوں کے لئے بطور نصاب منظور کر رکھی تھی۔ 1909ء میں انہوں نے کلکتہ میں سہروردیہ گرلز سکول کی بنیاد رکھی۔ وائسرائے ہند، لارڈ منٹو کی اہلیہ نے سکول کا افتتاح کیا۔ غرباء سے اظہار ہمدردی کے طور پر وہ اکثر کچی بستیوں میں جاتیں۔ ان لوگوں کے لئے تعلیم کا انتظام کرتیں اور انہیں صحت اور صفائی کی اہمیت سے آگاہ کرتیں۔ اسی نوعیت کے سماجی کام کے دوران وہ بیمار پڑ گئیں اور 12 جنوری 1919ء کو ان کا انتقال ہوا۔

خجستہ اختر بانو کے چار بھائی تھے۔ مامون سہروردی، عبداللہ المامون سہروردی، حسن سہروردی اور محمود سہروردی، مامون سہروردی کو بی اے کے فوراً بعد اجل نے آلیا البتہ باقی تینوں بھائیوں نے علم اور سماجی خدمت میں نام پیدا کیا۔ عبداللہ المامون سہروردی نے برطانیہ میں قانون کی تعلیم حاصل کی اور آکسفورڈ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی، ایل ایل ڈی اور ڈی لٹ کی ڈگریاں حاصل کیں اور انگلستان میں قانونی پریکٹس کرنے لگے۔ انگلستان میں قیام کے دوران وہ جمال الدین افغانی کی پان اسلامک تحریک سے بے حد متاثر ہوئے اور 1905ء میں پان اسلامک سوسائٹی لندن کی بنیاد رکھی۔[40] اسلام کے لئے ان کی محبت سے متاثر ہو کر ترکی کے خلیفہ، سلطان عبدالحمید نے انہیں مجیدیہ کا خطاب دیا۔[41] شاہ ایران نے بھی انہیں افتخار الملت کے خطاب سے نوازا۔[42] ہندوستان واپسی کے بعد عبداللہ المامون سہروردی اسلامیہ کالج لاہور کے پرنسپل کے طور پر فرائض سرانجام دینے لگے پھر کلکتہ ہائیکورٹ بار ایسوسی ایشن میں شمولیت اختیار کی لیکن جلد ہی استعفیٰ

دیکر کلکتہ یونیورسٹی میں ٹیگور پروفیسر آف لاء کی نشست سنبھال لی۔[43] اس زمانے میں یونیورسٹی میں تدریس کو نہایت معزز خیال کیا جاتا تھا اور اس منصب کے لئے معقول مشاہرہ ملتا تھا۔ 1911ء میں جنگ بلقان چھڑ گئی انہوں نے ترکی کے زخمیوں کی دیکھ بھال کے لئے ریڈ کراس سوسائٹی کلکتہ کی بنیاد رکھی۔[44] پھر برطانیہ اور امریکہ کی حکومتوں کی درخواست پر بالترتیب گیمبیا اور فلپائن کے مسلمانوں کے لئے دساتیر تشکیل دیئے۔[45] آپ نے ٹیپو سلطان (میسور) کے خاندان میں شادی کی لیکن لاولد رہے۔

سہروردی کے تیسرے ماموں لیفٹننٹ کرنل سر حسن سہروردی' ڈی ایس سی' ایل ایل ڈی' ایف آر سی ایس کلکتہ یونیورسٹی کے پہلے مسلمان وائس چانسلر تھے۔ حسن سہروردی نے لندن میں مسلم کلچرل سنٹر کے قیام اور ریجنٹ پارک مسجد کی تعمیر میں اہم کردار ادا کیا۔[46] آپ نے نواب آف ڈھاکہ' سید محمد آزاد کی دختر سے شادی کی۔ نواب صاحب کی ایک اور دختر کا عقد اے کے فضل الحق سے ہوا تھا۔ حسن سہروردی کی اکلوتی بیٹی 'شائستہ بیگم کی شادی 'محمد اکرام اللہ آئی سی ایس سے ہوئی جو برطانیہ کینیڈا اور فرانس میں پاکستان کے ہائی کمشنر اور سفیر رہے اور 1958ء سے لیکر 1962ء تک پاکستان کے خارجہ سیکرٹری بھی رہے۔ شائستہ بیگم کو پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی کی رکن منتخب کیا تھا۔ شائستہ بیگم نے اقوامِ متحدہ میں پاکستان کی نمائندگی بھی کی اور انہیں 1963ء میں اپنے خاوند کی وفات کے بعد مراکش میں پاکستان کی سفیر بھی مقرّر کیا گیا۔ حسین شہید سہروردی کے چوتھے ماموں 'محمود سہروردی انڈین کونسل آف سٹیٹس کے رکن تھے۔

حسین شہید سہروردی کے بڑے اور واحد بھائی پروفیسر حسن شاہد سہروردی آکسفورڈ یونیورسٹی سے بی اے آنرز کرنے کے بعد مزید تعلیم کے لئے روس چلے گئے۔ وہ ماسکو کے دانشور اور فنکار حلقوں میں بڑے ہر دلعزیز تھے چنانچہ انہوں نے ماسکو یونیورسٹی میں ہی انگریزی ادب پڑھانے کا فیصلہ کیا۔ روسی انقلاب کے بعد وہ روسی تارکینِ وطن کے ساتھ ہی روس سے باہر نکل گئے۔ انہوں نے ماسکو آرٹ تھیٹر میں کونسٹانٹن سٹین سلاوسکی کے ساتھ ملکر کام کیا تھا۔ پروفیسر حسن برصغیر کے ممتاز ماہر لسانیات تھے اور انہیں ایک درجن سے زائد زبانوں پر قدرت حاصل تھی۔ 1947ء میں تقسیم ہند سے قبل وہ کلکتہ یونیورسٹی میں فنونِ لطیفہ کے استاد تھے۔ بعد ازاں وہ بنگال اور پھر پاکستان پبلک سروس کمیشن کے رکن بن گئے۔ روسی تارکینِ وطن کے ساتھ روابط کی بنا پر ایک زمانے میں برطانوی حکومت انہیں شک و شبہے کی نظر سے دیکھتی تھی لیکن برطانیہ کے ملک الشعراء رابرٹ برجز نے خود برطانوی حکومت کے سامنے پروفیسر حسن کی بریت پیش کی اور معاملہ رفع دفع ہو گیا۔

تعلیم اور گھریلو ماحول

حسین شہید سہروردی نے ابتدائی تعلیم اپنی والدہ اور ماموں عبداللہ المامون سہروردی سے حاصل کی۔ بعد ازاں مدرسۂ عالیہ 'کلکتہ میں داخل ہو گئے اور سینٹ ژیویرز کالج سے سائنس میں آنرز کے ساتھ

بی ایس سی کی ڈگری لی۔ انہوں نے اپنی والدہ کی خواہش پر 1913ء کلکتہ یونیورسٹی سے ایم اے عربی کی ڈگری حاصل کی اور اسی برس اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان روانہ ہو گئے۔ آکسفورڈ یونیورسٹی سے بی ایس سی آنرز لیا اور اسی یونیورسٹی سے بی سی ایل کی سند حاصل کی۔ 1918ء میں گریز اِن سے بار ایٹ لاء کیا۔

سہروردی نے 1920ء میں سر عبدالرحیم کی دختر نیاز فاطمہ سے شادی کی سر عبدالرحیم کلکتہ ہائیکورٹ کے جج، گورنر کی ایگزیکٹو کونسل کے رکن اور ہندوستان کی مجلسِ قانون ساز کے صدر تھے۔ یہ ازدواجی تعلق صرف تین برس جاری رہ سکا۔ 1922ء میں بیگم نیاز کا انتقال ہو گیا۔ اس شادی سے سہروردی کی ایک بیٹی اور ایک بیٹا تھے۔ بیٹے شہاب سہروردی کا 1940ء میں لندن میں انتقال ہو گیا جب وہ آکسفورڈ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ بیٹی اختر جہاں سہروردیہ کی شادی سر محمد سلیمان کے بیٹے شاہ احمد سلیمان سے ہوئی۔ سر محمد سلیمان الہ آباد ہائیکورٹ کے چیف جسٹس، الہ آباد یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور انڈین فیڈرل کورٹ کے جج رہ چکے تھے۔ انہیں ایک ممتاز ماہرِ ریاضی کے طور پر بھی جانا جاتا تھا۔ بیگم اختر سلیمان کا انتقال 1982ء میں کراچی میں ہوا۔ ان کی واحد اولاد شاہدہ منی ہیں جو خود بھی بیرسٹر ہیں۔

فاطمہ نیاز کی وفات کے تقریباً 18 برس بعد 1940ء میں سہروردی نے ماسکو آرٹ تھیٹر کی سابق اداکارہ ویرا ٹسنکو سے شادی کر لی۔ ویرا ٹسنکو کی ملاقات پروفیسر شاہد سہروردی سے اس وقت ہوئی تھی جب وہ ماسکو آرٹ تھیٹر میں ہدایت کاری کر رہے تھے۔ انقلابِ روس کے بعد جب ویرا ٹسنکو کو اپنے اہلِ خانہ کے ہمراہ روس سے فرار ہونا پڑا تو پروفیسر شاہد نے انہیں ہندوستان آنے کی دعوت دی تھی۔ ویرا ٹسنکو نے ایک باصلاحیت روسی سرجن سے شادی کی تھی۔ لیکن ان کے درمیان علیحدگی ہو گئی۔ ویرا ٹسنکو نے بھی اپنے ہونے والے شوہر حسین شہید کی طرح بڑی رنگارنگ اور غیر معمولی زندگی بسر کی تھی۔ پہلے انقلابِ روس کے ہاتھوں جلاوطن ہونا پڑا۔ اٹلی میں قیام پذیر ہوئیں تو مسولینی برسرِ اقتدار آ گیا جن دنوں جرمنی پہنچیں، اڈلف ہٹلر نے عنانِ اقتدار سنبھال لی۔ اسپین کی خانہ جنگی کے دنوں میں وہ اسپین میں تھیں۔ ان تمام ممالک میں ان کی حیثیت ایک اجنبی کی تھی اور انہیں بڑے ہنگامہ خیز اور خطرناک حالات میں بار بار فرار ہونا پڑا۔ جب وہ ہندوستان پہنچیں تو یہاں جدوجہدِ آزادی اپنے طوفانی مرحلے میں داخل ہو رہی تھی۔

سیاست میں سہروردی کی ہمہ وقتی مشغولیت اور واضح معاشرتی، لسانی اور ثقافتی اختلافات نے اس بندھن پر اتنا دباؤ ڈالا کہ 1946ء میں دونوں علیحدہ ہو گئے تاہم طلاق کا بالفعل فیصلہ 1951ء میں اپنے اختتام کو پہنچا۔ دونوں نے اس کے بعد شادی نہیں کی۔

طلاق کے بعد اس تعلق کی واحد نشانی، راشد سہروردی نے انگلستان میں پرورش پائی۔ چارٹر ہاؤس، آکسفورڈ اور لندن یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد راشد سہروردی نے اپنے والد کی اجازت سے والدہ کے نقشِ قدم پر چلنے کا فیصلہ کیا اور رائل اکیڈمی آف ڈرامیٹک آرٹ سے امتیازی طور پر گریجویشن

کی۔ اب وہ انگلستان میں پیشہ ور اداکار ہیں اور کئی برس تک رائل شیکسپیئر کمپنی میں اداکاری کے جوہر دکھا چکے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ راشد سہروردی کے اس فیصلے نے سہروردی کو مایوس کیا ہوگا کیونکہ یقیناً ان کی یہ خواہش ہوتی کہ انکے اکلوتے فرزند انکے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے قانون یا سیاست میں نام پیدا کریں۔ تاہم سہروردی نے اپنی افتادِ طبع کے عین مطابق راشد کے اس فیصلے کی حمایت کی اور کہا کہ اگر حالات مختلف ہوتے شاید خود انہوں نے اداکار بننے کا فیصلہ کیا ہوتا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جن لوگوں نے انہیں عدالتوں اور عوامی اجتماعات میں اپنی شخصیت کے جوہر دکھاتے دیکھ رکھا تھا اور انکے نپے تلے لہجے اور کھنکتی ہوئی آواز میں ان کے دلائل سنے تھے، انہیں سہروردی کی یہ تجویز ہرگز غیر معقول نہ لگتی کہ وہ اداکار بھی بن سکتے تھے۔

ہندو مسلم اتحاد

1920ء میں سہروردی واپس وطن آئے اور فوراً اس زمانے کی سیاسی تحریکوں سے وابستہ ہوگئے۔ سیاست میں سہروردی کے فوراً داخل ہونے میں تین عوامل نے غالباً اہم ترین کردار ادا کیا۔

اولاً، اونچی ذات کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات تیزی سے خراب ہو رہے تھے۔ اگرچہ بنگالی مسلمان تعداد میں واضح طور پر اپنے ہم وطن ہندوؤں پر برتری رکھتے تھے لیکن معاشی اور سیاسی میدانوں میں وہ ہندوؤں کی قوّت کا مقابلہ کرنے سے قاصر تھے۔ اونچی ذات کے ہندو تعلیم میں مسلمانوں سے آگے نکل چکے تھے اور انہوں نے تمام کلیدی سرکاری ملازمتوں اور تجارت پر اجارہ داری قائم کر رکھی تھی۔ مسلمانوں کی اکثریت نیچی ذات کے ہندوؤں کی طرح کاشت کار بن کر رہ گئی تھی۔

ثانیاً، اگرچہ آل انڈیا مسلم لیگ کی بنیاد 1906ء میں ڈھاکہ میں رکھی گئی تھی اور اسکے مقاصد میں ہندوستان بھر کے مسلمانوں کے ساتھ بنگالی مسلمانوں کے مفادات کا تحفظ اور تقسیمِ بنگال کی تنسیخ کو روکنا شامل تھا تاہم مغربی صوبوں کے چند آرام طلب سیاست دانوں تک محدود ہونے کے باعث یہ تنظیم اپنی جنم بھومی بنگال میں اپنا اعتبار کھو بیٹھی تھی۔

ثالثاً، جنگِ عظیم اول (1914ء - 1918ء) ابھی ابھی اختتام کو پہنچی تھی اور اس کے نتیجے میں مشرقی یورپ، شمالی افریقہ اور مغربی ایشیا میں پھیلی ہوئی وسیع سلطنتِ عثمانیہ ٹکرے ٹکرے ہو چکی تھی اور خود خلافت کا وجود خطرے میں پڑ چکا تھا۔ مسلمانانِ ہند نے جنگِ بلقان (1911ء - 1912ء) کے دوران ترکی کی حمایت کی تھی۔ جب 1914ء میں جنگِ عظیم شروع ہوئی تب بھی مسلمانوں نے ترکی کی حمایت جاری رکھی۔ جنگ کے اختتام پر انکے لئے واحد مسلم سلطنت کے مستقبل کے بارے میں مضطرب ہونا قدرتی امر تھا۔ ترکی وہ واحد عالمی طاقت تھی جسے وہ اپنے اجتماعی شعور اور فخر کی علامت کے طور پر پیش کر سکتے تھے چنانچہ ہندوستانی مسلمانوں نے ترکی کی حمایت اور اپنی جدوجہد آزادی کے فروغ کی خاطر

تحریکِ خلافت شروع کی۔

تحریک خلافت

علی برادران...... گرم دمِ جستجو محمد علی جوہر اور نرم دمِ گفتگو شوکت علی...... کی زیرِ قیادت تحریک خلافت کی بازگشت سے ان دنوں پورا ہندوستان گونج رہا تھا۔ گاندھی نے صورتحال کا فائدہ اٹھایا اور ترکی میں بحالئ خلافت کے مطالبے کی حمایت شروع کر دی۔ جلد ہی خلافت کمیٹی متوسط طبقے کی تنظیم سے عوام کی آواز میں تبدیل ہو گئی۔ خلافت کمیٹی کے بہت سے ارکان کانگرس کے بھی رکن تھے چنانچہ دونوں جماعتوں میں گہرا تعاون پیدا ہو گیا۔ علی برادران نے مسلسل گاندھی سے تعاون کیا اور حتیٰ الامکان کوشش کی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے متضاد دعاوی اور مطالبات کے درمیان مفاہمت پیدا کی جاسکے۔ اس ضمن میں بہت سی کانفرنسیں منعقد ہوئیں جن میں کلکتہ کے نامور فوجداری وکیل اور ممتاز بنگالی رہنما دلیش بندھو سی آر داس نے خاص طور پر اہم کردار ادا کیا۔ سہروردی نے علی برادران کی سیاسی رہنمائی قبول کر لی اور بنگال میں علی برادران کے دستِ راست کی حیثیت سے بنگالی مسلمانوں کو متحد اور منظم کرنے لگے۔ انہیں کلکتہ خلافت کمیٹی کا سیکرٹری چنا گیا۔

بنگال پیکٹ

محض ایک برس بعد، 1921ء میں خدیر پور انڈسٹریل ایریا سے بنگال کی مجلسِ قانون ساز کا رکن منتخب کیا گیا۔[48] آکسفورڈ کے تعلیمی پس منظر کے باعث ان کا میلان آزادی اور اختلافی سیاست کی طرف تھا۔ چنانچہ مجلسِ قانون ساز میں انہوں نے مدلل لیکن تیکھے انداز میں حکومت کے افعال و اعمال پر گرفت کرنا شروع کیا اور آزادانہ روّیہ اختیار کیا۔ ان دنوں برطانوی حکومت نے اسمبلی میں قانونِ بیدزنی پیش کیا۔ سہروردی نے حزبِ اختلاف کے رہنما کی حیثیت سے اس قانون پر کڑی تنقید کی اور نوجوانوں کے دل موہ لئے۔[49] انہوں نے برطانوی حکومت کو خبردار کیا "ہندوستان کے رہنے والے حیوان نہیں ہیں۔ وہ بھی اپنے سفید آقاؤں کی طرح اشرف المخلوقات ہیں۔ انگریزوں کی طرح وہ بھی جذبات رکھتے ہیں۔ دنیا بھر کے معزز انسانوں کی طرح ان میں بھی عزتِ نفس کا احساس پایا جاتا ہے۔ عین ممکن ہے کہ اقتدار کے نشے میں چور انگریز اپنے نامزد کردہ ارکانِ مجلس کی مدد سے یہ بل پاس کروالیں لیکن یہ قانون انسانیت کی توہین ہے۔ ہم غلام نہیں تھے۔ ہم نے انگریزوں کی وحشی قوت کے سامنے سپر ڈالی تھی لیکن تاریخ اس بات کو ثابت کرے گی کہ تہذیب کے کسی بھی پیمانے سے ہمارا ماضی ہمارے حکمرانوں سے بہتر تھا"[50]

کانگرس کے رہنماؤں نے سہروردی کے جرأت مندانہ نقطۂ نگاہ کو تسلیم کیا اور انہیں حزبِ اختلاف کے لئے ایک قابلِ قدر اثاثہ سمجھنے لگے۔ اس سے سہروردی کو سی آر داس کے قریب آنے کا موقع ملا اور

جدوجہدِ آزادی سے قبل ہندو مسلم یگانگت کی اہمیت کے قائل ہو گئے۔ داس بھی ایمانداری سے سمجھتے تھے کہ جب تک مسلمانوں کو حکومت میں ان کا منصفانہ حق نہ دیا جائے ' آزادی کا خواب شرمندۂ تعبیر ہونا مشکل ہے۔ ایک اعلیٰ مرتبت مدبّر کے طور پر سی آر داس مکمل طور پر غیر جانبدار تھے۔ ہندو اور مسلمان ' سبھی یکساں طور ان کی عزّت کرتے تھے۔ سی آر داس نے سب سے پہلے بنگالی قومیت کا تصوّر پیش کیا اور 1923ء میں بنگالی مسلمانوں کے ساتھ ایک معاہدہ کیا جسے بنگال پیکٹ کے نام سے جانا جاتا ہے۔[51] اس معاہدے کی رو سے بنگال میں مسلم اکثریت ' جداگانہ انتخابات اور مسلم طلبہ کیلئے تعلیمی سہولتوں میں توسیع کو تسلیم کیا گیا۔ معاہدے میں یہ بھی تسلیم کیا گیا کہ مجلسِ قانون ساز سمیت تمام منتخب اداروں میں مسلمانوں کو مساوی نمائندگی دی جائے گی اور سرکاری اداروں میں مسلمانوں کو اس وقت تک بھرتی کیا جائے گا جب تک ان کی تعداد ہندوؤں کے برابر نہ ہو جائے۔ معاہدے میں یہ ضمانت بھی دی گئی کہ ہر تین برس بعد ایک مسلمان کو کلکتہ کا میئر چنا جائے گا، مراعات یافتہ ہندوؤں نے معاہدے کی مخالفت کی لیکن سی آر داس صوبائی اور مرکزی سطح پر آل انڈیا نیشنل کانگرس کی منظوری حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔[52]

داس آزاد خیال جمہوریت میں یقین رکھتے تھے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ کانگرس کے ارکان کی اکثریت انکے خیالات سے اتفاق نہیں رکھتی تو وہ کانگرس سے الگ ہو گئے۔ انہوں نے 1923ء میں سوراج پارٹی کی بنیاد رکھی اور اسکے ذریعے مجلسِ قانون ساز کے رکن منتخب ہوئے تاکہ مجلس کے پلیٹ فارم سے آزادی کے لئے جدوجہد کر سکیں۔[53] انہیں سہروردی پر اس قدر اعتماد تھا کہ سہروردی کو سوراج پارٹی کا ڈپٹی لیڈر مقرر کیا گیا۔ غالباً 1924ء میں کلکتہ میونسپلٹی کا درجہ بڑھا کر اسے کارپوریشن بنا دیا گیا۔ 1924ء میں کلکتہ کارپوریشن کے لئے انتخابات منعقد ہوئے اور سوراج پارٹی نے کارپوریشن میں اکثریت حاصل کر لی۔[54] اگرچہ سہروردی کبھی بھی کانگرس کے رکن نہیں رہے لیکن بنگال پیکٹ کی رو سے انہیں کارپوریشن کا ڈپٹی میئر منتخب کیا گیا جبکہ سی آر داس میئر بنے۔ سہروردی سے قبل کوئی مسلمان اس عہدے پر فائز نہیں ہوا تھا۔ اس زمانے میں کارپوریشن کو مقامی سیاسی معاملات میں خاصا اثر و نفوذ حاصل ہوتا تھا۔ سہروردی نے ڈپٹی میئر کی حیثیت سے بھرپور کوشش کی کہ کارپوریشن میں ہندوؤں کی اجارہ داری ختم کی جا سکے۔ سہروردی کے لئے یہ مشروط کامیابی بھی کوئی معمولی کارنامہ نہیں تھا کیونکہ ابھی تو وہ بساطِ سیاست کے نووارد تھے۔

1926ء کے فسادات

جب تک سی آر داس زندہ تھے، کسی کو بنگال پیکٹ کی خلاف ورزی کی جرأت نہ ہو سکی۔ 1925ء میں ان کی وفات کے بعد سہروردی اور سبھاش چندر بوس نے معاہدے کی تجدید کی۔[56] بایں ہمہ داس کی موت سے صرف بنگال ہی نہیں بلکہ پورے ہندوستان کی سیاست کا رنگ بدل کر رہ گیا۔ سہروردی کو یقین تھا کہ اگر سی آر داس زندہ رہتے تو انہوں نے "ہندو مسلم سیاست کے ان تضادات اور تلخیوں" کو ختم

کر کے دم لیا ہوتا جو بالآخر ہندوستان کی تقسیم پر منتج ہوئیں اور پاکستان وجود میں آیا۔[57]

1926ء میں ایک مسلمان نے "رنگیلا رسول" نامی کتاب کے مصنف راجپال کو قتل کر ڈالا چنانچہ مسلم کش فسادات پھوٹ پڑے[58]۔ فسادات کے دوران سہروردی اپنی جان خطرے میں ڈال کر فساد زدہ شہر کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک نہتّے شہریوں کی حفاظت کے لئے سرگرم عمل رہے۔ انہوں نے فسادات کی روک تھام اور ہندو مسلم ہم آہنگی کی بحالی کے لئے ہر ممکن کوشش کی۔

فسادات کے دوران ہندوؤں کو ہر طرح سے برتری حاصل تھی۔ نہ صرف یہ کہ کلکتہ کی 78 فیصد آبادی ہندو تھی بلکہ کلکتہ پولیس اوپر سے لیکر نیچے تک ہندوؤں سے بھری پڑی تھی۔ مسلح پولیس میں تو قریب قریب سبھی افراد ہندو تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کو کئی مقامات پر گاجر مولی کی طرح کاٹ پھینکا گیا۔ اس پر طرّہ یہ کہ مسلمانوں کی کمزور حیثیت اور زیادہ جانی و مالی نقصان کے باوجود فوجداری مقدمات بھی زیادہ تر مسلمانوں ہی کے خلاف قائم کئے گئے۔ 64 کے قریب مسلمانوں پر اقدامِ قتل کے الزام میں مقدمات قائم کئے تھے جبکہ صرف ایک ہندو کو اس قسم کے الزام میں ملوث کیا گیا۔ مسلمانوں کی بستیوں میں خوراک کی فراہمی کے انتظامات کرنا پڑے کیونکہ وہ ہر طرف سے ہندوؤں میں گھرے ہوئے تھے اور ان کے علاقوں میں ہندو دکاندار اپنی دکانیں بند کر کے گھروں میں بیٹھ رہے تھے چنانچہ خوراک کی قلّت پیدا ہو گئی۔ دوسری طرف فوجداری مقدمات میں ملوث مسلمانوں کا دفاع بھی ایک اہم مسئلہ تھا۔ نوجوان قانون دان سہروردی ان بے گناہ افراد کے دفاع کے لئے ایک جان گسل قانونی جنگ میں کود پڑے۔ ان کی مہارت اور توجّہ کے باعث تمام مسلمان بری ہوئے ان میں ایک ایسا شخص بھی شامل تھا جسے پھانسی کی سزا سنائی جا چکی تھی[59]۔ سہروردی نے بندر گاہ کے مسلمان کارکنوں سے اپیل کی کہ وہ فسادات سے متاثرہ مسلمانوں کی دل کھول کر اعانت کریں۔ بندر گاہ پر کام کرنے والے مزدوروں کی اکثریت کا تعلق مشرقی بنگال سے تھا۔ بندر گاہ کے مزدوروں اور کچّی بستیوں کے مکینوں سے قریب رابطے کے باعث سہروردی کو ان کے مسائل سمجھنے کا موقع ملا۔ اس کے بعد سہروردی بنگال کی مزدور تحریک سے براہِ راست وابستہ ہو گئے۔ اگرچہ فسادات کے دوران سہروردی نے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کے کئی ہندوؤں کو مسلمانوں کے علاقوں سے بحفاظت باہر نکالا اور کئی مسلمانوں کو ہندوؤں کے چنگل سے چھڑالائے تھے لیکن ہندوؤں کے ایک گروہ نے ان کے خلاف غلط بیانی اور بدنیتی پر مبنی پروپیگنڈے کی مہم شروع کر دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سہروردی نے 1927ء میں کلکتہ کارپوریشن کے ڈپٹی میئر کے عہدے سے استعفیٰ دیدیا۔

ان فسادات کے بعد 1927ء میں اعلیٰ سطح پر کوشش کی گئی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مفاہمت پیدا کی جا سکے۔ ہندوستان بھر سے ہندو اور مسلمان نمائندوں کی ایک کانفرنس شملہ کے مقام پر منعقد ہوئی جس کی صدارت مہاراجہ الور نے کی۔ اس کانفرنس میں محمد علی جناح اور سہروردی مسلمانانِ ہند کے نمائندوں کی حیثیت سے موجود تھے[60]۔ اختلافی نکات کا مرکز گاؤ کشی اور مسجدوں کے آگے ڈھول بجانے کی شکایات تھیں۔ عام خیال تھا کہ یہی اختلافات بنیادی طور پر 1926ء کے

فسادات کے پسِ پشت کار فرما تھے۔

سب سے پہلے ہندوؤں نے مطالبہ کیا کہ مسلمان گاؤ کشی بند کر دیں کیونکہ ہندو دھرم میں گائے کو مقدس سمجھا جاتا ہے بلکہ ماں کا درجہ دیا جاتا ہے لیکن مسلمانوں نے اصرار کیا کہ گائے کا گوشت لحمیات حاصل کرنے کا سستا طریقہ ہے کیونکہ گائے کا گوشت، بکرے، مچھلی یا پرندوں کے گوشت سے سستا ہے۔ مزید بر آں عید الضحیٰ کے موقع پر بکرے کی قربانی کی نسبت گائے کی قربانی زیادہ بہتر رہتی ہے۔ ایک گائے کی قربانی سے سات مسلمان اپنے مذہبی فریضے سے سبکدوش ہو سکتے ہیں جبکہ بکرے یا بھیڑ کی قربانی سے صرف ایک شخص کا فرض پورا ہوتا ہے۔ البتہ مسلمان اس کے لئے تیار تھے کہ گائے کو سرِ عام قربان یا ذبح نہ کیا جائے اور اسی طرح گائے کا گوشت سرِ عام ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچایا نہ جائے لیکن اس سے ہندوؤں کا اعتراض دور نہیں ہوتا تھا انہیں کسی بھی صورت گاؤ کشی قبول نہیں تھی خاص طور پر عید الضحیٰ کے موقع پر گائے کی قربانی تو انہیں خاص طور پر ناگوار ہوتی۔ شہروں میں گائے مذبح خانوں میں ذبح کی جاتی تھیں لیکن دیہات میں تو کسی بھی مناسب جگہ مثلاً سڑک کے کنارے انہیں ذبح کر لیا جاتا تھا تاکہ ان کا گوشت آسانی سے فروخت کیا جا سکے۔

مزید بر آں ہندوؤں کو اصرار تھا کہ انہیں سڑکوں پر ڈھول بجانے کا حق حاصل ہے خواہ وہاں قریب ہی کسی مسجد میں نماز کیوں نہ ادا ہو رہی ہو۔ مسلمانوں کا خیال تھا کہ مسجد کے پاس سے گزرتے ہوئے باجے وغیرہ بجانے سے اجتناب ہونا چاہئے۔ یہ مسلمانوں کے عہدِ حکومت سے ایک روایت چلی آ رہی تھی خاص طور پر مشرقی بنگال کے کچھ علاقوں میں جہاں مسلمان واضح اکثریت میں تھے۔ بعض مسلمان اس حد تک مفاہمت کے لئے تیار تھے کہ ہندو صرف اس وقت ڈھول باجے سے پرہیز کر لیا کریں جب مسجد میں واقعی نماز ادا ہو رہی ہو۔ تاہم انتہا پسند مسلمانوں کو اصرار تھا کہ مسجدوں کے پاس ڈھول باجے بجانے سے مکمل اجتناب ہونا چاہئے کیونکہ نماز تو دن میں کسی وقت بھی ادا کی جا سکتی ہے اور واقعتاً مساجد میں ہر وقت عبادت جاری رہتی ہے۔

دوسری طرف انتہا پسند ہندو مصر تھے کہ انہیں بحیثیت شہری شارعِ عام سے گزرنے اور ڈھول تاشے بجانے کا حق پہنچتا ہے خواہ دن کا کوئی وقت ہو اور نماز ادا ہو رہی ہو یا نہ ہو رہی ہو۔ آخر حکومت نے اس مسئلے کا بین بین حل ڈھونڈ لیا اور فیصلہ دیا کہ مساجد کے قرب و جوار میں موسیقی پر کوئی پابندی نہیں سوائے ان اوقات کے جب نماز ادا ہو رہی ہو یا ان جگہوں کے جہاں پر مسجدوں کے قریب موسیقی سے اجتناب کی دیرینہ روایت چلی آ رہی ہے۔ اس فیصلے سے ہندو مزید برافروختہ ہو گئے اور چڑ کر مسجدوں کے سامنے پہلے سے بھی زیادہ زور و شور کے ساتھ مسجدوں کے سامنے باجے تاشے بجانے لگے۔

علیحدگی پسند مسلم رہنما

1927ء کی شملہ کانفرنس کا کوئی نتیجہ بر آمد نہ ہو سکا۔ جناح نے نجی طور پر سہروردی سے کہا کہ وہ

ہندوؤں کو انتہائی غیر معقول سمجھتے تھے۔[61] اس وقت جناح کانگریس میں شامل تھے اور خیال تھا کہ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مصالحت کنندہ کا کردار ادا کر سکیں گے چنانچہ انہوں نے دونوں قوموں کے درمیان مابہ النزاع معاملات میں بین بین راستہ تلاش کرنے کی کوشش کی اور مخلوط انتخابات کی حمایت شروع کر دی لیکن شملہ امن کانفرنس کی ناکامی نے سہروردی کو قائل کر دیا کہ "ہندو مسلم اتحاد کی باتیں محض خواب وخیال ہیں" اور "ہندو مسلمانوں پر مکمل بالادستی کی قیمت پر ہندو مسلم اتحاد حاصل کرنا چاہتے ہیں"[62] اس کے بعد سہروردی نے واضح طور پر ایک علیحدگی پسند مسلم رہنما کا انداز اپنا لیا اور بحیثیت ایک قوم کے مسلمانوں کی بقا اور فلاح کے لئے جدوجہد کرنے لگے۔

1916ء میں طے پانے والے لکھنؤ پیکٹ کی رو سے 1909ء اصلاحات ایکٹ کا نافذ کردہ جداگانہ انتخابات کا اصول پہلے ہی تسلیم کرا لیا گیا تھا۔ اس اصول کے مطابق قانون ساز مجالس میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے لئے نشستوں کی تعداد مخصوص تھی۔ مسلمان رائے دہندگان مسلم ارکانِ مجالس کو منتخب کرتے تھے اور باقی نشستوں کے لئے تمام غیر مسلم رائے دہندگان انتخاب کرتے تھے۔ مسلمان محسوس کرتے تھے کہ مخلوط انتخابات میں اپنی عددی برتری اور سیاسی بالادستی کے باعث ہندو صرف ایسے مسلمان امیدواروں کو کامیاب ہونے دیں گے جو انکے حلقۂ اثر میں ہوں چنانچہ مجالسِ قانون ساز میں مسلمانوں کی نمائندگی بے معنی ہو کر رہ جائے گی۔

شملہ امن کانفرنس کی ناکامی کے بعد جناح نے دہلی فارمولا پیش کیا۔ اس کے چیدہ چیدہ نکات حسب ذیل تھے۔

(1) بنگال اور دیگر مسلم اکثریتی صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت تسلیم کی جائے۔

(2) مرکزی مجلسِ قانون ساز میں مسلمانوں کو ایک تہائی نشستیں دی جائیں۔

(3) شمال مغربی سرحدی صوبے میں اصلاحات نافذ کی جائیں۔

(4) مندرجہ بالا مطالبات کے تسلیم ہونے کی صورت میں مخلوط انتخابات کا اصول نافذ کر دیا جائے۔

حسین شہید سہروردی اور انکے ماموں عبداللہ المامون سہروردی نے اس فارمولے کی بھی مخالفت کی اور مسلمانوں پر مخلوط انتخابات مسلّط کرنے کی ایک اور کوشش ناکام ہو گئی۔[63] نامور شاعر علامہ اقبال نے بھی سہروردی سے اتفاق کیا کہ مسلمانوں کو کسی صورت میں جداگانہ انتخابات کا اصول ترک نہیں کرنا چاہئے۔[64] سہروردی پہلے شخص تھے جنہوں نے 1928ء میں شائع ہونے والی موتی لال نہرو رپورٹ کی مخالفت کی۔[65] اس رپورٹ میں پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کے لئے مخصوص نشستوں کے علاوہ مخلوط انتخابات کی حمایت کی گئی تھی۔ مسلم رہنماؤں کی اکثریت اس رپورٹ کو قابلِ قبول سمجھتی تھی اور کانگرس کی ہمنوا[66] ہو گئی لیکن سہروردی نے اس رپورٹ کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ ان کا خیال تھا کہ ابھی ایسے حالات پیدا نہیں ہوئے کہ مخلوط انتخابی عمل کو قابلِ قبول قرار دیا جا سکے۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان مفاہمت کی ایک خاص سطح کے حصول اور دونوں قوموں کے مطالبات اور حقوق میں ہم آہنگی پیدا ہوئے بغیر مخلوط

انتخاب کا تصوّر نہیں کیا جاسکتا تھا۔[67] سہروردی نے کلکتہ میں ایک کانفرنس منعقد کی جس میں نہرو رپورٹ کی مذمّت کی گئی اور اسے بالاتفاق رَد کیا گیا۔ سہروردی کے قریب ترین سیاسی معتمد، شیخ مجیب الرحمٰن نے بعدازاں لکھا کہ اگر سہروردی زوردار مخالفت نہ کرتے تو نہرو رپورٹ منظور کرلی جاتی اور جہاں تک تحریکِ پاکستان کے آئندہ مرحلوں کا تعلق تھا مسلمانان برصغیر کا مستقبل تاریک ہو گیا ہوتا۔[68]

1923ء سے 1926ء تک سہروردی نوجوانوں کی تنظیموں سے وابستہ رہے اور 1927ء کے بعد مزدور تحریک سے تعلق استوار کرلیا۔ بہت سے انقلابی اس زمانے میں مزدور تنظیموں میں گھس کر انہیں اپنے سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کرنا چاہتے تھے۔ سہروردی نے برطانوی طرز پر آئینی ٹریڈیونین کا تصوّر دیا۔ انہوں نے 1927ء میں نیشنل لیبر فیڈریشن کی بنیاد رکھی اور جلد ہی اسے ملک بھر میں مزدوروں کی بھاری اکثریت کا اعتماد حاصل ہو گیا۔ اس زمانے میں ٹریڈیونین کا نام لینا اپنے پیچھے بلا لگا لینے کے مترادف تھا۔ مالکان اور آجر مزدوروں کے جائز مطالبات پر بھی کان دھرنے کے لئے تیاّر نہیں تھے اور معمولی مطالبات منوانے کے لئے بھی ہڑتال اور ہنگامہ آرائی کا راستہ اختیار کرنا پڑتا تھا۔ سہروردی مختلف شعبوں میں کم وبیش 36 ٹریڈیونین تنظیمیں قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے ان میں پٹ سن، کپاس اور بندر گاہوں کی ٹریڈیونینیں بھی شامل تھیں۔ ان کی کوشش ہوتی تھی کہ معاملات کو انتہائی اقدام کی سطح پر لے جانے سے قبل مذاکرات کے ذریعے اپنے مقاصد پورے کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے۔

1926ء کے فسادات کے بعد ہندو مسلم تعلقات میں جو رخنہ پڑا اُسکے اثرات مزدور تحریک پر بھی پڑے۔ مسلمان مزدوروں کی اکثریت نے سہروردی کے بتائے ہوئے آئینی طریقوں کو اپنایا جبکہ ہندو مزدوروں کی اکثریت کمیونسٹ نواز، انتہاپسند ٹریڈیونینوں سے وابستہ ہو گئی جنہیں وہ زیادہ ترقی پسند تنظیمیں سمجھتے تھے۔ یہ لوگ منظم ٹریڈیونین کی بجائے ہنگامہ آرائی میں یقین رکھتے تھے۔

ہندوستانی مسلمانوں کا رہنما

خلافت کمیٹی کے سیکرٹری جنرل کی حیثیت سے سہروردی کلکتہ کے مسلمانوں میں خاصا اثرونفوذ حاصل کر چکے تھے۔ اب انہوں نے بتدریج ہندوستانی مسلمانوں کے رہنما کے طور پر شہرت حاصل کرنا شروع کی۔ 1928ء میں موتی لال نہرو نے کانگریس کے کلکتہ اجلاس کی صدارت کی۔ اس موقع پر کلکتہ میں منعقد ہونے والی انڈین نیشنل کانفرنس کی صدارت ایم اے انصاری نے کی۔ اس چیلنج کو قبول کرتے ہوئے سہروردی نے اسی ہفتے کلکتہ میں آل انڈیا خلافت کانفرنس کے انعقاد کا اہتمام کیا جس کی صدرت مولانا محمد علی جوہر نے کی۔ پھر انہوں نے 1928ء میں کلکتہ ہی میں پہلی آل بنگال مسلم کانفرنس بھی منعقد کی۔ اس زمانے میں مسلم لیگ دو دھڑوں، شفیع لیگ اور صباح لیگ میں بٹ چکی تھی۔ ان دھڑوں کے باہمی اختلافات کو ختم کرنے کے لئے دسمبر 1928ء میں ہندوستان کے مسلم زعماء دہلی میں مل بیٹھے۔ سر سلطان احمد اور ہزہائی نس دی آغاخاں کے زیر صدارت اس اجلاس میں ایک قرارداد منظور کی گئی جس میں جداگانہ انتخابات کا مطالبہ بھی شامل تھا، علی برادران اور سہروردی بھی اس کانفرنس

میں شریک ہوئے۔

1931ء میں تباہ کن سیلاب نے شمالی بنگال میں آفت برپا کر دی۔ سہروردی نے سیلاب زدگان کی امداد کے لئے ہر ممکن کوشش کی۔[72] اسی دوران میں ان کی ملاقات مولانا عبدالحمید خان بھاشانی سے ہوئی جنہوں نے سراج گنج میں کسان کانفرنس بلا رکھی تھی۔ سہروردی نے کانفرنس کا افتتاح کیا۔ اسی برس بمبئی میں آل انڈیا مسلم والنٹیرز کانفرنس منعقد ہوئی اگلے برس آل انڈیا مسلم کانفرنس کا انعقاد کلکتہ میں ہوا۔[73] سہروردی نے اول الذکر کی صدارت کی جبکہ موخر الذکر کانفرنس میں وہ استقبالیہ کمیٹی کے سربراہ تھے۔ اب نئی آئینی اصلاحات کے نفاذ کا وقت آ چکا تھا اور اس مقصد کے لئے لنلتھگو کمیشن مقرر کیا گیا۔ 1933ء میں سہروردی مسلم کانفرنس کے نمائندے کے طور پر لندن گئے اور کمیشن کے سامنے پیش ہوئے۔[74]

مزید آئینی اصلاحات پر محیط گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935ء میں نافذ ہوا۔ اس میں مکمل طور پر منتخب مجالسِ قانون ساز کی اجازت مل گئی۔ دوعملی کے اصول کو ختم کر دیا گیا تاہم جداگانہ انتخابات کو برقرار رکھا گیا۔ بالآخر جناح ہندوستان واپس آ گئے۔ انہوں نے مسلمانوں کی قیادت سنبھالی اور کانگرس مخالف نقطۂ نگاہ کے حامی بن گئے۔ انہوں نے مختلف الخیال مسلم رہنماؤں، خاص طور پر مسلم اکثریتی صوبوں کے زعماء سے رابطہ شروع کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کے مسلمان مسلم لیگ کے جھنڈے تلے جمع ہونے لگے اور مسلم متوسّط طبقے کی نمائندہ جماعت کی بجائے عوامی جماعت کا روپ دھارنے لگی۔ اب مسلم لیگ کانگرس سے ٹکّر لینے کے قابل ہو گئی جسے مسلمان گاندھی کے زیرِ سایہ ہندوؤں کی جماعت سمجھتے تھے۔ تاہم اب بھی کئی اہم مسلمان رہنما کانگرس سے وابستہ تھے۔ جب مولانا شوکت علی نے محمد علی جناح کو اشیرباد دی اور مسلمانانِ ہند سے درخواست کی کہ وہ جناح کی قیادت قبول کر لیں تو جناح کو مسلم عوام کا غیر متزلزل اعتماد حاصل ہو گیا۔

آزاد مسلم پارٹی

1935ء اور 1936ء کے دوران سہروردی نے تبلیغ اور سیرت کے نام سے کانفرنسیں منظم کیں اور آزادی کے حق میں مسلم رائے عامہ ہموار کرتے رہے اسی اثنا میں انہوں نے کلکتہ کارپوریشن کے بائیکاٹ کی مہم چلائی۔[75] درحقیقت انہوں نے اپنے سیاسی قلعے کلکتہ کو ہندوستانی سیاست کے اعصابی مرکز میں بدل دیا۔[76] انہوں نے آزاد مسلم پارٹی کے نام سے بنگال میں ایک عوامی تنظیم بھی قائم کی۔ اس تنظیم کی رکنیت کا چندہ وہی تھا جس شرح سے بعد ازاں محمد علی جناح نے مسلم لیگ کی تنظیمِ نو کی۔[77] آزاد مسلم پارٹی کا قیام 1936ء کے آغاز میں عمل میں آیا۔ سہروردی خود اس جماعت کے سیکرٹری جنرل بنے اور خواجہ ناظم الدین کو صدر منتخب کیا گیا۔ انہوں نے بنگال بھر میں جماعت کی شاخیں قائم کیں اور 1936ء

کے انتخابات میں مسلم پارٹی کے ٹکٹ پر حصّہ لینے کے لئے امیدواروں کا انتخاب کیا۔

بنگال صوبائی مسلم لیگ کے سیکرٹری جنرل

اس وقت بنگال میں مسلم لیگ کی حالت بہت پتلی تھی اور یہ جماعت چند آسودہ حال اور آرام طلب سیاست دانوں تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ فضل الحق نے مسلم لیگ سے الگ ہو کر 1936ء کے انتخابات میں حصّہ لینے کے لئے کرشک پرجا پارٹی قائم کر لی تھی۔[78] بہت سے مسلمان رہنما آزاد مسلم پارٹی میں شامل ہو گئے تھے۔ اس صورتحال کا مقابلہ کرنے کے لئے کلکتہ کی تاجر برادری نے اصفہانیوں کی قیادت میں محمد علی جناح کو کلکتہ مدعو کیا اور انہیں مشورہ دیا کہ سہروردی کی مسلم لیگ میں شمولیت کے بغیر بنگال میں مسلم لیگ کا مستقبل تاریک ہو جائے گا۔[79] جناح نے صورت حال کی سنگینی کو محسوس کیا اور خواجہ خیرالدین، خواجہ ناظم الدین، ابوالحسن، حسن اصفہانی اور عبدالرحمٰن صدیقی کی ———————

سنگینی کو محسوس کیا اور خواجہ خیرالدین، خواجہ ناظم الدین، ابوالحسن، حسن اصفہانی اور عبدالرحمٰن صدیقی کو ایک وفد کی صورت میں سہروردی کے پاس بھیجا تاکہ انہیں مسلم لیگ میں شمولیت پر آمادہ کیا جا سکے۔[80] اس ملاقات کے دوران ان زعماء نے جناح کی طرف سے یہ تجویز پیش کی کہ سہروردی اپنی جماعت کو مسلم لیگ کی بنگال شاخ قرار دیدیں۔ پہلے تو سہروردی نے گوناگوں وجوہات کی بنا پر ہچکچاہٹ کا اظہار کیا لیکن پھر یہ سوچ کر آمادہ ہو گئے کہ مسلم لیگ ہندوستان بھر کے مسلمان عوام کی جماعت تھی۔ انہوں نے اپنی جماعت کو آل انڈیا مسلم لیگ میں مدغم کر دیا اور مسلم لیگ کی بنگال شاخ کے جنرل سیکرٹری مقرّر ہوئے۔[81] اصفہانیوں کی اپنی سیاسی جماعت 'نیو مسلم مجلس کے نام سے موجود تھی۔ انہوں نے بھی اسی برس یعنی 1936ء میں مسلم لیگ میں ادغام قبول کر لیا۔[82]

کچھ تاخیر سے ہزہائی نس آغاخاں کے پیروکاروں نے بھی سہروردی سے رابطہ کیا اور ان سے ہزہائی نس آغاخاں کی جماعت مسلم کانفرنس میں شمولیت کی درخواست کی۔[83] سہروردی نے انہیں قائل کرنے کی کوشش کی کہ حالات کا تقاضا یہی ہے کہ آپ مسلم کانفرنس کے تسلسل کی بجائے محمد علی جناح سے تعاون کریں۔ چنانچہ مسلم کانفرنس کے قائدین نے یہ معقول تجویز قبول کر لی۔

1936ء کے عام انتخابات

1935ء ایکٹ کے تحت صوبائی خود مختاری کے نفاذ کے بعد 1936ء میں پہلے عام انتخابات منعقد ہوئے عملی طور پر یہ توسیع شدہ حقِ رائے دہی کے ساتھ اتنے وسیع پیمانے پر انتخابات کا پہلا تجربہ تھا۔ بہت سے مسلم امیدوار آزاد حیثیت میں انتخاب لڑ رہے تھے۔ تاہم انتخابات میں مسلمانوں کی 119 مخصوص نشستوں کے لئے بنگال صوبائی مسلم لیگ اور کرشک پرجا پارٹی کے درمیان براہِ راست مقابلہ تھا۔

بنگال مجلسِ قانون ساز کی کل نشستیں 250 تھیں۔ فضل الحق نے دال بھات کی ضمانت اور 14 نکاتی منشور کے ساتھ رائے دہندگان سے رابطہ کیا اُس منشور میں حسب ذیل نکات شامل تھے۔

(1) زرِ تلافی کے بغیر زمینداری کا خاتمہ

(2) بغیر محصولات عائد کئے مفت پرائمری تعلیم

(3) مکمل صوبائی خود مختاری

فضل الحق کو کسانوں کی اکثریت اور تعلیم یافتہ متوسّط طبقے کے روشن خیال حلقوں کی حمایت حاصل تھی۔[84] فضل الحق کی کرشک پرجا پارٹی کا مقابلہ کرنے کے لئے بنگال مسلم لیگ کا پارلیمانی بورڈ مقرّر کیا گیا اور سہروردی اسکے سیکرٹری جنرل قرار پائے تاہم کرشک پرجا کے برعکس جس کے رہنما دیہاتی عوام سے گہرا تعلق رکھتے تھے، بنگال مسلم لیگ کے رہنما (سوائے مولانا محمد اکرم خاں کے) بنگالی عوام میں گھل مل جانے کا تجربہ نہیں رکھتے تھے۔[85] مولانا اکرم خاں نے پہلا بنگالی مسلمان روزنامہ "آزاد" جاری کیا۔ اس اخبار نے بنگالی عوام میں مسلم لیگ کی مقبولیت بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔

سہروردی نے جو پہلے ہی ایک مستعد منتظم کی حیثیت سے اپنی دھاک بٹھا چکے تھے انتخابی مہم کی ذمّہ داری اپنے کندھوں پر لے لی اور جگہ جگہ مسلم عوام سے رابطہ کر کے مسلمانوں کے اتحاد کی اہمیت اجاگر کرنے لگے۔[86] ان کی انتھک مشقّت اور جدوجہد کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلم لیگ مسلمانوں کی مخصوص 119 نشستوں میں سے 39 نشستیں جیتنے میں کامیاب ہوگئی۔[87] وہ خود دو حلقوں سے کامیاب ہوئے اور انہوں نے ایک نشست خواجہ ناظم الدین کے لئے خالی کر دی۔ جنہیں ان کے آبائی حلقے میں فضل الحق نے شکست دی تھی۔ چنانچہ خواجہ ناظم الدین ضمنی انتخاب میں کامیاب ہو کر اسمبلی میں پہنچے۔ خوش قسمتی سے 44 آزاد ارکان میں سے 21 مسلم لیگ میں شامل ہو گئے کانگرس نے بھی 60 عمومی نشستوں پر کامیابی حاصل کر لی تھی۔ فضل الحق کی کرشک پرجا پارٹی کو 36 نشستیں ملیں جبکہ 18 آزاد ارکان ان کے ساتھ شامل ہو گئے۔ مجلس میں سب سے مختصر تعداد کے باوجود فضل الحق کے جوڑ توڑ رنگ لائے اور انہیں وزارت بنانے کی دعوت مل گئی۔ مسلم لیگ نے کانگرس اور کرشک پرجا پارٹی کی مخلوط وزارت سے بچنے کے لئے فضل الحق سے تعاون کی پیشکش کی اور انہیں وزیرِ اعظم بنانے پر اتفاق ہو گیا۔ فضل الحق جلد ہی مسلم لیگ میں شامل ہو گئے اور انہیں بنگال صوبائی مسلم لیگ کا صدر منتخب کیا گیا۔

وزارت محنت و تجارت

فضل الحق نے اپریل 1937ء میں جو پرجا لیگ مخلوط وزارت تشکیل دی اس میں سہروردی کو محنت اور تجارت کی وزارت دی گئی۔ بعد ازاں انہیں کئی دوسرے قلمدان بھی سونپے گئے جب کابینہ کے ہندو وزیرِ خزانہ نے استعفیٰ دیا تو وزارتِ خزانہ کی ذمّہ داری بھی سہروردی کو سنبھالنا پڑی۔ سہروردی کی بنیادی وابستگی مزدور تحریک سے تھی چنانچہ انہوں نے اپنی وزارت کے دوران مجلسِ قانون ساز سے، بہبود زچگان

ایکٹ اور لیبر ویلفیئر ایکٹ پاس کروائے۔[88] بعدازاں ان قوانین کو آئینی طور پر ملک بھر میں نافذ کیا گیا۔
سہروردی نے فضل الحق کے ساتھ کام کرتے ہوئے مسلم لیگ کے فروغ کے لئے ہر ممکن جدوجہد جاری رکھی۔ دوسری طرف وہ دیہاتی عوام کی زندگی، ان کی مشکلات، بول چال اور رہن سہن کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہے اور صوبے کے عوام بھی آہستہ آہستہ سہروردی پر اعتماد کرنے لگے۔ صوبے کے پسماندہ عوام کی فلاح کے لئے دونوں رہنماؤں نے قریبی تعاون جاری رکھا۔ جب صوبے میں مسلم لیگ وزارت نے تصفیۂ قرض بورڈ قائم کیا، قانونِ ساہوکار اں نافذ کیا اور بنگال ترمیمی قانون دخیل کاری 1938ء سمیت دیگر قوانین جاری کئے تو مسلم متوسط طبقے اور کسانوں نے سکھ کا سانس لیا۔ سہروردی نے 9 مئی کو حکومت کے نام ایک یادداشت ارسال کی جس میں ترمیمی قانون دخیل کاری کو باقاعدہ طور پر منظور کرنے کی اہمیت پر زور دیا گیا تھا۔ ''مجلسِ قانون ساز کے سبھی مسلم ارکان، جن میں جاگیردار اور متوسط زمیندار بھی شامل ہیں، نہ صرف اس اقدام کی حمایت کر رہے ہیں بلکہ ان کا خیال ہے کہ اس قانون کو زیادہ جامع ہونا چاہئے تھا۔ شیڈولڈ کاسٹ ارکانِ مجلس بھی اس اقدام کے حق میں ہیں۔ چنانچہ مٹھی بھر افراد کے علاوہ ان لوگوں کی اکثریت اس اقدام پر حکومت کا ساتھ دے رہی ہے۔ جن کے مفادات کو اس قانون سے گزند پہنچ سکتا ہے اگر بروقت فیصلہ نہ کیا گیا تو پھر زیادہ غیر معمولی اقدامات کی ضرورت پڑے گی۔ اگر بدقسمتی سے بل پاس نہ ہو سکا تو انقلاب اور بے چینی کا لاوا پھوٹ بہے گا۔ مزارعین لگان ادا کرنے سے انکار کر دیں گے اور تشدد کی ایسی آگ بھڑک اُٹھے گی جس پر قابو پانا ناممکن ہو جائے گا''۔[89] اکبرِ اعظم نے 1576ء میں بنگال کو مغل سلطنت میں مدغم کیا تھا اس کے بعد سے پہلی بار بنگالیوں نے اپنی حکومت کا چناؤ کیا تھا اور یہ حکومت اس آزمائش پر پوری اتری۔[90]

اس اثنا میں جدوجہد آزادی تیز ہو رہی تھی۔ مسلمان رہنما لاہور میں جمع ہوئے جہاں 23 مارچ 1940ء کو تاریخی قرارداد لاہور منظور کی گئی یہ قرارداد اے کے فضل الحق نے پیش کی۔ اس قرارداد میں ہندوستان کے مشرق (آسام، بنگال) اور مغرب (پنجاب، سندھ، شمال مغربی سرحدی صوبہ اور بلوچستان) پر مشتمل مسلم اکثریتی خطوں میں مسلمانوں کی دو خود مختار مملکتوں کے قیام کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ سہروردی نے بنگال وفد کے ترجمان کی حیثیت سے اجلاس لاہور میں شرکت کی اور 1935ء کے انڈیا ایکٹ میں دیئے گئے واحدانی طرز حکومت کے خلاف جدوجہد کی۔ کانگرس واحدانی (وفاقی) طرز حکومت کی حمایت کر رہی تھی۔ سہروردی کا کہنا تھا کہ وفاقی طرز حکومت قدرتی طور پر مرکزیت پسندی کا رجحان رکھتا ہے چونکہ دفاع، خارجہ پالیسی اور مالیات کے شعبوں پر اجارہ داری رکھنے والی مرکزی حکومت میں ہندوؤں کی اکثریت ہو گی چنانچہ وہ تمام اختیارات کو مرکزیت دیکر صوبائی خود مختاری کو غیر موثر کر کے رکھ دیں گے۔[91] سہروردی نے اصرار کیا کہ مسلم اکثریتی صوبوں میں سے ہر ایک کو خود مختار مملکت کا درجہ دیدیا جائے۔

1940ء سے 1947ء کے ہنگامہ خیز عہد میں جدوجہد آزادی میں سہروردی کا کردار اپنے

عروج کو پہنچ گیا۔ قرارداد لاہور کی منظوری کے صرف ایک برس بعد 1941ء میں جناح اور فضل الحق کے درمیان اختلافات پیدا ہو گئے اور فضل الحق نے مسلم لیگ سے استعفیٰ دیدیا۔[92] چنانچہ 7 دسمبر 1941ء کو جاپان نے پرل ہاربر پر حملہ کیا اور اسی روز جناح نے بنگال وزارت کے لئے مسلم لیگ کا تعاون واپس لے لیا۔ صوبے میں سیاسی بحران پیدا ہو گیا۔

فضل الحق نے ہندو مہاسبھا اور فارورڈ بلاک کی حمایت سے دوسری مخلوط کابینہ تشکیل دی جس میں ہندو مہاسبھا کے ایک ممتاز رہنما شیام پرشاد مکرجی کو فضل الحق کے نائب کا درجہ حاصل تھا۔ کابینہ میں اس شخص کی شمولیت سے عوام بھڑک اٹھے۔ سہروردی نے اس خداداد موقع سے فائدہ اٹھایا' دیہی علاقوں میں سینکڑوں اجتماعات سے خطاب کیا اور مسلم عوام سے تعاون کی درخواست کی۔ فضل الحق کی مخلوط وزارت کا مقابلہ کرنے کے لئے مسلمان طلبہ سہروردی کے ساتھ کھڑے ہو گئے۔ ادھر مسلمان متوسط طبقے میں بھی سیاسی بیداری کی لہر دوڑ چکی تھی اور انہوں نے اونچی ذات کے ہندوؤں سے ٹکر لینے کا فیصلہ کر لیا۔ فضل الحق کبھی بنگال کے بے تاج بادشاہ کہلاتے تھے اب اکی جگہ گندے انڈوں اور ٹماٹروں کی بارش ان کا مقدر بن گئی۔ وہ جہاں جاتے سیاہ جھنڈوں سے ان کا استقبال کیا جاتا۔ اپنی طویل سیاسی زندگی میں پہلی بار فضل الحق مسلم عوام سے کٹ کر رہ گئے۔ ایک سال کے عرصے میں کرشک پرجا پارٹی کے بہت سے ارکان نے اپنی وفاداریاں تبدیل کرلیں اور مسلم لیگ پارلیمانی گروپ میں شامل ہو گئے۔ اس مخلوط وزارت کے دوران دو مسلم نشستیں خالی ہوئیں اور دو ضمنی انتخابات منعقد ہوئے۔ سہروردی نے مسلم لیگ کی طرف سے ان ضمنی انتخابات کی نگرانی کی۔ دوسری طرف سے فضل الحق اپنی جماعت کیلئے انتخابی مہم چلا رہے تھے۔ دونوں مواقع پر فضل الحق کو زبردست زک اٹھانا پڑی اور انکے امیدواروں کی ضمانتیں ضبط ہو گئیں۔ یہ اس حقیقت کا اظہار تھا کہ مسلمان اب ہندوؤں سے سمجھوتے کے لئے ہرگز تیار نہیں تھے اور وہ دل و جان سے اس جدوجہد کے حامی تھے جو مسلم لیگ ان کے حقوق کے لئے کر رہی تھی۔ اس سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ بنگالی عوام سیاسی شعور سے بہرہ ور ہو چکے ہیں' دھونس' چرب زبانی اور سرکاری سرپرستی سے ان کے جوش و جذبے کو کم نہیں کیا جا سکے گا۔

1943ء کے آغاز تک شیام۔حق وزارت کی کارکردگی کے باعث مسلم لیگ خاصی مضبوط ہو چکی تھی اور حکومت ایوان کے اندر اور باہر اپنی حمایت سے محروم ہو چکی تھی۔ برطانوی گورنر کے ساتھ تند و تیز خطوط کے تبادلے کے بعد فضل الحق 29 مارچ 1943ء کو ایوان اقتدار سے رخصت ہو گئے۔[93]

فضل الحق کے زوال میں ان غیر معمولی حالات نے بھی اہم کردار ادا کیا جن پر انہیں کوئی اختیار حاصل نہیں تھا۔ دوسری جنگ عظیم جاری تھی۔ جاپانی ہندوستان کے دروازے پر دستک دے رہے تھے۔ بنگال پر جاپانیوں کے حملے کا شدید خطرہ محسوس کیا جا رہا تھا۔ کانگرس نے ہندوستان چھوڑ دو تحریک شروع کر رکھی تھی۔ جنگ کے باعث بنگال میں شدید قحط پیدا ہو گیا تھا۔ ہڑتالوں' فسادات اور بدامنی نے امن و امان کی صورتحال کو بری طرح متاثر کر رکھا تھا۔ بظاہر یوں معلوم ہوتا تھا کہ صورتحال پر قابو پانا انتظامیہ کے بس

کاروگ نہیں رہا۔

وزارت سول سپلائیز (1943ء کا قحط)

شیام۔ حق وزارت کے خاتمے کے بعد 24 راپریل 1943ء کو خواجہ ناظم الدین نے کابینہ تشکیل دی اور سہروردی کو سول سپلائیز کا محکمہ سونپا گیا اس محکمے اور خاص طور پر سہروردی کی بنیادی ذمہ داری یہ تھی کہ قحط پر قابو پایا جائے۔ یہ قحط انسانی غفلت، دانستہ ہیرا پھیری اور برطانوی انتظامیہ کی نا اہلی کا شاخسانہ تھا۔ فضل الحق نے بنگال کے وزیر اعظم کی حیثیت سے اناج کی بڑھتی ہوئی قیمتوں پر قابو پانے کی کوئی بروقت کوشش نہ کی چنانچہ یہ قیمتیں کبھی کم نہ ہو سکیں۔ دسمبر 1942ء میں دہلی فوڈ کانفرنس کے موقع پر فضل الحق نے اعلان کیا کہ بنگال میں اناج کی کمی کا کوئی خدشہ نہیں چنانچہ حکومت نے بنگال میں اناج بھیجنے کی کوئی ضرورت محسوس نہ کی۔[94] حزب اختلاف کے رہنما سہروردی نے اسی وقت احتجاج کیا تھا اور اعلان کیا تھا کہ متواتر دو فصلوں کی تباہی کے باعث قحط کا خطرہ سر پر منڈلا رہا ہے۔[95]

اب سہروردی کو ایک کٹھن ذمہ داری کا سامنا تھا۔ شیخ مجیب الرحمٰن نے قحط کے دوران سہروردی کے کردار کی تعریف کرتے ہوئے صورتحال کی ایک دل دوز عکاسی کی ہے[96] وہ لکھتے ہیں کہ معاوضہ ادا کرنے پر بھی اناج کا ملنا دشوار ہو چکا تھا۔ برما پر جاپانیوں کے قبضے سے صورتحال اور بھی خراب ہو گئی کیونکہ بنگال کے لئے اناج وہیں سے درآمد کیا جاتا تھا۔ خود صوبے کے اندر اناج میں خود کفیل علاقوں سے قحط کے شکار علاقوں کے لئے اناج کی رسد بھی ممکن نہ رہی کیونکہ ذرائع رسل ورسائل پر فوج نے قبضہ کر رکھا تھا اور فوج جاپان کے امکانی حملے کا مقابلہ کرنے کی تیاری کر رہی تھی۔ بنگال کے وسیع پاٹ رکھنے والے دریاؤں میں بڑی بڑی کشتیوں کے ذریعے اناج کی ترسیل ممکن تھی لیکن یہ کشتیاں بھی اتلاف پالیسی کے تحت ڈبو دی گئیں تاکہ ممکنہ حملے کی صورت میں جاپانی افواج کو دریا پار کرنے وسائل میسر نہ آسکیں۔ بنگال کے مختلف علاقوں میں تعینات افواج کو اناج اور دیگر اضافی غذاؤں مثلاً انڈوں، مرغ، کیلے، ناریل سبزیوں اور دالوں کی فراہمی میں پہلی ترجیح دی جاتی تھی۔ اناج کی بین الاضلاعی اور بین الصوبائی رسد پر پابندی اور سر عزیز الحق کی جگہ لینے والے مرکزی وزیر خوراک سری نواس کے معاندانہ رویے نے تو گویا سہروردی کی ان مساعی پر مہر ہی لگا دی کہ عوام کو اناج فراہم کیا جائے۔[97]

لیکن سہروردی مشکلات کے سامنے ہتھیار ڈالنے والوں میں سے نہیں تھے اپنے عہدے کا حلف اٹھانے کے فوراً بعد ایک نشریاتی اعلامیے کے ذریعے انہوں نے اپنے سامعین کو مطلع کیا کہ قحط سے اندازاً دو کروڑ افراد متاثر ہوں گے اور ان میں سے نصف ہلاک ہو جائیں گے کیونکہ چاول حاصل کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی تھی۔[98] بایں ہمہ انہوں نے ابنائے وطن کو بتایا کہ وہ ایک ایک انسانی جان بچانے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دیں گے۔ انہوں نے مرکزی حکومت سے دو ماہرین کی خدمات حاصل کیں اور دن رات ان کے ساتھ بیٹھ کر قحط کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک منصوبہ تیار کیا۔ چنانچہ زبردست کشاکش کے بعد وہ

مرکزی حکومت سے یہ مطالبہ منوانے میں کامیاب ہو گئے کہ ان صوبوں سے جو اناج میں خود کفیل تھے
اناج کی اضافی مقدار لیکر بنگال کے حوالے کی جائے۔ ان صوبوں میں سے کچھ بنگال سے خاصے فاصلے پر
واقع تھے۔ اناج کی موعودہ مقدار بروقت بنگال نہ پہنچ سکی کیونکہ جنگی نقل وحرکت جاری تھی اور اناج کے
حصول میں مشکلات پیش آ رہی تھیں۔ سہروردی نے بنگالی حکام کو اضافی اناج رکھنے والے صوبوں مثلاً
پنجاب وغیرہ میں بھیجا لیکن ان حضرات کو بھی جزوی کامیابی ہی نصیب ہو سکی۔
بالآخر یہ طے پایا کہ جہاں تک ممکن ہو ملحقہ صوبوں مثلاً آسام، اڑیسہ، بہار اور سی پی کے مشرقی
علاقوں سے اناج حاصل کیا جائے۔ گوناگوں وجوہات کی بنا پر سہروردی کو ان علاقوں سے اناج کے حصول
میں بے شمار دقتیں پیش آئیں لیکن انہوں نے اناج کے حصول اور ترسیل کے لئے ایک نئی تنظیم کھڑی کر
دی۔ بالآخر آسام نے نامی ہچکچاہٹ کے بعد اپنے حصے کی اعانت کا معتدبہ حصہ بنگال روانہ کر دیا۔ اڑیسہ نے
بھی اناج کی موعودہ مقدار فراہم کر دی۔ سی پی کے مشرقی اضلاع میں اناج کا حصول ایک دشوار امر تھا لیکن
وہاں بھی کچھ نہ کچھ کامیابی حاصل ہوئی۔ بہار نے جسے اناج کی سب سے زیادہ مقدار بہم پہنچانا تھی اناج بھیجنے
سے بالکل انکار کر دیا۔[99] پہلے صوبائی حکومت نے بہانہ کیا کہ مرکزی حکومت نے بہار میں اناج کے ذخیرے
کا غلط تخمینہ لگایا تھا اور پھر بنگال کے حکام نے جو اناج خریدا تھا اسے زبردستی گاڑیوں سے نیچے اتروا لیا گیا۔
اس انکار کی اہم وجہ یہ تھی کہ صوبے میں کانگرسی وزارت قائم تھی جو بنگال میں بگڑتی ہوئی صورتحال اور قحط
کی غارت گری کے باوجود مسلم لیگی وزارت کی مدد کرنے سے گریزاں تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اناج کی
حاصل کردہ مقدار کم از کم ضروریات پوری کرنے کے لئے بھی ناکافی ثابت ہوئی۔ مزید براں کسی کو راشن
بندی، اناج کے حصول، تقسیم اور اس ضمن میں پیش آنے والی مشکلات کا صحیح علم نہیں تھا چنانچہ سہروردی کو
اپنی عقل سلیم، زیرکی اور قوت اختراع سے کام چلانا پڑا۔ انہوں نے شہروں میں رہنے والوں کے لئے جو
اناج خریدنے کی استطاعت رکھتے تھے راشن ڈپو کھولے جبکہ غریب دیہاتی عوام کے لئے مطبخ کھولے گئے
جہاں انہیں مفت کھانا فراہم کیا جاتا تھا۔ قحط زدہ افراد کی طبّی امداد کے لئے ملک بھر میں امدادی دواخانے
کھولے گئے کیونکہ قحط کے باعث پیچش اور دیگر وبائی امراض پھوٹ پڑے تھے۔
سہروردی کے شدید ترین مخالف بھی اعتراف کرتے ہیں کہ سہروردی کی انتظامی اہلیت کے بغیر مزید
کئی لاکھ افراد موت کے منہ میں چلے جاتے بایں ہمہ قحط میں 50 لاکھ کے لگ بھگ افراد ہلاک ہوئے۔ اس
آفت سے تحریک پاکر زین العابدین نے چارکول میں قحط کے اندوہ گیں اور رقت انگیز مناظر کی ایسی عکاسی
کی کہ قحط کے ساتھ ساتھ ان کا اپنا نام بھی امر ہو گیا۔[100]

1946ء کے عام انتخابات

1945ء اور 1946ء کے دوران پاکستان کے سوال پر مرکزی اور صوبائی انتخابات منعقد

ہوئے۔ یہ انتخابات بنگال مسلم لیگ کے لئے ایک بڑے امتحان کے مترادف تھے۔ جناح کو بنگال کا دورہ کرنے کے لئے مدعو نہیں کیا گیا تاکہ سندھ کی طرح وہ بنگال کے پارلیمانی بورڈ میں بھی مداخلت نہ شروع کر دیں۔[101] وہ اس عرصے میں ایک بار سلہٹ جاتے ہوئے بذریعہ ٹرین بنگال میں گزرے تھے لیکن انہوں نے کسی عوامی اجتماع سے خطاب نہیں کیا۔ لیاقت علی خاں نے بھی میمن سنگھ ضلع میں صرف جعفر گاؤں حلقے کا دورہ کیا لیکن اس حلقے میں مسلم لیگی امیدوار کو زبردست شکست ہوئی۔

ان حالات میں بنگال کے عام انتخابات کی بھاری ذمہ داری سہروردی کے کندھوں پر آن پڑی بنگال صوبائی مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری کی حیثیت سے انتخابی مہم کو منظم کرنا ان کی ذمہ داری تھی اور انہوں نے وفادار کارکنوں کی ایک مختصر جماعت کے بل پر تن تنہا اس مہم کا بیڑا اُٹھا لیا انہوں نے صوبے کے دور افتادہ ترین مقامات کا دورہ کیا اور مسلم عوام میں ایسی تحریک پیدا کی کہ انتخابات کے فیصلہ کن روز صوبائی مجلس قانون ساز کی 119 مسلم نشستوں میں سے 114 مسلم لیگ کی جھولی میں آن پڑیں۔[102] فضل الحق نے کرشک پرجا پارٹی کو ایک بار پھر مسلم لیگ کے مقابلے پر اکھاڑے میں اتارا لیکن صرف 5 نشستوں پر کامیابی حاصل کر سکے۔ پاکستان کے سوال پر لڑے جانے والے ان انتخابات میں مسلم لیگ کو بنگال میں فیصلہ کن کامیابی حاصل ہوئی۔

بنگال کی وزارت عظمیٰ

بنگال میں مسلم لیگ کی فتح کو سہروردی کی شخصی کامیابی قرار دیا جارہا تھا جس پر جناح نے انہیں تہنیتی پیغام بھی ارسال کیا۔[103] 3 را پریل 1946ء کو انہیں مسلم لیگ پارلیمانی پارٹی کا قائد چنا گیا۔ 24 را پریل کو انہوں نے کابینہ تشکیل دی اور برصغیر میں بننے والی یہ مسلم لیگ کی واحد وزارت تھی ان کی حکومت نے ابتداء میں ہی یہ اہم فیصلہ کیا کہ ان سیاسی قیدیوں کو رہا کر دیا جائے جنہیں مقدمہ چلائے بغیر نظر بند رکھا گیا تھا۔ ان کی حکومت کے ڈیڑھ برس کے دوران کسی شخص کو سیاسی وجوہات کی بنا پر گرفتار نہیں کیا گیا۔ بعد ازاں 1956ء میں جب انہوں نے عوامی لیگ کی مختصر سی پارلیمانی جماعت کے ساتھ پاکستان کی مخلوط وزارت تشکیل دی تب بھی ان کے دور حکومت میں کسی کو سیاسی نظریات کی بنا پر پابند سلاسل نہیں ہونا پڑا۔ اس طرح انہوں نے ایشیا اور افریقہ کی تاریخ میں جمہوریت نوازی کی منفرد مثال قائم کی۔ غالباً ان کا سب سے جرات مندانہ اقدام یہ تھا کہ انہوں نے چٹاگانگ کے اسلحہ خانے پر حملے کے مجرموں کو 1946ء میں رہا کر دیا ان کے اس فیصلے سے عوام میں خوشی اور تشکر کی لہر دوڑ گئی۔

بنگال میں مسلم لیگ کی فتح تحریک آزادی میں فیصلہ کن ثابت ہوئی۔ اس کامیابی سے مسلم لیگ ممکنہ تباہی سے بچ گئی ورنہ عین ممکن تھا کہ مطالبہ پاکستان غیر مؤثر ہو کر رہ جاتا۔ تین دوسرے مسلم اکثریتی صوبوں، پنجاب سندھ اور سرحد نے پاکستان کے خلاف رائے دی۔ اس سے جناح کی سیاسی حیثیت پر کافی برا اثر پڑا۔ جناح چار مسلم اکثریتی صوبوں میں سے تین میں مسلم عوام کی حمایت حاصل کرنے میں ناکام

رہے تھے۔ دوسری طرف مسلم اقلیتی صوبوں میں مسلح عوام نے مسلم لیگ کی بھرپور حمایت کی تھی۔ جناح کے لئے انگریزوں اور ہندوؤں کو اس امر پر قائل کرنا خاصا مشکل ہو گیا کہ مسلم عوام پاکستان کے قیام کے حامی ہیں۔

پاکستان کے حصول کا سہرا جناح کے سر بندھتا ہے اور وہ اس اعزاز کے مستحق بھی ہیں لیکن یہ سہروردی ہی تھے جنہوں نے جناح کو پاکستان کے لئے جدوجہد میں فیصلہ کن ہتھیار فراہم کیا۔ اگر سہروردی نے 1946ء میں کامیابی حاصل نہ کی ہوتی تو باقی تین مسلم اکثریتی صوبوں میں مسلم لیگ کی مکمل ناکامی کے پیش نظر پاکستان بنانے کا خواب پریشان ہو گیا ہوتا۔[104]

بنگال میں مسلم لیگ کی کامیابی کی اہمیت اور اس ضمن میں سہروردی کے کردار کے متعلق ایس اسلام نے لکھا ہے "ایک نئی مملکت کی تخلیق میں سہروردی کا کردار کسی سے کم نہیں تھا ان کا تعلق بنگال سے تھا لیکن انہوں نے ہندوستان بھر کے مسلمانوں کی رہنمائی کی۔ یہ حقیقت تاریخ کا حصہ ہے کہ بنگال میں مسلم لیگ کی کامیابی نے حقیقی معنوں میں پاکستان کے قیام کی راہ ہموار کی اور بنگال میں مسلم لیگ کی شاندار فتح کے اصل معمار سہروردی تھے جن کی ان تھک سعی نے تقسیم ہند کو ممکن بنا دیا۔ سہروردی کی جانفشانی اور ولولہ انگیز قیادت نے بنگالی عوام کے دلوں میں پاکستان کے حصول کی ایسی لگن پیدا کر دی کہ پاکستان کا قیام ناگزیر نظر آنے لگا۔"[105] بنگال میں مسلم لیگ کی کامیابی کے علاوہ انگریزوں کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہ تھی کہ وہ ہندوستان کی باگ ڈور کانگرس کے ہاتھ میں دیکر اپنے وطن سدھارتے۔

دہلی کنونشن

انتخابات کے بعد 17 راپریل 1946ء کو جناح نے مرکزی اور صوبائی مجالس قانون ساز کے مسلم لیگی ارکان کا کنونشن محمڈن اینگلو عربیک کالج دہلی کی عمارت میں طلب کیا۔ سہروردی نے جناح کو خط لکھ کر یہ کنونشن بلانے کی تجویز دی تھی تاکہ مسلم لیگ کے اس مطالبے پر بحث کی جا سکے کہ مسلم لیگ کو مرکزی عبوری کابینہ میں تمام مسلمان ارکان نامزد کرنے کا استحقاق حاصل ہے کانگرس نے مسلم لیگ کے اس دعویٰ کو چیلنج کر دیا تھا۔[106] 480 مسلم لیگی ارکان میں سے 450 اس کنونشن میں شریک ہوئے۔ جناح کی صدارت میں 9 اور 10 راپریل 1946ء کو منعقد ہونے والا مسلمان ارکان مجالس قانون ساز کا یہ کنونشن بظاہر عبوری کابینہ میں مسلمانوں کے کوٹے پر غور کرنے لئے بلایا گیا تھا لیکن اس اجلاس میں قرارداد لاہور کے مندرجات کو ہی بدل ڈالا گیا۔ قرارداد لاہور میں دو خود مختار مسلم مملکتوں کے قیام کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ جناح کی انگیخت پر مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری نے قرارداد لاہور میں "ریاستوں" کے لفظ کو املا کی غلطی قرار دیتے ہوئے تصحیح چاہی کہ اسے لفظ "ریاست" میں بدل ڈالا جائے۔ بنگالی نمائندوں کے پرزور احتجاج کو نظرانداز کر دیا گیا۔ احتجاج کرنے والوں میں نمایاں آوازیں آسام صوبائی مسلم لیگ کے صدر مولانا عبدالحمید خاں بھاشانی اور بنگال صوبائی مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری ابوالہاشم کی تھیں۔[107]

بنگالی نمائندوں نے سوال کیا کہ ہندوستان بھر کے مسلمانوں کے نمائندہ اجتماع کی منظور کردہ قرارداد کو قانون سازوں کا یہ اجلاس کیسے تبدیل کر سکتا ہے لیکن پاکستان کے خواب کی تعبیر کو سامنے پا کر جناح ایک پاکستان کے قیام پر مصر ہو گئے۔ بظاہر انہوں نے اس ضمن میں جغرافیائی مشکلات اور دونوں خطوں کے عوام میں معاشرتی اور ثقافتی اختلافات کو بھی نظرانداز کر دیا۔ بنگال کے مغرب میں بسنے والے مسلمانوں کی مشترکہ زبان اردو تھی لیکن بنگال کے عوام بول چال اور تحریر میں بنگالی زبان استعمال کرتے ہیں۔ اسی طرح ان کی سماجی روایات، رہن سہن، خوراک اور لباس بھی مختلف ہیں۔ ان دونوں خطوں کے عوام کے درمیان واحد اشتراک مذہب کا ہے ایک مشترکہ دشمن کے خلاف جدوجہد کے دوران تو یہ اشتراک اور تعلق اتحاد کا جواز فراہم کر سکتا تھا لیکن بعدازاں مل کر ایک ہی قوم کی حیثیت سے زندہ رہنے کے لئے یہ جواز یقیناً ناکافی تھا۔ مزید برآں بنگال کے مسلمانوں کی جدوجہد آزادی کی بنیاد محض مذہب پر نہیں بلکہ زیادہ ترقی یافتہ اور خوشحال ہندوؤں کے اقتصادی چنگل سے نجات کا حصول بھی اس جدوجہد کا ایک اہم مقصد تھا۔[108] بنگال کے مسلمانوں کے لئے ہندو مہاجنوں اور زمینداروں سے نجات مذہبی آزادی سے کہیں زیادہ اہم تھی لیکن غربی ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے مذہبی وجوہات بھی معاشی عوامل کے برابر اہمیت رکھتی تھیں۔

یہ سوال آج بھی بہت سے افراد کو پریشان کر دیتا ہے کہ سہروردی جو کبھی تقسیم بنگال کے حق میں نہیں تھے کس طرح اس تبدیلی پر آمادہ ہو گئے۔ بایں ہمہ ہمیں یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہئے کہ 1946ء کی قرارداد، 1940ء میں منظور ہونے والی قراردادِ لاہور (بعدازاں "قرارداد پاکستان") اور پھر پاکستان کے سوال پر لڑے جانے والے 1946ء کے انتخابات کے باعث وجود میں آنے والی سیاسی صورتحال کا منطقی نتیجہ تھی، جب بنگالی عوام نے یہ دیکھا کہ ان کی طرف سے ہندو اجارہ داری سے نجات کے مطالبے کو کانگرس کی طرف سے اکھنڈ بھارت کے مطالبے سے خطرہ درپیش ہو گیا ہے تو انہوں نے دو خود مختار مسلمان مملکتوں کے مطالبے کو اسی سرعت سے فراموش کر دیا جس تیزی سے انہوں نے فضل الحق کی قیادت کو مسترد کیا تھا۔ تین مسلم اکثریتی صوبوں میں مسلم لیگ وزارت کی تشکیل میں ناکامی کے بعد جناح کا مقدمہ پہلے ہی کمزور ہو چکا تھا۔ سہروردی نے اپنی خداداد بصیرت سے بھانپ لیا تھا کہ اگر بنگال خود مختار مملکت کے مطالبے پر ڈٹا رہا تو مستقبل قریب میں پاکستان کا معرض وجود میں آنا ناممکن ہو جائے گا اور یہ کانگرس کے ہاتھوں میں کھیلنے کے مترادف ہو گا۔ برصغیر میں واحد مسلم لیگی وزارت کے سربراہ کی حیثیت سے سہروردی پر بھاری ذمّہ داری عائد ہوتی تھی چنانچہ انہوں نے سب سے پہلے قوم پرست مسلمان ہندوستانی رہنما کے طور پر اپنا فرض نبھاتے ہوئے پاکستان کی تخلیق میں اعانت کرنے کا فیصلہ کیا لیکن انہوں نے مشرقی ہندوستان میں ایک خود مختار مملکت کے اصول کو ترک نہیں کیا۔ چنانچہ جس روز یہ قرارداد منظور ہوئی اسی روز انہوں نے کابینہ مشن کے نام اپنے خفیہ نوٹ میں لکھا "برطانیہ کے لئے ہندوستان میں ایک مرکزی حکومت کی بجائے دو، تین یا زیادہ وحدتوں سے معاملہ کرنا

زیادہ آسان ہو گا"[109]

قرار داد پیش کرتے ہوئے سہروردی نے اعلان کیا کہ برِّ صغیر کے مسلمانوں کے لئے مسلم لیگ کے علاوہ کوئی راستہ نہیں تھا اور پاکستان کے علاوہ کوئی مقصد نہیں تھا۔[110] (ضمیمہ 3) انہوں نے کہا کہ "انگریز ہندوستانیوں کو اقتدار سونپنا چاہتے ہیں اور کابینہ مشن انتقالِ اقتدار کے کئے مناسب لائحہ عمل کی تلاش میں ہندوستانی سرزمین پر موجود ہے۔ کانگرس انگریزوں سے کہہ رہی ہے "ہمیں اقتدار دو۔ ہم تمام اختلافی آوازوں کا گلا گھونٹ دیں گے۔ ہم مسلمانوں کو صفحہ ہستی سے مٹادیں گے۔ ہم شیڈولڈ کاسٹ عوام کے دماغ ٹھکانے لگادیں گے۔ ہریجنوں کو نیست ونابود کر دیں گے۔ ہمیں پولیس ، فوج اور ہتھیار دے دو اور ہم متحدہ ہندوستان کے نام پر شمشان گھاٹ تعمیر کر دیں گے" میں اسے اقتدار کی ہوس سے پیدا ہونے والی دیوانگی سمجھتا ہوں۔ ہم خانہ جنگی نہیں چاہتے لیکن ہم ایک ایسا خطہّ چاہتے ہیں جہاں پر ہم امن سے رہ سکیں۔ ہم ایک قوم ہیں اور ہم سمجھتے ہیں کہ موقع ملنے پر ہم تہذیبِ عالم میں مثبت اضافے کریں گے لیکن کیا انگریز اور کانگرس ہمیں امن اور وقار کے ساتھ پاکستان لینے دیں گے؟ اگر نہیں تو کیا ہم لڑنے کے لئے تیاّر ہیں؟ میں نے ایک طویل عرصے تک ان سوالات پر غور کیا اور میں پوری ایمانداری سے اعلان کرتا ہوں کہ بنگال کا ہر مسلمان پاکستان کی راہ میں جان قربان کرنے کے لئے تیاّر ہے۔ مسٹر جناح میں آپ کو دعوت دیتا ہوں کہ آپ ہمارا امتحان لے لیں"[111]

یوم راست اقدام

اس دوران میں وائسرائے نے مسلمانانِ ہند کے سیاسی حق کو پامال کرتے ہوئے پنڈت نہرو کو عبوری حکومت بنانے کی دعوت دے ڈالی۔ نہرو نے کابینہ تشکیل دی لیکن مسلم لیگ نے اس میں شمولیت سے انکار کر دیا جناح نے وائسرائے لارڈ ویول سے اپنے مذاکرات بھی منسوخ کر دیئے اور 16 اگست 1946ء کو ہندوستان بھر میں یومِ راست اقدام منانے کا اعلان کر دیا[112] سندھ میں مسلم لیگ کی وزارت صرف ایک رکن کی اکثریت پر قائم تھی۔ یہ وزارت بھی کانگرسی وزیرِ اعلیٰ اللہ بخش کی وفات کے باعث [A]بیل پا سکی تھی۔ سندھ حکومت سے بھی یومِ راست اقدام منانے کے لئے کہا گیا لیکن اس وزارت کی ڈانواں ڈول حالت کے پیشِ نظر اس پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ یومِ راست اقدام کو کامیاب بنانے کی ساری ذمہّ داری بنگال مسلم لیگ کو اٹھانا پڑی۔ اس روز مسلمانوں کو بڑے بڑے عوامی اجتماعات میں شریک ہو کر مطالبہٗ پاکستان سے اپنی یکجہتی کا اظہار کرنا تھا۔ شہید سہروردی نے اس روز کلکتہ میں عام تعطیل کا اعلان کر دیا۔

ایک گزشتہ موقع پر تعطیل کا اعلان نہیں کیا گیا تھا چنانچہ ہندو مسلم تصادم وقوع پذیر ہوا تھا۔ لوگوں کو ان کی کاروں سے باہر گھسیٹ کر مارا پیٹا گیا تھا۔ اب ہندوؤں نے تعطیل کے اعلان پر سخت احتجاج کیا اور

خفیہ طور پر ہنگامہ آرائی اور مسلمانوں پر حملوں کے لئے تیاری کر لی۔ پولیس کی خفیہ برانچ کا کام دہشت گردی اور تخریب کاری سے نپٹنا تھا لیکن اس ادارے اور سی آئی ڈی نے وزیر اعظم کو ممکنہ ہنگاموں کے بارے میں کوئی اطلاع فراہم نہ کی۔ دونوں اداروں میں ہندو ملازمین کی اکثریت تھی۔ یومِ راست اقدام کے روز فسادات نے سہروردی کو گویا بے خبری میں آلیا۔[113] 16 راگست کو وزیر اعظم اوچر لنی یادگار میدان میں کلکتہ اور اسکے نواح سے آنے والے مسلمانوں کے اجتماع سے خطاب کر رہے تھے کہ انہیں ہندوؤں کی طرف سے جلوس روک پر مسلمانوں پر حملے کرنے کی اطلاع موصول ہوئی۔ شہر کے بہت سے علاقوں میں فسادات شروع ہو گئے تھے۔ رمضان المبارک کا مہینہ تھا۔ سہروردی نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ پر امن طور پر منتشر ہو کر اپنے اپنے گھروں کو چلے جائیں۔ یہ اجتماع بہت بڑا تھا۔ بہت سے شرکاء نے اپنے بچے کندھوں پر اٹھا رکھے تھے۔ یہ لوگ کلکتہ، نواحی علاقوں ہاوڑا چوبیس پرگنہ نیز پٹ سن اور کپاس کے کارخانوں سے آئے تھے۔ منتشر ہوتے ہوئے ہجوم پر ہندوؤں نے حملہ کر دیا اور 1926ء سے بھی وسیع پیمانے پر ہندو مسلم فساد پھوٹ پڑا۔

برطانوی پولیس کمشنر کلکتہ کے مخصوص حالات سے پوری طرح واقف نہیں تھا اور وہ پولیس کی مٹھی بھر نفری سے حالات پر قابو پانے میں ناکام رہا۔ فسادات کے بعد حکومت نے جو تحقیقاتی کمیشن مقرر کیا اس کی رپورٹ کے مطابق فسادات کی اطلاع ملتے ہی وزیر اعظم سہروردی لال بازار میں واقع پولیس ہیڈ کوارٹرز پر براہِ راست اطلاعات حاصل کرنے پہنچے، انہوں نے صورتحال کی سنگینی کا اندازہ ہوتے ہیں گورنر سے فوج بھجوانے کا مطالبہ کر دیا۔[114] گورنر بروز نے اس خیال سے یہ درخواست رد کر دی کہ فوج کی آمد سے برطانوی حکومت کے خلاف معاندانہ جذبات پیدا ہوں گے اور ہندو مسلم تعلقات میں مزید کشیدگی آجائے گی۔ اس سے قبل جون 1945ء میں یومِ راشد علی کے موقع پر ایسا ہی ہوا تھا۔[115] کیپٹن راشد علی آزاد ہند فوج میں شامل تھے۔ یہ فوج دوسری جنگِ عظیم کے دوران سبھاش چندر بوس نے انگریزوں سے مقابلہ کرنے کے لئے قائم کی تھی۔ کیپٹن راشد علی کو گرفتار کر کے ان پر مقدمہ چلایا گیا اور انہیں سات برس قید کی سزا سنائی گئی۔ کیپٹن علی نے اپنے مقدمے کے دوران مسلم لیگ سے حمایت طلب کی اور سہروردی نے سرکاری پابندی کی پرواہ کئے بغیر مسلم لیگ اور کانگرس کے اعلیٰ قیادت کے ساتھ ایک بہت بڑا جلوس نکالا۔[116]

گورنر نے سہروردی کی یہ تجویز بھی رد کر دی کہ شہر میں ہندو اور مسلمان علاقوں کے درمیان چوکیاں قائم کر دی جائیں تاکہ ایک فریق دوسرے فریق کے علاقے پر حملہ نہ کر سکے۔ یہ تجویز بعد ازاں منظور کر لی گئی لیکن اس وقت تک نقصان ہو چکا تھا۔ مسلمانوں کے کئی محلے ملبے کا ڈھیر بن چکے تھے اور ہزاروں مسلمانوں کو موت کے گھاٹ اتارا جا چکا تھا۔ بروز نے سہروردی کی رائے تسلیم کرنے کی بجائے پولیس کمشنر کے خیال سے اتفاق کیا کہ سول انتظامیہ صورتحال کو سنبھالنے کی اہل تھی اور فوج تعینات کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ جب سہروردی نے استعفیٰ دینے کی دھمکی دی تو گورنر کچھ نرم پڑا اور اس نے تین چار روز کی تاخیر کے بعد فوج تعینات کر دی لیکن فوج کو عملی اقدامات کی بجائے محض اپنی موجودگی ظاہر کرنے کے احکامات

دیئے گئے۔ سہروردی نے گورنر اور علاقہ کمانڈر کے ساتھ 18 ر اگست کو سوہابازار کا دورہ کیا اور انہیں مسلمانوں کی سربریدہ لاشیں دکھائیں جو گلی کوچوں میں بکھری پڑی تھیں۔ اس محلّے میں ہندوؤں کی اکثریت تھی اور مسلمانوں کے معدودے چند مکانات اور دکانیں تھیں لیکن ان سب مسلمانوں کو تہہ تیغ کر دیا گیا۔ فوج کو اس علاقے میں فسادات کا کوئی علم نہیں تھا حتیٰ کہ پولیس کمشنر کو بھی اس ضمن میں اطلاع فراہم نہیں کی گئی تھی۔ مسلمانوں کے قتلِ عام کے ان مناظر سے گورنر اور جنرل کو گہرا صدمہ ہوا۔[117]

پنجاب پولیس کی تعیناتی

ان دنوں کلکتہ کی آبادی 60 لاکھ سے زیادہ تھی لیکن کلکتہ پولیس کی نفری صرف 1200 نفوس پر مشتمل تھی جن میں سے صرف 63 مسلمان تھے۔[118] افسروں میں صرف ایک ڈپٹی کمشنر اور ایک تھانیدار کے علاوہ دیگر تمام اہلکار ہندو تھے۔[119] فسادات کا زہر اتنی دور تک پھیل گیا کہ سرکاری اہلکار بھی اس میں براہِ راست ملوث ہو گئے۔ چنانچہ 1200 افراد پر محیط پولیس کی نفری نہ صرف یہ کہ امنِ عامہ کی صورتحال کے پیشِ نظر ناکافی تھی بلکہ اس کی وفاداری بھی مشکوک تھی۔ اس صورتحال میں سہروردی نے پولیس میں توازن حاصل کرنے کے لئے 1200 پنجابی سپاہی تعینات کرنے کا فیصلہ کیا۔[120] ہندو رہنماؤں نے گورنر سے اس اقدام کی شکایت کی۔ گورنر نے سہروردی کو مشورہ دیا کہ وہ پنجابی سپاہی بھرتی کرنے کی بجائے اسی تعداد میں تربیت یافتہ بنگالی مسلمان سپاہیوں کی خدمات حاصل کر لیں۔ سہروردی نے گورنر کو بتایا کہ اتنی تعداد میں تربیت یافتہ بنگالی مسلمان سپاہیوں کا ملنا دشوار تھا اور انہیں فسادات پر فوری قابو پانے کے لئے تربیت یافتہ سپاہیوں کی ضرورت تھی۔ سہروردی نے گورنر کو یہ بھی بتایا کہ کلکتہ کی پولیس میں بنگالی ہندوؤں کی بجائے سکھ، گورکھا، جٹ، راجپوت، ہندو بھرتی کئے گئے تھے۔ سہروردی نے گورنر کو صاف صاف بتا دیا کہ وہ صرف اسی صورت میں بنگالی مسلمان بھرتی کریں گے اگر کلکتہ میں موجودہ پولیس نفری کو بھی برطرف کر کے بنگالی ہندو بھرتی کئے جائیں۔ گورنر نے اس تجویز سے اتفاق نہیں کیا لیکن سہروردی سے اصرار کرتے رہے کہ وہ پنجابی مسلمان سپاہیوں کو بھرتی نہ کریں۔ جب سہروردی نے ایک بار پھر مستعفی ہونے کی دھمکی دی تو گورنر نے آمادگی کا اظہار کر دیا۔[121] سہروردی نے پولیس کی نفری میں توازن پیدا کرنے کے لئے فوراً 12 سو پنجابی سپاہی بھرتی کا حکم دیا اور کلکتہ کے 22 تھانوں میں سے 21 تھانوں میں مسلمان تھانیدار تعینات کر دیئے۔ سہروردی نے ایک برطانوی افسر سے پولیس کنٹرول روم کا انتظام سنبھال لیا اور فسادات پر قابو پانے کے لئے بذاتِ خود پولیس کو احکامات دیتے رہے۔

سینکڑوں بار ایسا ہوا کہ سہروردی کسی برطانوی فوجی کی وردی پہن کر ہندو مسلمان کی تمیز کئے بغیر نہتے مصیبت زدگان کی جان بچانے کے لئے فساد زدہ علاقوں میں گھس گئے۔ حسن اصفہانی، حسین شہید سہروردی کے شدید مخالف تھے، وہ اس قتلِ عام کی قلمی تصویر کشی کرتے ہوئے سہروردی کے کردار کے

بارے میں رقم طراز ہیں "میں نے کبھی کسی شخص کو سہروردی کی طرح جانفشانی اور مستعدی سے فسادات کی آگ بجھاتے ہوئے نہیں دیکھا۔"[122] فسادات کے دوران انہوں نے متعدد ہندو خاندانوں کو سر چھپانے کے لئے جگہ مہیا کی، ان میں ہندو گوالوں کے 95 خاندان، سہروردی کے ذاتی حجام، نوجن میسل اور دھوبی کنجا دھوپا کے خاندان بھی شامل تھے۔[123] سہروردی کے ذاتی مدد گاروں میں شیبو بھی شامل تھا جو اڑیسہ کا ہندو تھا شیبو نے ان کٹھن سالوں میں بڑی پامردی کے ساتھ سہروردی کا ساتھ دیا۔ جلد ہی فساد زدہ شہر میں امن کی فضا بحال ہو گئی اور حالات معمول پر آگئے۔

امن کا سفیر

ان فسادات نے برطانوی حکومت کو بھی ہلا کر رکھ دیا۔ 25 اگست کو لارڈ ویول نے کلکتہ کا دورہ کیا اور اپنی آنکھوں سے قتل و غارت گری کے ہولناک مناظر دیکھے۔[124] کلکتہ کے مسلمانوں نے شہر کی دیواروں کو کاغذی اشتہارات سے بھر دیا۔ یہ اشتہار علامتی طور پر سرخ روشنائی سے لکھے گئے تھے۔ ان اشتہارات میں لارڈ ویول کو فسادات کا ذمہ دار ٹھہراتے ہوئے اس سے واپس جانے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔[125] ڈھاکہ میں بھی لارڈ ویول کا ایسا ہی سواگت ہوا۔ وائسرائے نے سہروردی سے سوال کیا کہ اسے کس حوالے سے فسادات کا ذمہ دار قرار دیا جا رہا تھا۔[126] سہروردی نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ فسادات کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ مسلم لیگ کے بغیر عبوری مرکزی کابینہ تشکیل دی گئی، جس سے مسلمانوں کے اس خیال کو تقویت ملی کہ انگریز جان بوجھ کر ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان غلط فہمیاں پیدا کرتے ہیں تاکہ ان اختلافات کو جواز بنا کر عنانِ اقتدار صرف کانگرس کے سپرد کی جا سکے۔[127] سہروردی نے وائسرائے کو خبردار کیا کہ اگر برطانوی حکومت نے اپنی پالیسی تبدیل نہ کی تو کلکتہ کی کہانی پورے ہندوستان میں دہرائی جائے گی۔ سہروردی نے وائسرائے کو قائل کرنے کی کوشش کی کہ متحدہ ہندوستان کے امکانات ختم ہو چکے ہیں اور اگر ملک کو خانہ جنگی سے بچانا مقصود ہے تو انگریزوں کو مسلم لیگ کا تعاون حاصل کرنا ہو گا۔ بنگال سے رخصت ہونے سے قبل لارڈ ویول نے سہروردی سے درخواست کی کہ وہ جناح اور وائسرائے کے درمیان رابطے کا کام کریں۔[128]

چنانچہ سہروردی نے چھ ستمبر کو بمبئی میں جناح سے ملاقات کی اور دو دن بعد دہلی میں لارڈ ویول سے ملے۔ آخر کار وہ دونوں کے درمیان مفاہمت کروانے میں کامیاب ہو گئے۔ جناح اور ویول کے درمیان پہلی ملاقات 16 ستمبر کو دہلی میں ہوئی۔ لارڈ ویول نے جناح کو یقین دہانی کروائی کہ حکومت مسلم لیگ کا مطالبہ تسلیم کرنے پر تیار ہے۔ اس پر مسلم لیگ نے 15 اکتوبر کو پنڈت نہرو کی قیادت میں عبوری کابینہ میں شرکت کا فیصلہ کر لیا۔[129] اس موقع پر جناح نے تسلیم کیا کہ سہروردی نے ملک کو ایک خطرناک صورتحال سے بچانے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔[130]

تقسیم ہند

جناح کی راست اقدام کی حکمتِ عملی، مسلمانانِ کلکتہ کے لہو میں غلطاں ہونے کے باوجود جناح کے لئے عظیم سیاسی فتح کا پیش خیمہ ثابت ہوئی اور پاکستان کا قیام ناگزیر ہوگیا۔ کلکتہ کے فسادات کے باعث برِّ صغیر میں دیگر مقامات پر خانہ جنگی کا خدشہ بڑھنے لگا اور آزادی کی منزل زیادہ تیزی سے قریب آنے لگی۔

انگریزوں نے پہلے پہل اپنے اقتدار کو طول دینے کے لئے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نفاق پیدا کیا تھا لیکن جلد ہی معاملہ ان کے ہاتھ سے نکل گیا چنانچہ 24 فروری 1947ء کو اٹلی حکومت نے اعلان کیا کہ برطانیہ جون 1948ء سے پہلے ہندوستان سے رخصت ہو جائے گا خواہ اس مقصد کے حصول کی خاطر ہندوستان کو تقسیم ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ ادھر ہندوستان میں برطانوی راج کے آخری مرحلے میں تاجِ برطانیہ کی نمائندگی کے لئے لارڈ ویول کی جگہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو وائسرائے ہند مقرر کیا گیا۔

طویل خانہ جنگی کا واحد حل

ماؤنٹ بیٹن مارچ 1947ء میں ہندوستان پہنچا۔ اس نے اپنی جاندار اور متحرک شخصیت کے بل پر ہند۔ برطانیہ تعلقات میں ایک نئی روح پھونک دی۔ پنڈت نہرو تو پہلے روز ہی سے لارڈ[131] ماؤنٹ بیٹن کے گرویدہ ہو گئے۔ بایں ہمہ یہ شیفتگی مسلمانوں کے حق میں خاصی ضرر رساں ثابت ہوئی۔ نیا وائسرائے ہندوستان کو متحد دیکھنا چاہتا تھا لیکن جلد ہی اسے احساس ہو گیا کہ پاکستان کا قیام ناگزیر ہو چکا تھا۔ خانہ جنگی اور ابتری کے لمبے ہوتے سایوں نے بالآخر گاندھی کے علاوہ ہر ایک کو قائل کر لیا کہ طویل خانہ جنگی کا واحد متبادل ہندوستان کی تقسیم تھا۔ 3 جون کو ماؤنٹ بیٹن نے تقسیم ہند کے منصوبے کا اعلان کیا۔ اس منصوبے کی رو سے انگریزی کو محض دس ہفتے کی مختصر مدت میں اپنا بوریا بستر سمیٹ کر ہندوستان سے چل دینا تھا۔ چنانچہ 14 اگست 1947ء کا دن یوم نجات قرار[132] پایا۔ برطانوی ہائی کورٹ کے جج، سر سیرل ریڈ کلف کو پنجاب اور بنگال کی تقسیم، سرحدوں کے تعین اور تقسیم ہند کے ضمنی مسائل میں حکومت کی رہنمائی کے لئے ہندوستان بھیجا گیا۔ جناح، سیرل ریڈ کلف سے شخصی طور پر آشنا تھے اور انہیں ریڈ کلف کی دیانتداری پر بے حد اعتماد تھا۔ ریڈ کلف نے پنجاب اور بنگال کی تقسیم کا منصوبہ تیار کیا۔ بایں ہمہ مسلمانوں کا خیال ہے کہ ریڈ کلف نے ماؤنٹ بیٹن کی براہِ راست مداخلت پر ضلع گورداسپور اور تحصیل بٹالہ کے مسلم اکثریتی علاقوں کو مشرقی پنجاب میں شامل کر دیا تاکہ بھارت کے لئے ریاستِ کشمیر سے جغرافیائی اتصال ممکن ہو سکے۔ مسلمانوں کو بنگال اور پنجاب کی تقسیم کے بارے میں ریڈ کلف کے فیصلوں پر سخت اعتراضات تھے لیکن چونکہ جناح ریڈ کلف ایوارڈ کے اعلان سے پہلے ہی اسے تسلیم کر چکے تھے لہٰذا اب احتجاج لاحاصل

تھا۔

عظیم تر بنگال کا منصوبہ

جب تقسیم ہند کے منصوبے کا اعلان کیا گیا تو سہروردی نے اس بنا پر تقسیم بنگال کی مخالفت کی کہ یہ مسلم اکثریتی صوبہ ہے۔[133] سہروردی کا کہنا تھا کہ ہندوستان کی تقسیم تو ناگزیر ہے لیکن بنگال کو متحد رہنا چاہئے جناح نے بھی اعلان کیا کہ انہیں کٹا پھٹا اور ادھ کھایا پاکستان قبول نہیں ہو گا۔[134] تقسیم بنگال کا مطلب تھا کہ کلکتہ کو جس کی ساری ترقی مشرقی بنگال کے خون پسینے کی مرہون منت تھی بھارت کے حوالے کر دیا جائے۔ اس تقسیم کا متبادل ایک خود مختار بنگال تھا۔ خود مختار بنگال یا عظیم تر بنگال کے منصوبے کے خالق کی حیثیت سے سہروردی کے حصے میں داد و تحسین کے پھول بھی آئے اور ان پر طعن و تشنیع کے پتھر بھی برسائے گئے۔ آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے رکن مولانا راغب احسن نے اس منصوبے کے بارے میں ایک جامع دستاویز شائع کی تھی۔[135]

ماؤنٹ بیٹن نے اپنے عملے کے واحد ہندوستانی رکن وی پی مینن اور کانگرس کے رہنماؤں مثلاً پنڈت نہرو اور سردار پٹیل کے ساتھ ملکر گہرے غور و فکر کے بعد وسط مئی میں تقسیم بنگال کا منصوبہ مکمل کیا تھا۔[136] تاہم آل انڈیا مسلم لیگ کی اعلیٰ قیادت کو اپریل میں ہی علم ہو چکا تھا کہ ماؤنٹ بیٹن بنگال کو تقسیم کرنے اور کلکتہ کو مغربی بنگال میں شامل کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔[137] جب بنگال میں مسلم لیگ وزارت نے اس منصوبے کو تسلیم کرنے سے انکار کیا تو جناح نے سہروردی کو مشورہ دیا کہ وہ ایک خود مختار ' آزاد بنگال کے قیام کے لئے کام کریں۔[138] سہروردی نے فوری طور پر تقسیم بنگال سے بچنے کے لئے بنگال کے کانگرسی رہنماؤں سے مذاکرات شروع کر دیئے تاکہ متفقہ منصوبے پر پہنچا جا سکے۔

بنگال صوبائی مسلم لیگ کے رہنماء تو کچھ عرصہ پہلے سے ہی اس مسئلے پر آپس میں بحث و تمحیص کر رہے تھے۔ 1944ء میں جناح گاندھی بمبئی مذاکرات کے دوران خود جناح نے بنگال صوبائی مسلم لیگ کے رہنماؤں سے کہا تھا کہ وہ مشرقی پاکستان کے آئندہ خاکے ' سرحدوں اور دستوری ڈھانچے کے بارے میں اپنا نقطۂ نگاہ بیان کریں۔[139] وسط اگست میں بنگال صوبائی مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے کئی اجلاس کلکتہ میں سہروردی کی ذاتی قیام گاہ پر منعقد ہوئے اور تین متبادل تجاویز سامنے آئیں۔

(1) راغب احسن نے بنگال ' آسام اور جھرکنڈ (جہاں چھوٹا ناگپور کے آدیواسی آباد تھے) کے وفاق یا نیم وفاق کی تجویز پیش کی۔

(2) فضل الرحمٰن نے تجویز پیش کی کہ بنگال اور آسام میں کرزن تقسیم لائن تک سرما وادی کو ملا کر مشرقی پاکستان قائم کیا جائے تاکہ اس خطے میں مسلمانوں کی اکثریت کو یقینی بنایا جا سکے۔

(3) حمید الحق چودھری نے منصوبہ پیش کیا کہ متحدہ بنگال اور آسام پر مبنی پاکستان کی ایک انتظامی وحدت

قائم کی جائے۔

بنگال صوبائی مسلم لیگ کی مجلسِ عاملہ نے ایک خصوصی ایلچی کے ذریعے یہ تینوں تجاویز بمبئی میں جناح کو ارسال کر دیں۔ ان تجاویز پر جناح کا ردِّعمل کیا تھا اس ضمن میں کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا البتہ آسام کے عبدالمتین چودھری سمیت آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلسِ عاملہ کے ارکان نے مطالبہ کیا کہ بنگال اور آسام کو مکمل طور پر مشرقی پاکستان میں شامل کیا جائے۔[140]

1942ء میں جب بنگال پر جاپان کے حملے کا خطرہ منڈلا رہا تھا، کرپس وفد نے جس انڈین یونین کی تجویز پیش کی تھی اس میں صوبوں کو مرکز سے علیحدگی کا اختیار دیا گیا تھا۔[141] دو برس بعد راج گوپال اچاریہ نے مسلم اکثریتی صوبوں کو حقِ خود ارادیت کی پیشکش کی تھی۔[142] پھر 1946ء میں کابینہ وفد نے اس بنا پر دو خود مختار مملکتوں کو اقتدار سونپنے سے انکار کیا تھا کہ ایسی صورت میں پاکستان کے دونوں حصے اپنی بقا کے لئے ہندوستان کے رحم و کرم پر ہوں گے اس کی بجائے کابینہ وفد نے تجویز پیش کی تھی کہ صوبوں کو تین گروپوں میں تقسیم کر دیا جائے اور ان گروپوں کو مرکز سے علیحدگی کا اختیار حاصل ہو۔[143] پھر لارڈ ویول کے آخری ایّام میں مسلم لیگ کے رہنماؤں تک یہ خبر پہنچی کہ ملک معظم کی حکومت صوبوں کی موجودہ حکومت کو اقتدار سونپنے کے بارے میں سنجیدگی سے غور کر رہی ہے۔[144] اس امکان کی بنیاد پر فروری 1947ء کے آخری ہفتے میں ابو الہاشم اور سرت چندر بوس نے ایک خود مختار، آزاد بنگال کے منصوبے پر بات چیت کی۔ اس منصوبے میں مشرقی ہندوستان کے بنگالی بولنے والے عوام کے علاقے یعنی بہار میں پورنیا سے لیکر مشرقِ بعید میں آسام تک کا علاقہ شامل تھا۔ جب اس منصوبے کو آشکار کیا گیا تو ہندو مہا سبھا نے بنگال کی تقسیم کا مطالبہ شروع کر دیا۔ مارچ میں اچاریہ کرپلانی نے بھی، جو اس وقت کانگرس کے صدر تھے، تقسیمِ بنگال کا مطالبہ کیا۔[147] اس پر گاندھی نے تبصرہ کیا کہ اگر بنگال کو تقسیم کیا گیا تو ہندوستان کے مشرقی افق سے کبھی فرقہ وارانہ کشیدگی کے بادل چھٹ نہیں سکیں گے۔[148] گاندھی کے رویئے سے بنگالی رہنماؤں کو حوصلہ ملا اور انہوں نے خود مختار متحدہ بنگال کے متفقہ منصوبے کے لئے کوشش جاری رکھی۔

وزیرِ اعظم سہروردی نے ایک خود مختار متحدہ بنگال کی تجویز سب سے پہلے 27 اپریل 1947ء کو دہلی میں ایک پریس کانفرنس میں پیش کی۔[149] اگلے روز یعنی 28 اپریل کو جناح اور ماؤنٹ بیٹن کی ملاقات کے بعد وہ کلکتہ پہنچے اور اسی روز فارورڈ بلاک کے رہنما سرت چندر بوس سے ملاقات کی۔ اس ملاقات میں سہروردی کے علاوہ خواجہ ناظم الدین، ابو الہاشم اور فضل الرحمٰن بھی شامل تھے۔[150] مسلم لیگ نے سہروردی، حبیب اللہ بہار، حمید الحق چودھری اور فضل الرحمٰن پر مشتمل ایک سب کمیٹی تشکیل دی۔ نور امین اس سب کمیٹی کے کنوینر تھے۔ اس سب کمیٹی کے ذمے یہ فرض سونپا گیا کہ ہندو رہنماؤں خاص طور پر کانگرس کے قائد سریندر موہن گھوس، کانگرس پارلیمانی پارٹی کے قائد کرن شنکر رائے اور فارورڈ بلاک کے رہنما سرت چندر بوس، سے مذاکرات کئے جائیں۔[151] ابو الہاشم اور سرت چندر بوس پر مشتمل ایک دو رکنی وفد نے 12 مئی کو دہلی میں گاندھی سے بھی ملاقات کی اور متحدہ بنگال کے منصوبے کے لئے ان کی اشیرباد حاصل

کی۔[152] بنگال کانگرس کے رہنماؤں، بنگال مجلسِ قانون ساز میں ہندو قائدین اور بنگالی دانشوروں کی اکثریت کا تعلق مشرقی بنگال سے تھا اور یہ لوگ تقسیمِ بنگال کے مخالف تھے۔[153] یہ حضرات ہندو مہاسبھا کے سربراہ مکرجی کی عقل و فراست پر سربہ گریبان تھے جو تقسیمِ بنگال کی وکالت کر رہے تھے۔ اس ردّ عمل کو دیکھتے ہوئے سہروردی نے ہندوؤں کو پہلے مخلوط انتخابات کی پیشکش کی[154] اور پھر اس پیشکش میں اس ترمیم کے لئے بھی تیاّر ہو گئے کہ مخلوط انتخابات کے علاوہ آبادی کی بنیاد پر مسلمانوں، اونچی ذات کے ہندوؤں، نچلی ذات کے ہندوؤں اور دیگر اقلیتوں کے لئے کچھ نشستیں مخصوص بھی رکھی جائیں۔ یہ پیشکش محمد علی فارمولا کی بنیاد پر کی گئی تھی۔ یہ فارمولا مخلوط اور جداگانہ انتخابات کا امتزاج پیش کرتا تھا۔ اس پیشکش میں یہ انتخابی اصول بھی شامل تھا کہ اپنے فرقے کے کم از کم 33 فیصد ووٹ لئے بغیر کسی امیدوار کو کامیاب قرار نہ دیا جائے۔ بالآخر مسلم لیگ اور کانگرس کی مشترکہ کمیٹی نے 20 مئی کو متحدہ بنگال کے لئے ایک عبوری معاہدے پر باقاعدہ دستخط کر دیئے۔[155] سہروردی نے اس منصوبے کا خاکہ جناح تک پہنچا دیا جبکہ منصوبے کو گاندھی کے سامنے پیش کرنے کی ذمہ داری سرت چندر بوس نے اٹھائی۔ بوس نے مہاتما گاندھی کو یقین دلایا کہ بنگال میں مسلم لیگ اور کانگرس غالباً چند ترامیم کے بعد اس منصوبے کی توثیق کر لیں گی۔[156]

تعجب انگیز امر یہ ہے کہ بوس کے اس مکتوب کے جواب میں جس میں منصوبے کا متفقہ خاکہ ملفوف تھا، گاندھی نے بوس کو مشورہ دیا کہ وہ متحدہ بنگال کے لئے جدوجہد ترک کر دیں اور اس ماحول کو خراب نہ کریں جو تقسیمِ بنگال کے لئے تیاّر کیا گیا ہے۔[157] گاندھی کے رویئے میں یہ تبدیلی نہرو اور پٹیل سے ملاقات کے بعد آئی تھی۔ نہرو اور پٹیل متحدہ بنگال کی تجویز کے مخالف تھے اور اسے ہندوؤں میں داخلی پھوٹ ڈالنے کی سازش سمجھتے تھے۔[158]

بوس کو شدید صدمہ ہوا انہوں نے اعلان کیا کہ اگر ہندوستان کی تقسیم گناہ ہے تو بنگال ماتا کی چیر پھاڑ اس سے بھی بڑا گناہ ہے۔[159] انہوں نے ہندوؤں کو ان قربانیوں کی یاد دلائی جو انہوں نے 1905ء کی تقسیمِ بنگال کو منسوخ کروانے کے لئے دی تھیں۔ انہوں نے ہندوؤں کو وہ سلوک بھی یاد دلوایا جو سی آر داس اور نیتاجی سبھاس چندر بوس (سرت چندر بوس کے بھائی) کو شمالی ہندوستان کے ہندو رہنماؤں کے ہاتھوں برداشت کرنا پڑا تھا۔ وہ دونوں کانگرس سے نکل کر بالترتیب سوراج پارٹی اور فارورڈ بلاک کی تشکیل پر مجبور ہو گئے تھے۔ بایں ہمہ سرت چندر بوس کو طاقتور ہندو اخبارات سے کوئی مدد نہ مل سکی اور تقسیمِ بنگال کا مطالبہ زور پکڑنے لگا۔

سرت چندر بوس اور کرن شنکر رائے ڈیرہ دون میں سردار پٹیل سے بھی ملے جب انہوں نے سردار پٹیل کے سامنے متحدہ بنگال کی تجویز پیش کی تو سردار نے فوراً یہ کہہ کر اسے رد کر دیا کہ سہروردی نے یہ سازش بنگال کو پاکستان میں شامل کرنے کے لئے تیاّر کی ہے۔[160] اس کا کہنا تھا کہ متحدہ بنگال کی خود مختاری کے بعد آسام کے لئے پاکستان میں شمولیت کے علاوہ کوئی راستہ باقی نہیں رہے گا۔ وزیرِ داخلہ اور وزیر برائے ریاستی امور کی حیثیت سے پٹیل کانگرس کی اعلیٰ قیادت میں بہت طاقتور ہو چکے تھے۔ ان کی مخالفت کا

مطلب یہ تھا کہ کانگرس یقیناً اس تجویز کو مسترد کر دے گی۔ بعدازاں پٹیل نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے ساتھ اپنے خفیہ گٹھ جوڑ کا انکشاف کرتے ہوئے بتایا کہ وہ (سردار پٹیل) صرف اس شرط پر ہندوستان کی تقسیم پر آمادہ ہوا تھا کہ کلکتہ کو مغربی بنگال میں شامل کیا جائے گا (مغربی بنگال ہندوستان کے حصے میں آنا تھا)[161] شاطر ماؤنٹ بیٹن نے یہ چال چلی کہ متحدہ بنگال کے منصوبے کی منظوری کو کانگرس اور مسلم لیگ دونوں کی متفقہ منظوری سے مشروط کر دیا۔[162] جب کانگرس نے اس تجویز کو رد کر دیا تو لازمی طور پر جناح کو تقسیمِ بنگال پر رضامند ہونا پڑا۔

انگریزوں نے 1905ء میں بنگال کو تقسیم کیا تھا لیکن یہ تقسیم 1911ء میں منسوخ کرنا پڑی تھی اور انگریزوں نے تسلیم کیا تھا کہ بنگال ایک سیاسی وحدت ہے۔[163] اسی یقین کی بنا پر انہوں نے کابینہ مشن اور کرپس مشن کی تجاویز میں بنگال کو ایک متحدہ وحدت کے طور پر برقرار رکھا۔ 1757ء میں جب انگریزوں نے جنگِ پلاسی کے بعد مسلمانوں سے بنگال چھینا اس وقت یہ ریاست بنگال، بہار اور اڑیسہ پر محیط ایک وسیع سلطنت تھی لیکن ماؤنٹ بیٹن نے تاریخ کو مسخ کرتے ہوئے ہندوؤں کی خواہشات کے احترام میں بنگال کے حصے بخرے کر دیئے۔

اونچی ذات کے ہندوؤں نے متحدہ بنگال کے منصوبے کو اس لئے رد کیا کہ اس کا مطالبہ مسلمانوں نے کیا تھا اور 1937ء سے 1947ء تک دس سال کے عرصے میں بنگال پر حکومت کی آزمائش میں پورا اتر کر مسلمانوں نے ان ہندوؤں کی سیاسی حیثیت خطرے میں ڈال دی تھی۔ اونچی ذات کے ہندوؤں کی طرف سے متحدہ بنگال کی مخالفت ناقابلِ فہم تھی کیونکہ انہی لوگوں نے 1905ء میں تشدد کے ذریعے تقسیم بنگال کی مخالفت کی تھی اور اسے منسوخ کرا کے دم لیا تھا۔ اس رویئے کی ایک توجیہہ یہ پیش کی جاتی ہے کہ اونچی ذات کے ہندوؤں کو 1937ء میں پرجا لیگ مخلوط وزارت کے قیام سے مایوسی ہوئی تھی اور ان لوگوں نے ہندوستانی قوم پرستی کا پرچار شروع کر دیا تھا۔[164] بعدازاں ہر سال باقاعدگی سے وقوع پذیر ہونے والے ہندو مسلم فسادات نے دونوں فرقوں کے مابین خلیج اور بھی وسیع کر دی۔[165] مسلم اکثریت کے ساتھ آزاد بنگال میں جاگیرداریاں ختم کر دی جاتیں اور زرعی املاک قومی تحویل میں چلی جاتیں چونکہ اونچی ذات کے بیشتر ہندو جاگیردار طبقے سے تعلق رکھتے تھے لہٰذا وہ قراردادِ لاہور کے شدید مخالف تھے جس میں مشرقی ہندوستان میں آزاد خودمختار مسلمان ریاست کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ ان لوگوں نے ہی متحدہ بنگال کے منصوبے کی بھی مخالفت کی۔ ایک اور سبب یہ تھا کہ ان لوگوں نے اپنی قسمت ہندو بھارت کے خواب سے وابستہ کر رکھی تھی چنانچہ بنگالی قوم پرستی کا چراغ گل ہونا فطری امر تھا۔

بنگالی مسلمانوں کو مذہبی یکجہتی کے حد سے بڑھے ہوئے جوش و جذبے کے ہاتھوں بھی نقصان اٹھانا پڑا۔ 1940ء میں مسلم لیگ کے لاہور اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے فضل الحق نے بڑے جوش سے اعلان کیا تھا کہ "وہ خود کو پہلے مسلمان اور بعد میں بنگالی سمجھتے ہیں" ایسے ہی جذبات کے باعث بنگالی مسلمان خود کو باقی ہندوستان کے مسلمانوں کے ساتھ ملا کر سوچنے کے عادی ہو گئے۔[166] بنگال میں ہندوؤں

اور مسلمانوں دونوں کے لئے بنگال کی سرحدوں سے باہر کے لوگوں سے باندھے گئے پیمانِ وفا کی گرہیں کھولنا ناممکن ثابت ہوا۔ اس کے نتیجے میں بنگالیوں نے نہ صرف اپنے حق خود ارادیت کا سودا کر لیا بلکہ جسمانی طور پر بھی انہیں تقسیم ہونا پڑا۔

کلکتہ گم گشتہ

بنگال کی پارٹیشن کونسل کا قیام 1946ء[لے] میں عمل میں آیا۔ اس کے ارکان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی یکساں تعداد شامل تھی اور گورنر سر فریڈرک بروز کو اس کا سربراہ ٹھہرایا گیا۔ سہروردی اس کونسل میں مسلم لیگ وزارت کی نمائندگی کر رہے تھے۔ انہوں نے کونسل کے سامنے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ کلکتہ کے مسلمان تحریکِ آزادی کے ہراول دستے میں شامل تھے اور انہوں نے پاکستان کے حصول کی راہ میں بے پناہ قربانیاں دی ہیں[167] اس شہر کی تعمیر و ترقّی بنیادی طور پر مشرقی بنگال میں کاشت ہونے والے پٹ سن کی آمدنی کی مرہونِ منت ہے۔ چنانچہ انہوں نے لیبر پارٹی سے تعلق رکھنے والے انگریز گورنر کو قائل کر لیا کہ مشرقی بنگال صوبے کی دو تہائی آبادی اور رقبے پر مشتمل علاقہ ہے اور کلکتہ پر اس کا حق مغربی بنگال کی نسبت فائق ہے۔ مغربی بنگال اس صوبے کا محض ایک چھوٹا سا علاقہ ہے جو صوبے سے علیحدگی کا خواہش مند ہے چنانچہ دنیا بھر میں کہیں بھی مرکزی خطّے سے علیحدہ ہونے والے حصّے کو خطّے کا سیاسی، تاریخی اور معاشی مرکز نہیں سونپا جاتا۔ مزید براں ابھی ریڈ کلف کمیشن کو کلکتہ کی قسمت کا فیصلہ کرنا ہے چنانچہ مرکزی فریق مشرقی بنگال کو باؤنڈری کمیشن کے فیصلے تک صوبے کے دارالحکومت سے بے دخل نہیں کیا جا سکتا۔ باؤنڈری کمیشن کی طرف سے اثاثوں کی تقسیم اور نئے دارالحکومت کے لئے اخراجات کی ادائیگی تک کلکتے کو مغربی بنگال کے حوالے نہ کیا جائے گورنر بروز کو وزیرِاعظم بنگال کے مربوط استدلال میں وزن نظر آیا اور اس نے وعدہ کیا کہ اگر کونسل میں ارکان کی آراء برابر ہوئیں تو وہ اپنی رائے اس تجویز کے حق میں دے گا۔[168] تعجب انگیز طور پر ایک مسلمان رکن نے اپنا ووٹ ہندو اراکین میں شامل کر کے کلکتہ کی قسمت پر مہر لگا دی۔[169]

بنگال صوبائی مسلم لیگ کے ڈھاکہ گروپ کا ایک حصّہ کلکتہ کو مغربی بنگال میں شامل کرنے کا متمنی تھا تاکہ سہروردی کے سیاسی قلعے میں شگاف ڈالا جا سکے۔ کلکتہ سہروردی گروپ کی سیاسی سرگرمیوں کا گڑھ تھا۔[170] ستم ظریفی تو یہ ہے کہ یہ حضرات سمجھتے تھے کہ مستقبل میں کلکتہ اپنی سیاسی، معاشی اور ثقافتی اہمیت کھو بیٹھے گا۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ مشرقی بنگال کی علیحدگی کے بعد چٹا گانگ بندرگاہ کی ترقّی کلکتہ کے لئے صدائے جرس ثابت ہوگی۔[171] یہ مسلمان زعماء کلکتہ کو اپنے حال پر چھوڑ کر ڈھاکہ منتقل ہو گئے۔

اس موقع پر جون میں سلہٹ کے استصوابِ رائے کے فوراً بعد سلہٹ ضلع سے تعلق رکھنے والے

مصنف سے سہواً ہوا ہے۔ پارٹیشن کونسل جون 1947ء کے آخری ہفتے میں قائم ہوئی تھی۔ (مترجم)

مسلم لیگ پارلیمانی پارٹی کے سترہ ارکان نے سہروردی سے رابطہ کر کے انہیں پیشکش کی کہ اگر وہ ان ارکان کو تین وزارتوں اور تین پارلیمانی سیکرٹریوں کے عہدوں کی یقین دہانی کرادیں تو وہ پارلیمانی قائد کے انتخاب میں سہروردی کی حمایت کے لئے تیار ہیں۔[172] سہروردی نے انتخاب سے قبل اس مشروط پیشکش کو مسترد کر دیا۔ سہروردی سے مایوس ہو کر یہ حضرات اس عہدے کے دوسرے امیدوار خواجہ ناظم الدین کے پاس پہنچے۔ خواجہ ناظم الدین نے فوراً یہ پیشکش منظور کر لی اور آل انڈیا مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری لیاقت علی خاں کی حمایت سے منصوبہ تیار کیا کہ مشرقی بنگال مسلم لیگ کے پارلیمانی قائد کے لئے نئے سرے سے انتخاب کروایا جائے۔ در حقیقت جناح نے سہروردی کو یقین دلایا تھا کہ نئے پارلیمانی قائد کے انتخاب کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ چنانچہ سہروردی ان وکلاء کے لئے کاغذات اور متعلقہ دستاویزات تیار کرنے میں مشغول رہے جنہیں مسلم لیگ کی طرف سے باؤنڈری کمیشن کے سامنے پیش ہونا تھا۔[173] ادھر لیاقت علی خاں نے جو سہروردی کو شدید ناپسند کرتے تھے، پنجاب کے علاوہ بنگال میں بھی پارلیمانی قائد کے لئے نئے انتخاب کا اعلان کر دیا۔ بعدازاں لیاقت علی خاں نے کھلم کھلا خواجہ ناظم الدین کی حمایت شروع کر دی۔ کسی کو سہروردی کی شکست کے بارے میں شک نہ رہا خواجہ ناظم الدین کو مسلم لیگ کا نیا پارلیمانی قائد اور نامزد وزیر اعلیٰ منتخب کر لیا گیا۔ ڈھاکہ کو مشرقی بنگال کا نیا صدر مقام قرار دیا گیا۔ کلکتہ کے مغربی بنگال میں شامل ہونے پر معاوضے کا مطالبہ بے چوں وچرا کئے ترک کر دیا گیا۔[174]

سہروردی 13ر اگست 1947ء تک بنگال کے وزیر اعظم رہے اس روز انہوں نے دو نئے پارلیمانی قائدین کو اقتدار منتقل کر دیا۔ بنگال کی سرزمین دولخت ہو چکی تھی اور پی سی گھوش کو مغربی بنگال کا قائد منتخب کیا گیا تھا۔

گاندھی کی ہم رکابی

14ر اگست 1947ء کو تقسیم ہند کے بعد انگریز سپاہیوں پر مشتمل برطانوی فوج کلکتہ سے واپس بلا لی گئی۔ یہ فوج امن وامان کی صورتحال کو قابو میں رکھنے کے لئے کلکتہ شہر میں تعینات کی گئی تھی۔ انگریز فوجیوں کی جگہ سکھ سپاہیوں نے لے لی۔ پنجابی مسلمان سپاہیوں نے جنہیں سہروردی نے کلکتہ پولیس کا نظم ونسق بگڑنے پر بھرتی کیا تھا، مشرقی بنگال کا انتخاب کیا اور کلکتہ چھوڑ کر ڈھاکہ روانہ ہو گئے۔ کلکتہ کے ہندوؤں نے اس صورتحال کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اگست 1947ء میں مسلمان بستیوں پر منظم حملے شروع کر دیئے۔ خوفزدہ عوام کا ایک سیلاب ہندوستان اور پاکستان سے نقل مکانی کر رہا تھا۔ کلکتہ کے مسلمانوں کو ایک اور آزمائش کا سامنا تھا۔ انہوں نے سہروردی سے درخواست کی کہ وہ کلکتہ چھوڑ کر نہ جائیں۔ سہروردی ان لوگوں کی درخواست رد نہ کر سکے جنہوں نے چوتھائی صدی تک ہر مشکل مرحلے میں بڑی استقامت کے ساتھ سہروردی کا ساتھ دیا تھا۔ آج جب یہ عوام ایک پر آشوب موڑ پر آ پہنچے تھے تو ان

کا ساتھ چھوڑنا سہروردی کے ضمیر نے گوارا نہ کیا۔[175]

اوائل اگست میں گاندھی نواکھلی جاتے ہوئے کلکتہ سے گزرے۔ گاندھی کا ارادہ تھا کہ یومِ آزادی نواکھلی کے عوام کے درمیان گزارا جائے نیز وہاں فسادات کے نتیجے میں ہندوؤں کے جان و مال کے اتلاف کا براہِ راست مشاہدہ کیا جائے۔ ہندوؤں نے ان فسادات کے اعداد و شمار کو بہت بڑھا چڑھا کر بیان کیا تھا۔ کلکتہ کے میئر اور ضلعی مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری ایم اے عثمانی نے گاندھی سے ملاقات کر کے ان سے درخواست کی کہ نواکھلی جانے سے قبل وہ کلکتہ میں قیامِ امن کے لئے کوشش کریں[176] وہ گاندھی کو ساتھ لیکر کچھ فساد زدہ علاقوں میں گئے۔ نہتّے اور بے بس مسلمانوں کے بے دریغ قتلِ عام اور مالی غارت گری کے ہولناک مناظر دیکھ کر گاندھی دہشت زدہ ہو گئے۔ انہوں نے ایم اے عثمانی کی اس تجویز سے اتفاق کیا کہ انہیں سہروردی کو ساتھ لیکر برصغیر بھر میں امن مشن پر نکلنا چاہئے۔[177] شہید سہروردی ابھی ابھی کراچی میں آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلسِ عاملہ کے اجلاس میں شرکت کر کے کلکتہ لوٹے تھے۔ عثمانی نے انہیں گاندھی سے اپنی گفت و شنید کے بارے میں مطلع کیا۔ اس پر سہروردی نے سودھ پور آشرم میں جاکر گاندھی سے ملاقات کی اور برصغیر میں قیامِ امن کی ضرورت پر زور دیا تاکہ پاکستان اور ہندوستان کے درمیان جنگ کے خطرے کو ٹالا جا سکے اور فرقہ وارانہ فسادات کی لہر کو ختم کیا جا سکے۔ سہروردی نے گاندھی کو امن کی جدوجہد میں اپنے مکمل تعاون کا بھی یقین دلایا۔ دونوں رہنماؤں نے مرتے دم تک امن کے قیام کے لئے جدوجہد کرنے کا عزم کیا۔ سہروردی، گاندھی امن مشن (المعروف گاندھی امن مشن) کا بنیادی نکتہ یہ تھا کہ دونوں ممالک میں اکثریتی فرقے کو قیامِ امن کا ذمہ دار ٹھہرایا جائے۔ پاکستان اور ہندوستان میں اکثریتی فرقے، اقلیتی فرقوں کی طرف دوستی اور تعاون کا ہاتھ بڑھائیں تاکہ تلخیوں کو مٹا کر ایک قوم کی طرح اپنے اپنے ملک کی خدمت ممکن ہو سکے۔[178]

گاندھی امن مشن کے دوران سہروردی نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر سادھوؤں کی طرح کام کیا۔ اس اثناء میں انہوں نے ہندوستانی مسلمانوں کے تحفّظ اور بہتر مستقبل کی خاطر جناح کی پانچ پیشکشوں کو یکے بعد دیگرے مسترد کیا۔[179] کوئی دوسرا مسلم لیگی رہنما بے کس ہندوستانی مسلمانوں کی دادرسی کے لئے آگے بڑھنے کی جرأت نہ کر سکا۔ یوں پاکستان جاکر اعلیٰ عہدے کی نرم آغوش میں آسودہ ہونے کی بجائے سہروردی نے گاندھی کے ساتھ کلکتہ، مغربی بنگال، مشرقی پنجاب، الور، بھارت پور، دہلی اور اتر پردیش میں عظیم اجتماعات سے خطاب کیا ہر جگہ انہوں نے مسلمانوں کو تلقین کی کہ وہ تقسیمِ ہند کو تاریخ کا فیصلہ سمجھ کر قبول کریں اور ہندوستان کے وفادار شہری بن کر رہیں۔[180] دونوں رہنماؤں کی انتھک اور جرأت مندانہ مساعی نے ہندوستان میں رائے عامہ کا رخ امن اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی طرف موڑ دیا۔ اس جدوجہد کے باعث پاکستان میں ہندوستانی مسلمانوں کی بے امان آمد پر بند باندھ دیا گیا اور پاکستان ممکنہ معاشی تباہی کے خطرے سے بچ گیا۔ مشرقی بنگال کی سالمیت کو درپیش خطرہ ٹل گیا اور لاکھوں ہندوستانی مسلمانوں کی جانیں بچالی گئیں۔[181]

تاہم ہندو فرقہ وارانہ تنظیموں مثلاً راشٹریہ سیوک سنگھ وغیرہ کو گاندھی امن مشن جیسی سرگرمیاں سخت ناپسند تھیں۔ ایک مرحلے پر انتہاپسند ہندوؤں نے کلکتے کا امن وسکون تہہ وبالا کر دیا اور مسلمانوں کا قتل عام شروع ہو گیا۔ اس وقت گاندھی اور سہروردی بیلیا گھاٹ کے ایک خستہ حال مکان میں قیام پذیر تھے۔ بیس ہزار غضبناک افراد کا ہجوم سہروردی کو قتل کرنے کی نیت سے اس مکان تک پہنچ گیا۔ سہروردی تن تنہا اس ہجوم کے سامنے آئے اور بولے "اگر آپ کو میرے خون کی ضرورت ہے تو میری جان حاضر ہے لیکن مجھے مارنے سے پہلے آپ کو ایک وعدہ کرنا ہو گا اور وہ یہ کہ میرے بعد آپ ہندوستان میں مزید کسی مسلمان کی جان نہیں لیں گے"[182] شوروغل سن کر گاندھی بھی مکان سے باہر نکل آئے اور ہجوم سے درخواست کی کہ سہروردی کو قتل کرنے سے پہلے انہیں ختم کیا جائے۔[183] ان الفاظ نے جادو کا سا اثر کیا اور مجمع چھٹنے لگا۔ مہاتما گاندھی نے بعدازاں اس حملے کی شدید الفاظ میں مذمت کی اور دھمکی دی کہ اگر مسلمانوں کا قتلِ عام بند نہ ہوا تو وہ مرن برت رکھ لیں گے۔

ان دو عظیم رہنماؤں کی قربانیوں کے طفیل ہندوستانی مسلمانوں کو تباہ وبرباد کرنے اور ابتدا ہی میں پاکستان کا گلا گھونٹنے کا ناپاک منصوبہ برباد ہوتے دیکھ کر انتہاپسند ہندوؤں نے منصوبہ بنایا کہ دونوں رہنماؤں کا کام تمام کر دیا جائے۔[184] اپنی زندگیوں کو درپیش واضح خطرے کے باوجود گاندھی اور سہروردی نے بلاجھجک امن کے لئے اپنی کوششیں جاری رکھیں۔ یہ کہنا غلط نہیں ہو گا کہ خود گاندھی کے استثنا کے علاوہ ہم عصر سیاست دانوں میں اس قربانی اور شجاعت کی مثال نہیں ملتی جس کا مظاہرہ سہروردی نے آزادی ملنے کے فوراً بعد چند مہینوں کے دوران کیا۔ بہت سے مورّخین کا خیال ہے کہ یہ ایام سہروردی کی سیاسی زندگی کے عہدِ زرّیں کا درجہ رکھتے تھے۔ انہوں نے تدبّر اور انسان دوستی کی معراج کو چھو لیا تھا۔

بنگال میں امن قائم کرنے کے بعد یہ دورکنی فوج پنجاب میں بھی پوری باؤنڈری فورس کے مقابلے میں زیادہ گراں قدر ثابت ہوئی۔ اکتوبر میں گاندھی دہلی منتقل ہو گئے جہاں انہوں نے اپنی زندگی کے باقی ماندہ چند ہفتے فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے فروغ میں صرف کئے۔[185] ہندوستان کے مغربی خطّے میں اور بھی زیادہ ہولناک پیمانے پر آگ اور خون کی ہولی کھیلی گئی تھی۔ پورے کے پورے گاؤں نیست ونابود کر دیئے گئے اور مسلمان مہاجرین سے کھچا کھچ بھری ہوئی ریل گاڑیوں کو مذبح خانوں میں بدل دیا گیا تھا۔[186] لاکھوں کی تعداد میں دہشت زدہ انسان سرحد کے دونوں طرف نقل مکانی کر رہے تھے۔ ہندوستان میں آنے والے شرنارتھیوں کا ریلا دہلی تک پہنچ گیا تھا۔ ان شرنارتھیوں کے ساتھ ساتھ کشیدگی اور مسلم دشمنی کے جذبات بھی سفر کر رہے تھے۔ ان لوگوں نے پرانی دہلی میں بہت سی مساجد پر قبضہ کر لیا جس سے بچے کھچے مسلمانوں میں سراسیمگی اور اضطراب کی لہر دوڑ گئی۔ جنوری 1948ء کے اوائل میں انتہاپسند ہندوؤں نے سردار پٹیل کی انگیخت پر پاکستان کو ان پچاس کروڑ روپے کے اثاثوں کی منتقلی پر شوروغوغا شروع کر دیا جو منصوبۂ تقسیم کی رو سے پاکستان کے حصّے میں آتے تھے۔ ان لوگوں کا کہنا تھا کہ یہ رقم کشمیر میں ہندوستانی

فوج کے خلاف استعمال ہو گی۔ سہروردی بھی گاندھی کے ساتھ دہلی پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے گاندھی سے ملاقات کر کے اس معاملے میں مداخلت کی درخواست کی۔ گاندھی نے اپنے استدلال اور پر استقامت مرن برت کے ذریعے نہ صرف یہ کہ پاکستان کو مطلوبہ مالیت کے اثاثے دلوائے بلکہ مسلمانوں کے مقدس مقامات سے ہندو اور سکھ شرنارتھیوں کو بے دخل کروایا اور مسلمانوں کے جان و مال کے تحفظ کی ضمانت حاصل کی۔[187]

ان واقعات نے راشٹریہ سیوک سنگھ کے لئے جلتی پر تیل کا کام کیا اور اس جماعت کے کارکن سہروردی اور گاندھی کی جان کے درپے ہو گئے۔ ان دنوں سہروردی گاندھی کے ساتھ دہلی میں برلا بھون میں مقیم تھے۔ راشٹریہ سیوک سنگھ کے گرگوں نے سہروردی کی جان لینے کی کوشش کی۔ سہروردی گہرے مراقبے میں بھی ایک آنکھ کھلی رکھتے تھے چنانچہ انہیں ایک کایاں شخص کی طرح خبردار پا کر سازشیوں نے اپنا ارادہ ترک کیا اور کان دبا کر چل دیئے۔ 20 جنوری کو برلا پارک میں گاندھی کی پرارتھنا پر بم پھینکا گیا۔ آخر کار وہ لوگ 30 جنوری 1948ء کو اس وقت گاندھی کو قتل کرنے میں کامیاب ہو گئے جب وہ پرارتھنا میں شرکت کے لئے جا رہے تھے۔ گاندھی کے قتل کے بعد راشٹریہ سیوک سنگھ پر پابندی عائد کر دی گئی لیکن گاندھی کی موت سے امن مشن میں ایسا شگاف پڑ گیا جسے پُر کرنا ناممکن تھا۔ سہروردی کے لئے تن تنہا اس کام کو جاری رکھنا بہت بڑا جوکھم تھا لیکن انہوں نے گاندھی امن مشن جاری رکھا اور کلکتہ میں کئی مقامات پر گاندھی امن کمیٹیاں قائم کیں۔

مشرقی بنگال میں سہروردی کے داخلے پر پابندی

ادھر مشرقی بنگال میں مسلم لیگی وزیر اعظم خواجہ ناظم الدین نے سہروردی کو امنِ عامہ کے لئے خطرہ قرار دیکر مشرقی بنگال میں ان کے داخلے پر پابندی عائد کر دی۔ انہیں گرفتار کر کے ڈھاکہ سے باہر نکال دیا گیا۔[188] خواجہ ناظم الدین نے سہروردی پر یہ الزام بھی عائد کیا کہ وہ بنگال کے دونوں حصّوں کو متحد کرنے کی سازش کر رہے تھے۔[189] سہروردی نے 5 جون 1948ء کو کلکتہ میں ایک پریس کانفرنس کے ذریعے ان الزامات کو بے بنیاد اور غلط قرار دیتے ہوئے اعلان کیا کہ وہ اپنے امن مشن کو جاری رکھیں گے۔[190] انہوں نے وزیر اعلیٰ ناظم الدین کے اس دعوے کو چیلنج کہا کہ مشرقی بنگال میں کسی امن مشن کی ضرورت نہیں تھی۔ سہروردی نے واشگاف الفاظ میں اعلان کیا کہ جب تک مشرقی بنگال سے ہندوؤں کا انخلاء جاری ہے اور شرنارتھیوں کے واپس اپنے گھروں کو لوٹنے کا خواب پورا نہیں ہوتا امن مشن کی ضرورت برقرار ہے۔ ماضی کے اختلافات کے نتیجے میں دونوں فرقے اس امر پر مجبور تھے کہ جدا جدا جھنڈوں تلے آزادی کے لئے جدوجہد کریں۔ مذہب کی بنیاد پر دو مملکتوں کے معرضِ وجود میں آ جانے کے باوجود یہ کشیدگی برقرار رہی۔ حقیقت تو یہ تھی کہ مشرقی بنگال میں قیامِ امن کی کہیں زیادہ ضرورت ہے کیونکہ وہاں ہندوؤں کی ایک

بہت بڑی تعداد آباد ہے اگر یہ لوگ ہندوستان میں داخل ہو گئے تو ہندوستانی حکومت بھارت میں تمام مسلمانوں کو پاکستان چلے جانے کا حکم دینے پر مجبور ہو جائے گی۔ پاکستان کی حکومت مہاجرین کی اتنی بڑی تعداد کے انجذاب اور آباد کاری پر قادر نہ ہونے کے باعث انتظامی اور معاشی طور پر بالکل تباہ ہو جائے گی۔

سہروردی نے خواجہ ناظم الدین کو یاد دلایا کہ پاکستان برِصغیر کے دس کروڑ مسلمانوں کے تحفّظ کے لئے بنایا گیا تھا اس کا مقصد محض چھ کروڑ پاکستانیوں کے لئے ایک حکومت کا قیام نہیں تھا۔ برطانوی راج کے دوران مسلمان دعویٰ کرتے تھے کہ اقلیتوں کا مسئلہ صرف پاکستان کے قیام سے حل ہو سکتا ہے لہٰذا اب پاکستان کو آگے بڑھ کر اپنی سرزمین پر اقلیتوں کا تحفّظ کرنا چاہئے۔ سہروردی کا کہنا تھا کہ اقلیتوں کے تحفّظ اور امن کے قیام کی بنیادی ذمّہ داری اکثریتی فرقے پر عائد ہوتی ہے لہٰذا پاکستان میں مسلمانوں اور ہندوستان میں ہندوؤں کو اپنے اپنے ملک میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو فروغ دینا چاہئے۔ ہندوستان میں بہت سے ممتاز ہندو رہنما پہلے ہی امن قائم کرنے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ اگر پاکستانی رہنماؤں نے بھی اپنے ملک میں فرقہ وارانہ بھائی چارے کے لئے کوشش کی ہوتی' سہروردی نے اضافہ کیا' تو مجھے مشرقی بنگال میں امن کے لئے خصوصی اجتماعات اور ہندو اقلیت کی دلجوئی کی ضرورت پیش نہ آتی۔

سہروردی نے پاکستانی حکومت سے درخواست کی کہ وہ فاشسٹ روّیہ ترک کر دے اور انکے امن مشن میں رکاوٹ نہ ڈالے کیونکہ مسلم اکثریت پر مشتمل مشرقی بنگال میں جو کچھ ہو گا اس کا ردِعمل سرحد کے پار مغربی بنگال بلکہ ہندو اکثریت پر مشتمل پورے ہندوستان میں ہو گا جہاں مسلمان اقلیت کا تحفظ خطرے میں پڑ جائے گا۔ مشرقی بنگال میں سہروردی کے داخلے پر پابندی سے تو منطقی طور پر یہی نتیجہ نکالا جائے گا کہ پاکستانی حکومت مختلف فرقوں کے درمیان امن اور بھائی چارے کے حق میں نہیں ہے۔

نومبر 1947ء میں سہروردی نے کلکتہ میں آل انڈیا مسلم لیگ کا کنونشن بلایا ہندوستان میں رہ جانے والے مسلم لیگی رہنماؤں نے کنونشن میں شرکت کی۔[191] سہروردی نے شرکاء کو شرمندگی دلائی کہ جب وہ مشرقی پنجاب میں فسادات کی آگ کو ٹھنڈا کرنے اور مصیبت زدہ افراد کی امداد کا کام کر رہے تھے تو کسی مسلم لیگی رہنما نے ان کا ساتھ دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اسی برس سہروردی نے کراچی میں آل انڈیا مسلم لیگ کی کونسل کے آخری اجلاس میں بھی شرکت کی جس کی صدارت جناح کر رہے تھے۔ اس اجلاس میں سہروردی نے تجویز پیش کی کہ ایک اور مسلم لیگ قائم کرنے کی بجائے ایک قومی جماعت تشکیل دی جائے لیکن کسی نے ان کے مشورے کو خاطر خواہ اہمیت نہیں کی۔[192]

مجاہد جمہوریت

1949ء کے اوائل میں شہید سہروردی کے والد' سر زاہد سہروردی کا طویل علالت کے بعد کلکتہ میں انتقال ہو گیا اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ہندوستانی حکومت نے ان پر بے تحاشا انکم ٹیکس عائد کر دیا اور

عدم ادائیگی کو جواز بنا کر ان کی ساری جائیداد ضبط کر لی۔ سہروردی پائی پائی کو محتاج ہو گئے مشرقی بنگال میں ان کے داخلے پر پابندی عائد تھی چنانچہ وہ 5 مارچ 1949ء کو کراچی چلے آئے جہاں عدم شہریت کو بنیاد بنا کر دستور ساز اسمبلی میں ان کی نشست خالی قرار دیدی گئی اور اس حکم کو موثر بہ ماضی کے صیغے میں رکھا گیا۔[193] اسمبلی کے ایک ہندو رکن بابو راجکمار چکرورتی مستقل طور پر کلکتہ میں قیام پذیر تھے لیکن انہیں دستور ساز اسمبلی کی رکنیت سے محروم نہیں کیا گیا۔[194] درحقیقت سہروردی کے علاوہ کسی دوسرے رکن کی رکنیت پر اعتراض نہیں کیا گیا۔ سہروردی کو جو اس اسمبلی کے خالقوں میں سے ایک تھے اس فیصلے سے خاصی کوفت ہوئی۔

جمہوریت کا قتل عام

سہروردی کے پاکستان آنے تک جناح کی وفات ہو چکی تھی۔ جناح قائدِ اعظم اور بابائے قوم تھے انکے انتقال کے باعث پاکستان دوسرے درجے کے مدبّرین اور حریص سیاست دانوں کے قبضے میں آ گیا۔ وزیرِ اعظم لیاقت علی خاں کی قیادت میں فاشزم کے رجحانات سر اٹھانے لگے۔

لیکن کیا جمہوریت کے اس قتلِ عام کے لئے صرف لیاقت علی خان کو مطعون کرنا روا ہے؟ جناح جمہوریت کے بہت بڑے علمبردار تھے لیکن خود انہوں نے جمہوری اصولوں کی ایسی کونسی پاسداری کی تھی؟ قیامِ پاکستان کے بعد جناح نے' جو آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے پاکستان کے بانی تھے' خود پاکستان کا گورنر جنرل بننا پسند کیا اور مسلم لیگ کے سیکرٹری جنرل لیاقت علی خاں کو پاکستان کا وزیرِ اعظم نامزد کیا۔ اس حقیقت کے باوجود کہ پاکستان کی 56 فیصد آبادی مشرقی پاکستان میں رہتی ہے کسی بنگالی کو ان دو اہم ترین عہدوں میں سے کسی ایک کا اہل نہیں سمجھا گیا۔ بنگال میں مسلم لیگ کی فتح کے معمار کی حیثیت سے (مسلم لیگ کی بنگال میں کامیابی نے ہی قیامِ پاکستان کو ممکن بنایا) سہروردی بجا طور پر وزیرِ اعظم کے عہدے کے حقدار تھے لیکن مسلم لیگ کی مرکزی مجلسِ عاملہ نے جس کے ارکان کی اکثریت اردو بولنے والے مغربی صوبوں سے تعلق رکھتی تھی جوڑ توڑ کر کے بنگال صوبائی مسلم لیگ کی تنظیم ہی تڑوا دی (حالانکہ پنجاب کی تقسیم کے باوجود پنجاب مسلم لیگ کی صوبائی تنظیم بدستور برقرار رہی) ڈھاکہ میں ایک کمزور حکومت قائم کی گئی اور سہروردی کو اقتدار سے باہر رکھا گیا۔[195] معاملات کی یہ صورت آزادی سے پہلے کئی سالوں سے چلی آ رہی تھی۔ ہر سال جناح کو آل انڈیا مسلم لیگ کا صدر اور لیاقت علی خان کو جنرل سیکرٹری منتخب کیا جاتا رہا۔ قومی دار الخلافہ کسی ملک کی اقتصادی ترّقی کی بنیاد ہوتا ہے۔ یہ اعزاز کراچی کے حصے میں آیا۔ بنگالی ملک کی اکثریتی آبادی کی زبان تھی لیکن اردو کو واحد سرکاری زبان کے طور پر مسلّط کیا گیا۔

پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کے بعد جناح ایک برس سے کچھ ہی زیادہ عرصہ زندہ رہے لیکن

ان کی زندگی میں لیاقت علی خاں نام کے وزیراعظم تھے۔[196] پاکستان نے وفاقی پارلیمانی طرزِ حکومت کا انتخاب کیا تھا۔ اس طرزِ حکومت میں گورنر جنرل مملکت کا آئینی سربراہ ہوتا ہے لیکن اختیارات کا سرچشمہ کابینہ اور خود مختار پارلیمان کو سمجھا جاتا ہے لیکن بابائے قوم جناح نے گورنر جنرل کی حیثیت سے کابینہ اور دستور ساز پارلیمان کا چراغ جلنے نہیں دیا۔ مملکت کا آئینی سربراہ مطلق اقتدار کا سرچشمہ قرار پایا۔[197] یہ کہنا مشکل ہے کہ اس صورتحال کے پیدا ہونے میں کس حد تک جناح کا ارادہ شامل تھا لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ مستقبل میں اس کے تباہ کن نتائج برآمد ہوئے جب جناح کی مضبوط اور قد آور شخصیت سے بے بہرہ لیکن اقتدار کی ہوس میں شرابور افراد اس عہدہ جلیلہ پر فائز ہوئے۔ انتقالِ اقتدار کے قانون میں جناح کو یہ اختیار بھی دیا گیا تھا کہ وہ وزراء کو برطرف کر سکتے ہیں۔ قانون کی یہ شق لیاقت علی خاں کو خاص طور پر ناگوار گزرتی تھی لیکن وہ دم مارنے کی مجال نہیں رکھتے تھے۔[198] جب جناح نے لیاقت علی خاں یا پارلیمینٹ سے مشورہ کئے بغیر وزراء مقرر کر دیئے اور انہیں براہِ راست گورنر جنرل کو جواب دہ ٹھہرایا تو لیاقت علی خاں نے نجی طور پر خاصا واویلا کیا۔

اس سارے عرصے میں لیاقت علی خاں غم و غصے کی آگ کو سینے میں دبائے رہے۔ اس کا پہلا اظہار اس وقت ہوا جب جناح اپنی زندگی کے آخری چند مہینوں میں شدید بیمار پڑ گئے اور انہیں علاج کی غرض سے زیارت لے جایا گیا۔ زیارت میں قیام کے دوران وزیر اعظم لیاقت علی خاں صرف ایک بار عیادت کی غرض سے وہاں گئے اور وہ بھی محض چند منٹ کے لئے۔[199] بعد ازاں جب جان بلب رہنما کو واپس کراچی لایا گیا تو وزیر اعظم یا ان کی کابینہ کے کسی رکن نے قائد اعظم کی رہائش گاہ پر عیادت کی غرض سے تشریف لے جانے کی زحمت گوارا نہ کی۔[200] المختصر یہ کہ نئی قوم کے معمار نے گورنر جنرل کی حیثیت سے من مانے اختیارات حاصل کر کے جمہوریت پر پہلی ضرب لگائی۔ ملک میں سیاسی نظام کو پہلا دھچکا لگا اور آئندہ کے لئے سول اور فوجی انقلابات کی راہ ہموار ہو گئی۔[201]

نوکر شاہی کا جنم

جناح نے پاکستان میں نوکر شاہی کے تسلط کی بھی بنیاد رکھی۔ انہیں علم تھا کہ ان کے معتمد انتظامی معاملات میں نا تجربہ کار تھے۔ چنانچہ انہوں نے نئی مملکت کا بندوبست چلانے کے لئے اعلیٰ حکام پر اعتماد کرنا شروع کر دیا۔ برطانوی راج کے تربیت یافتہ سو کے لگ بھگ اعلیٰ افسران نے پاکستان جانے کو ترجیح دی اور وہ تقریباً سبھی غیر بنگالی تھے۔ ان حضرات نے ملک میں کسی منظم سیاسی جماعت کی عدم موجودگی اور سیاست دانوں کی نا تجربہ کاری اور نا اہلی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ملک پر کاٹھی رکھ لی۔ پاکستان کے پہلے سیکرٹری جنرل چودھری محمد علی اور مشرقی بنگال کے پہلے چیف سیکرٹری عزیز احمد ملک کے اصل آقا بن گئے۔[102] نوکر شاہی میں پنجابی گروپ کے گرو غلام محمد، سر ظفر اللہ خاں اور نواب مشتاق حسین گورمانی کو کابینہ میں

وزارتوں سے نوازا گیا۔ بعدازاں غلام محمد[203]، چودھری محمد علی اور سیکرٹری دفاع سکندر مرزا کو اعلیٰ ترین مناصب دیئے گئے یہی وہ لوگ تھے جو سیاسی جوتم پیزار اور اقتدار کی کشمکش کے اصل کھلاڑی قرار پائے۔ بایں ہمہ جناح نے کسی بنگالی اعلیٰ افسر کو سیاست دان بنا کر وزارت کا قلمدان نہیں سونپا۔

نوکر شاہی اس قدر طاقتور ہو گئی کہ یہی لوگ سرکاری پالیسی کا تعین کرتے اور انہیں لوگوں کو اسے نافذ کرنے کی ذمہ داری سونپی جاتی۔ ان لوگوں نے مرکز میں انتظامی ڈھانچے پر مکمل قبضہ کر رکھا تھا۔ مشرقی بنگال میں تمام محکمے کے سیکرٹری بھی انہی حضرات میں سے چنے گئے اور بنگالی عوام کی امنگوں اور آرزوؤں کا خون ہوتا رہا۔ اقتدار پر اپنی گرفت کو مزید مضبوط کرنے کے لئے نوکر شاہی نے مسلم لیگی رہنماؤں اور فوج سے پینگیں بڑھانا شروع کر دیں۔ فوج میں پہلے ہی پنجابی افسران کی اکثریت تھی۔ اگرچہ ملک کا صدر مقام کراچی تھا لیکن اقتدار کے ان دو سرچشموں یعنی نوکر شاہی اور فوج پر غلبے کے باعث پنجابی پاکستان کی قسمت کے مالک بن گئے۔ ان لوگوں کو بخوبی علم تھا کہ مسلم لیگی قیادت عوام کی نمائندہ نہیں تھی اور یہ کہ مسلم لیگ دستور بنانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی تھی کیونکہ دستور پر عمل درآمد کی صورت میں مسلم لیگ کی قیادت کو سیاسی میدان سے اپنا بوریا بستر گول کرنا پڑتا تھا لہٰذا مسلم لیگی قیادت اپنے اقتدار کی خاطر نوکر شاہی کے نخرے برداشت کرنے پر مجبور تھی۔ مسلم لیگی رہنماؤں میں ایسے مہاجر سیاست دان بھی موجود تھے جو مشرقی بنگال کے حصے کی نشستوں پر منتخب ہو کر پارلیمان میں براجمان تھے۔ ان سیاست دانوں نے مغربی پاکستان میں دارالخلافے کے پاس رہائش اختیار کرنا قرینِ مصلحت جانا اور مشرقی بنگال کے ان سیاست دانوں سے اقتدار کی بولی لگواتے رہے، جو خود بھی عوام میں جڑوں سے محروم تھے۔ فوج اور نوکر شاہی میں نمائندگی کی عدم موجودگی اور معدودے چند سیاست دانوں کے علاوہ جو بنگال کے حق میں آواز بلند کرنے پر تیار تھے، بنگالی عوام پاکستان کی مرکزی سیاست میں اپنی آواز کھو بیٹھے۔ مشرقی بنگال کے عوام دن رات اپنے سیاسی استحصال اور معاشی لوٹ کھسوٹ کا تماشا دیکھتے تھے لیکن بے بس تھے۔ بدیہی وجوہات کی بنا پر مفاد یافتہ مقتدر طبقوں کے لئے معاشی اور دفاعی لحاظ سے یہ ضروری ہو گیا کہ جغرافیائی طور پر ہزاروں میل کے فاصلے پر واقع صوبوں کو سیاسی طور پر متحد رکھا جائے۔[204] جناح اور لیاقت علی خاں مہاجر تھے اور انہیں نئی مملکت کی سیاسی، سماجی اور معاشی پیچیدگیوں کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ چنانچہ وہ آسانی سے نوکر شاہی کی ریشہ دوانیوں کے چنگل میں پھنس گئے۔ پاکستان کی کل آبادی میں مغربی پاکستان کے چھوٹے صوبوں یعنی سندھ، بلوچستان اور شمال مغربی سرحدی صوبے کا حصہ محض سات فیصد تھا جبکہ بنگال اور پنجاب کو آبادی میں بالترتیب 56 فیصد اور 37 فیصد نمائندگی حاصل تھی۔ چھوٹے صوبوں کی اپنی مشکلات تھیں لیکن وہ احتجاج کے لئے کسی مناسب پلیٹ فارم سے محروم تھے۔ تاہم مشرقی بنگال کے عوام زیادہ تعلیم یافتہ اور سیاسی طور پر کہیں زیادہ باشعور تھے۔ انہوں نے اس دھاندلی اور سازش کے خلاف پرزور احتجاج کیا اور مطالبہ کیا کہ فوری طور پر دستور کی تشکیل سازی کر کے ملک میں عام انتخابات کروائے جائیں نیز دستور میں

1940ء کی قراردادِ لاہور کے مطابق مکمل صوبائی خود مختاری کی ضمانت دی جائے لیکن اس کے جواب میں بنگالیوں کو مطعون کیا گیا۔ دستور سازی کے مطالبے پر انہیں علیحدگی پسند ٹھہرایا گیا اور الزام لگایا گیا کہ مشرقی پاکستان میں آباد ہندو اقلیت بنگالیوں کو گمراہ کر رہی ہے۔ پنجابی نوکر شاہی کو اندیشہ تھا کہ آئین کی تکمیل کے نتیجے میں مشرقی بنگال کے عوام سیاسی اقتدار حاصل کرلیں گے اور مشرقی پاکستان کا نو آبادیاتی طرز منظم استحصال جاری نہیں رہ سکے گا۔ مشرقی بنگال کے بارے میں نوکر شاہی کا یہ قابل نفرین رویّہ پاکستان کے ٹوٹنے تک جاری رہا۔ اس روش میں صرف ایک بار تیرہ ماہ کے لئے اس وقت خلل پڑا جب سہروردی وزیر اعظم بنے لیکن نوکر شاہی کے اختیارات کو لگام دینے کی کوشش میں سہروردی اپنا اقتدار کھو بیٹھے۔

فاشزم کا ظہور

جناح نے 11 ستمبر 1948ء کو وفات پائی اور خواجہ ناظم الدین جو اس وقت تک بنگال کے وزیر اعلیٰ تھے اگلے گورنر جنرل بنے۔ اس اعلیٰ منصب کے حصول کے لئے خواجہ ناظم الدین نے مشرقی پاکستان کی نصف درجن سے زیادہ نشستیں مغربی پاکستان کی جھولی میں ڈال دیں اور دستور ساز اسمبلی میں مشرقی پاکستان کی اکثریت کو اقلیت میں بدل ڈالا[205]۔ خواجہ ناظم الدین نے یہ قدم مشرقی بنگال کے عوام کو اعتماد میں لئے بغیر اٹھایا اور مغربی پاکستان کے منظورِ نظر بن گئے۔ نوابزادہ لیاقت علی نے گویا قائد اعظم کے عہد کا حساب چکانے کے لئے نئے گورنر جنرل کو نمائشی گڈے سے بھی زیادہ بے ضرر اور بے اختیار بنا ڈالا۔ مزید بر آں "تقسیم کرو اور حکومت کرو" کے اصول کو اپناتے ہوئے صوبوں میں کمزور حکومتیں قائم کیں تاکہ انکے اپنے اقتدار کی طرف کوئی آنکھ اٹھا کر نہ دیکھ سکے۔ اس پر طرّہ یہ کہ دستور ساز اسمبلی، جسے مملکت خداداد پاکستان کے دستور کی تشکیل کا فریضہ سونپا گیا تھا، چار سال کے عرصے میں یہ ذِمّہ داری پوری کرنے میں مکمل طور پر ناکام ہو گئی درحقیقت دستور ساز اسمبلی اَسّی افراد کے ایک ٹولے میں تبدیل ہو گئی جو اپنے میں چند ایک کو وزیر اعظم، گورنر جنرل، وزیر اور سفیر چن لیتے تھے اور اقتدار کی نیم گرم آغوش کے مزے لوٹتے تھے۔

یوپی سے تعلق رکھنے والے لیاقت علی خاں کو پاکستان کے کسی حصّے میں اپنی سیاسی بنیاد میّسر نہیں تھی چنانچہ انہیں مزمن طور پر یہ فکر دامن گیر رہتی تھی کہ اقتدار انکے ہاتھوں سے نکل جائے گا۔ اقتدار پر اپنی گرفت مضبوط کرتے کرتے انہیں خبطِ عظمت ہو گیا اور معمولی سی تنقید بھی ان کی طبعِ نازک پر گراں گزرنے لگی۔ انہوں نے پنجاب میں ممدوٹ وزارت اور سندھ میں ایوب کھوڑو وزارت کو برطرف کر دیا اور انہیں عوامی نمائندگی کے لئے نا اہلی کے قانون 1949ء (پروڈا) کی مدد سے ہراساں کرنے لگے[206]۔

حمید الحق چودھری اسی ٹولے سے تعلق رکھتے تھے لیکن لیاقت علی خاں سے معمولی اختلاف کی پاداش میں انہیں یک بنی و دو گوش نکال باہر کیا گیا۔ حمید الحق پر پروڈا کے تحت مقدمہ چلایا گیا۔ انکا اخبار

"پاکستان آبزرور" ڈھاکہ کا ممتاز انگریزی روزنامہ تھا اُس پر بھی پابندی لگادی گئی۔ لیاقت علی خاں اپنی مخالفت کے بارے میں اتنے حسّاس ہو گئے کہ پاکستان کے تیسرے یومِ آزادی (14 اگست 1950ء) کے موقع پر انھوں نے سہروردی کو بھارتی گماشتہ قرار دیا اور مزید یہ کہ "سہروردی وہ کتّا ہے جسے بھارت نے کھلا چھوڑ رکھا ہے"۔ مولانا عبدالحمید خاں بھاشانی اور شیخ مجیب الرحمٰن جیل میں ڈال دیئے گئے۔[207] لیاقت علی نے ایک بزرگ سیاست دان چودھری خلیق الزماں کو پاکستان مسلم لیگ کا صدر مقرر کیا لیکن ان سے اختلافات رونما ہونے پر مسلم لیگی رضا کاروں کو انکے گھر پر پتھراؤ کرنے کے لئے بھیجا گیا۔ چودھری خلیق نے اپنے اور اپنے اہلِ خانہ کے تحفّظ کی خاطر مسلم لیگ کی صدارت سے استعفیٰ دے دیا اور یہ بار بھی لیاقت علی خاں نے اپنے کندھوں پر اٹھالیا۔ جلد ہی آل انڈیا مسلم لیگ کی جانشین پاکستان مسلم لیگ ایک بند کارپوریشن کی شکل اختیار کر گئی۔[208] دراصل لیاقت علی خاں بڑی مستقل مزاجی سے پاکستان میں یک جماعتی نظام کے قیام کی طرف قدم بڑھا رہے تھے۔[209]

عوامی لیگ کی تشکیل

ملک کے حالات بڑی شدّت سے حزبِ اختلاف کی سیاسی جماعت کی تشکیل کا تقاضا کر رہے تھے تاکہ پاکستان میں آمریت کے بڑھتے ہوئے رجحان کے خلاف آئینی جدوجہد کی جاسکے۔ سہروردی جمہوریت میں یقین رکھتے تھے اور ملک میں جمہوری نظام کے قیام کے خواہش مند تھے۔[210] یک جماعتی نظام میں ہر قسم کی حزبِ مخالف پر پابندی کے باعث مختلف النوع خیالات دب کر رہ جاتے ہیں اور حریّت فکر کا پودا مرجھا جاتا ہے۔ سہروردی مشرقی پاکستان کے عوام کے سیاسی شعور سے بخوبی واقف تھے اور چاہتے تھے کہ انہیں ملکی معاملات میں بھرپور شرکت کا موقع ملے۔

مغربی پاکستان میں میاں افتخار الدین اور نواب ممدوٹ کی جناح مسلم لیگ اور پیر مانکی شریف کی عوامی مسلم لیگ، برسرِاقتدار پاکستان مسلم لیگ کی مخالفت کا فریضہ ادا کر رہی تھیں۔ ابتدا میں سہروردی نے ان جماعتوں میں شمولیت پر غور کیا لیکن پھر 23، 24 جون 1949ء کو ڈھاکہ میں پرانے مسلم لیگی کارکنوں کا اجلاس بلایا اور مشرقی پاکستان عوامی مسلم لیگ کی بنیاد رکھی۔ مولانا عبدالحمید خاں بھاشانی اس جماعت کے سربراہ منتخب ہوئے۔[211] اس کنونشن کی صدارت مولانا راغب احسن نے کی۔ 1950ء میں سہروردی نے عوامی مسلم لیگ کا دائرہ پاکستان کے دونوں حصّوں تک پھیلا دیا وہ خود اس کے صدر بنے اور ایم ایچ عثمانی کو جنرل سیکرٹری مقرّر کیا۔ مسلم لیگ کے آمرانہ ہتھکنڈوں کا مقابلہ کرنے کے لئے اس جماعت کے دروازے تمام پاکستانیوں پر کھلے رکھے گئے۔ بعدازاں سہروردی نے اپنی جماعت 'نواب ممدوٹ کی جماعت میں مدغم کر دی اور نئی جماعت کا نام جناح عوامی مسلم لیگ قرار پایا۔ لیکن ممدوٹ کی ذاتی خواہشات آڑے آئیں اور یہ تعلق 1953ء میں ٹوٹ گیا۔ سہروردی نے دوبارہ عوامی مسلم لیگ

کے نام سے کام کرنا شروع کر دیا۔ جنوری 1953ء میں مجلسِ عاملہ کے ایک اجلاس میں فیصلہ کیا گیا کہ جماعت کے نام سے لفظ "مسلم" حذف کر دیا جائے۔ سہروردی کا خیال تھا کہ پاکستان کے عوام دیگر مذہبی فرقوں کے ساتھ ایک مشترکہ شہریت کے تصوّر سے آشنا ہو رہے ہیں اور پاکستان کی مضبوطی اور ترّقی کے لئے ضروری ہے کہ تمام شہری مذہبی وابستگیوں سے بالاتر ہو کر آپس میں تعاون کریں۔[212]

نوتشکیل کردہ جماعت کے لئے عوامی رابطہ کی مہم چلاتے ہوئے سہروردی نے زوردار الفاظ میں مسلم لیگ کے اس دعویٰ کو باطل ٹھہرایا کہ پاکستان مسلم لیگ پاکستان کی خالق ہے۔ انہوں نے سوال کیا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ بیٹا باپ کی تخلیق سے پہلے ہی پیدا ہو جائے۔ انہوں نے آل انڈیا مسلم لیگ اور نیشنل گارڈز کے خاتمے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اعلان کیا کہ پاکستان مسلم لیگ پاکستان بننے کے بعد وجود میں آئی تھی۔[213] سہروردی نے اپنے رفقاء کو ہمراہ لیا اور مشرقی بنگال کے کونے کونے کا دورہ کر کے عوامی مسلم لیگ کو صوبے کی سب سے مقبول اور منظم ترین جماعت میں بدل دیا۔ یہ جماعت بھرپور طریقے سے 1954ء کے صوبائی انتخابات میں حصہ لینے کے لئے تیّار ہو چکی تھی۔ مشرقی بنگال کے وزیرِ اعلیٰ نورالامین نے مرکز کے اشارے پر سہروردی کے کارکنوں پر جھوٹے مقدمات قائم کئے اور انہیں مہینوں بلکہ سالوں کے لئے جیل میں ڈال دیا۔ ان اقدامات سے یہ نوزائیدہ جماعت ان رجعت پسند قوتوں کے خلاف تحریک کا ہراول دستہ اور بلند ترین احتجاجی آواز بن گئی جن کا مرکز مغربی پاکستان میں تھا۔[214] چنانچہ پاکستان مسلم لیگ اور عوامی لیگ کی آویزش عملی طور پر ملک کے دونوں حصوں میں کشمکش کا روپ اختیار کر گئی۔[215] طلبہ کی بے چینی بڑھ رہی تھی اور ڈھاکہ یونیورسٹی ان کی سرگرمیوں کا گڑھ بن گئی تھی۔ مشرقی پاکستان مسلم لیگ کی حکومت کے خلاف جدوجہد میں طلبہ اور عوامی لیگ نے شانہ بشانہ حصہ لیا۔

مشرقی پاکستان میں صوبائی مجلسِ قانون ساز کو بہت پہلے تحلیل ہونا تھا کیونکہ مغربی پاکستان کے صوبائی انتخابات 1951ء میں مکمل ہو گئے تھے لیکن دستور ساز اسمبلی ہر سال مشرقی پاکستان مجلسِ قانون ساز کی میعاد میں توسیع کرتی رہی گوناگوں وجوہات کی بنا پر مختلف نشستیں خالی ہوتی رہتی تھیں لیکن صرف ایک ضمنی انتخاب کے بعد جس میں مسلم لیگی امیدوار کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا مزید ضمنی انتخابات سے احتراز کیا گیا۔[216] 1954ء میں جب مشرقی پاکستان مسلم لیگ نے بالآخر صوبائی مجلسِ قانون ساز کے لئے نئے انتخابات کا اعلان کیا اس وقت مجلسِ قانون ساز میں 35 کے قریب نشستیں خالی تھیں۔[217]

مشرقی پاکستان مسلم لیگ کو مغربی پاکستان کی پٹھو جماعت قرار دیا جا رہا تھا اور مشرقی پاکستان کے عوام میں مسلم لیگ کی جڑیں کٹ چکی تھیں۔ درحقیقت قیامِ پاکستان کے وقت ہی دونوں حصوں کے عوام میں تضادات اور اختلافات واضح ہو چکے تھے۔ مشرقی پاکستان کے زیادہ تعلیم یافتہ اور سیاسی لحاظ سے باشعور عوام مرکز کے سوتیلی ماؤں جیسے سلوک سے نالاں تھے اور انہیں مرکز کی طرف سے غیر منصفانہ آئین مسلّط کرنے کی کوشش سخت ناگوار تھی ۔ ملک کے دونوں حصّوں میں معاشی عدم مساوات کی جڑیں پاکستان کی غیر فطری تشکیل میں مضمر تھیں۔ آبادی کی اکثریت مشرقی حصے میں آباد تھی لیکن ملک کی اقتصادی بنیادیں اور

سرمائے کا ارتکاز مغربی حصے میں تھا۔ اس صورتحال نے بنگالی دانشوروں پر واضح کر دیا کہ 1946ء کی قرارداد بنیادی طور پر ناقابلِ عمل اور غیر منصفانہ تھی۔ مشرقی پاکستان سے 1500 میل کے فاصلے پر واقع مرکز بنگالی عوام کی آرزوؤں اور امنگوں کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ اس پر مزید ستم یہ کہ دونوں حصوں کے درمیان بھارت کی سرزمین واقع تھی جو بدیہی طور پر دونوں خطوں کے عوام کے بارے میں معاندانہ جذبات رکھتی تھی۔ ادھر مرکزی حکومت بنگالیوں کی وفاداری کو مشکوک گردانتی تھی۔ مغربی پاکستان، خاص طور پر پنجاب کے عوام مشرقی بنگال کے مسلمانوں کو شودر اور نیم ہندو سمجھتے تھے جنہوں نے اسلام قبول کر رکھا ہے اور انہیں حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔

لسانی تحریک

اسی اثناء میں لسانی تنازعہ اٹھ کھڑا ہوا اگرچہ بنگالی پاکستانیوں کی اکثریت کی زبان تھی اس حیثیت سے قومی زبان قرار دیئے جانے کا استحقاق رکھتی تھی لیکن جناح، لیاقت علی خاں اور دیگر حکّام نے قطعاً غیر جمہوری انداز میں نام نہاد قومی یکجہتی کے نام پر اردو کو پاکستان کی واحد سرکاری زبان قرار دیدیا۔ اردو ہندوستان سے آنے والے مہاجروں کی زبان تھی اور اسے پاکستان کی صرف چھ فیصد آبادی روزمرّہ بول چال کے لئے استعمال کرتی تھی۔[218]

سب سے پہلے لسانی تحریک کی آواز حکومت کے ایوان میں ابھری۔ فروری 1948ء میں کانگرس کے رکن دھریندر ناتھ دتہ نے تحریک پیش کی کہ اردو کے ساتھ ساتھ بنگالی کو بھی پاکستان کی سرکاری زبان قرار دیا جائے۔[219] بعد میں مولانا عبدالرشید ترکباغش نے قومی اسمبلی کے قواعد کی خلاف ورزی کرتے ہوئے بنگالی میں تقریر کی۔ مولانا عبدالرشید ترکباغش کا تعلق بھی مشرقی بنگال سے تھا۔[220] تاہم وزیراعظم لیاقت علی خاں نے یہ کہتے ہوئے بنگالی کو اردو کے برابر درجہ دینے سے انکار کر دیا کہ یہ مطالبہ پاکستان کے عوام میں تفرقہ ڈالنے کی کوشش ہے۔[221] اس رویئے سے بنگالی طلبہ اور دانشوروں میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی اور انہوں نے کھلم کھلا احتجاجی تحریک شروع کر دی کہ بنگالی کو مشرقی پاکستان کی سرکاری زبان اور پاکستان کی سرکاری زبان میں سے ایک قرار دیا جائے۔ جلد ہی تحریک زور پکڑ گئی اور 2 مارچ 1948ء کو ایک مجلسِ عمل تشکیل دی گئی جس نے مطالبہ کیا کہ بنگالی کو پاکستان کی سرکاری زبانوں میں سے ایک قرار دیا جائے۔[222] 11 مارچ کو صوبے بھر میں ہڑتال کی گئی اور بڑے بڑے جلوس نکالے گئے۔ خواجہ ناظم الدین نے خوفزدہ ہو کر 15 مارچ کو ایک معاہدے پر دستخط کر دیئے جس میں طلبہ کے آٹھ نکاتی مطالبات تسلیم کرنے کا اعلان تھا۔ معاہدے کی رو سے بنگالی کو مشرقی پاکستان کی سرکاری زبان اور پاکستان کی سرکاری زبانوں میں سے ایک تسلیم کر لیا گیا۔[223] ایسٹ بنگال اسمبلی کا اجلاس جاری تھا جس نے فوری طور پر بنگالی کو مشرقی پاکستان کی سرکاری زبان اور ذریعۂ تعلیم کے طور پر تسلیم کرنے کی قرارداد منظور کر لی۔

تاہم 19 مارچ کو جناح ڈھاکہ پہنچے اور انہوں نے طلبہ کے ساتھ معاہدے کی شرائط تسلیم کرنے سے انکار کر دیا' ان کا کہنا تھا کہ معاہدے پر زبردستی دستخط کروائے گئے تھے۔ مجلس عمل کے ارکان کے ساتھ ایک ملاقات میں جناح نے ملک کے دونوں حصوں کے درمیان اتحاد کی مضبوطی کے لئے دونوں حصوں کی ایک ہی سرکاری زبان کی اہمیت پر زور دیا۔ انہیں بتایا گیا کہ پاکستان کے کسی صوبے کے عوام کی زبان اردو نہیں ہے لہٰذا اگر دونوں حصوں کے درمیان بھائی چارے کا فروغ مقصود ہے تو عوام کی اکثریت کی زبان بنگالی یا پھر انگریزی کو سرکاری زبان قرار دے دیا جائے۔ جناح نے اس استدلال کو رد کر دیا اور طلبہ کے وفد کو صاف صاف بتا دیا کہ ہندوستان نے ہندی کو سرکاری زبان قرار دیا ہے لہٰذا پاکستان کی سرکاری زبان اردو ہوگی اور 21 مارچ کو ڈھاکہ کے جلسہ عام میں غیر حقیقت پسندانہ طور پر اسی پالیسی پر زور دیا۔ ڈھاکہ یونیورسٹی کے سالانہ کانووکیشن کے موقع پر بھی انہوں نے یہی فیصلہ دہرایا جس پر طلبہ نے احتجاجی نعروں سے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ جناح کو اپنی پوری سیاسی زندگی میں مسلمانوں کے کسی اجتماع میں ایسے مخالفانہ سلوک کا تجربہ نہیں ہوا تھا۔

26 جنوری 1952ء کو پاکستان کے وزیراعظم کی حیثیت سے مشرقی پاکستان کے پہلے دورے کے دوران آل پاکستان مسلم لیگ کنونشن سے خطاب کرتے ہوئے خواجہ ناظم الدین نے ایک بار پھر اعلان کیا "اردو اور صرف اردو پاکستان کی سرکاری زبان ہوگی"[228] اس بیان پر طلبہ بھڑک اٹھے اور انہوں نے اپنے مطالبے کی حمایت میں 21 فروری کو صوبے بھر میں ہڑتال کا اعلان کر دیا۔ وزیراعلیٰ نورالامین نے پولیس تشدّد کے ذریعے تحریک کو دبانا چاہا۔ پولیس نے ڈھاکہ میڈیکل کالج کے سامنے نہتّے طالب علموں پر گولی چلا دی۔ آٹھ طالب علم ہلاک ہو گئے اور کئی زخمی ہوئے۔[229] لسانی تنازعے کے بارے میں جو بے حسی روا رکھی گئی اس نے مشرقی پاکستان کے عوام کو مرکز سے بالکل مایوس کر دیا۔ قوم پرستی کی تحریک پروان چڑھنے لگی جو بالاخر بنگلادیش کے قیام پر منتج ہوئی۔

مسلم لیگ کے رہنماؤں میں جو لوگ مشرقی بنگال کی نمائندگی کرتے تھے ان کی جڑیں بنگال کی سرزمین میں نہیں تھیں اور وہ بنگال کی نمائندگی کے استحقاق سے محروم تھے۔ مزید یہ کہ مرکز انہی رہنماؤں کو قبول کرتا تھا جو مغربی پاکستان کی ہاں میں ہاں ملا سکیں۔ خواجہ ناظم الدین تقسیم ہند سے قبل بنگال کے وزیراعظم رہ چکے تھے لیکن وہ بنگالی لکھنے یا پڑھنے سے قاصر تھے۔ اگر کبھی انہیں کسی اجتماع سے خطاب کرنا پڑتا اور ایسے مواقع شاذ و نادر ہی آتے تھے تو وہ ہمیشہ بنگالی میں لکھی ہوئی تقریر پڑھتے تھے اور یہ تقریر ہمیشہ اردو رسم الخط میں لکھی ہوتی تھی۔ دراصل ناظم الدین کشمیری النسل بنگالی زمیندار تھے اور انہیں ہمیشہ مغربی پاکستان کا نمائندہ سمجھا جاتا تھا۔ مولانا عبدالحمید خاں بھاشانی اور شیر بنگال اے کے فضل الحق پیدائشی طور پر بنگالی تھے اور عوامی رہنما سمجھے جاتے تھے۔ وہ عوام کی زبان بولتے تھے اور جبلی طور پر عوام کی مشکلات اور تکالیف سے آگاہ ہو جاتے تھے۔ سہروردی کا معاملہ اور بھی پیچیدہ تھا اگرچہ انکے آباؤاجداد دو صدیوں سے مدناپور میں آباد تھے لیکن انکے خاندان کا کوئی فرد بنگالی لکھ' پڑھ یا بول نہیں سکتا تھا۔ 1937ء کے صوبائی انتخابات میں فضل الحق نے خواجہ ناظم الدین کو انکی اپنی زمینداری میں شکست دی تھی۔ سہروردی نے ناظم الدین کی

سرمائے کا ارتکاز مغربی حصے میں تھا۔ اس صورتحال نے بنگالی دانشوروں پر واضح کر دیا کہ 1946ء کی قرارداد بنیادی طور پر ناقابلِ عمل اور غیر منصفانہ تھی۔ مشرقی پاکستان سے 1500 میل کے فاصلے پر واقع مرکز بنگالی عوام کی آرزوؤں اور امنگوں کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ اس پر مزید ستم یہ کہ دونوں حصوں کے درمیان بھارت کی سرزمین واقع تھی جو بدیہی طور پر دونوں خطوں کے عوام کے بارے میں معاندانہ جذبات رکھتی تھی۔ ادھر مرکزی حکومت بنگالیوں کی وفاداری کو مشکوک گردانتی تھی۔ مغربی پاکستان 'خاص طور پر پنجاب کے عوام مشرقی بنگال کے مسلمانوں کو شودر اور نیم ہندو سمجھتے تھے جنہوں نے اسلام قبول کر رکھا ہے اور انہیں حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔

لسانی تحریک

اسی اثناء میں لسانی تنازعہ اٹھ کھڑا ہوا اگرچہ بنگالی پاکستانیوں کی اکثریت کی زبان تھی اس حیثیت سے قومی زبان قرار دیئے جانے کا استحقاق رکھتی تھی لیکن جناح' لیاقت علی خاں اور دیگر حکّام نے قطعاً غیر جمہوری انداز میں نام نہاد قومی یکجہتی کے نام پر اردو کو پاکستان کی واحد سرکاری زبان قرار دیدیا۔ اردو ہندوستان سے آنے والے مہاجروں کی زبان تھی اور اسے پاکستان کی صرف چھ فیصد آبادی روزمرّہ بول چال کے لئے استعمال کرتی تھی۔[218]

سب سے پہلے لسانی تحریک کی آواز

حکومت کے ایوان میں ابھری۔ فروری 1948ء میں کانگرس کے رکن دھریندر ناتھ دتہ نے تحریک پیش کی کہ اردو کے ساتھ ساتھ بنگالی کو بھی پاکستان کی سرکاری زبان قرار دیا جائے۔[219] بعد میں مولانا عبدالرشید ترکباغش نے قومی اسمبلی کے قواعد کی خلاف ورزی کرتے ہوئے بنگالی میں تقریر کی۔ مولانا عبدالرشید ترکباغش کا تعلق بھی مشرقی بنگال سے تھا۔[220] تاہم وزیراعظم لیاقت علی خاں نے یہ کہتے ہوئے بنگالی کو اردو کے برابر درجہ دینے سے انکار کر دیا کہ یہ مطالبہ پاکستان کے عوام میں تفرقہ ڈالنے کی کوشش ہے۔[221] اس رویئے سے بنگالی طلبہ اور دانشوروں میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی اور انہوں نے کھلم کھلا احتجاجی تحریک شروع کر دی کہ بنگالی کو مشرقی پاکستان کی سرکاری زبان اور پاکستان کی سرکاری زبان میں سے ایک قرار دیا جائے۔ جلد ہی تحریک زور پکڑ گئی اور 2 مارچ 1948ء کو ایک مجلسِ عمل تشکیل دی گئی جس نے مطالبہ کیا کہ بنگالی کو پاکستان کی سرکاری زبانوں میں سے ایک قرار دیا جائے۔[222] 11 مارچ کو صوبے بھر میں ہڑتال کی گئی اور بڑے بڑے جلوس نکالے گئے۔ خواجہ ناظم الدین نے خوفزدہ ہو کر 15 مارچ کو ایک معاہدے پر دستخط کر دیئے جس میں طلبہ کے آٹھ نکاتی مطالبات تسلیم کرنے کا اعلان تھا۔ معاہدے کی رو سے بنگالی کو[223] مشرقی پاکستان کی سرکاری زبان اور پاکستان کی سرکاری زبانوں میں سے ایک تسلیم کر لیا گیا۔ ایسٹ بنگال اسمبلی کا اجلاس جاری تھا جس نے فوری طور پر بنگالی کو مشرقی پاکستان کی سرکاری زبان اور ذریعۂ تعلیم کے طور پر تسلیم کرنے کی قرارداد منظور کر لی۔

تاہم 19 مارچ کو جناح ڈھاکہ پہنچے اور انہوں نے طلبہ کے ساتھ معاہدے کی شرائط تسلیم کرنے سے انکار کر دیا' ان کا کہنا تھا کہ معاہدے پر زبردستی دستخط کروائے گئے تھے۔ مجلس عمل کے ارکان کے ساتھ ایک ملاقات میں جناح نے ملک کے دونوں حصوں کے درمیان اتحاد کی مضبوطی کے لئے دونوں حصوں کی ایک ہی سرکاری زبان کی اہمیت پر زور دیا۔ انہیں بتایا گیا کہ پاکستان کے کسی صوبے کے عوام کی زبان اردو نہیں ہے لہٰذا اگر دونوں حصوں کے درمیان بھائی چارے کا فروغ مقصود ہے تو عوام کی اکثریت کی زبان بنگالی یا پھر انگریزی کو سرکاری زبان قرار دے دیا جائے۔ جناح نے اس استدلال کو رد کر دیا اور طلبہ کے وفد کو صاف صاف بتا دیا کہ ہندوستان نے ہندی کو سرکاری زبان قرار دیا ہے لہٰذا پاکستان کی سرکاری زبان اردو ہوگی اور 21 مارچ کو ڈھاکہ کے جلسہ عام میں غیر حقیقت پسندانہ طور پر اسی پالیسی پر زور دیا۔ ڈھاکہ یونیورسٹی کے سالانہ کانووکیشن کے موقع پر بھی انہوں نے یہی فیصلہ دہرایا جس پر طلبہ نے احتجاجی نعروں سے آسمان سر پر اٹھالیا۔ جناح کو اپنی پوری سیاسی زندگی میں مسلمانوں کے کسی اجتماع میں ایسے مخالفانہ سلوک کا تجربہ نہیں ہوا تھا۔

26 جنوری 1952ء کو پاکستان کے وزیر اعظم کی حیثیت سے مشرقی پاکستان کے پہلے دورے کے دوران آل پاکستان مسلم لیگ کنونشن سے خطاب کرتے ہوئے خواجہ ناظم الدین نے ایک بار پھر اعلان کیا "اردو اور صرف اردو پاکستان کی سرکاری زبان ہوگی"[228] اس بیان پر طلبہ بھڑک اٹھے اور انہوں نے اپنے مطالبے کی حمایت میں 21 فروری کو صوبے بھر میں ہڑتال کا اعلان کر دیا۔ وزیر اعلیٰ نور الامین نے پولیس تشدّد کے ذریعے تحریک کو دبانا چاہا۔ پولیس نے ڈھاکہ میڈیکل کالج کے سامنے نہتّے طالب علموں پر گولی چلادی۔ آٹھ طالب علم ہلاک ہو گئے اور کئی زخمی ہوئے۔[229] لسانی تنازعے کے بارے میں جو بے حسی روا رکھی گئی اس نے مشرقی پاکستان کے عوام کو مرکز سے بالکل مایوس کر دیا۔ قوم پرستی کی تحریک پروان چڑھنے لگی جو بالآخر بنگلادیش کے قیام پر منتج ہوئی۔

مسلم لیگ کے رہنماؤں میں جو لوگ مشرقی بنگال کی نمائندگی کرتے تھے ان کی جڑیں بنگال کی سرزمین میں نہیں تھیں اور وہ بنگال کی نمائندگی کے استحقاق سے محروم تھے۔ مزید یہ کہ مرکز انہی رہنماؤں کو قبول کرتا تھا جو مغربی پاکستان کی ہاں میں ہاں ملا سکیں۔ خواجہ ناظم الدین تقسیم ہند سے قبل بنگال کے وزیر اعظم رہ چکے تھے لیکن وہ بنگالی لکھنے یا پڑھنے سے قاصر تھے۔ اگر کبھی انہیں کسی اجتماع سے خطاب کرنا پڑتا اور ایسے مواقع شاذ و نادر ہی آتے تھے تو وہ ہمیشہ بنگالی میں لکھی ہوئی تقریر پڑھتے تھے اور یہ تقریر ہمیشہ اردو رسم الخط میں لکھی ہوتی تھی۔ دراصل ناظم الدین کشمیری النسل بنگالی زمیندار تھے اور انہیں ہمیشہ مغربی پاکستان کا نمائندہ سمجھا جاتا تھا۔ مولانا عبدالحمید خاں بھاشانی اور شیر بنگال اے کے فضل الحق پیدائشی طور پر بنگالی تھے اور عوامی رہنما سمجھے جاتے تھے۔ وہ عوام کی زبان بولتے تھے اور جبلی طور پر عوام کی مشکلات اور تکالیف سے آگاہ ہو جاتے تھے۔ سہروردی کا معاملہ اور بھی پیچیدہ تھا اگرچہ انکے آباؤ اجداد دو صدیوں سے مدنا پور میں آباد تھے لیکن انکے خاندان کا کوئی فرد بنگالی لکھ' پڑھ یا بول نہیں سکتا تھا۔ 1937ء کے صوبائی انتخابات میں فضل الحق نے خواجہ ناظم الدین کو انکی اپنی زمینداری میں شکست دی تھی۔ سہروردی نے ناظم الدین کی

شکست سے یہ سبق حاصل کیا کہ جب تک وہ بنگالی نہیں سیکھیں گے۔ بنگالی نہیں بولیں گے اور بنگال کی ثقافت سے محبت کرنا نہیں سیکھیں گے وہ بنگالی عوام کے دلوں میں گھر نہیں کر سکیں گے۔ سہروردی کا سیاسی فلسفہ بھی یہی تھا کہ "میرا بنگالی ہونا میرے مسلمان ہونے سے بڑی حقیقت ہے"[230] چنانچہ انہوں نے فوراً بنگالی زبان سیکھ لی اور اسے روانی سے بولنے لگے اگرچہ ان کا لہجہ بدستور اجنبی رہا انہوں نے عوام کے جذبات کا گہرا اور مخلصانہ احساس تھا۔ بنگالی سیاست سے ان کی دیرینہ وابستگی کی بنا پر وہ جہاں بھی جاتے بنگالی عوام انہیں خوش آمدید کہتے۔

جگتو فرنٹ

1954ء کے صوبائی انتخابات کی تاریخ نزدیک آنے پر تین عوامی رہنما میدان میں اتر آئے۔ اے کے فضل الحق، حسین شہید سہروردی اور مولانا بھاشانی' ڈیموکریٹک یوتھ لیگ اور مشرقی پاکستان کمیونسٹ پارٹی نے ستمبر 1952ء میں ہی تجویز پیش کی تھی کہ آئندہ صوبائی انتخابات میں برسراقتدار مسلم لیگ کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک متحدہ محاذ تشکیل دیا جائے۔[231] ترقی پسند طلبہ کی تنظیمیں بھی مسلم لیگ مخالف اتحاد کے حق میں مہم چلا رہی تھیں۔[232] آخر کار مئی 1953ء میں عوامی لیگ کی مجلسِ عاملہ نے قرارداد پیش کی کہ "مقتدر مشرقی پاکستان مسلم لیگ کا مقابلہ کرنے کے لئے ہم خیال سیاسی جماعتوں کے ساتھ مل کر ایک متحدہ محاذ (جگتو فرنٹ) تشکیل دیا جائے۔"[233] سہروردی نے ملک میں آمریت کے بڑھتے ہوئے رجحان کی روک تھام اور پاکستان کے سیاسی منظرنامے میں مشرقی پاکستان کے صحیح نمائندوں کے موثر داخلے کو یقینی بنانے کے لئے اس اقدام کی حمایت کی۔ رسمی طور پر جگتو فرنٹ کے قیام کا اعلان 13 نومبر 1953ء کو ڈھاکہ کے ایک عوامی اجتماع میں کیا گیا۔ محاذ میں شامل سب سے بڑی جماعت' عوامی لیگ حزب اختلاف کے ہراول دستے کا کردار ادا کرتی رہی۔[234] محاذ نے فیصلہ کیا کہ 21 فروری (یوم شہداء) کی یاد میں مارچ کا انتخاب 21 نکاتی پروگرام کی بنیاد پر لڑا جائے اس پروگرام میں دیگر نکات کے علاوہ بنگالی کو بطور سرکاری زبان اختیار کرنے' مشرقی بنگال کو خود مختاری دلانے' پٹ سن کی تجارت کو قومی تحویل میں لینے' مفت پرائمری تعلیم' جاگیرداری کے خاتمے اور اضافی زمینوں کی بے زمین کسانوں میں تقسیم کرنے کا وعدہ کیا گیا تھا۔[235]

محاذ کے منشور اور قائدین کی شخصیتوں کے باعث عوامی حمایت کا فقید المثال سیلاب امڈ آیا۔ تاہم محاذ کی مقبولیت کا اصل راز سہروردی کی تنظیمی صلاحیتوں میں مضمر تھا۔ محاذ کو فیصلہ کن کامیابی حاصل ہوئی 237 مسلم نشستوں میں سے محاذ نے 215 پر کامیابی حاصل کی مسلم لیگ کے حصے میں 9 نشستیں آئیں اور باقی پر آزاد امیدوار کامیاب ہوئے[236] ۔ انتخابات سے قبل جیسور میں جلسۂ عام سے خطاب کرتے ہوئے سہروردی نے دعویٰ کیا تھا کہ برسرِاقتدار جماعت کو صرف نو نشستیں مل سکیں گی۔ مسلم لیگ واقعتاً نو نشستوں پر کامیابی حاصل کر سکی۔ اس سے ایک طرف تو سہروردی کی انتخابی مہم کے موثر

ہونے کا اندازہ ہوتا ہے لیکن یہ بھی علم ہوتا ہے کہ وہ عوام کی خواہشات اور مشکلات کے کتنے صحیح نبض شناس[237] تھے بعد ازاں 8 آزاد امیدوار بھی محاذ میں شامل ہو گئے اور محاذ کے ارکان کی تعداد 223 ہو گئی۔ عوامی لیگ نے 140 حلقوں میں اپنے امیدوار کھڑے کئے تھے اور اسے ان تمام نشستوں پر کامیابی حاصل ہوئی۔ مشرقی پاکستان مسلم لیگ کے وزیر اعلیٰ نورالامین اور انکی کابینہ کے چار ارکان کو اپنے حلقوں میں عبرتناک ناکامی سے دوچار ہونا پڑا۔ مسلم لیگ کے 50 سے زیادہ امیدوار اپنی ضمانت ضبط کروا بیٹھے۔ مشرقی پاکستان میں خون ریزی کے بغیر انقلاب برپا ہو چکا تھا۔[238]

درج ذیل وجوہات کی بنا پر جگتو فرنٹ کی کامیابی ناگزیر ہو چکی تھی۔[239]

(1) متحدہ محاذ کی قیادت اے کے فضل الحق، حسین شہید سہروردی اور مولانا بھاشانی جیسی قد آور شخصیات کر رہی تھیں جبکہ مشرقی پاکستان مسلم لیگ کی قیادت نورالامین اور ان کے حواریوں جیسے درجہ دوم کے سیاست دانوں کے ہاتھ میں تھی یہ لوگ لسانی تحریک کے دوران اپنے کردار کے باعث عوام کے غم و غصے کا مرکز بن چکے تھے۔

(2) متحدہ محاذ نے عوام کے سامنے ایک واضح 21 نکاتی منشور رکھا اور صوبوں کے اقتصادی مسائل کی نشاندہی کی جبکہ مسلم لیگ کی قیادت منشور کے نام پر یہ واویلا کرتی رہی کہ اسلام اور پاکستان کو خطرہ لاحق ہے۔

(3) مشرقی پاکستان مسلم لیگ نے سینکڑوں طالب علموں اور مخالف سیاست دانوں کو جیل میں ٹھونس رکھا تھا نیز مسلم لیگ کا دامن سات سالہ اقتدار کی بد عنوانیوں اور کوتاہیوں سے داغدار ہو چکا تھا۔

جگتو فرنٹ کی وزارت

متحدہ محاذ کی شاندار کامیابی پر مرکز اور بھی زیادہ غیظ و غضب میں آ کر محاذ کی مخالفت پر تل گیا۔ مشرقی بنگال میں غیر مسلم لیگی قیادت کے ظہور نے مرکز میں مسلم لیگ کو سراسیمہ کر دیا اور اس نے انتخابی نتائج کو سبوتاژ کرنے کی غرض سے ریشہ دوانیاں شروع کر دیں۔[240] انتخابات سے صرف پندرہ روز بعد 23 مارچ کو چٹا گانگ میں امریکی امداد سے تعمیر کردہ چٹا گانگ پیپر ملز پر بنگالی، بہاری فسادات کروائے گئے۔[241] یہ فسادات پیش آمدہ طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہوئے ایک ماہ کے پس و پیش کے بعد فضل الحق کو کابینہ کی تشکیل کی دعوت دی گئی۔ تین اپریل کو انہوں نے تین رکنی کابینہ کا اعلان کیا اور فوراً کلکتہ روانہ ہو گئے۔ کلکتہ کے شہریوں کی طرف سے شاندار استقبال کے جذباتی ماحول میں انہوں نے جو کچھ کہا اس کا یہ مفہوم لیا گیا کہ وہ تقسیم ہند کے خلاف تھے اور قیامِ پاکستان کے خواہاں نہیں تھے نیز یہ کہ وہ پھر سے دونوں بنگالوں کو متحد کرنے پر آمادہ تھے۔[242] اس بیان سے بہت بڑا تنازعہ اٹھ کھڑا ہوا۔ مرکز کے مقتدر حلقوں اور مشرقی بنگال کی نو منتخب قیادت کے تعلقات اس سیاسی بحران کے باعث مزید کشیدہ ہو گئے۔[243] فضل الحق نے

فوراً اپنا بیان واپس لے لیا اور جواز یہ پیش کیا کہ وہ بڑھاپے اور بے حد جذباتی ماحول کے باعث بھک گئے تھے 15 مئی کو انہوں نے اپنی کابینہ میں توسیع کی اور عوامی لیگ سمیت محاذ میں شامل دیگر جماعتوں کو بھی کابینہ میں نمائندگی دی۔ متحدہ محاذ کے وزراء کی تقریب حلف برداری کے دوران ہی خبر پہنچ گئی کہ ڈھاکہ سے چند میل کے فاصلے پر واقع صنعتی قصبے نارائن گنج میں آدم جی جیوٹ ملز میں نسلی فسادات شروع ہو گئے تھے۔ یہ کارخانہ ایک غیر بنگالی کی ملکیت تھا اور اس کے مزدوروں کی اکثریت مولانا بھاشانی کی ٹریڈ یونین تنظیم کی رکن تھی۔ ان مزدوروں نے بھاری اکثریت سے متحدہ محاذ کے امیدوار کو انتخابات میں کامیاب کروایا تھا۔ بظاہر یہ فسادات سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کروائے گئے تھے۔

مرکز میں وزیر اعظم محمد علی بوگرہ نے الزام عائد کیا کہ متحدہ محاذ میں کیمونسٹوں کی دراندازی کے باعث فضل الحق امن وامان کی صورتحال بہتر بنانے سے قاصر ہیں۔[245] فضل الحق نے اس الزام کی سختی سے تردید کی لیکن "نیویارک ٹائمز" کے نمائندے جان پی کالہان نے 23 مئی کی اشاعت کے لئے خبر ارسال کی کہ وزیر اعلیٰ فضل الحق صوبے کی علیحدگی کے لئے کوشش کر رہے ہیں۔[246] فضل الحق اس وقت کراچی میں وزراء اعلیٰ کی کانفرنس میں شریک تھے انہوں نے فوراً اس اطلاع کی تردید کرتے ہوئے اسے افترا پردازی کی دانستہ کوشش قرار دیا[247] لیکن رائے دہندگان کے ہاتھوں مسترد کئے جانے پر مرکز چراغ پا ہو چکا تھا اسے وزیر اعلیٰ کے بیان کی بجائے اخبار نویس کی خبر زیادہ "مصدقہ" معلوم ہوئی اور مرکزی حکومت نے اس سنہری موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے متحدہ محاذ کی وزارت سے پیچھا چھڑانے کا فیصلہ کر لیا۔[248] فضل الحق کو غدار قرار دیکر برطرف کر دیا گیا۔ 29 مئی کو کابینہ توڑ دی گئی[249] اور آئین کی دفعہ 92۔ اے کی رو سے وزارتی طرزِ حکومت کی بجائے گورنر راج نافذ کر دیا گیا۔ گورنر خلیق الزمان کو تبدیل کر کے سخت گیر سیکرٹری دفاع کرنل (بعدازاں میجر جنرل) سکندر مرزا کو گورنر مقرر کیا گیا۔ سکندر مرزا نے آئین کی دفعہ 92۔ اے کے نفاذ کے ساتھ ہی متحدہ محاذ کے رہنماؤں اور احتجاج کرنے والے طلبہ کی گرفتاریاں شروع کر دیں۔ ایک وزیر شیخ مجیب الرحمٰن اور صوبائی مجلس قانون کے 35/ ارکان سمیت کم وبیش 3000/ افراد کو پابندِ سلاسل کر دیا گیا۔ وزیر اعلیٰ فضل الحق کو انکی قیام گاہ پر نظر بند کر دیا گیا۔

حالات نے بڑی صفائی سے مرکز کے حق میں پلٹا کھایا تھا اور کالہان کی اطلاع نے حکومت کو ایک موثر ہتھیار فراہم کیا تھا۔ مزید برآں 19 مئی کو پاکستان اور امریکہ کے درمیان دفاعی امداد کا جو معاہدہ طے پایا تھا اس پر عمل درآمد کی ایک شرط فضل الحق وزارت کی برطرفی تھی۔[250] سہروردی طبی معائنے کے لئے ملک سے باہر تھے انہوں نے مرکزی حکومت کے اس اقدام پر غم وغصے کا اظہار کیا اور مشرقی بنگال کے عوام سے درخواست کی کہ وہ اپنی صفوں میں اتحاد کو برقرار رکھیں۔[251]

آئینی بحران

مرکز میں 25/ اکتوبر 1954ء کو گورنر جنرل غلام محمد نے ایک غیر معمولی اقدام کے ذریعے

مقتدر پارلیمان کو برخاست کر دیا اور محمد علی بوگرہ کو نئی وزارت کی تشکیل کی دعوت دی۔ محمد علی بوگرہ خواجہ ناظم الدین کی برطرفی کے بعد یعنی اپریل 1953ء سے ملک کے تیسرے وزیرِ اعظم بن چکے تھے۔ خواجہ ناظم الدین نے 16 اکتوبر 1951ء کو لیاقت علی خاں کے قتل کے بعد ملک کے وسیع تر مفاد میں گورنر جنرل کا منصب چھوڑ کر وزیرِ اعظم بننا قبول کیا تھا لیکن انہیں اپریل 1953ء میں معزول کر دیا گیا۔

غلام محمد نوکر شاہی کا کارندہ تھا لیکن لیاقت کابینہ میں اسے وزارتِ خزانہ کا قلمدان سونپا گیا جب خواجہ ناظم الدین وزیر اعظم بننے کے لئے گورنر جنرل کے منصب سے سبکدوش ہوئے تو نوکر شاہی کے اس کارندے نے پاکستان کی آئینی سربراہی اپنے ذمّے لے لی۔ اسے پارلیمانی جمہوریت کا کوئی تجربہ نہیں تھا اور وہ وزیرِ اعظم کو کسی انتظامی ادارے کا سربراہ سمجھتا تھا۔ چنانچہ پارلیمانی روایات کو پامال کرتے ہوئے وہ اپنی مرضی سے وزیروں کو برطرف اور مقرّر کیا کرتا تھا۔ جب اس نے محمد علی بوگرہ کو پاکستان کا ویزر اعظم مقرر کیا اس وقت موخرالذکر دستور ساز اسمبلی کا رکن بھی نہیں تھا بلکہ امریکہ میں پاکستانی سفیر کے فرائض سرانجام دے رہا تھا۔

جب غلام محمد کو خطرہ محسوس ہوا کہ پارلیمینٹ نے کابینہ اور پارلیمینٹ برطرف کرنے کے بارے میں گورنر جنرل کے خصوصی اختیارات چھین لئے ہیں اور اب منطقی طور پر اگلا قدم یہ ہو گا کہ گورنر جنرل کی چھٹی کروادی جائے گی تو اس نے فوراً عوامی لیگ کے ایک ممتاز رہنما عطا الرحمٰن سے رابطہ کر کے دریافت کیا کہ اگر گورنر جنرل دستور ساز اسمبلی کی چھٹی کروادے تو جگتو فرنٹ کی طرف سے گورنر جنرل کی حمایت کے کیا امکانات ہیں۔ بعد ازاں اس نے فوج، نوکر شاہی اور بڑے بڑے صنعت کاروں کی حمایت سے دستور ساز اسمبلی برطرف کر دی اور پاکستان کو اپنی تاریخ کے سب سے گھمبیر سیاسی اور آئینی بحران سے دوچار کر دیا۔[252]

محمد علی بوگرہ اس وقت ملک سے باہر تھے۔ غلام محمد نے انہیں واپس آنے کا حکم دیا۔ جب وہ بغیر کسی تاخیر کے وطن واپس پہنچے تو انہوں نے خود کو عملی طور پر زیرِ حراست پایا۔ انہیں کابینہ اور اسمبلی کی برطرفی تسلیم کرنے پر مجبور کیا گیا۔ ان سے حلفیہ بیان لیا گیا کہ انہیں گورنر جنرل کے خلاف کسی خفیہ سازش کے بارے میں کوئی علم نہیں تھا۔ اس کے بعد انہیں حکم دیا گیا کہ وہ وزیرِ اعظم کے طور پر پہلے سے تیار شدہ تقریر ریڈیو پر نشر کریں۔[253] غلام محمد کی خواہش تھی کہ اپنے آمرانہ اقدام کا جواز ایک بنگالی سے پیش کروائے اور محمد علی بوگرہ یہ خدمت سرانجام دینے پر آمادہ ہو گئے۔ "بلا صلاحیت" افراد پر مشتمل ایک کابینہ تشکیل دی گئی جس میں فوج کے سربراہ جنرل ایوب خاں وزیرِ دفاع بنائے گئے اور سکندر مرزا کو مشرقی بنگال سے واپس بلا کر وزارتِ داخلہ کی ذمّہ داری سونپی گئی۔

وزیر قانون

سہروردی اس وقت علاج معالجے کی غرض سے زیورخ میں قیام پذیر تھے۔ صوبائی انتخابات کے دوران

دن رات کام کرنے کے باعث ان کی صحت مخدوش ہو چکی تھی۔ غلام محمد نے اپنا ایلچی زیورخ بھیجا اور ان سے درخواست کی کہ وہ وطن واپس آ کر سیاسی اور آئینی بحران کی شدت کو کم کرنے اور مرکزی کابینہ کو مضبوط بنانے میں گورنر جنرل کی مدد کریں۔[254] ایلچی نے غلام محمد کی طرف سے سہروردی کو یقین دلایا کہ بالآخر انہیں وزیراعظم مقرر کیا جائے گا تاہم فی الحال انہیں وزیر کی حیثیت سے کابینہ میں شامل ہونا ہوگا۔ بایں ہمہ وزیر کی حیثیت میں بھی وہ حقیقی وزیراعظم ہوں گے اور انہیں حکومت کے "گندے کپڑے دھونے کا اختیار" حاصل ہوگا۔[255] سہروردی کابینہ میں جنرل محمد ایوب خاں کی شمولیت کے باعث شش و پنج میں مبتلا تھے انہوں نے جواب دیا کہ وہ وطن واپس آکر اپنے لائحہ عمل کا فیصلہ کریں گے۔[256]

اس دوران میں سکندر مرزا اور محمد ایوب خاں نے گورنر جنرل کو سہروردی کے بارے میں اپنی ناپسندیدگی سے مطلع کر دیا۔[257] ان دونوں حضرات کو اندیشہ تھا کہ کابینہ میں شمولیت کے بعد سہروردی ان فوجی جنرلوں کی رہائی کا مسئلہ اٹھائیں گے جنہیں لیاقت علی خاں کے خلاف سازش کے الزام میں گرفتار کیا گیا تھا۔ سہروردی نے عدالت میں ان فوجی افسروں کا اس مہارت سے دفاع کیا تھا کہ وہ موت کی سزا سے بچ گئے تھے۔ خود کو اس ناپسندیدہ صورتحال میں پا کر غلام محمد نے محمد علی بوگرہ سے درخواست کی کہ وہ اسے نجات دلائیں۔[258] محمد علی بوگرہ غیر منقسم بنگال میں سہروردی کی کابینہ میں شامل رہے تھے چنانچہ وہ بھی اپنی کابینہ میں سہروردی کی شمولیت سے چنداں خوش نہیں تھے۔ محمد علی بوگرہ نے فضل الحق سے ملاقات کی اور وعدہ کیا کہ وہ انہیں اور ان کی کرشک سرامک پارٹی کو مشرقی بنگال میں اقتدار دلا دیں گے بشرطیکہ وہ بنگال میں سہروردی کے خلاف یہ پرچار شروع کریں کہ سہروردی کو مشرقی بنگال کی نمائندگی کا حق ہی نہیں ہے۔[259] اس طرح حکمران ٹولے کے مفادات کی خاطر بنگال کے دو رہنماؤں میں پھوٹ ڈلوا دی گئی۔[260]

سہروردی اپنے خلاف ہونے والی اس سازش سے بالکل بے خبر تھے جب وہ 5 دسمبر کو کراچی پہنچے تو انہیں مشرقی بنگال میں اپنے رفقاء سے مشورہ کرنے کا موقع نہیں دیا گیا۔ سہروردی گورنر جنرل غلام محمد کے بھرے میں آ گئے اس کی آنکھوں میں چمکتے آنسو انہیں دھوکہ دینے میں کامیاب ہو گئے اور سہروردی نے 21 دسمبر کو بوگرہ وزارت میں شمولیت اختیار کر لی۔ ان کے اس فیصلے سے انکے دوست اور دشمن یکساں طور پر حیرت زدہ رہ گئے۔ سہروردی نے یہ قدم پارلیمانی جمہوریت کی بحالی اور پاکستان کے افق پر منڈلاتے فوجی آمریت کے خطرے کے پیش نظر اٹھایا تھا۔[261] وزیر قانون کا قلمدان غیر معمولی اہمیت کا حامل تھا کیونکہ سپریم کورٹ کے پیچیدہ عدالتی فیصلوں کی گرہ کشائی کرنا سہروردی کے حصے میں آیا۔[262] تاہم جلد ہی سہروردی غلام محمد کی چال بھانپ گئے۔ سہروردی کی مشکلات میں اس وقت مزید اضافہ ہو گیا جب فضل الحق کے نامزد کردہ ابوالحسن سرکار کو وزیر صحت بنا کر کابینہ میں بٹھا دیا گیا۔ کسی نے ابوالحسن کی تقرری کے وقت سہروردی سے مشورہ تک نہیں کیا۔ ملک کے انتظامی اور آئینی ڈھانچے میں جن تبدیلیوں کی خاطر سہروردی نے کابینہ میں شمولیت اختیار کی تھی انہیں بدعہدیوں کی ایک طویل فہرست کے ذریعے ناممکن بنا دیا گیا۔

اصول مساوات

بایں ہمہ 1955ء میں مری کے مقام پر منعقد ہونے والی ایک اعلیٰ سطحی کانفرنس میں سہروردی نے مری پیکٹ پر شرکاء کی رضامندی حاصل کرنے میں بنیادی کردار ادا کیا۔ اس سمجھوتے میں ریاست کے پانچ بنیادی اصول بیان کئے گئے تھے[263]۔ اس معاہدے پر دستخطوں کے بعد سہروردی نے کامیابی سے نئی مرکزی اسمبلی تشکیل دی جس کی بنیاد اصولِ مساوات پر رکھی گئی تھی۔ بنگال پیکٹ (1923ء) سے تحریک حاصل کر کے سہروردی نے بڑی اہلیت سے مشرقی بنگال کے عوام کو قائل کر لیا کہ وہ اپنی اکثریت سے دستبردار ہو جائیں اور مرکز میں اصولِ مساوات کو تسلیم کر لیں۔ بظاہر یہ اصول بڑی ناانصافی کا مظہر تھا۔ مشرقی بنگال کو پاکستان کی 56 فیصد آبادی پر مشتمل حصہ ہونے کے باعث واضح اکثریت حاصل تھی چنانچہ بنگالیوں کو برابری قبول کرنے پر آمادہ کرنا آسان کام نہیں تھا۔ 1950ء میں وزیراعظم لیاقت علی خاں نے رہنما اصول کمیٹی کی پہلی رپورٹ پیش کی تھی جسے بنگالیوں نے "ناقابل قبول" قرار دیکر رد کر دیا تھا کیونکہ اس میں مرکزی اور صوبائی مجالسِ قانون ساز کے لئے جداگانہ نمائندگی کے اصول کو برقرار رکھا گیا تھا[264]۔

رہنما اصول کمیٹی کی اس رپورٹ نے پاکستان کی واحد سرکاری زبان کے طور پر اردو کی سفارش کی تھی لیکن صوبائی خود مختاری کے اصول کو مکمل طور پر نظرانداز کر دیا گیا تھا۔ اگلے برس خواجہ ناظم الدین نے رہنما اصول کمیٹی کی دوسری رپورٹ پیش کی لیکن اس بار پنجاب نے اسے رد کر دیا کیونکہ رپورٹ میں پنجاب سے کہا گیا تھا کہ وہ اپنی زمین کا کچھ حصہ مغربی پاکستان کے چھوٹے صوبوں میں تقسیم کر دے۔ صورت حال بگڑ گئی، صوبے میں مارشل لاء لگانا پڑا۔ بعدازاں ______ صوبے میں دولتانہ وزارت کو برطرف کر دیا گیا اور بالآخر ناظم الدین کی وزارت بھی اس بحران کے سامنے سپر ڈال گئی۔ بظاہر ان تمام واقعات کے پس پشت نمائندگی کا لاینحل مسئلہ کارفرما تھا۔ بعض اوقات سہروردی کو مشرقی بنگال کے اکثریتی حقوق رہن رکھنے کا مجرم ٹھہرایا جاتا ہے۔ فضل الحق اور ان کی کرشک سرامک پارٹی نے اس ضمن میں سہروردی کی جی بھر کے مخالفت کی کیونکہ انکے خیال میں یہ سہروردی کی مشرقی بنگال میں مقبولیت پر ضرب لگانے کا بہترین موقع تھا۔ فضل الحق کے اس الزام کے باوجود کہ سہروردی نے مشرقی پاکستان کو مغربی پاکستان کے پاس رہن رکھ دیا ہے سہروردی نے مشرقی پاکستان کے عوام کو اصولِ مساوات قبول کرنے پر آمادہ کر لیا۔ سہروردی سمجھتے تھے کہ اس اصول کو تسلیم کئے بغیر آئین کی تشکیل ناممکن ہو جائے گی۔

اصول مساوات کا مقصد اکثریت کی بالادستی کے خدشات کو رفع کرنا تھا۔ اس اصول کی روشنی میں "کچھ لو کچھ دو" کی بنیاد پر قومی زندگی کے تمام شعبوں میں یکساں نمائندگی کی ضمانت دی جا سکتی تھی[265]۔ سہروردی کو توقع تھی کہ اصولِ مساوات کے نفاذ کے بعد ارکان علاقائی مفادات کو مدنظر رکھنے کی بجائے

سیاسی جماعتوں کے منشور کی روشنی میں اپنی آراء دے سکیں گے اور قومی جماعتوں کا قیام ممکن ہو جائے گا۔ سب سے اہم امر یہ تھا کہ اصولِ مساوات میں مشرقی اور مغربی پاکستان کو ڈھیلی ڈھالی اصطلاح میں دو علیحدہ "قوموں" یا دو "فریقین" کے طور پر تسلیم کر لیا گیا تھا۔[266] علاقائی انفرادیت اور جغرافیائی اختلافات کو تسلیم کرنے کے بعد مشرقی پاکستان کو خود مختاری اور مخلوط انتخابات کے حق سے محروم رکھنا مشکل ہو گیا۔[267] اقلیت کی حیثیت سے ہندوؤں کا متحد اور منظم رہنا لازمی امر تھا اور ملک کے دونوں حصوں میں وسیع ہوتی خلیج کے پیش نظر مسلمانوں میں تفرقہ بازی اور بالآخر اقتدار کے لئے ہندو اقلیت کی محتاجی کا امکان تھا لیکن مخلوط انتخابات کی صورت میں ہندو اقلیت، مغربی پاکستان کی مقتدر اور استحصالی قوتوں کے خلاف جدجہد میں بنگالی قوم پرستی کا حصہ بن سکتی تھی چنانچہ مخلوط انتخابات اور صوبائی خود مختاری کی قیمت کے طور پر مشرقی پاکستان اصولِ مساوات کو تسلیم کرنے کے لئے آمادہ ہو گیا۔ اسے مشرقی پاکستان کی خوش قسمتی کہئے کہ ہندوؤں نے خود کو اقلیتی فرقہ تسلیم کروانے کی بجائے سہروردی کی تحریک کا بھرپور ساتھ دیا اگرچہ اس کے لئے انہیں سہروردی کے وزیرِ اعظم بننے کا انتظار کرنا پڑا۔

اس موقع پر گورنر جنرل سکندر مرزا کی رضامندی سے (سکندر مرزا نے غلام محمد کی جگہ گورنر جنرل کا منصب سنبھال لیا تھا) دستور ساز اسمبلی کی اکثریتی جماعت مسلم لیگ نے سہروردی کو وزارت بنانے کی دعوت دیدی۔ وزیروں کے انتخاب اور قلمدانوں کی تقسیم کے لئے جوڑ توڑ ہونے لگے۔[268] عین وقت پر جبکہ بی بی سی نے آئندہ وزیرِ اعظم کے طور پر سہروردی کے نام کا بھی اعلان کر دیا تھا سکندر مرزا نے شاطرانہ طور پر اپنی پیشکش واپس لے لی اور چودھری محمد علی سے رابطہ کر لیا۔ قبل ازیں چودھری محمد علی سہروردی کے وزیرِ اعظم بننے پر آمادہ ہو چکے تھے لیکن وزارتِ عظمیٰ کو ہاتھ آتے دیکھ کر چودھری محمد علی کے منہ میں پانی بھر آیا اور 11 / اگست 1955ء کو انہوں نے اگلی کابینہ تشکیل دے لی۔ فضل الحق نئی کابینہ میں وزیرِ داخلہ کے طور پر شامل تھے۔ سہروردی نے سرکاری طور پر قائد حزبِ اختلاف کا کردار ادا کرنے کا فیصلہ کیا۔ محمد علی بوگرہ واپس واشنگٹن پہنچ گئے اور امریکہ میں پاکستانی سفیر کے طور پر فرائض سرانجام دینے لگے۔

پہلے آئین کی تشکیل

نئی انتظامیہ نے ملک کے پہلے آئین کی تدوین اور عام انتخابات کے انعقاد کے لئے تیزی سے اقدامات کئے، حزبِ اختلاف کی طرف سے سہروردی نے دستور سازوں کو اپنے بھرپور تعاون کا یقین دلایا۔ سہروردی نے اپنا تصوّر آئین بیان کرتے ہوئے کہا کہ وہ ایسا آئین چاہتے ہیں جو ملک کے دونوں حصوں کو یکساں طور پر قابلِ قبول ہو۔ جس سے بالواسطہ انتخابات کا سلسلہ ختم ہو جائے۔ اسمبلیوں کو ان غیر مقبول اور بدعنوان حضرات سے نجات مل سکے جنہوں نے اقتدار پر قبضہ کر رکھا ہے۔ جلد از جلد انتخابات کا انعقاد ہو تاکہ جمہوریت کے قیام اور سیاسی استحکام کی ضمانت مل سکے۔[269]

مغربی پاکستانیوں سے تعلق رکھنے والے کچھ حضرات نے تجویز دی تھی کہ اگر مشرقی پاکستان علیحدہ ہونا چاہتا ہے تو وہ علیحدہ ہو سکتا ہے۔ سہروردی نے ان حضرات کو جواب دیتے ہوئے کہا کہ اگرچہ ملک کے دونوں حصوں میں ڈھیلے ڈھالے الفاظ میں دو مختلف قومیں آباد ہیں لیکن انہیں مشترکہ جدوجہدِ آزادی کی یاد اور اس یقین نے ایک دوسرے سے باندھ رکھا ہے کہ پاکستان کا کوئی حصّہ دوسرے سے الگ ہو کر زندہ نہیں رہ سکتا۔[270] مذہب کا اشتراک ایک ڈھیلا ڈھالا تعلق ہے کیونکہ حقیقت میں یہ تعلق ثقافتی اور لسانی لحاظ سے مختلف النوع مسلمان ہمسایوں کو سیاسی اتحاد بخشنے سے قاصر ہے۔ انہوں نے مجلسِ قانون ساز کی توجہ پاکستان کی مخصوص جغرافیائی ترکیب کی طرف دلائی جس نے کوئی مسئلہ پیدا کرنے کی بجائے ملک کو ایک انفرادیت بخشی ہے[271] ایک طرف تو پاکستان مغربی دنیا اور مغربی افریقہ تک مشرقِ وسطیٰ کے مسلم ممالک سے جڑا ہوا ہے دوسری طرف اسکے جغرافیائی ڈانڈے برما، انڈونیشیا اور مشرق کے دوسرے ممالک سے جا ملتے ہیں۔ ان وسیع روابط سے پاکستان کو سیاسی سطح پر بہت زیادہ اہمیت مل گئی ہے اور توقع کی جاتی ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ یہ دنیا کے طاقتور ممالک میں شمار ہونے لگے گا۔ سہروردی نے رائے ظاہر کی کہ اگر پاکستان تقسیم ہو گیا تو اس کے دونوں حصوں کا اثر ونفوذ بے معنی ہو کر رہ جائے گا چنانچہ سہروردی نے حکومت پر زور دیا کہ وہ دونوں حصوں کی ترقی پر یکساں توجّہ دے، مشرقی پاکستان کو صوبائی خود مختاری دی جائے نیز اقتصادی ماہرین کی ایک کمیٹی تشکیل دی جائے جو مشرقی پاکستان کی اقتصادی بدحالی کے اسباب معلوم کرے اور صورتحال کو بہتر بنانے کے لئے اقدامات کی سفارشات پیش کرے۔ سہروردی نے متنبہ کیا کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو مایوسی اور بے توجہی کی آغوش میں پروان چڑھنے والا طوفان بے قابو ہو کر پورے صوبے کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔[272] اپنی معروضات کے اختتام پر سہروردی نے کہا کہ اگر بنگالی افہام وتفہیم سے کام لیں اور پنجابی بھی سمجھ داری کا ثبوت دیں تو پاکستان کا مستقبل محفوظ ہو سکتا ہے۔

آئین کو 29 فروری 1956ء کو آخری شکل دی گئی اور سہروردی نے حزبِ اختلاف کے قائد کی حیثیت سے اس پر دستخط ثبت کیے۔ دراصل یہ آئین خود مختاری کے خواہاں مشرقی پاکستان اور مرکزیت پسند مغربی پاکستان کے درمیان ایک سمجھوتے کا نتیجہ تھا۔ آئین میں بنگالی اور اردو کو پاکستان کی دو سرکاری زبانوں کے طور پر تسلیم کیا گیا۔ کافی حد تک صوبائی خود مختاری کی ضمانت دی گئی۔ تاہم مخلوط انتخابات کے بارے میں کسی حتمی فیصلے سے احتراز کیا گیا۔ گورنر جنرل سکندر مرزا نے یہ تحریری یقین دہانی حاصل کرنے کے بعد آئین پر دستخط کیے کہ انہیں نئی جمہوریہ کا پہلا صدر مقرّر کیا جائے گا۔[273] چنانچہ انہوں نے 5 مارچ 1956ء کو عبوری صدر کے عہدے کا حلف اٹھالیا اور نیا آئین 23 مارچ کو نافذ کر دیا گیا۔ اس تاریخ کا انتخاب 1940ء کی قراردادِ لاہور کی یاد میں کیا گیا تھا جس نے مسلمانانِ ہندوستان کے مستقبل کا خاکہ تجویز کیا تھا۔

سکندر مرزا سیاسی سازباز اور فریب کاری کے فن میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے جب وہ سربراہِ مملکت بنے تو یہ حقیقت ہر کہ ومہ کے علم میں تھی کہ سکندر مرزا کی سیاسی قوت کا سرچشمہ فوج کے سربراہ جنرل ایوب

خاں کی شخصیت ہے۔[274] صدر نے اس مفروضے کو اپنی سیاسی قوت کے فروغ اور اپنے ہی تشکیل کردہ آئین کی دھجیاں بکھیرنے کے لئے پوری طرح استعمال کیا۔ سینڈ ہرسٹ کے تربیت یافتہ سکندر مرزا نے شمال مغربی سرحدی صوبے میں انگریزوں کے پولیٹیکل ایجنٹ کی حیثیت سے کام کیا تھا جہاں انہیں لامحدود اختیارات حاصل تھے اور وہ مختلف قبائل کو آپس میں لڑوانے اور قبائلی سرداروں کو رشوت دے کر خریدنے کے فن میں برق ہو گئے تھے۔

قوم کا سربراہ بننے کے بعد بھی وہ اس عادت سے چھٹکارا حاصل نہ کر سکے اور اپنے اقتدار کو طول دینے کے لئے "سرحدی قبائل" والا کھیل کھیلتے رہے۔ آئین کی تشکیل کے بعد وزیر اعظم کو ایک سیاسی قائد کے طور پر ابھرتے دیکھ کر سکندر مرزا خوف زدہ ہو گئے اور وہ سر عام "کنٹرولڈ ڈیماکریسی" (پابند جمہوریت) کی مالا جپنے لگے۔[275] خود آئین کے خالق بھی سکندر مرزا کا ردِ عمل بھانپ کر خوف زدہ ہو گئے اور انہوں نے اپنی تخلیق کو خطرے میں دیکھ کر فیصلہ کیا کہ جلد از جلد انتخابات منعقد کئے جائیں۔ سکندر مرزا جانتے تھے کہ انتخابات کی صورت میں ان کی سیاسی قوت ختم ہو جائے گی۔ چنانچہ انہوں نے مجلسِ قانون ساز میں اپنی سیاسی جماعت کھڑی کرنے کے لئے سیاسی جوڑ توڑ شروع کر دیئے تاکہ انتخابات کو التوا میں ڈالا جا سکے۔ خان عبدالغفار خاں کے بڑے بھائی ڈاکٹر خاں صاحب نے سکندر مرزا کی انگیخت پر ری پبلکن پارٹی کی داغ بیل ڈالی۔ مغربی پاکستان سے مسلم لیگ کے ارکانِ اسمبلی راتوں رات اس محلاتی جماعت میں انبوہ در انبوہ شامل ہو گئے جلد ہی مغربی پاکستان میں ری پبلکن پارٹی کی وزارت تشکیل پا گئی۔ مرکز میں چودھری محمد علی کے پاس دو ہی راستے تھے انہیں ری پبلکن پارٹی میں شریک ہونا تھا یا پھر استعفیٰ دینا تھا۔ انہوں نے اپنی سیاسی ایمانداری ثابت کرنے کے لئے موخر الذکر راستے کا انتخاب کیا اور 8 ستمبر 1956ء کو سبکدوش ہو گئے۔ صدر نے سہروردی کو ڈھاکہ سے بلا کر اگلی وزارت تشکیل دینے کی دعوت دی۔ سہروردی نے 12 ستمبر 1956ء کو ملک کے پانچویں وزیر اعظم کی حیثیت سے حلف اٹھایا۔ انہیں اپنی جماعت عوامی لیگ کے 14 ارکان کے علاوہ ری پبلکن پارٹی اور مشرقی پاکستان کے سات شیڈولڈ کاسٹ ارکان کی حمایت حاصل تھی۔

وزیر اعظم

سہروردی کے وزیر اعظم پاکستان بننے سے ملک میں ایک نئی صبح طلوع ہونے کا احساس دوڑ گیا۔ انہوں نے تین مقاصد کو اپنی بنیادی ترجیحات قرار دیا۔

(1) ملک میں عام انتخابات کا انعقاد

(2) عالمی رائے عامہ میں پاکستان کے وقار کو بڑھانا

(3) پاکستان کے نظر انداز شدہ علاقوں سے مساوی سلوک

سریع رفتار داخلی اقدامات

اقتدار سنبھالنے کے بعد سہروردی نے ایک ماہ کے اندر ڈھاکہ میں پارلیمان کا اجلاس طلب کیا تاکہ مخلوط انتخابات سمیت بہت سے پیچیدہ اور نازک مسائل کا حل تلاش کیا جاسکے۔[276]

مخلوط انتخابات

مسئلہ حق رائے دہی پر بحث کا آغاز کرتے ہوئے سہروردی نے کہا کہ انہوں نے برطانوی ہند ے مسلمانوں کے لئے جداگانہ انتخابات کے لئے جدوجہد کی تھی تاکہ اسے مسلمانانِ ہند کی اقلیت کے لئے آزاد مملکت کے حصول کی جدوجہد میں ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جاسکے۔ بایں ہمہ اب پاکستانی قوم کو استحکام بخشنے کے لئے مخلوط انتخابات کا ہتھیار استعمال ہونا چاہئے کیونکہ ہندوستان اور پاکستان اپنے اپنے ممالک میں اقلیتوں کے وجود کو تسلیم کر چکے ہیں۔ سہروردی نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ مسلمانوں نے دوقومی نظریہ تقسیمِ ہند کے جواز کے طور پر پیش کیا تھا تاکہ جغرافیائی طور پر متّصل وحدتوں کی ایسی ریاست تشکیل دی جاسکے جہاں پہ مسلمان عددی طور پر اکثریت میں ہوں' ایسی ریاست کے معرضِ وجود میں آنے کے بعد خود مسلمانوں کے لئے بھی دوقومی نظریئے کی ضرورت ختم ہوچکی ہے۔[277] سہروردی نے کہا اگر پاکستان نے اپنی اقلیتوں کے لئے بھی جداگانہ انتخابات کا نظام قائم رکھا تو مستقبل میں اقلیتیں قانونی طور پر یہ مطالبہ کرنے میں حق بجانب ہوں گی کہ ان علاقوں پر مشتمل ایک علیحدہ مملکت تشکیل دی جائے جہاں وہ عددی طور پر مسلمانوں پر برتری رکھتی ہیں۔ سہروردی نے استدلال کیا کہ تمام مسلمان ممالک اس امر پر اتفاق رکھتے ہیں کہ اسلام نے انتخابات کے لئے کسی خاص طریقۂ کار کو ترجیح نہیں دی چنانچہ مخلوط انتخابات کو غیر اسلامی قرار دینا بے بنیاد ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ کسی مسلمان ملک نے اپنی اقلیتوں کے لئے جداگانہ انتخابات کا نظام رائج نہیں کیا۔

مخلوط انتخابات کا مطلب ہے کہ ہندو اور مسلمان اپنے نمائندوں کے انتخاب میں مشترکہ طور پر رائے دیں تو کیا ہم اسلامی جمہوریہ پاکستان کے صدر اور قومی اسمبلی کے سپیکر کے انتخاب میں مشترکہ طور پر ووٹ نہیں دیتے؟ اسی طرح کیا ہم اسمبلی میں مختلف قوانین اور مسائل پر بحث و تمحیص کے بعد مشترکہ طور پر رائے نہیں دیتے۔ مشرقی پاکستان میں بلدیاتی سطح پر مخلوط انتخابات کا نظام ایک عرصے سے رائج ہے۔ میونسپل کمیٹی ضلع کونسل یونین بورڈ' سکول اور کالج کی انتظامی مجلسوں وغیرہ کے لئے مخلوط انتخابات منعقد ہوتے ہیں اور یہ نظام کامیابی سے چل رہا ہے۔ جداگانہ انتخاب کے حامی اس خدشے کا اظہار کرتے ہیں کہ مخلوط انتخابات کی صورت میں ہندو منتخب اداروں میں بالادستی حاصل کرلیں گے۔ سہروردی نے کہا کہ یہ خوف بے بنیاد اور بلا جواز ہے۔ ضلع کھلنا میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی آبادی تقریباً یکساں ہے۔ صوبائی مجلس قانون ساز کے لئے جداگانہ انتخابات میں 8 مسلمان ارکان کے ساتھ 7 ہندو ارکان منتخب ہوئے جبکہ ضلع

کونسل کے لئے مخلوط انتخابات کے ذریعے 30 ارکان میں سے صرف 2 ہندو منتخب ہو سکے۔ چنانچہ اگر کسی کو مخلوط انتخابات میں نقصان پہنچ سکتا ہے تو وہ ہندو ہیں اور ہندو مخلوط انتخابات کی حمایت کے لئے تیار ہیں تاکہ انہیں محض ہندوؤں کی بجائے پاکستانی تسلیم کیا جا سکے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ ہندو بالادستی کا ہوا ملک کے اس خطے میں کھڑا کیا جا رہا ہے جہاں ہندو اقلیت کل آبادی کے صرف 2 فیصد حصے پر مشتمل ہے۔

سہروردی نے قوم سے درخواست کی کہ اس مسئلے پر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے۔ انہوں نے مزید کہا کہ جداگانہ انتخابات کا مطالبہ تقسیم ہند کے دنوں میں ہندوؤں سے پیدا ہونے والی نفرت اور بدظنی کا شاخسانہ ہے۔ انہوں نے تسلیم کیا کہ دلوں میں پیدا ہونے والے اس فاصلے کو پاٹنے میں کچھ وقت لگے گا لیکن اس کام کو فوراً شروع کرنا ہو گا۔ اگر پاکستان اور ہندوستان کے درمیان اقلیتوں کی اجتماعی نقل مکانی کی نوبت آئی تو پاکستان کی سرزمین اس قدر وسیع تعداد میں پناہ گزینوں کا بوجھ برداشت نہیں کر سکے گی۔ چنانچہ ہمیں حقیقت پسندی سے کام لینا چاہئے اور ہندوؤں سے عزت و احترام کا سلوک کرتے ہوئے ان میں وہ اعتماد پیدا کرنا چاہئے جو پاکستان کے ہر شہری کا جائز حق ہے۔ یہ اعتماد صرف تمام ریاستی امور میں مساوی شرکت سے ہی پیدا ہو سکتا ہے۔ جب ہندوؤں کو اکثریتی فرقے کے برابر حقوق اور مراعات حاصل ہوں گی تو وہ قومی تعمیر کے کام میں بھی برابر کا تعاون پیش کریں گے۔ سہروردی نے جداگانہ انتخابات کے حامیوں کو خبردار کیا کہ ان کے عزائم کی تکمیل سے قوم میں تفرقہ بازی کو فروغ حاصل ہو گا۔ ہمیں ایک پرامن، خوشحال اور مضبوط پاکستان کی تخلیق کے لئے ہندوؤں کے تعاون کی ضرورت ہے۔

سہروردی نے عوام سے اپیل کی کہ وہ پاکستان کے وسیع تر مفاد میں مخلوط انتخابات کی حمایت کریں۔ انہوں نے پرزور لہجے میں اعلان کیا کہ جن رائے دہندگان نے مشترکہ رائے دہی کے تحت موجودہ حکومت کو اقتدار دیا ہے انہیں مذہبی بنیادوں پر مختلف خانوں میں تقسیم نہیں کرنا چاہئے۔ جداگانہ انتخابات کے کٹر ترین حامی بھی سہروردی کے مدلل استدلال کو رد نہ کر سکے۔ سہروردی نے پارلیمان میں مخلوط انتخابات کا قانون پیش کیا جسے ایوان نے منظور کر لیا۔

جمہوریت کی آزمائش

سہروردی نے ملک کے تمام شہریوں کو مذہب، نسل، عقیدے یا ثقافت کے امتیازات سے قطع نظر یکساں شہری حقوق کی ضمانت دی۔[278] ایک عرصے سے جمہوریت کا صرف نام ہی باقی رہ گیا تھا۔ اب مشرقی پاکستان میں جمہوریت کو صحیح معنوں میں کام کرنے کا موقع دیا گیا۔ مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ کی وزارت مرکز میں سہروردی کے برسراقتدار آنے سے صرف چھ روز پہلے معرض وجود میں آئی تھی۔ اب عوامی لیگ نے جگتو فرنٹ کے 21 نکاتی منشور کی تکمیل کے لئے پوری تندہی سے اقدامات شروع کئے۔ تمام سیاسی قیدیوں کو رہائی اور پبلک سیفٹی ایکٹ کی منسوخی سے عوام میں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ سابقہ

حکومتوں نے سیاسی مخالفین کو ہراساں کرنے کے لئے بار بار اس قانون کو استعمال کیا تھا۔ اسی طرح سابقہ حکومتوں کی روش کے برعکس عوامی لیگ وزارت نے باقاعدگی سے مجلسِ قانون ساز کے اجلاس منعقد کروائے ۔ اس وزارت نے سات ضمنی انتخابات منعقد کروائے جن میں سے عوامی لیگ نے چھ میں کامیابی حاصل کی اور ایک ضمنی انتخاب میں اسے شکست ہوئی لیکن عوامی لیگ کی صوبائی حکومت مرکز کو مزید خود مختاری دینے پر آمادہ نہ کر سکی۔ صوبائی حکومت کے اصرار پر سہروردی آئینی حدود کے اندر رہتے ہوئے اقتدار کے مزید عدم ارتکاز پر آمادہ ہو گئے۔

معاشی پالیسیاں

سہروردی نے مشرقی پاکستان نیز مغربی پاکستان کے چھوٹے صوبوں کی معاشی بدحالی دور کرنے کے لئے ہنگامی بنیادوں پر اقدامات کئے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ کسی حکومت نے اس سمت توجّہ دی تھی۔ انہوں نے درآمدات کی درجہ بندی کا جائزہ لے کر ایسی اصلاحات نافذ کیں جن سے درآمدات کے شعبے میں نئے افراد اور ادارے داخل ہو سکیں۔ کراچی میں درآمدات کے چیف کنٹرولر کا دفتر ختم کر دیا گیا اور درآمدات و برآمدات کے لئے تین خود مختار دفاتر قائم کئے گئے' مشرقی پاکستان کے لئے چٹاگانگ' مغربی پاکستان کے لئے لاہور اور وفاقی علاقے کے لئے کراچی میں ایک ایک دفتر قائم کیا گیا[280]۔ انہوں نے اس امر کو بھی یقینی بنایا کہ زرِ مبادلہ کی صورت میں ہونے والی آمدنی کو مشرقی پاکستان' مغربی پاکستان اور وفاق کے درمیان برابر تقسیم کیا جائے[281]۔ چٹاگانگ اور لاہور میں درآمدات کے اعلیٰ حکام کو اختیار دے دیا گیا کہ وہ متعلقہ صوبائی حکومت سے مشورہ کر کے درآمدات کے اجازت نامے جاری کر سکتے ہیں۔ کراچی کے کنٹرولر کو ہدایت کی گئی کہ وہ وفاقی وزارتِ تجارت کے ساتھ مشورہ کر کے اجازت نامے جاری کر سکتے ہیں[282]۔ سہروردی نے مشرقی پاکستان کی ضروریات کے مطابق رسد کو یقینی بنانے کے لئے مرکزی رسد اور شعبۂ ترقیات کی چٹاگانگ شاخ کا درجہ بڑھا کر اسے ایک ایڈیشنل ڈائریکٹر جنرل کی تحویل میں دے دیا[283]۔ سہروردی نے ہر سال جولائی سے شروع ہونے والے مالی سال کا بھی اجراء کیا تاکہ مشرقی پاکستان کے حکام کو مون سون کے آغاز سے پہلے تعمیراتی منصوبے مکمل کرنے کا موقع مل سکے[284]۔ جب عوامی لیگ نے اقتدار سنبھالا تو اس وقت مشرقی پاکستان کے مختلف علاقوں میں قحط کا خطرہ منڈلا رہا تھا۔ اپنی وزارت کی تشکیل کے تین روز بعد سہروردی نے صوبے کا دورہ کر کے اس کی ضروریات کا اندازہ لگایا اور فوراً آسٹریلیا' برما' تھائی لینڈ اور دیگر ممالک سے چاول درآمد کرنے کا حکم دیا تاکہ 1943ء کے قحط جیسے حالات سے بچا جا سکے[285]۔ مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ وزارت کو مکمل آزادی دی گئی تھی اور سہروردی کی بھرپور اعانت کے باعث کسی جانی نقصان کے بغیر قحط کے خطرے کو دور کر لیا گیا۔ حکومت نے آزمائشی امدادی کام پر لاکھوں روپے صرف کئے تاکہ بے زمین کسانوں کی اجرت میں معقول اضافہ کیا جا سکے۔ عوامی لیگ حکومت نے فلمی صنعت کے فروغ میں نجی شعبے کی اعانت کے لئے فلم ڈویلپمنٹ کارپوریشن قائم کی۔ پٹ سن کی برآمد سے

پاکستان کو کل زرِ مبادلہ کا 70 فیصد حصہ حاصل ہوتا تھا۔ پٹ سن کی تجارت بڑھانے کے لئے جیوٹ مارکیٹنگ کارپوریشن کا قیام عمل میں لایا گیا۔ ڈھاکہ اور چٹاگانگ کے تیزی سے پھیلتے ہوئے شہروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے ڈھاکہ امپروومنٹ ٹرسٹ اور چٹاگانگ ڈویلپمنٹ اتھارٹی کے نام سے دو ادارے قائم کیئے گئے۔ دریاؤں کی اس سرزمین میں آبی راستوں کی ترقّی کے لئے اندرونِ ملک آبی مواصلات کا ادارہ قائم کیا گیا۔[286] سہروردی نے اقوامِ متحدہ کے جنرل سیکرٹری کے ساتھ صلاح مشورہ کرنے کرگ کی سربراہی میں ایک کمیشن مقرر کیا جس کے ذمّے یہ کام لگایا گیا کہ وہ مشرقی پاکستان میں باقاعدگی سے آنے والے سیلابوں کی روک تھام کے لئے تجاویز پیش کرے۔[287] کرگ کی سفارشات کی روشنی میں خود مختار واٹر ڈویلپمنٹ بورڈ قائم کیا گیا جن کی بنیادی ذمّہ داری سیلاب کی روک تھام تھی۔

جاندار خارجہ پالیسی

بایں ہمہ سہروردی کا اہم ترین کارنامہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ انہوں نے ایک جاندار خارجہ پالیسی متعارف کروائی۔ اگرچہ وہ ایک سال سے کچھ ہی دیر زیادہ برسراقتدار رہے لیکن وہ عالمی رائے عامہ کی نظروں میں پاکستان کا وقار بلند کرنے میں کامیاب رہے۔ قوم کے نام اپنے پہلے نشریئے میں سہروردی نے علان کیا کہ وہ دیانت داری اور سچائی پر مبنی آزاد خارجہ پالیسی پر عمل کریں گے۔[288] انکی خارجہ پالیسی بنیادی لور پر درج ذیل چار عوامل کے پیشِ نظر تشکیل دی گئی۔

(1) پاکستان کو اپنے قیام کے وقت ہندوستان سے اپنے سول اور فوجی سازوسامان کا جائز حصہ نہیں مل سکا تھا۔ چنانچہ اس ملک نے معاشی لحاظ سے پسماندگی کے سائے میں جنم لیا اور اس میں صنعتوں کی مقدار نہ ہونے کے برابر تھی چنانچہ دفاعی قوت کو مضبوط کرنے کے لئے گولہ بارود اور دیگر فوجی سازوسامان حاصل کی ضرورت تھی۔ دوسری صنعتی پسماندگی دور کرنے کے لئے صنعتوں کی تعمیر ملک کی اہم ضروریات تھی۔

(2) بھارت کی روس اور چین سے قریبی دوستی کے باعث کمیونسٹ ممالک پاکستان کی طرف معاندانہ روّیہ رکھتے تھے۔ اس مخالفت کی ایک وجہ پاکستان کی طرف سے غلامانہ طور پر امریکی امداد کی قبولیت بھی تھی۔

(3) جب سہروردی وزیراعظم بنے اس وقت پاکستان کی خارجہ پالیسی کمزور اور منتشر تھی۔ ایشیا میں سوائے عراق، ترکی، تھائی لینڈ اور فلپائن کے کسی ملک سے ہماری دوستی نہیں تھی۔ محولّہ بالا ممالک بھی مختلف دفاعی معاہدوں میں شرکت کے باعث ہمارے دوست شمار ہوتے تھے۔ بھارت، روس، چین جیسے ہمسایہ ممالک ہم سے مخالفت رکھتے تھے۔ برما کا روّیہ غیر دوستانہ اور سیلون (سری لنکا) کا روّیہ لاپرواہی کا غمّاز تھا۔[289]

(4) مسئلہ کشمیر جسے کوئی پاکستانی حکومت نظرانداز نہیں کر سکتی تھی ابھی تک حل نہیں ہو سکا تھا۔ اس صورتحال کا تقاضا تھا کہ عصری حقائق اور پاکستان کی بنیادی ضروریات کو مدّ نظر رکھتے ہوئے ایک خارجہ

پالیسی تشکیل دی جائے چنانچہ سہروردی نے تمام ممالک کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ عالمی سطح پر بھارتی خارجہ پالیسی کا مقابلہ کرنے، نہرو کی بددیانتی، بے نقاب کرنے اور کشمیری عوام کی اعانت کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے اپنی خارجہ پالیسی کو ان الفاظ میں بیان کیا تھا "ہم تمام ممالک سے خیر سگالی کے تعلقات چاہتے ہیں اور کسی سے بھی عناد نہیں رکھنا چاہتے"[290]

ہمسایہ ممالک

سہروردی نے اس حقیقت کو تسلیم کیا کہ اپنی سفارتی حیثیت کو مضبوط بنائے بغیر کشمیر کا مسئلہ اٹھانا بے فائدہ ہو گا۔ چنانچہ انہوں نے مسئلہ کشمیر کے حل کے لئے ایشیائی ممالک اور روس سے تعاون حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔ اسی پالیسی کے تحت انہوں نے تعلقات میں بہتری اور دوست ممالک کی تعداد میں اضافے کے لئے ہمسایہ ممالک کے دورے کئے۔ سب سے پہلے اکتوبر 1956ء میں چین کا دورہ کرنے کے لئے چینی حکومت کی دعوت قبول کی۔[291] سہروردی پاکستان کے پہلے سربراہِ حکومت تھے جو اس قسم کا قدم اٹھانے کی جرأت اور بصیرت سے بہرہ مند تھے۔ ان سے پہلے کسی رہنما نے عوامی مخالفت کے پیشِ نظر یہ جرأت نہیں کی تھی کہ چینی رہنماؤں سے سلسلۂ جنبانی شروع کیا جائے۔ تاریخی پلٹن میدان میں ایک جلسۂ عام سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے اعلان کیا۔

"میں نے سب سے پہلے اس (پاک چین دوستی) کا آغاز کیا۔ مجھ سے پہلے کسی نے ایسا کرنے کی جرأت نہیں کی تھی۔ میرے پیش رو کہا کرتے تھے

"حضرات! ہمیں ایسا کرنے سے خوف آتا ہے۔" اس میں ڈرنے اور خوف کھانے کی کیا بات تھی۔ اگر میرا ذہن صاف ہے۔ میرے دل میں خیر سگالی کے جذبات ہیں اور میں حسد اور کینے سے بے نیاز ہوں تو مجھے کسی سے خوف کھانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ مجھے سوائے اللہ کے کسی کا ڈر نہیں ہے۔"[292]

چینی وزیر اعظم چاؤ این لائی نے بھی جواب میں پاکستان کا دورہ کیا۔ ڈھاکہ میں ان کا تاریخی استقبال پاک چین تعلقات میں ایک اہم سنگِ میل ثابت ہوا۔ سہروردی نے چینی رہنماؤں کو قائل کر لیا کہ مختلف النوع سیاسی نظاموں کے باوجود پاکستان اور چین اچھے ہمسایوں کی طرح رہ سکتے ہیں نیز ثقافتی اور دو طرفہ تعلقات استوار کر سکتے ہیں۔ پاکستان نے ایک اعلیٰ سطحی وفد چین روانہ کیا 1956ء میں دلائی لامہ کے دورہ بھارت سے چین اور بھارت کے درمیان غلط فہمیوں نے جنم لیا تھا اور سہروردی نے اس صورتحال سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔[293] سہروردی نے چین جاتے ہوئے اور پھر واپسی پر دونوں مرتبہ برما میں قیام کیا جس سے انہیں برما کے قائدین سے براہِ راست رابطے کا موقع ملا۔ بعدازاں ایک اعلیٰ سطحی وفد نے مذاکرات کی غرض سے برما کا دورہ کیا اور ایک معاہدے پر دستخط کئے جس میں باہمی مفادات کا تعین کیا گیا تھا ایک تجارتی وفد نے بھی برما کا دورہ کیا جس کے بعد کراچی کی فرینڈز آف برما سوسائٹی نے ایک نجی وفد برما بھیجا۔ مہاتما بدھ کی ڈھائی ہزار سالہ تقریبات میں بھی پاکستان کی نمائندگی کی گئی۔ سہروردی نے اپریل 1957ء میں

جاپان کا دورہ کیا۔ روس کے ساتھ بھی ایک تجارتی معاہدے پر دستخط کئے گئے۔ ایک پارلیمانی وفد نے روس کا دورہ کر کے روسیوں کو دعوت دی کہ وہ آئندہ پاکستان کی تعلیمی اور ثقافتی کانفرنسوں میں اپنے وفود بھیجیں۔

مسلم دنیا

سہروردی نے نو آزاد مسلم ممالک کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کی افادیت پر کڑی نکتہ چینی کی کیونکہ یہ ممالک آپس میں گہرے اختلافات کا شکار تھے اور انکی اقتصادی و فوجی حالت پتلی تھی۔[294] ڈھاکہ یونیورسٹی کے ایس ایم ہال میں طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے سہروردی نے ایک مسلم بلاک کی تشکیل کے نتائج پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا۔ "آپ ایک صفر میں کتنے ہی صفر کیوں نہ جمع کرتے چلے جائیں نتیجہ ہمیشہ صفر ہی رہے گا۔ چنانچہ آنکھیں بند کر کے صفر جمع کرتے چلے جانے سے کوئی مثبت نتیجہ بر آمد نہیں ہو گا لیکن اگر صفر کو ایک کے عدد سے جوڑا جائے تو حاصل جمع کا انحصار ایک سے اتحاد کرنے والے صفروں کی تعداد پر ہو گا۔ خواہ ان صفروں کو ایک کے دائیں طرف رکھا جائے یا بائیں طرف۔ نتیجہ محض صفروں کے حاصل جمع سے بہتر ہی ہو گا۔"[295]

اس مثال سے سہروردی ابھرتے ہوئے مسلمان ممالک کی فوجی قوت کی طرف اشارہ کر رہے تھے۔ وہ ان ممالک کی عالمی اہمیت کا ذکر نہیں کر رہے تھے۔[296] امریکہ، برطانیہ یا روس کے مقابلے میں ان مسلمان ممالک کے پاس نہ تو جدید جنگی ٹیکنالوجی تھی اور نہ یہ ممالک صنعتی علوم سے بہرہ ور تھے۔ چنانچہ یہ ممالک بیرونی امداد کے بغیر جارحیت کا مقابلہ کرنے یا بین الاقوامی معاملات میں حصہ لینے کے اہل نہیں سمجھے جاتے تھے۔ سہروردی نے پاکستان کو بھی اسی صفت میں شامل کیا تھا لیکن انکی اس سرِعام تنقید نے عرب ممالک خاص طور پر مصر کو بے حد برافروختہ کر دیا۔ سویز کے بحران کے دوران فرانس، برطانیہ اور اسرائیلی افواج کے انخلاء کے بعد خطّے میں امن وامان برقرار رکھنے کے لئے اقوامِ متحدہ نے جو امن فوج مصر روانہ کی تھی، مصر نے اس میں پاکستانی دستے کی شمولیت قبول کرنے سے انکار کر دیا جب سہروردی نے عرب ممالک کے بارے میں پاکستان کی پالیسی کی وضاحت کے لئے مصر کا دورہ کرنا چاہا تو مصر کی حکومت نے ان کا استقبال کرنے سے بھی انکار کر دیا۔ بایں ہمہ سب سے شدید ردِّعمل اس وقت سامنے آیا جب اقوامِ متحدہ میں مسئلہ کشمیر پر بحث کے دوران مصر نے پاکستان کی مخالفت میں رائے دی۔

یہ مناقشہ ناخوشگوار تاہم غیر متوقع نہیں تھا۔ آزادی کے بعد سے ہندوستان نے مشرقِ وسطیٰ کے بارے میں دوٹوک اور مستعد خارجہ پالیسی اختیار کر رکھی تھی چنانچہ عرب ممالک پاکستان کی نسبت ہندوستان سے زیادہ گرم جوشی کا مظاہرہ کرتے تھے۔ ہندوستان نے عرب ممالک میں مسلمان سفیر تعینات کر رکھے تھے نیز ان ممالک سے مضبوط تجارتی روابط استوار کرنے کے علاوہ بھارت معاہدۂ بغداد کا پرجوش مخالف تھا۔ لہٰذا عربوں کے لئے بھارت کا شکر گزار ہونا زیادہ قرینِ قیاس تھا۔ بھارت نے

پاکستان کی مغرب نوازی کے خلاف ہرزہ سرائی کر کے عربوں میں پاکستان کے خلاف منفی جذبات پیدا کر دیئے حالانکہ خود بھارت نے اسرائیل کو تسلیم کر کے اس سے تجارتی روابط قائم کر رکھے ہیں جبکہ پاکستان نے مسلسل اسرائیل کی ریاست کو تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے۔ جب برطانیہ، فرانس اور اسرائیل نے مصر پر حملہ کیا اس وقت سہروردی چین کا سرکاری دورہ کر رہے تھے۔ چین سے واپسی کے فوراً بعد سہروردی نے اسرائیل کو جارح قرار دیا اور مصر پر حملہ کرنے پر برطانیہ اور فرانس کی مذمت کی۔ معاہدہ بغداد کے تین دوسرے مسلمان ممالک عراق، ترکی اور ایران کے ساتھ پاکستان نے بھی اس حملے کی مذمت کرتے ہوئے برطانیہ اور فرانس پر زور دیا کہ وہ اقوامِ متحدہ کی قرارداد پر عمل کرتے ہوئے مصر کی سرزمین سے اپنی افواج واپس بلائیں۔[297]

بایں ہمہ اگرچہ پاکستان کو مصری حمایت نہ مل سکی لیکن سہروردی دیگر تمام عرب ممالک سے مسئلہ کشمیر پر پاکستان کی حمایت کا وعدہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔[298] عرب ممالک اب پاکستان کی مشکلات کو پوری طرح سمجھ چکے تھے۔ اگرچہ یہ ممالک اپنی داخلی وجوہات کی بنا پر معاہدہ بغداد میں شامل ہونے سے قاصر تھے تاہم انہوں نے ان اقدامات کی تائید کی جو پاکستان اپنے دفاع کے لئے کر رہا تھا۔ ان ممالک کو معاہدۂ بغداد میں شامل ہونے واحد عرب ملک عراق پر شدید اعتراضات تھے کیونکہ عرب ممالک ابھی تک عرب قوم پرستی کے تصور پر اپنی امیدیں قائم کئے ہوئے تھے اور انہیں کسی عرب ملک کا دیگر غیر عرب مسلم ممالک کے ساتھ کسی معاہدے میں شریک ہونا ناگوارِ خاطر تھا۔[299]

تمام مسلم ممالک کے ساتھ برادرانہ تعلقات استوار کرنے کی مساعی کے ضمن میں سہروردی نے جنوب مشرقی ایشیا کے دو ہمسایہ مسلم ممالک ملایشیا اور انڈونیشیا کے وزراء اعظم کو پاکستان کے دورے کی دعوت دی، وفاق ملایشیا کو اگست 1957ء میں آزادی ملنا تھی۔ پاکستان نے ملایشیا کے آئندہ آئین کی تدوین میں اعانت کے لئے ایک آئینی ماہر کو ملایشیا آئینی کمیشن کے رکن کی حیثیت سے ملایشیا بھیجا۔ نومبر 1956ء میں سہروردی نے ایران اور لبنان نیز جنوری 1957ء میں ترکی کا دورہ کیا۔ سعودی عرب کے بادشاہ کی دعوت پر صدر سکندر مرزا نے مملکتِ سعودی عرب کا دورہ کیا۔ سعودی عرب کے ساتھ ایک معاہدے پر دستخط ہوئے اور خیر سگالی کی علامت کے طور پر سعودی وزیر تجارت نے پاکستان کا دورہ کیا۔

شمال میں واقع ہمسایہ ملک افغانستان کے ساتھ پاکستان کے تعلقات ہمیشہ سے ناخوشگوار تھے۔ افغانستان واحد ملک تھا جس نے اقوامِ متحدہ میں پاکستان کی شمولیت کے خلاف رائے دی تھی۔ یہ تعلقات 1955ء میں انحطاط کی آخری حدوں کو چھونے لگے۔ جب کابل میں پاکستانی سفارت خانے پر حملہ کر کے توڑ پھوڑ کی گئی اور پاکستانی پرچم نوچ کر اس کی توہین کی گئی۔ بھارت سے قریبی روابط کی حامل افغان حکومت پاکستان کے شمال مغربی سرحدی صوبے کے معتدبہ حصے کی دعویدار تھی۔ سہروردی کے عنانِ اقتدار سنبھالنے کے بعد ان تعلقات میں کافی بہتری آ گئی۔ افغانستان کے فرمانروا ظاہر شاہ کی دعوت پر صدر سکندر مرزا نے افغانستان کا دورہ کیا۔ سردار داؤد کے جوابی دورے سے دونوں ملکوں کے تعلقات مزید بہتر

ہو گئے۔ بعد ازاں سہروردی نے بھی افغانستان کا دورہ کیا۔

سہروردی کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ "جہاں ممکن ہو، مختلف ممالک کے قائدین کو مل بیٹھنا چاہئے اور تبادلۂ خیالات کے بعد اگر سیاسی اشتراک ممکن نہ ہو تو بھی ایسے اقتصادی، ثقافتی اور مذہبی تعلقات قائم کئے جائیں۔ جن سے مستقبل میں اشتراک فکر و نظر کے راستے ہموار ہو سکیں۔[300]" انہیں امید تھی کہ مسلم ممالک کے درمیان قریبی رابطے کی صورت میں قدرتی طور پر عالمی سیاست کے منظر نامے پر ایسی طاقت سامنے آئے گی جو فوجی قوت سے زیادہ موثر ہوگی اور عالمی معاملات میں زیادہ مثبت کردار ادا کر سکے گی۔[301]

پاکستان کی سلامتی

غالباً سہروردی سے قبل کسی پاکستانی حکومت نے ملکی تحفظ پر اس شدّت سے توجہ نہیں دی تھی۔ پاکستان کے بجٹ کا بڑا حصہ (85 فیصد) دفاع پر صرف ہوتا تھا لیکن اسکے باوجود بیرونی جارحیت کے خلاف تحفّظ کا احساس مفقود تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ حصولِ آزادی کے فوراً بعد پاکستان کے عدم تحفّظ کی صورتحال اتنی سنگین تھی جتنی جنگِ عظیم اول (1914ء1918ء) کے بعد فرانس کی دفاعی حالت پتلی تھی۔[302] چنانچہ 1954ء میں پاکستان، برطانیہ، امریکہ اور تین ہمسایہ مسلم ممالک عراق، ایران اور ترکی کے ساتھ معاہدۂ بغداد میں شریک ہو گیا۔ ستمبر 1955ء میں پاکستان نے آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، برطانیہ، امریکہ، فرانس، فلپائن اور تھائی لینڈ کے ساتھ ایسٹ ایشیا ٹریٹی آرگنائزیشن (سیٹو) میں بھی شمولیت اختیار کر لی۔

ہندوستانی وزیرِ اعظم پنڈت نہرو نے ان معاہدوں میں پاکستان کی شرکت پر کڑی تنقید کی اور کہا کہ ان دونوں معاہدوں کے تحت ملنے والی فوجی امداد ہندوستان کے خلاف استعمال ہوگی اور امریکہ ان ہتھیاروں کی تنصیب کی نگرانی نہیں کر سکے گا۔ اس پر امریکہ نے بھارتی حکومت کو یقین دہانی کروادی کہ اگر امریکی فوجی امداد کو بھارتی سرحدوں پر استعمال کیا گیا تو امریکہ بھارت کی حمایت کرے گا۔[303] سہروردی نے بھی کئی مواقع پر واضح کیا کہ پاکستان امریکی فوجی امداد کو صرف اپنے تحفّظ اور دفاع کے لئے استعمال کرے گا اور اگر پاکستان کی سرحدوں کی خلاف ورزی نہ کی گئی تو ان ہتھیاروں کو بھارت یا کسی دوسرے ملک کے خلاف استعمال کرنے کی نوبت نہیں آئے گی۔ سہروردی نے تعجب کا اظہار کیا کہ امن کے اور سامراج کے دشمن نہرو 23 راکتوبر 1955ء کو ہنگری کے خلاف روسی جارحیت پر تو خاموش رہے لیکن پاکستان کے اپنی قومی سلامتی اور دفاع کی غرض سے مختلف معاہدوں میں شریک ہونے پر معترض ہیں۔ مزید بر آں نہرو نے روس اور مشرقی یورپ میں واقع گماشتہ ریاستوں کے درمیان وارسا پیکٹ، روس اور چین کے درمیان فوجی معاہدے یا شام کو روس کی فوجی امداد پر کبھی تنقید نہیں کی۔ نہرو صرف پاکستان جیسے چھوٹے ملک پر نکتہ چینی کرنے پر قادر ہیں کیونکہ خود بھارت دفاعی لحاظ سے خود کفیل ہے اور اسے اپنی سرحدوں پر کسی خطرے کا سامنا نہیں۔

بایں ہمہ سہروردی پاکستان اور بھارت کے درمیان امن کے قیام کے خواہشمند تھے تاکہ دونوں اقوام ترقّی کر سکیں۔ بھارت ایک وسیع اور امیر ملک ہے جس میں مسلمانوں کی بڑی تعداد آباد ہے چنانچہ سہروردی بھارت کو اشتعال دلانے یا دشمن تصوّر کرنے کے قطعاً خلاف تھے انکی خواہش تھی کہ اس خیرسگالی کو دو طرفہ ہونا چاہئے۔ مسئلۂ کشمیر کو جلد از جلد حل ہونا چاہئے اور نئے مسائل مثلاً مشرقی پاکستان میں دریائے گنگا کے بہاؤ میں رکاوٹ' آسام سے سیلابی پانی کی آمد اور مغربی پاکستان میں نہری پانی کی تقسیم کے تنازعات کا تصفیہ تلاش کیا جانا چاہیئے۔ انہوں نے بھارت کو "ناجنگ معاہدے" کی پیشکش کا اعادہ کیا بلکہ تجویز کیا کہ محوّلہ بالا اہم مسائل کے تصفیے کے بعد دونوں ممالک میں قومی فوج کو تحلیل کر دیا جائے۔[304]

دونوں دفاعی معاہدوں میں پاکستان کی شرکت پر اندرونِ ملک بھی نکتہ چینی کی گئی۔ عوام کی خاصی بڑی تعداد کی خواہش تھی کہ پاکستان غیر جانبدارانہ پالیسی اپنائے۔ مشرقی پاکستان عوامی لیگ کے صدر مولانا عبدالحمید خاں بھاشانی ان معاہدوں میں پاکستان کی شمولیت کے مخالف تھے چنانچہ انہوں نے عوامی لیگ سے علیحدگی اختیار کر کے اپنی سیاسی جماعت نیشنل عوامی پارٹی کی بنیاد ڈالی۔

سہروردی اور مولانا کے اختلافات 7 اور 8 فروری 1957ء کو منعقد ہونے والی کگماری کانفرنس کے دوران پہلی بار منظرِ عام پر آئے۔ مولانا بھاشانی نے یہ کانفرنس پاکستان کی خارجہ پالیسی پر بحث کے لئے بلائی تھی۔[305] مولانا نے کانفرنس کے لئے تواریخ منتخب کرتے ہوئے التزام رکھا تھا کہ عین انہی دنوں سلامتی کونسل میں مسئلۂ کشمیر پر بحث ہو رہی تھی۔ انہوں نے مختلف ممالک کے سربراہان کو بھی کانفرنس میں مدعو کیا جن میں بھارت کے وزیرِ اعظم پنڈت جواہر لال نہرو، مغربی بنگال کے وزیرِ اعلیٰ پی سی گھوش اور سہروردی سے عناد رکھنے والے متعدد بھارتی دانشور شامل تھے۔ سہروردی نے دونوں دفاعی معاہدوں کی پرزور وکالت کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان کو ایشیا کا سوئٹزرلینڈ یا سویڈن بننے کی خواہش نہیں کرنی چاہئے کیونکہ ملک کے دونوں حصے 1500 میل کے فاصلے پر واقع ہیں اور درمیان میں بھارت جیسا غیر دوستانہ ملک پڑتا ہے۔[306]

سہروردی نے سوال کیا کہ جس ملک کو بیرونی جارحیت کے واضح خطرے کا سامنا ہو اور وہ اس جارحیت کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو وہ کس طرح غیر جانبدار اور الگ تھلگ رہنے کے بارے میں سوچ سکتا ہے؟ مارچ 1950ء اور جولائی 1951ء میں دو مواقع پر بھارت نے فوجوں کی بھاری تعداد بین الاقوامی سرحدوں پر لاکھڑی کی اور پاکستان بالکل بے یار و مددگار رہ گیا تھا۔[307] پاکستان اپنی سرحدوں پر موجود اس مسلسل خطرے کی موجودگی میں اطمینان سے نہیں بیٹھ سکتا اور اسے جارحیت کے خلاف تحفّظ کی ضرورت ہے۔

بدقسمتی سے ان دفاعی معاہدوں میں پاکستان کی شمولیت کا فیصلہ صرف تین حضرات یعنی غلام محمد ظفراللہ خاں اور جنرل ایوب نے کیا تھا۔[308] کابینہ کو اس فیصلے سے اس وقت آگاہ کیا تھا جب معاہدوں کو آخری شکل دی جا چکی تھی۔ اس تگڈم کے ارکان نے جرأت اور بصیرت کی کمی کے باعث عوام کو اعتماد میں

لینامناسب نہ سمجھا۔ سہروردی نے اقتدار سنبھالنے کے بعد اپنے پہلے بیان میں ان معاہدوں پر روشنی ڈالی اور کہا کہ ان کی نوعیت قطعی طور پر دفاعی ہے اور انہیں کسی صورت روس یا چین حتیٰ کہ ہندوستان کے خلاف بھی استعمال نہیں کیا جائے گا جو کہ فوجی لحاظ سے پاکستان سے کہیں زیادہ طاقتور ممالک ہیں۔[309] مزید بر آں نبڈونگ کانفرنس نے بھی جس میں نو آزاد افریقی اور ایشیائی ممالک کے سربراہان نے شرکت کی تھی قوموں کے اس حق کو تسلیم کیا ہے کہ وہ اپنے دفاع کی غرض سے مختلف معاہدوں میں شریک ہو سکتی ہیں۔[310] ان معاہدوں کے نتیجے میں پاکستان کو فوجی، معاشی اور غذائی اعانت ملنے لگی جس کی پاکستان کو اشد ضرورت تھی۔ دوست ممالک اور دولتِ مشترکہ کے ارکان ممالک سے تعلقات استوار ہوئے اور مسئلہ کشمیر پر پاکستان کی حمایت میں اضافہ ہوا۔ سہروردی خصوصیت سے امریکی امداد کے بڑے قدردان تھے اور اسے ایک سچے دوست کی بروقت اعانت قرار دیتے تھے کیونکہ پاکستان کی امداد کر کے امریکہ نے سلامتی کونسل میں مستقل رکن کی حیثیت سے اپنے کردار کو خطرے میں ڈال دیا تھا۔[311]

امریکی دفاعی امداد کا استعمال

محولہ بالا اہم کوششوں کے علاوہ سہروردی نے مشرقی یورپ کے ممالک سمیت متعدد ممالک میں تجارتی اور خیر سگالی کے وفود روانہ کئے۔ جنوری 1957ء میں دولتِ مشترکہ کے وزراء اعظم کی لندن کانفرنس کے دوران انہوں نے دیگر سربراہانِ حکومت سے گفت و شنید کی اور انہیں موثر طور پر پاکستان کی مشکلات سے آگاہ کیا۔ لندن سے سہروردی نے امریکہ کے لئے رختِ سفر باندھا جہاں انہوں نے آئزن ہاور اور امریکی عوام کو بھی یہی پیغام پہنچایا۔ امریکی کانگرس کے سامنے ان کا فی البدیہہ خطاب عالمی صورتحال کا فکر انگیز تجزیہ تھا۔ خطابت کے اس شاہکار پر کانگرس کے ارکان نے کھڑے ہو کر سہروردی کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ سہروردی امریکی حکومت سے یہ اجازت لینے میں کامیاب ہو گئے کہ امریکی فوجی امداد کو ہر طرح کی جارحیت کے خلاف استعمال کیا جا سکے گا۔[312]

امریکہ کے دورے کے بعد سہروردی نے مشرقی پاکستان کا دورہ کیا اور جگہ جگہ عوامی اجتماعات سے خطاب کر کے امریکہ نواز خارجہ پالیسی کی تائید حاصل کرنے کی کوشش کی، وہ ڈھاکہ کے منہ زور طلبہ اور عوامی لیگ کی حمایت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ مشرقی پاکستان کے دورے سے واپسی پر لاہور ہوائی اڈے پر انہوں نے اخبار نویسوں سے گفتگو کرتے ہوئے انکشاف کیا کہ امریکی فوجی امداد کو ہر طرح کی جارحیت کے خلاف استعمال کیا جا سکے گا۔ پاکستان میں امریکہ کے سفیر نے پشاور میں ایک بیان کے ذریعے سہروردی کے بیان کی تردید کر دی۔ سہروردی کو کراچی پہنچنے پر امریکی سفیر کے بیان کا علم ہوا۔ انہوں نے فوراً درخواست کی کہ خارجہ پالیسی پر بحث کی غرض سے چار روز کے لئے قومی اسمبلی کا اجلاس طلب کیا جائے۔ پھر انہوں نے امریکی صدر ڈیوائٹ، ڈی آئزن ہاور کو خط لکھا کہ اگر امریکی حکومت نے فوجی امداد

کے ہر قسم کی جارحیت کے خلاف استعمال کے بارے میں سہروردی کے خیالات کی توثیق نہ کی تو عوام میں امریکہ کے بارے میں وہ مثبت جذبات ختم ہو جائیں گے جو سہروردی نے بڑی محنت سے پیدا کئے تھے۔ انہیں اس مکتوب کا کوئی جواب نہ ملا۔ تاہم سہروردی نے قائدِ حزبِ اقتدار کی حیثیت سے تقریر کر کے خارجہ پالیسی پر بحث کا آغاز کر دیا انہوں نے اس تقریر میں امریکہ نواز خارجہ پالیسی کی حمایت کی تھی۔ دوسری طرف انہوں نے صدر آئزن ہاور پر ایک اور خط کے ذریعے زور دیا کہ وہ جلد از جلد اپنی حکومت کے ردِّ عمل سے آگاہ کریں کیونکہ قومی اسمبلی کا اجلاس صرف چار دن کے لئے بلایا گیا تھا۔

خارجہ پالیسی پر بحث کے آخری روز انہیں صدر آئزن ہاور کا تار موصول ہو گیا جس میں سہروردی کے نقطۂ نظر کی توثیق کی گئی تھی۔ چنانچہ قومی اسمبلی نے پہلی مرتبہ متفقہ طور پر سہروردی کی خارجہ پالیسی منظور کر لی۔ بایں ہمہ اکتوبر 1957ء میں سہروردی کے استعفیٰ کے دو ہفتے بعد امریکی حکومت نے یہ رعایت واپس لے لی۔ امریکی صدر نے ایوانِ نمائندگان سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ امریکہ کمیونسٹ جارحیت کے علاوہ کسی اور جارح کے خلاف اپنے ہتھیاروں کا استعمال برداشت نہیں کرے گا اور اگر ایسا کیا گیا تو امداد کی ترسیل پر پابندی عائد کر دی جائے گی۔

مسئلہ کشمیر

سرحدوں کی سلامتی کے بعد' پاک بھارت تعلقات میں دوسری اہم رکاوٹ مسئلۂ کشمیر نے پیدا کر رکھی تھی۔ 14 اگست 1947ء کو ہندوستان کی تقسیم کے وقت والیانِ ریاست کو موقع دیا گیا کہ وہ بھارت یا پاکستان میں شامل ہو جائیں حتیٰ کہ انہیں خود مختار رہنے کا متبادل بھی پیش کیا گیا تھا۔ قدرتی طور پر توقع کی جا رہی تھی کہ کشمیر پاکستان میں شامل ہو گا کیونکہ اس کی آبادی میں مسلمانوں کی اکثریت تھی اور اس کی سرحدیں پاکستان سے متّصل تھیں لیکن اس کے ہندو مہاراجہ' راجہ ہری سنگھ نے عوام کی خواہشات کے برعکس بھارت سے الحاق کر لیا اور پاکستان کی طرف سے قبائلیوں کے حملے کو پسپا کرنے کے لئے بھارتی افواج کو کشمیر بلا بھیجا۔ یوں مسئلہ کشمیر پیدا ہوا جو آج تک حل نہیں ہو سکا۔

سہروردی تہہِ دل سے کشمیر کے ضمن میں پاک بھارت کشیدگی کو کم کرنے کے خواہش مند تھے۔[213] انہوں نے کشمیر میں اقوامِ متحدہ کی امن فوج تعینات کرنے کی تجویز پیش کی۔ اس کے علاوہ انہوں نے اقوامِ متحدہ میں پاکستان کے مستقل مندوب کو ہدایت کی کہ اقوامِ متحدہ میں تنازعۂ کشمیر کو زیرِ بحث لانے کی درخواست کی جائے۔[314] اس بحث کے اختتام پر پیش کی جانے والی قرارداد کی روس کے علاوہ تمام ممالک نے تائید کی۔ پہلے روز جب قرارداد منظور کی گئی تو روس کے نمائندے نے کوئی رائے دینے سے احتراز کیا لیکن اگلے روز روس نے قرارداد کے اس حصے پر حقِ استعمال کیا جس میں کشمیر کے متعلق عملی اقدامات تجویز کئے گئے تھے۔ سلامتی کونسل نے صفر کے مقابلے میں دس آراء کے ساتھ پانچویں مرتبہ کشمیر میں استصواب

رائے کے انعقاد کا مطالبہ کیا نیز یہ تسلیم کیا کہ کشمیر کی کٹھ پتلی حکومت کو قطعاً یہ اختیار حاصل نہیں تھا کہ وہ ریاست کو ہندوستان میں شامل کر سکے۔ ہندوستانیوں کو روس کے کوئی واضح رائے دینے سے اجتناب پر خاصی مایوسی ہوئی کیونکہ خروشیف، بہ بانگِ دہل کشمیر پر بھارت کے حق کا اعلان کر چکے تھے تاہم عملی سیاست کے تلخ حقائق یہ تھے کہ روس ان دنوں مشرقِ وسطیٰ میں مسلم ممالک سے پینگیں بڑھا رہا تھا۔ اقوامِ متحدہ میں پاکستان کے حق میں ڈالی جانے والی آراء کی اکثریت کو پاکستان کی بہت بڑی سفارتی کامیابی سے تعبیر کیا گیا۔ سہروردی نے روسی حکومت سے رابطے کی غرض سے اپنا ذاتی ایلچی روس روانہ کیا۔ پاکستان کی اس "اخلاقی فتح" پر نہرو خاصے جزبز ہوئے۔[315]

اقوامِ متحدہ میں کامیابی سے سہروردی کو احساس ہوا کہ وہ عالمی سیاست میں نہرو کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے مختلف ممالک سے رابطہ کر کے نہرو کے عزائم اور ہٹ دھرمی کی وجوہات کو بے نقاب کرنے کا فیصلہ کیا۔ نہرو صرف اس لئے عالمی رائے عامہ کے علی الترغم کشمیر میں اقوامِ متحدہ کی زیرِ نگرانی استصواب کرانے سے کنّی کترا رہے تھے کیونکہ انہیں یقین تھا کہ استصواب رائے کی صورت میں کشمیری مسلمان پاکستان سے الحاق کے حق میں رائے دیں گے اور خود بھارت میں نہرو کی سیاسی حیثیت کا دھڑن تختہ ہو جائے گا۔[316] سہروردی نے ان حکومتوں پر واضح کیا کہ ماضی میں پاکستان اور بھارت کے درمیان دو طرفہ مذاکرات موخرالذکر کے عدم اخلاص کے باعث ناکام ہوتے رہے۔ چنانچہ آئندہ بھی اس قسم کی گفت و شنید سے کوئی نتیجہ بر آمد نہیں ہو گا۔[317] سہروردی نے ڈھاکہ پلٹن میدان میں ایک جلسۂ عام سے خطاب کرتے ہوئے بڑے پر اعتماد لہجے میں اعلان کیا کہ آئندہ ستمبر میں جنرل اسمبلی کے اجلاس میں مسئلۂ کشمیر پر بحث کے دوران اقوامِ متحدہ کے 81 ارکان میں سے 70 ممالک پاکستان کا ساتھ دیں گے اور بھارت کو صرف 11 ارکان کی حمایت حاصل ہو گی، گویا پہلی مرتبہ یہ امید پیدا ہو چلی تھی کہ کشمیر کا دیرینہ مسئلہ جلد ہی حل ہو جائے گا، در حقیقت خارجی اور داخلی محاذ پر پاکستان کی حیثیت تیزی سے بہتری کی طرف گامزن تھی۔ پوری قوم نئے احساسِ زندگی سے سرشار تھی اور عالمی برادری میں پاکستان کا نام عزت و احترام سے لیا جانے لگا تھا۔

استعفیٰ

اندرونِ ملک سہروردی کے بارے میں یہ خیال عام تھا کہ وہ سیاست اور سفارت کاری میں نہرو کے ہم پلہ سیاست دان ہیں۔ سہروردی یقینی طور پر نہرو سے بہتر پارلیمنٹرین اور مقرر تھے جبکہ سیاسی تنظیم کاری میں ان کا تجربہ نہرو سے کم نہیں تھا۔[318] اپنی سیاسی شہرت کے نصف النہار پر سہروردی ایک طرف تو مسئلۂ کشمیر پر عالمی رائے عامہ کی حمایت حاصل کر رہے تھے۔ دوسری طرف قومی رہنما کے طور پر ابھر رہے تھے چنانچہ رجعت پسند قوتوں نے جن کی نمائندگی مغربی پاکستان کے مفاد یافتہ تجارتی حلقے اور صدر سمیت نوکر شاہی کے کل پرزے کر رہے تھے، عام انتخابات سے بچنے کے لئے سہروردی کو اقتدار سے محروم کرنے

کی کوششیں شروع کر دیں[319]۔ کراچی کے ایوانِ صنعت و تجارت کے سالانہ عشائیے میں صدر سکندر مرزا مہمانِ خصوصی تھے۔ انہیں خطبۂ استقبالیہ پیش کرتے ہوئے ایوان کے صدر نے سہروردی حکومت کی معاشی پالیسیوں پر کڑی تنقید کی۔ ایوان کے صدر نے کہا "ہمارے سیاست دانوں نے ہر طرف گڑبڑ پیدا کر دی ہے۔ اصولِ مساوات نے نہ صرف ملکی سیاست کو متاثر کیا ہے بلکہ اس سے قوم کی معاشی زندگی پر بھی اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ سیاسی طور پر تو اصولِ مساوات ایک قابلِ عمل سمجھوتہ ہو سکتا ہے لیکن اہم معاشی عوامل کو مدِ نظر رکھے بغیر اقتصادی منصوبہ بندی میں اس اصول کے نفاذ سے قوم ایسی بند گلی میں داخل ہو جائے گی جہاں سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ملے گا۔[320]"

سہروردی نے زرِ مبادلہ کی تقسیم کے بارے میں مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان مساوات کا اصول نافذ کیا تھا کیونکہ سہروردی کا خیال تھا کہ ملک کے کسی حصے میں ترقی کی بنیاد دوسرے حصے کے استحصال پر نہیں ہونی چاہئے[321]۔ اس پر کراچی میں تجارتی حلقے آتش زیر پا ہو گئے اور انہوں نے سہروردی کی مخالفت کمر باندھ لی۔ یہ اختلافات اس وقت اور بھی شدید ہو گئے جب وزارتِ تجارت نے تجویز پیش کی کہ ملک کے دونوں حصوں کے درمیان بحری تجارت کے فروغ کے لئے سرکاری شعبے میں ایک شپنگ کارپوریشن قائم کی جائے۔ وزیرِ تجارت کا تعلق بنگال سے تھا[322]۔

جلد ہی مخلوط حکومت میں حلیف جماعتوں کے ساتھ بھی وزیرِ اعظم کے اختلافات پیدا ہونے لگے۔ صدر سکندر مرزا بظاہر مغربی پاکستان میں ون یونٹ کے مسئلے پر سہروردی کی حمایت کر رہے تھے لیکن ان کی جماعت ری پبلکن پارٹی اسے منسوخ کرنے کے درپے تھی۔ ری پبلکن پارٹی کے پارلیمانی قائد' وزیرِ خارجہ ملک فیروز خان نون نے لندن میں اعلان کیا کہ ون یونٹ کی منسوخی کی قرارداد کی حمایت کرنا انکے اور انکی پارٹی کے لئے عزت کا سوال ہے۔ ری پبلکن پارٹی کے دوسرے ارکان اور وزراء نے بھی اسی قسم کا رویّہ اپنا رکھا تھا۔ ون یونٹ کی مخالفت پر نیشنل عوامی پارٹی کے رہنما خان عبدالغفار خان کو شمال مغربی سرحدی صوبے میں بے حد مقبولیت حاصل ہو گئی۔ سندھ میں نیشنل عوامی پارٹی کے رہنما جی ایم سید نے ایسا رویّہ اختیار کیا جیسے انہیں پاکستان کی حکمرانی مل چکی ہو۔ انہوں نے سہروردی پر ایسی تنقید کی جو معمولی سیاست دانوں پر کی جاتی ہے۔ انہوں نے سندھ سے تعلق رکھنے والے سرکاری حکّام کا ایک اجلاس بھی بلایا اور انہیں یقین دلایا کہ مغربی پاکستان میں ون یونٹ نظام عنقریب ختم ہو جائے گا اور انہیں واپس سندھ میں لایا جائے گا۔ ری پبلکن پارٹی نے نیشنل عوامی پارٹی سے بھی سازباز شروع کر دی اور اس امر پر دونوں جماعتوں کا اتفاق ہو گیا کہ ون یونٹ کی منسوخی کے لئے قومی اسمبلی میں پیش ہونے والی قرارداد کی تائید کی جائے۔

ایسی صورتحال میں سہروردی کی حیثیت خاصی مخدوش ہو گئی۔ ری پبلکن پارٹی اور نیشنل عوامی پارٹی کے گٹھ جوڑ کا مقصد براہِ راست وزیرِ اعظم کی ذات' ان کی خارجہ پالیسی اور ون یونٹ کے بارے میں انکے نقطۂ نظر کی مخالفت کرنا تھا۔ اس سے وہ اتحاد ہی خطرے میں پڑ گیا جس پر سہروردی کی مخلوط وزارت کی

بنیاد تھی۔ سہروردی نے اس حملے کا پامردی سے مقابلہ کیا۔ان کا کہنا تھا کہ ون یونٹ کی منسوخی پاکستان کی تخلیق کے دس برس بعد تشکیل پانے والے آئین کی جڑیں کھودنے کے مترادف ہوگی۔ ملک کی تاریخ میں پہلی بار عام انتخابات اور ان کے نتیجے میں ملک پر مسلط غیر نمائندہ قیادت سے چھٹکارے کے ضمن میں ان کی مساعی کاانحصار بھی 1956ء کے آئین پر تھا۔[323] اس امر میں کوئی شک نہیں کہ ون یونٹ کادفاع کرنے پر پنجاب میں انہیں کئی حلقوں کی حمایت حاصل ہوئی اور فقید المثال عوامی حمایت کے اظہار سے سہروردی کو یقین ہو گیا کہ وہ ملک کے پہلے عام انتخابات میں کامیابی سے ہمکنار ہوں گے لیکن مفاد یافتہ عناصر کو ایک بنگالی سیاست دان کی کامیابی گوارا نہیں تھی چنانچہ سہروردی کا اقتدار سے محروم ہونا ناگزیر ہو گیا۔
10راکتوبر 1957ء کو سہروردی مغربی پاکستان کا دورہ مکمل کر کے کراچی واپس پہنچے توانہیں محلاتی سازشوں اور جوڑ توڑ کے بادشاہ صدر سکندر مرزا نے بلا بھیجا۔ سہروردی نے مغربی پاکستان کے دورے میں رائے عامہ کو ون یونٹ کی حمایت کرنے پر ابھارا تھا۔ سکندر مرزا نے ری پبلکن پارٹی کی طرف سے ایک خط سہروردی کے حوالے کیا جس میں ری پبلکن پارٹی نے قومی اسمبلی میں سہروردی کی حمایت واپس لینے کا اعلان کیا تھا اور سہروردی کی کابینہ پر بد عنوانی کے توہین آمیز الزامات عائد کئے تھے۔ خط کے آخر میں اصل معاملہ کھل کر سامنے آ گیا۔ ری پبلکن پارٹی نے ون یونٹ کے مسئلے پر سہروردی کے رویئے کو مخلوط وزارت کی ناکامی کا ذمّہ دار قرار دیا حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ جب نیپ اور ری پبلکن پارٹی کے درمیان سہروردی کی رائے کے برعکس ون یونٹ کی منسوخی پر اتفاق رائے ہو گیا توری پبلکن پارٹی نے از خود مخلوط وزارت توڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ 10راکتوبر کی رات سہروردی نے صدر کے نام ایک خط ارسال کیا جس میں درخواست کی گئی تھی کہ وہ مجلسِ قانون ساز کا اجلاس بلائیں جہاں پر سہروردی اعتماد کا ووٹ حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔سہروردی نے تجویز پیش کی کہ ایوان کا اجلاس 24راکتوبر کو طلب کر لیا جائے۔ وزیرِ اعظم کے مشرقی پاکستان سے تعلق رکھنے والے رفقاء نے انکی خواہش کے برعکس یہ خبر قومی اخبارات کو جاری کر دی۔ اگلی صبح صدر نے اخبارات میں یہ خبر پڑی اور قومی اسمبلی کا اجلاس بلانے سے انکار کر دیا اور سہروردی سے مطالبہ کیا کہ وہ ساڑھے دس بجے تک استعفیٰ دے دیں ورنہ انہیں برطرف کر دیا جائے گا۔ سہروردی نے صرف تیرہ ماہ برسرِاقتدار رہنے کے بعد برطرفی کی ذلّت سے بچنے کے لئے صدر کی خواہش پر استعفیٰ دے دیا۔ سہروردی کے استعفیٰ کی خبر اتنی اچانک اور وحشت انگیز تھی کہ پوری قوم دم بخود رہ گئی۔کراچی یونیورسٹی کے طلبہ نے شہر کے ممتاز ترین انگریزی روزنامے "ڈان" میں پورے صفحے کا طنزیہ اشتہار شائع کیا جس میں وزیرِ اعظم پاکستان کے "عارضی ترین عہدے" کے خواہش مند امیدواروں سے درخواستیں طلب کی گئی تھیں۔ امیدواروں کو نوٹس کے بغیر برطرفی کے لئے تیار رہنا تھا۔[324]
صدر اور ری پبلکن پارٹی کے قائدین سہروردی کو قومی اسمبلی میں اپنی قوت آزمانے کا موقع فراہم کرنے کے حق میں نہیں تھے کیونکہ انہیں خدشہ تھا کہ اس سے خود ری پبلکن پارٹی میں دراڑیں پڑ سکتی ہیں اور عین ممکن ہے سیاسی جماعتوں کے جوڑ توڑ سے نئی مخلوط حکومت سامنے آجائے۔ مزید برآں

ایسی صورت میں قومی اسمبلی وزارت سازادارے کے طور پر سامنے آجاتی۔ یہ امکان ہی صدر سکندر مرزا اور ان کے ٹولے کے لئے سوہانِ روح تھا۔

صدر چھ روز تک مسلم لیگ اور ری پبلکن پارٹی کی قابلِ عمل مخلوط وزارت کے قیام کے لئے سرتوڑ کوشش کرتے رہے۔ ری پبلکن پارٹی اور مسلم لیگ میں اینٹ کتّے کا بیر چلا آرہا تھا اور دونوں جماعتیں ایک دوسرے کے خلاف زہرافشانی کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی تھیں۔ اب مسلم لیگ کے اسماعیل ابراہیم چندریگر کو اس یقین پر چھٹا وزیراعظم بننے پر آمادہ کر لیا گیا کہ جداگانہ طریق انتخاب کو آئندہ انتخابات کی اساس قرار دیا جائے یہ ایک اور قلابازی تھی چونکہ مخلوط انتخابات کا اصول ری پبلکن پارٹی کے بنیادی منشور کا حصہ تھا اور خود مسلم لیگ مری کے مقام پر مخلوط انتخابات کے اصول کو تسلیم کر چکی تھی۔

چنانچہ اس نتیجے پر پہنچنے کے لئے کسی گہرے سیاسی تجزیئے کی ضرورت نہیں رہتی کہ محض سہروردی کو اقتدار سے باہر رکھنے کے لئے مسلم لیگ نے ری پبلکن پارٹی کے لئے نرم گوشہ پیدا کر لیا اور ری پبلکن پارٹی نے بھی اسی مقصد کے پیشِ نظر مخلوط انتخاب کے اصول کا سودا کر لیا۔ جداگانہ طریقِ انتخاب کی منظوری کو جواز بنا کر مسلم لیگ اپنے حامیوں سے مخلوط حکومت کی تائید کروا سکتی تھی۔ جداگانہ طریقِ انتخاب پر مسلم لیگ کے اصرار کی وجہ یہ تھی کہ اس سے مسلم لیگ مذہب انتہاپسندی اور فرقہ وارانہ نفرت کے شعلے بھڑکا کر مسلمان رائے دہندگان کے خاصے بڑے حصے کو متاثر کر سکتی تھی۔ ادھر ری پبلکن پارٹی کے لئے طریقِ انتخاب کی کوئی خاص اہمیت نہیں تھی اور وہ ضرورت پڑنے پر کسی بھی طریقِ انتخاب کی حمایت کر سکتی تھی اس جماعت نے مغربی پاکستان میں مخلوط انتخابات کے حق میں رائے عامہ بھی تیار نہیں کی تھی دراصل اپنی مخصوص محلاتی نوعیت اور غیر سیاسی تنظیم کے باعث یہ جماعت ایسے کام کی اہل بھی نہیں تھی۔ یوں بھی 98 فیصد مسلم آبادی پر مشتمل مغربی پاکستان کو طریقِ انتخاب سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ اس مسئلے کا براہِ راست تعلق مشرقی پاکستان سے تھا اور ری پبلکن پارٹی ہوسِ اقتدار میں مشرقی پاکستان سے منہ موڑنے پر ہمہ وقت تیار تھی۔

سہروردی کو اقتدار سے باہر رکھنے کے لئے ری پبلکن پارٹی مسلم لیگ کی حلیف بننے پر آمادہ ہو گئی۔ وزارتِ عظمیٰ بھی مسلم لیگ کو جھینٹ کر دی گئی لیکن اسمبلی میں ری پبلکن پارٹی کے ارکان کی تعداد 22 سے 24 تک تھی چنانچہ ری پبلکن پارٹی جب چاہتی مسلم لیگ کا کان مروڑ سکتی تھی۔ تاہم اس مخلوط وزارت کی تشکیل میں سب سے زیادہ ہاتھ صدر کے دباؤ کا تھا۔ سکندر مرزا کا خیال تھا کہ مستقبل میں صدر کے عہدے پر دوبارہ انتخاب کے لئے صرف ایک ہی سیاسی جماعت پر بھروسہ کیا جاسکتا ہے اور اس کا نام مسلم لیگ تھا۔ اقتدار سے ہم آغوش ہونے کے بعد مسلم لیگ نے اس ڈھٹائی سے اپنے سیاسی مخالفین کو ہراساں کرنا شروع کیا کہ خود ری پبلکن پارٹی بھی خوفزدہ ہو گئی۔ چندریگر نے 28 نومبر 1957ء کو قومی اسمبلی کا اجلاس طلب کیا اور دوٹوک الفاظ میں اعلان کیا کہ اگر وہ اس تاریخ تک جداگانہ انتخاب کا قانون منظور نہ کروا سکے تو مستعفی ہو جائیں گے۔ ری پبلکن پارٹی کے ارکان کو اندیشہ تھا کہ اگر انہوں نے

جداگانہ انتخاب کے سوال پر مسلم لیگ کی تائید کی تو ایک علیحدہ جماعت کے طور پر ان کا وجود خطرے میں پڑ جائے گا اور انہیں بالاخر مسلم لیگ میں مدغم ہونا پڑے گا۔ صدر بھی اس سمت میں دباؤ ڈال رہے تھے۔ ری پبلکن پارٹی کے رہنماؤں اور کارکنوں کو خوف تھا کہ مسلم لیگ میں ادغام کے بعد انہیں ایک ایک کر کے جماعت سے باہر نکالا جائے گا اور یوں انکے سیاسی کردار کو نیست و نابود کر دیا جائے گا۔ ان ارکان نے قبل ازیں مسلم لیگ کو داغِ مفارقت دیکر اقتدار قبول کیا تھا اور مسلم لیگ اتنی وسیع القلب نہیں تھی کہ ایسے جرم کو ٹھنڈے پیٹوں برداشت کر لے۔ ری پبلکن پارٹی کی تنظیمی کمیٹی نے 17 نومبر کو لاہور میں اپنا اجلاس منعقد کیا جس میں مسلم لیگ سے اتحاد کے بارے میں ری پبلکن قائدین کے فیصلے پر نکتہ چینی کی گئی۔ اجلاس میں ایک قرار داد منظور کی گئی جس میں قائدین پر زور دیا گیا کہ مسلم لیگ کے ساتھ جداگانہ طریقِ انتخاب پر مفاہمت سے قبل مشرقی پاکستان کا دورہ کر کے عوام کی اکثریت رائے کا تعین کیا جائے۔[326] چندریگر نے اپنے واضح اعلان کے باجود 28 نومبر کو طریقِ انتخاب کا قانون اسمبلی میں پیش نہیں کیا۔

تاہم قومی اسمبلی کے اجلاس کے دوران کراچی میں مسلم لیگ کے مقامی رہنماؤں نے پارلیمنٹ ہاؤس کے باہر ایک مظاہرہ کیا۔ مظاہرین نے موقع پر موجود ڈاکٹر خاں صاحب اور ری پبلکن پارٹی کے دیگر ارکان کی توہین کی۔ ڈنڈوں اور پتھروں سے سہروردی کی کار کی ونڈسکرین پاش پاش کر دی گئی۔ مظاہرین کی اکثریت پرجوش نوجوانوں پر مشتمل تھی جو جداگانہ انتخابات کو پاکستان کے وجود کا لازمہ قرار دے رہے تھے۔ انہوں نے مخلوط انتخابات کو غیر اسلامی قرار دیتے ہوئے اعلان کیا کہ اس طریقِ انتخاب سے تصورِ پاکستان کی جڑیں کھوکھلی ہو جائیں گی اور ہندوؤں کی بالادستی کا راستہ ہموار ہو جائے گا۔ مظاہرین نے مخلوط انتخابات کی حمایت کرنے والوں کو غدّار اور واجب القتل قرار دیا۔ وزیر اعظم چندریگر نے مظاہرین سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ان کے مظاہرے کے مقاصد پورے ہو چکے ہیں لہٰذا انہیں منتشر ہو جانا چاہئے۔[327] اس مظاہرے سے ری پبلکن پارٹی وحشت زدہ ہو گئی۔ صدر نے اپنی قسمت مسلم لیگ سے وابستہ کر لی تھی۔ انہوں نے ری پبلکن پارٹی پر دباؤ ڈالا کہ جداگانہ انتخاب، مسلم لیگی وزیر اعظم اور انکے 11 رار کان اسمبلی کی حمایت کی جائے۔ ری پبلکن رہنماؤں کو احساس تھا کہ وہ مغربی پاکستان میں اپنی وزارت قائم رکھنے پر قادر نہیں ہیں اور مسلم لیگ انہیں مات دے دے گی۔ تاہم سہروردی نے ری پبلکن پارٹی کو یقین دہانی کروائی کہ اگر وہ مسلم لیگ سے قطع تعلق کر لے تو وہ وزارت کی تشکیل میں ری پبلکن پارٹی کی حمایت کرنے کے لئے تیّار ہیں لیکن انہوں نے واضح کیا کہ وہ خود یا ان کی جماعت عوامی لیگ کے ارکان کوئی وزارت قبول نہیں کریں گے۔

مجلسِ قانون ساز کا اجلاس 11 دسمبر تک ملتوی کر دیا گیا۔ اس وقت تک ری پبلکن پارٹی مخلوط انتخابات کی حمایت کا فیصلہ کر چکی تھی اور چندریگر کو اقتدار سنبھالنے کے صرف دو ماہ بعد استعفیٰ دینے پر مجبور ہونا پڑا۔ صدر سکندر مرزا چندریگر وزارت کی ناکامی کے بعد بھی اقتدار سے چمٹے رہنے پر مصر تھے۔ چنانچہ انہوں نے اس امید پر چندریگر کو نئی وزارت بنانے کی دعوت دے ڈالی کہ وہ کسی طور ری پبلکن پارٹی

کے ارکان کو جداگانہ طریقِ انتخاب قبول کرنے کے لئے دباؤ میں لے آئیں گے۔ جلد ہی سکندر مرزا کو احساس ہو گیا کہ ری پبلکن ارکانِ اسمبلی کے ارادے خطرناک تھے اور وہ ان کے اشارۂ ابرو پر چلنے کے لئے آمادہ نہیں تھے۔ دوسری طرف غیر نمائندہ وزیراعظم کی مسلسل حمایت کے باعث وہ خود بھی تضحیک کا نشانہ بن رہے تھے، آخر خاصے تذبذب کے بعد انہوں نے ری پبلکن پارٹی کے قائد فیروز خان نون کو پاکستان کے ساتویں وزیراعظم کے طور پر وزارت تشکیل دینے کی دعوت دیدی۔

فیروز خان نون مشرقی پاکستان کے گورنر اور سہروردی کی کابینہ میں وزیر خارجہ رہ چکے تھے۔ انہوں نے 16 دسمبر 1957ء کو ری پبلکن پارٹی کی وزارت تشکیل دی انہیں عوامی لیگ کی اخلاقی حمایت بھی حاصل تھی جو ملک میں جلد از جلد عام انتخابات کے انعقاد کے ساتھ مشروط تھی۔ نئے وزیراعظم نے وسط فروری 1959ء کو مدّت سے تعویق میں چلے آ رہے عام انتخابات کے لئے آخری تاریخ قرار دیا۔

فوجی آمریت

عام انتخابات کے آثار دیکھ کر صدر سکندر مرزا ایک بار پھر وحشت زدہ ہو گئے۔ ذاتی مفادات کے باعث انہیں عام انتخابات کے نام سے بھی ہول آتا تھا۔ ستم ظریفی تو یہ ہے کہ سہروردی نے بعد ازاں متعدد مواقع پر بیان کیا کہ عوامی لیگ نے آئندہ عام انتخابات میں کامیابی کی صورت میں صدارتی اختیارات میں کافی زیادہ تخفیف کے ساتھ سکندر مرزا کو صدر کے عہدے پر برقرار رکھنے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔[328] بایں ہمہ 17 اکتوبر 1958ء کو ایک غیر معمولی قدم اٹھاتے ہوئے صدر سکندر مرزا نے اپنے ہی آئین کو منسوخ کر دیا اور کلی اقتدار کے مالک بن بیٹھے، وفاقی اور صوبائی حکومتیں برطرف کر دی گئیں اور پورے ملک میں مارشل لاء نافذ کر دیا گیا۔[329] پاکستانی فوج کے سربراہ جنرل ایوب خاں کو چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر مقرر کیا گیا۔ صدر نے اعلان کیا "میں غدّاروں کو مشورہ دیتا ہوں کہ موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ملک چھوڑ کر بھاگ جائیں۔"[330] صدر کے اس اعلان کا سب سے پہلا نشانہ خود صدر کی اپنی ذات ثابت ہوئی۔ صرف 20 روز بعد 27 اکتوبر 1958ء کو چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر ایوب خاں نے ایک اور بغاوت کے ذریعے صدر کو پستول کی نوک پر استعفیٰ دینے پر مجبور کر دیا اور انہیں 24 گھنٹوں کے اندر اندر ملک سے نکلنا پڑا۔[331] یوں نوکر شاہی کی بغاوتوں کا عہد ختم ہو گیا۔ سازش اور حیلہ سازی کو علم و ریا کا درجہ دینے والے سکندر کے دور کا انجام فوجی آمریت کی شکل میں سامنے آیا اور ملک میں جمہوریت کے بچے کھچے آثار بھی معدوم ہو گئے۔[332] پاکستان اتھاہ تیرگی کے عہد میں داخل ہو گیا۔

اپنی وزارتِ عظمٰی کے دوران ایک بار سہروردی نے جنرل ایوب سے ان افواہوں کے بارے میں استفسار کیا کہ فوج بغاوت کرنے پر غور کر رہی ہے۔ ایوب خاں نے جواب دیا "جناب! اگر کسی نے بغاوت کرنا چاہی تو اسے میری لاش پر سے گزرنا ہو گا۔"[333] ابتدا میں ایوب خاں نے اعلان کیا کہ وہ غیر معینہ مدّت تک برسرِاقتدار رہنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا اور جونہی سیاسی فضا سازگار ہو گی، اقتدار سیاست دانوں

کے سپرد کر دیا جائے گا۔ سہروردی نے اس وقت بھی ذاتی دوستوں کی محفل میں پیش گوئی کی تھی کہ ایوب خان دس برس تک برسرِ اقتدار رہے گا۔ ان کی یہ پیش گوئی حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی۔[334]

اس طرح ایوب خان راج سنگھاسن پر براجمان ہو گئے۔ قبل ازیں وہ محمد علی بوگرہ کی وزارت میں وزیرِ دفاع کے طور پر اقتدار کا ذائقہ چکھ چکے تھے۔ اس کے بعد وہ کھلے عام یا خفیہ طور پر اعلیٰ سطحی سیاست میں مسلسل دخل انداز رہے۔

ایبڈو اور قید و بند

مطلق العنان حکمران بننے کے بعد ایوب خان نے 17 راگست 1959ء کو نافذ ہونے والے ایسکٹوباڈیز ڈسکوالیفکیشن ایکٹ کے تحت آزمودہ سیاست دانوں پر سات سال کے لئے سیاست میں حصہ لینے پر پابندی عائد کر دی۔ جولائی 1960ء میں سہروردی پر بھی ایبڈو کا وار کیا گیا۔ یہ معاملہ یہیں ختم نہیں ہوا۔ سیاست سے بے دخلی کے بعد سہروردی مکمل طور پر قانونی پریکٹس میں مشغول تھے کہ انہیں رسمی طور پر کوئی الزام عائد کئے بغیر 30 جنوری 1962ء کو گرفتار کر لیا گیا۔ ایوب خاں نے کوئی مخصوص الزام عائد کرنے سے اس لئے اجتناب کیا تھا کہ ایسی صورت میں ان پر مقدمہ چلانا لازم ہو جاتا۔ یکم مارچ کو ایوب خاں اپنا ایک شخصی آئین نافذ کرنا چاہتے تھے جس کے بعد انہیں بنیادی جمہوریتوں کے اسی ہزار نمائندوں کی مدد سے پاکستان کی گردن پر سوار رہنے کا جواز مل جاتا چنانچہ آئین کے نفاذ سے ایک مہینہ پیشتر سہروردی کو ملک دشمن سرگرمیوں کے نام نہاد الزام کی بنا پر گرفتار کر لیا گیا۔ اس سے قبل دسمبر 1961ء میں ایوب خان نے لاہور میں سہروردی سے نجی طور پر رابطہ کر کے مجوزہ آئین پر ان کی رائے مانگی تھی۔ سہروردی نے ایوب خاں کو بتایا کہ جمہوریت کی بحالی کا وقت آ چکا ہے چنانچہ 1956ء کے آئین کو بحال کر دینا چاہیے کیونکہ اب وہ وجوہات ختم ہو چکی ہیں جن کی بنا پر اس آئین کو منسوخ کیا گیا تھا یوں ایوب خان کے مجوّزہ آئین کی مخالفت کر کے سہروردی نے گویا اپنی گرفتاری پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی تھی۔[335] سہروردی کی طرف سے مجوّزہ آئین کی مخالفت کے اندیشے کے پیشِ نظر ایوب خاں نے انہیں گرفتار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ سہروردی کی عمر 70 برس ہو چکی تھی۔ ان کی گرفتاری ایوب کے چار سالہ فوجی عہدِ حکومت کا احمقانہ ترین اقدام تھا۔ مشرقی پاکستان کے طلبہ نے متفقہ طور پر اس گرفتاری کے خلاف احتجاج کیا۔ یونیورسٹیاں بند ہو گئیں اور ہڑتال کا اعلان کر دیا گیا۔ حکومت نے اندھا دھند گرفتاریوں اور سیاسی جبر و تشدّد کے ذریعے اس احتجاج کا جواب دیا۔

حکومت نے اس گرفتاری کے جواز میں جو الزامات عائد کئے تھے۔ سہروردی نے ایوب خاں کے نام ایک تند و تیز مکتوب میں ان کا جواب دیتے ہوئے لکھا

"جنابِ صدر، معاف کیجئے گا لیکن میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ مجھے اس قدر قریب سے جاننے کے باوجود آپ نے میری حبّ الوطنی کو مشکوک قرار دینے والے ان بیانات، کینہ آمیز اشاروں اور مبنی

بر دروغ الزامات کو کیسے قابلِ اعتنا سمجھ لیا جو یقیناً آپ تک پہنچائے گئے ہوں گے۔ میرا اشارہ نظر بندی کی سرکاری وجوہات کی طرف نہیں ہے کیونکہ ان وجوہات میں دیئے گئے الزامات تو اس قدر لغو اور بچگانہ ہیں کہ وہ میری نظر بندی کی اصل بنیاد نہیں ہو سکتے۔ یقیناً آپ کے ذہن کو کچھ اور تہمتوں کی مدد سے زہر آلود کیا گیا ہے۔ میری گرفتاری سے اگلے ہی روز آپ نے اخبار نویسوں سے بات چیت کے دوران میری نظر بندی کی جو وجوہات بیان کی تھیں ان میں سے ایک بھی اس فہرست میں شامل نہیں جو میرے حوالے کی گئی ہے چنانچہ یہ واضح ہے کہ میری گرفتاری کی اصل وجوہات سرکاری طور پر مجھے مہیّا کی جانے والی وجوہات سے مختلف ہیں......... جنابِ صدر، امید ہے کہ آپ برا نہیں منائیں گے اگر میں یہ کہوں کہ میرے متعلق آپ کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ میری نظر بندی کی اصل بنیاد یہ خدشہ ہے کہ اگر میں جیل سے باہر رہا تو مستقبل قریب میں نافذ ہونے والے آئین پر عمل در آمد میں کھنڈت ڈالوں گا۔ ورنہ اس بیان میں اس خدشے کے اظہار کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ جس میں آپ نے میری گرفتاری کی وجوہات بیان کی تھیں۔

سہروردی نے صدر کے نام لکھا "جنابِ صدر، اسے ایک بار پھر دل پر ہاتھ رکھ کر دہرایئے اور اللہ ہمارے درمیان خود ہی انصاف کرے گا۔ اس دنیا میں یا اگلے جہان میں، کیونکہ اگر آپ کے یہی جذبات ہیں تو پھر مجھے زندہ رہنے کا حق نہیں پہنچتا۔"

قیامِ پاکستان کی جدوجہد میں اپنے کردار کا ذکر کرتے ہوئے سہروردی نے صدر کو مطلع کیا "جنابِ صدر، شاید آپ کو علم نہ ہو اس لئے میں آپ کو بتائے دیتا ہوں کہ پاکستان میری زندگی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میں نے اس ملک کی تخلیق میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ مسلم اکثریتی صوبوں میں بنگال وہ واحد صوبہ تھا جس نے قائدِاعظم کو مسلم لیگ کی وزارت دی تھی۔ بنگال قائدِاعظم کے ہاتھ میں ترپ کا وہ پتہ تھا جس کے باعث کانگرس کو تقسیمِ ہند قبول کرنا پڑی، مسلم لیگ کو بنگال میں قابلِ قبول بنانے کے لئے اور مطالبہ پاکستان کی پذیرائی کی خاطر مجھے اپنے معاش، صحت اور سلامتی کو خطرے میں ڈال کر دن رات کام کرنا پڑا۔"

مئی 1962ء میں نئے آئین کے تحت ملک میں عام انتخابات منعقد ہوئے۔ اس آئین کے تحت وفاقی طرز کی وحدانی حکومت قائم ہونا تھی اور بنیادی جمہوریتوں کے 80000 ارکان نے قومی اسمبلی کو منتخب کرنا تھا چونکہ بنیادی جمہوریتوں کے بالواسطہ نظام کے تحت عوام کے حقیقی نمائندوں کا اسمبلی میں پہنچنا ممکن نہیں تھا لہٰذا مشرقی پاکستان میں تمام سیاسی جماعتوں نے انتخابات کا بائیکاٹ کر دیا۔ بہر حال، عام انتخابات کے انعقاد کے بعد 8 جون کو مارشل لا اٹھا لیا گیا۔ سولہ روز بعد 24 جون کو مشرقی پاکستان کے نو ممتاز رہنماؤں نے مشترکہ طور پر مطالبہ کیا کہ آئین کو منسوخ کر دیا جائے اور حقِ بالغ رائے دہی کے ذریعے منتخب ہونے والے نمائندوں کو نئے آئین کی تشکیل کی ذمّہ داری سونپی جائے۔ سہروردی کی رہائی کا مطالبہ بھی زور پکڑنے لگا۔ آخر کار عوامی دباؤ کی تاب نہ لا کر صدر نے سہروردی کو 19 اگست کو رہا کر دیا۔ انہیں چھ ماہ اور بیس روز تک قیدِ تنہائی میں رکھا گیا تھا۔ یہیں پر انہیں عارضۂ قلب لاحق ہوا اور وہ کبھی صحت یاب نہ ہو سکے۔

ستم ظریفی کی بات ہے کہ صدر ایوب نے سہروردی کو گرفتار کر کے بزعم خود جو تحفّظ حاصل کیا تھا اسے بعد ازاں خاصا دھچکا پہنچا۔ ایوب خاں نے اپنے خود ساختہ آئین پر سہروردی کے متوقع شدید ردِّ عمل سے گھبرا کر انہیں گرفتار کر لیا تھا لیکن پھر انہیں سہروردی کے بچوں کے ساتھ انکے والد کی رہائی کے بارے میں مضحکہ خیز سودے بازی کی خفّت اٹھانا پڑی۔[336] 19 راگست کی سہ پہر کو وزیر خارجہ محمد علی بوگرہ نے سہروردی کے دو بچوں بیگم اختر سلیمان اور راشد سہروردی سے رابطہ کیا اور ان سے درخواست کی کہ وہ ان سے فوری طور پر دفترِ خارجہ میں ملیں۔ لندن میں زیرِ تعلیم راشد سہروردی حال ہی میں پاکستان پہنچے تھے۔ مشرقی پاکستان سے تعلق رکھنے والے محمد علی بوگرہ نے سہروردی کی گرفتاری کے بعد سے مشرقی پاکستان میں قدم رکھنے کی جرأت نہیں کی تھی کیونکہ انہیں اندیشہ تھا کہ مشرقی پاکستان کے عوام ان کا کالی جھنڈیوں اور مخالفانہ نعروں سے سواگت کریں گے۔ بیگم سلیمان اور راشد سہروردی کے وزیرِ خارجہ کی رہائش گاہ پر پہنچنے کے بعد جو کچھ ہوا وہ اس قدر مضحکہ خیز تھا کہ اس سے قطعاً یہ اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ ان واقعات سے قوم کی قسمت اور ایک بہت قد آور سیاسی شخصیت کی زندگی پر گہرے اثرات مرتب ہو سکتے ہیں۔ بوگرا نے ہاٹ لائن پر راولپنڈی میں صدر ایوب سے رابطہ کیا اور ایوب نے اپنے تحکّمانہ لہجے میں سہروردی کے بچوں کو مطلع کیا کہ وہ ان کے والد کو رہا کرنے پر تیار ہیں بشرطیکہ سہروردی یہ یقین دہانی کروا دیں کہ وہ آئندہ چھ ماہ تک مشرقی پاکستان کا دورہ نہیں کریں گے۔ وزیرِ خارجہ کی سرکاری گاڑی میں بیگم سلیمان اور راشد سہروردی کراچی جیل پہنچے اور اپنے والد کو صدر کا پیغام پہنچایا۔ سہروردی کا ردِّ عمل قطعاً غیر متوقع نہیں تھا وہ کسی قسم کی شرط تسلیم کرنے پر رضامند نہیں تھے۔ ان لوگوں نے واپس وزیرِ خارجہ کی رہائش گاہ پر پہنچ کر ایوب خاں سے رابطہ کیا اور انہیں اپنے والد کے ردِّ عمل سے آگاہ کیا۔ ایوب خاں نے کچھ نرم پڑتے ہوئے اس میعاد کو تین ماہ کر دیا۔ راشد اور بیگم سلیمان دوبارہ جیل پہنچے۔ وزیرِ خارجہ کا حفاظتی دستہ آگے آگے کراچی کی پر ہجوم سڑکوں پر راستہ صاف کرتا جا رہا تھا۔ جیل میں سہروردی کو ایوب کے رویئے میں لچک کی اطلاع دی گئی ”نہیں، بالکل نہیں۔ اسے بتادو کہ میں یہاں بالکل خوش و خرم ہوں، اپنی ٹیپس اور فلموں کی تدوین کر رہا ہوں اور کتابیں پڑھتا ہوں، مجھے کوئی عجلت نہیں ہے۔“ بوگرہ کی رہائش گاہ پر پھر سے ٹیلی فون کیا گیا۔ صدر ایوب نے کہا ”صرف ایک مہینہ، مجھے یقین ہے اسے ایک مہینے کی میعاد پر کوئی اعتراض نہیں ہو گا“ کسی کو صدر کے لہجے پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

ایک بار پھر سے ٹریفک کے جنگل میں سے گزرتے ہوئے بیگم سلیمان اور راشد سہروردی جیل پہنچے اور نفی میں جواب لیکر واپس چلے آئے۔ ایوانِ صدر میں فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس بار صدر ایوب اس زور سے دھاڑے کہ ٹیلیفون کے بغیر ہی ان کی آواز سنائی دے سکتی تھی ”دو ہفتے‘ دو ہفتے کی مدّت پر تو اسے آمادہ ہو جانا چاہیئے“ پولیس والے بھی اس بار بار کی آمدورفت سے گڑبڑا چکے تھے۔ بیگم سلیمان اور راشد نے سہروردی سے درخواست کی کہ وہ اس میعاد کو تسلیم کر لیں۔ راشد نے شرارت سے کہا ”ابّا“ کم از کم آپ کو پیٹرول کے زیاں کا ہی خیال کرنا چاہیئے“۔ ایوب کی نئی تجویز پر سہروردی نے ایک زوردار قہقہہ

لگایا۔ صورتِ حال کے مہمل پن پر ہنستے ہنستے ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ آخر انہوں نے جواب دیا "اسے بتادو کہ مجھے یہ شرط منظور ہے کیونکہ مجھے رہائی کے بعد طبّی معائنے کے لئے مہینہ بھر ہسپتال میں رہنا ہو گا"چنانچہ فیدیو کے طربیے کو شرمانے والے اس تماشے کے نتیجے میں ان کی سات ماہ پر محیط قیدِ تنہائی اپنے اختتام کو پہنچی۔

شہید جمہوریت

جیل سے رہائی کے بعد پہلی فرصت میں سہروردی 16 ستمبر کو ڈھاکہ پہنچ گئے۔ ہوائی اڈّے پر اپنے استقبال کے لئے آنے والے ہجوم کے جوش و خروش کو دیکھ کر سہروردی نہایت متاثر ہوئے۔ خیر مقدم کے لئے آنے والوں کی تعداد اس قدر زیادہ تھی کہ ان کے طیّارے کو ہوائی اڈّے سے پون میل کے فاصلے پر رکنا پڑا۔ سہروردی نے عوام سے خطاب کرتے ہوئے انہیں تلقین کی کہ وہ متحد رہیں اور پاکستان میں بحالئ جمہوریت کی تحریک میں ہراول دستے کا کردار ادا کریں۔ سہروردی مدت العمر سے روشن خیال جمہوریت پسند چلے آ رہے تھے۔ انہوں نے بغیر وقت ضائع کئے ایوب خاں کی مخالف تمام سیاسی جماعتوں سے رابطہ کیا اور انہیں لاہور سے منعقد ہونے والے کنونشن میں شرکت پر آمادہ کر لیا۔ 5 اکتوبر 1962ء کو نیشنل ڈیموکریٹک فرنٹ (قومی جمہوری محاذ) کی تشکیل کا اعلان کیا گیا۔[337] اسی روز چون رہنماؤں کے دستخطوں کے ساتھ ایک بیان جاری کیا گیا۔ جس میں قومی جمہوری محاذ کو پاکستان میں بحالئ جمہوریت کی تحریک قرار دیا گیا۔ سہروردی سیاسی جماعتوں کے احیاء کے حق میں نہیں تھے۔ کیونکہ ان کا خیال تھا کہ مختلف سیاسی مقاصد کی بنا پر سیاست دانوں کا اتحاد قائم نہیں رہ سکے گا۔ ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالا جائے گا اور بحالئ جمہوریت کے مقصد واحد پر توجہ مرکوز رکھنا مشکل ہو جائے گا۔ سہروردی نئے آئین کی منسوخی کے مطالبے کے بھی حق میں نہیں تھے کیونکہ ایسی صورت میں غیر ضروری طور پر آئینی خلاء پیدا ہو جاتا اور حکومت کو موقع مل جاتا کہ غیر جمہوری عہد کو طوالت دے سکے۔

سہروردی نے محاذ کے رہنماؤں کے ساتھ ملک کے طول و عرض کا دورہ کیا۔ بحالئ جمہوریت کی مہم سے سیاسی فضا ایسی متحرک ہوئی کہ ایوب خان کو بحالئ جمہوریت کے مطالبے کا جائزہ لینے کے لئے اعلیٰ اختیاراتی کمیشن مقرّر کرنا پڑا۔ اس کمیشن کو یہ دیکھنا تھا کہ واقعی عوام بالغ حقِ رائے دہی کی بنیاد پر انتخابات کے خواہش مند ہیں۔ ایوب خاں کی رضامندی کے ساتھ نئے پارلیمان نے ڈھاکہ میں منعقد ہونے والے اجلاس کے دوران بنیادی حقوق کا قانون بھی منظور کیا۔

عین اس وقت جب سہروردی کی مستعد اور متحرک قیادت میں بحالئ جمہوریت کی تحریک اپنے پاؤں پر کھڑی ہو رہی تھی، کاتبِ تقدیر کی چال سہروردی کے راستے کی دیوار بن گئی۔ تین ماہ کی جانکاہ جدوجہد اور طویل قیدِ تنہائی نے ان کی صحت کا دیوالیہ نکال دیا۔ پہلے تین جنوری اور پھر 12 جنوری 1963ء کو ان پر عارضہ قلب کے دو شدید حملے ہوئے اور وہ ہسپتال میں داخل ہونے پر مجبور ہو گئے۔ اس دوران میں چھ

جنوری کو صدر نے دو مزید آرڈیننس جاری کیئے۔ جن کی رو سے ایبڈو زدہ سیاست دانوں پر پابندی عائد کی گئی کہ وہ کسی بھی شکل میں سیاسی سرگرمیوں میں حصہ نہیں لے سکتے، خلاف ورزی کی صورت میں انہیں دو سال قید یا جرمانہ یا پھر بیک وقت دونوں سزائیں دی جاسکتی تھیں۔[338] علاوہ ازیں صدر نے کسی سیاست دان پر پابندی کی میعاد کم کرنے، مکمل طور پر ختم کرنے یا اس میں چھ ماہ تک توسیع کرنے کے اختیارات بھی حاصل کر لئے۔ بلاشبہ یہ قوانین خاص طور پر سہروردی پر شکنجہ کسنے کے لئے نافذ کیئے گئے تھے۔ سہروردی کی ذاتی مقبولیت کے علاوہ بحالیٔ جمہوریت کے لئے ان کی تحریک کو عوام سے ملنے والی طوفانی حمایت سے حکومت کی نیندیں اڑ چکی تھی۔ سہروردی نے بسترِ علالت سے ان قوانین کو للکارا اور انہیں بد دیانتی اور سیاسی استبداد کی بدترین مثال قرار دیا۔[339] انہوں نے صدر پر واضح کیا کہ اگر وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ایبڈو کی پابندیوں سے سیاست دانوں کا وقار ختم ہو جائے گا تو یہ انکی خوش فہمی ہے کیونکہ عوام کے دلوں میں سیاسی قائدین کی آج بھی وہی قدر و منزلت ہے۔

سہروردی کے معالجوں نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ بیرونِ ملک جا کر عارضۂ قلب کا علاج کروائیں۔ 19 مارچ کو سہروردی بیروت روانہ ہو گئے، کچھ افاقہ ہونے پر انہوں نے مکمل صحت یابی تک اپنے بیٹے کی قیام گاہ پر آرام کی غرض سے لندن کے لئے رختِ سفر باندھا۔ نومبر میں وہ واپس بیروت چلے گئے۔ ان کا ارادہ تھا کہ زیورخ میں ہرنیا کا اپریشن کروالیں جو ایک مدت سے ملتوی ہوتا چلا آرہا تھا۔ 3 یا 4 جنوری کو انہیں واپس وطن لوٹ آنا تھا۔ بیرونِ ملک علاج سے واپسی پر وطن میں انکے شاندار استقبال کی تیاریاں ہو رہی تھیں کہ بیروت کے ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل میں ان کی اچانک موت کی خبر سے پورا ملک غم واندوہ میں ڈوب گیا۔ سہروردی نے 5 دسمبر 1963ء کو صبح کے ابتدائی گھنٹوں میں دم توڑا۔ ہوٹل کے ٹیلیفون ایکسچینج کی آپریٹر کے علاوہ دمِ نزع ان کے پاس کوئی ذی نفس موجود نہیں تھا۔ صبح تین بجے انہوں نے فون کر کے اپنے ایک لبنانی دوست سے بات کرنا چاہی۔ عین اس وقت انہیں دل کا دورہ پڑا اور ریسیور ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ ٹیلیفون آپریٹر خوف زدہ ہو کر بالائی منزل پر انکے کمرے میں پہنچی۔ سہروردی بے ہوشی کے عالم میں فرش پر پڑے تھے۔ طبی امداد طلب کی گئی لیکن بہت دیر ہو چکی تھی۔ سہروردی علی الصبح تین بجکر بیس منٹ پر دم توڑ گئے، ان کا جسدِ خاکی اے کے فضل الحق اور خواجہ ناظم الدین کی قبروں کے ساتھ ڈھاکہ میں پرانی ہائیکورٹ کے احاطے میں آسودۂ خاک ہے۔

سہروردی کی موت جن حالات میں وقوع پذیر ہوئی وہ گہرے اسرار میں ملفوف ہیں۔ شیخ مجیب الرحمن سمیت بہت سے افراد اسے قدرتی موت تسلیم کرنے سے انکار کرتے تھے۔ اگرچہ اس ضمن میں کوئی حتمی نتیجہ مرتب کرنا ممکن نہیں ہے لیکن دو واقعات ایسے ہیں جن سے اس شبہے کو تقویت ملتی ہے کہ سہروردی کی موت طبعی نہیں تھی۔[340] ان دنوں ذوالفقار علی بھٹو پاکستان کے وزیرِ خارجہ تھے۔ ان کی شقاوتِ قلبی اور بے رحمی کہیں ایک عشرہ بعد پوری طرح سامنے آنا تھی لیکن انہوں نے پر پرزے نکالنا شروع کر دیئے تھے۔ فرانسوا جیبرے سہروردی کے علاوہ بھٹو سے بھی دوستانہ تعلقات رکھتے تھے۔ بھٹو نے جیبرے سے

کہا "اس سے (سہروردی سے) کہو کہ پاکستان واپس آنے کی جرأت نہ کرے ورنہ مجھے خود یہ انتظام کرنا پڑے گا کہ وہ پاکستان کی زمین پر قدم نہ رکھ سکے" بھٹو کی اس یاوہ گوئی کو کسی ناپختہ درباری کی گیدڑ بھبھکی سمجھ کر نظر انداز کیا جا سکتا ہے لیکن اس پیغام کو اس وقت اور بھی زیادہ اہمیت مل گئی جب سنٹرل انٹیلی جنس ڈیپارٹمنٹ کے ایک افسر نے جو سہروردی خاندان سے دوستانہ روابط رکھتے تھے۔ بیگم اختر سلیمان سے کہا "اپنے والد سے کہئے کہ محتاط رہیں۔ افواہیں اڑ رہی ہیں کہ حکمران ان کے لہو کے پیاسے ہو رہے ہیں" تین روز بعد سہروردی اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔

غالباً سہروردی وجدانی سطح پر آنے والے حادثے سے باخبر ہو چکے تھے۔ ڈھاکہ کے ممتاز بنگالی روزنامے "اتفاق" کے مدیر مانک میاں کے نام ایک مکتوب میں 29 نومبر کو سہروردی نے لکھا "مجھے امید ہے کہ میں جو کچھ لکھ رہا ہوں یہ میرے اور آپ کے درمیان رہے گا۔ اگر میری موت واقع ہو گئی تو میں اسے خوش قسمتی سمجھوں گا جینے کا کوئی مقصد باقی نہیں رہا۔ اب میں کسی کے کام نہیں آسکتا اور اگر جینا محض اپنے لئے ہو تو زندگی بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔[341]" موت سے صرف چھ روز قبل تحریر کی گئی ان سطور میں سہروردی کی اس مدت العمر خواہش کی جھلک نظر آتی ہے کہ پاکستان میں قانون کی حکمرانی قائم ہو اور عوام کی فلاح کی کوئی صورت نظر آئے۔ 43 برس کی ہنگامہ پرور سیاسی زندگی میں وہ دس سال سے بھی کم عرصے کے لئے حکومت میں رہے۔ غیر منقسم بنگال میں سات سال تک محنت و تجارت، سول سپلائز اور خزانے کے وزیر رہے اور کچھ عرصہ کے لئے بنگال کے وزیر اعظم بھی بنے۔ پاکستان میں دو برس کی مدتِ اقتدار کے دوران وزارتِ قانون و پارلیمانی امور اور وزارتِ عظمیٰ کے مناصب پر فائز رہے لیکن اقتدار کے اندر رہتے ہوئے یا اقتدار سے باہر وہ ہمہ وقت عوام کے قائد رہے اور عوام نے بھی ہمیشہ انکی آواز پر لبیک کہا۔ عوام کے اس اعتماد پر اظہارِ تشکّر کے طور پر سہروردی نے اپنی غیر معمولی ذہانت، دولت، صحت اور بالآخر اپنی جان بھی عوام پر نچھاور کر دی۔ تخلیقِ پاکستان میں صرف جناح کا رتبہ ان سے بڑھ کر ہے لیکن پاکستان میں جمہوری حزبِ اختلاف کے قیام کی جدوجہد میں کوئی دوسرا رہنما ان سے اولیت کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔[342] پاکستان میں بحالئ جمہوریت کی انتھک جدوجہد کی صورت میں انہوں نے پاکستان کو ایک انمول تحفہ دیا تھا اور یہی جدوجہد انکی بہترین یادگار ہے۔

کہا جاتا ہے کہ مہاتما گاندھی نے مسلمانوں کے ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا "جناح آپ کے مدبّر ہیں۔ لیاقت آپ کے سیاست دان ہیں اور سہروردی آپ کے قائد ہیں۔[343]" جدوجہدِ آزادی میں شامل ان تینوں چوٹی کے قائدین کے بارے میں اس سے بہتر رائے نہیں دی جا سکتی۔ بلاشبہ سہروردی ایک قائد تھے، پیدائشی قائد جن کی قسمت میں لاکھوں ہم وطنوں کی قیادت لکھی تھی۔ سہروردی سے عوام کے اٹوٹ تعلق کی تصدیق ان گنت مرتبہ ہو چکی تھی۔ سینکڑوں بلکہ ہزاروں کی تعداد میں لوگ بنگال کی ٹوٹی پھوٹی گرد آلود سڑکوں پر پاپیادہ سفر کرتے ہوئے عوامی اجتماعات میں شریک ہوتے تاکہ اپنے محبوب قائد...... اپنے سیاسی مسیحا کی ایک جھلک دیکھ سکیں۔ ان سے امید اور آزادی کا کوئی پیغام سن

-- پائیں اور ملکی مصائب کے تدارک کے لئے کسی نئے لائحہ عمل کی خبر سن سکیں۔[344]

1937ء اور پھر 1946ء کے انتخابات میں سہروردی نے دور افتادہ مقامات کا دورہ کرنے کے لئے ہر قسم کے ذرائعِ آمدورفت مثلاً گاڑیاں، دخانی کشتیاں، ڈونگیاں اور بیل گاڑیاں استعمال کیں۔ کئی بار تو انہیں پیدل ہی کئی کئی میل کا سفر کرنا پڑتا۔ معمولی خوراک استعمال کرتے ہوئے وہ روزانہ 25 سے 30 اجتماعات سے خطاب کرتے۔ 1954ء میں بھی یہی صورتحال دہرائی گئی 1937ء اور 1946ء کے انتخابات میں انکی حیران کن کامیابیوں کے علم کے باوجود لوگ آج تک انگشت بدنداں ہیں کہ انہوں نے کس طرح محض ایک سال کے قلیل عرصے میں جگتو فرنٹ کو اسقدر منظم کر لیا کہ اس محاذ نے 1954ء میں برسرِ اقتدار جماعت مسلم لیگ کو عبرتناک شکست سے دوچار کیا۔ بنگال میں مسلم لیگ کی بنیادیں رکھنے والے بھی سہروردی خود ہی تھے اور بنگال مسلم لیگ نے تخلیقِ پاکستان میں بنیادی کردار ادا کیا تھا، بدقسمتی سے موت نے انہیں 1963ء میں اس وقت آ لیا جب وہ قومی جمہوری محاذ کے پرچم تلے جمہوریت دشمن قوتوں پر ایسی ہی فیصلہ کن ضرب لگانے کی تیاری کر رہے تھے۔

بنگال کے عظیم سپوت سی آر داس کو بلاشبہ سہروردی کا سیاسی گرو ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ انہوں نے سہروردی کی سیاسی تربیت کی اور انکی شخصیت پر گہرے اثرات مرتب کئے۔ ابوالمنصور احمد لکھتے ہیں "ہر دو حضرات کے مقصدِ حیات کی عظمت اور قامت یکساں ہے۔ چترنجن داس ہندوستان کے مسلمانوں اور ہندوؤں میں اتحاد و اشتراک پیدا کرنے کے متمنی تھے اگر وہ اپنا مقصد حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے تو ہندوستان کی تقسیم کی نوبت نہ آتی۔ شہید سہروردی کا مقصد پاکستان کے دونوں حصوں میں اتحاد کو برقرار رکھنا تھا۔ تاریخ بتائے گی کہ سی آر داس کی بے وقت اور حادثاتی موت سے ہندوستان کو جس المیے سے دوچار ہونا پڑا تھا کیا پاکستان میں بھی اس کا اعادہ ہو گا"[345] سی آر داس کی طرح شہید سہروردی بھی وکالت میں خطیر رقوم بطورِ حق السعی وصول کرتے تھے اور انہی کی طرح جو کماتے تھے اپنی جماعت پر نچھاور کر دیتے تھے یا مستحقین میں تقسیم کر دیتے تھے۔ اپنی موت سے کچھ ماہ قبل سہروردی نے اے کے بروہی سے نجی گفتگو کرتے ہوئے کہا "بروہی صاحب! میں چاہتا ہوں اب اس سیاسی جدوجہد کا باب ختم کر کے اطمینان کی موت مروں لیکن میں اس اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچا سکتا جو عوام نے مجھ پر کیا ہے۔ اس کے علاوہ مجھے اپنے اکلوتے بیٹے کے لئے بھی سوچنا پڑ رہا ہے۔ میرے پاس اسے دینے کو کچھ نہیں ہے۔ اتنا بھی نہیں جس سے وہ اپنی تعلیم جاری رکھ سکے۔"[346] ابوالہاشم کہتے ہیں "بلاشبہ انہیں ایک مفلس کی موت اور شہنشاہ کی تدفین نصیب ہوئی۔"[347]

تفضّل حسین لکھتے ہیں "عام طور پر دیکھنے میں آیا ہے کہ صاحبِ ثروت ہونے کے بعد لوگ اپنے غریب رشتہ داروں کو فراموش کر دیتے ہیں لیکن شہید سہروردی کے ساتھ ایسا معاملہ نہیں تھا۔ وہ اپنے غریب رشتے داروں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر انکی جھونپڑیوں میں جاتے، ان کے ساتھ کھانا کھاتے اور دل کھول کر ان کی مدد کرتے"[348] وہ عام لوگوں، جھگی نشینوں، کارکنوں، مزدوروں اور کسانوں میں اعتماد پیدا کرنے کے

لئے ان کے درمیان اسی آسانی سے گھل مل جاتے تھے جس سہولت سے وہ مدبّرینِ عالم کے ساتھ گفت و شنید میں پاکستان کا وقار بلند کرتے تھے۔[349]

شیخ مجیب الرحمٰن لکھتے ہیں ، "کلکتہ میں ایک روز اتفاق سے سیاہ جلد والی ایک نوٹ بک پر میری نظر پڑ گئی۔ اس میں دیگر چیزوں کے علاوہ پنشن یافتگان کی ایک فہرست تھی۔ سہروردی ان تمام لوگوں کو ہر مہینے کل ملا کر تین ہزار روپے کے لگ بھگ پنشن ادا کرتے تھے۔ ان لوگوں میں ہر مذہب سے تعلق رکھنے والے پرانے ملازمین ، حجام ، مزدور ، بزرگ ، ادیب اور کچھ سیاسی کارکن بھی شامل تھے۔"[350] ان کے گھر پر غریب لیکن ہونہار طالبِ علموں کی رہائش کے لئے ایک الگ حصہ تعمیر کیا گیا تھا۔ جب یہ طلبہ تعلیم مکمل کر لیتے تو سہروردی ان کے لئے ملازمتوں کا بندوبست کرتے۔ یہ ان کی خاندانی روایت کا حصہ تھا۔

شہید سہروردی کثیر الجہت کردار کے حامل تھے۔ عطاالرحمٰن خان کے مطابق "اس کی شخصیت نرم و سخت ، سرد و گرم اور سادگی و پیچیدگی کا امتزاج تھی۔ بیرونی خول سختی اور لئے دیئے کی چغلی کھاتا تھا لیکن اس سراپے میں ایک شفیق اور غمگسار دل دھڑکتا تھا۔ ان سے پہلی بار ملنے والا اس ظاہری سرد مہری سے دھوکہ کھا جاتا تھا۔[351]

ایک بلند قامت شخصیت رکھنے کے باوجود انہیں خلقِ خدا سے نفور نہیں تھا۔ ان میں بے تکان کام کرتے چلے جانے کی بے پناہ صلاحیت تھی۔ جن دنوں وہ کسی سرکاری ذمّہ داری میں مشغول ہوتے تو دن میں اٹھارہ سے بیس گھنٹے تک کام کیا کرتے تھے۔ سہروردی سیاسی انتقام جیسی گراوٹ سے کوسوں دور تھے اور انہوں نے کبھی سیاسی حریفوں پر ذاتی حملہ نہیں کیا۔ انہوں نے سیاست میں رواداری اور خرد پسندی کو فروغ دیا۔ متعدد مواقع پر انہوں نے سیاسی طریقوں سے وسعتِ قلبی پر مبنی سلوک کیا لیکن ان کے ہم عصروں میں اس خصوصیت کا افسوس ناک حد تک فقدان پایا جاتا تھا۔ اس ضمن میں متعدد مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں کہ انہوں نے بغیر معاوضہ لئے عدالتوں میں اپنے سیاسی حریفوں کا دفاع کیا۔ اے کے بروہی کہتے ہیں ، "سہروردی کی شخصیت کا روشن ترین پہلو یہ ہے کہ انہوں نے اپنے عمل سے اپنے ناقدین کو شائستگی کا سبق پڑھایا۔ ان کے مخالفین ان کے بارے میں کذب و افتراء کے طومار باندھتے رہے لیکن وہ بڑی بے نیازی سے اپنی دھن میں مگن رہے۔[352] "سہروردی نے کبھی کسی دھمکی کے سامنے دب کے نہیں دیا اور جب ایک بار انہیں اپنے مؤقف کی سچائی کا یقین ہو جاتا اُن کے لئے میدان چھوڑنے کا سوال ہی خارج از بحث ہو جاتا۔ قائدِ اعظم کی وفات کے بعد لیاقت علی خاں کی قیادت میں آمریت کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ ان دنوں سہروردی کے ایک دوست نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ کچھ دنوں کے لئے ملک سے باہر چلے جائیں۔ سہروردی نے دھاڑ کر کہا "ہرگز نہیں ، انہیں بتا دو کہ میں پاکستان کے عوام کی طرف سے ان کا مقابلہ کروں گا۔[353]

سہروردی "غیر معمولی صلاحیت کے مالک ایسی عظیم شخصیت تھے جس کی دانشورانہ حق گوئی ایک مدبر کے لئے تو اعزاز ہو سکتی ہے لیکن ایک سیاست دان کے پاؤں کی زنجیر بن جایا کرتی ہے۔ صرف وہی یہ

جرأت کر سکتے تھے کہ اپنی مقبولیت اور سیاسی زندگی کو داؤ پر لگا کر پاکستانی قومیت کے تصوّر کو اجاگر کریں تاکہ پاکستان کی بنیادیں مضبوط ہو سکیں۔ یہ کام آسان نہیں تھا۔ اس ضمن میں سہروردی قائدِاعظم کے بعد پاکستانی رہنماؤں میں واحد زعیم تھے جو تصوّرِ پاکستان کی روح کو سمجھتے تھے اور اس کے مطابق عمل کرنا چاہتے تھے۔ تقسیمِ ہند کے بعد ان کی تمام سرگرمیوں کا یہی مقصدِ واحد تھا۔"[354]

اے کے بروہی لکھتے ہیں "زندگی بھر جدوجہد کے باوجود وہ جو مقصد حاصل نہ کر سکے وہ ان کی موت کے ذریعے پورا ہوتا نظر آتا ہے۔ اہلِ نظر کے لئے اس حقیقت میں اشارے پنہاں ہیں کہ انتقال کے بعد جب ان کا جسدِ خاکی کراچی پہنچایا گیا تو عوام نے اس عدیم المثال عقیدت و احترام کا مظاہرہ کیا جو ان سے پہلے بہت کم کو نصیب ہوا اور ان کے بعد بھی شاید ہی کسی کے حصے میں آئے۔ پاکستان کے عوام نے سہروردی کو غیر معمولی خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ تاریخ نے اپنے مخصوص انداز میں سہروردی کی وفات کے فوراً بعد اپنا فیصلہ دے دیا ہے۔ عوام کے بڑے بڑے اجتماعات میں جس طرح بچھڑنے والے محبوب رہنما کی مغفرت کے لئے ہاتھ اٹھا کر دعائیں کی گئیں ہیں انہیں دیکھتے ہوئے یہ معلوم کرنا کہ تاریخ کا فیصلہ کیا ہے بالکل سامنے کی بات ہے۔"[355]

سہروردی ہماری تاریخ کی کہکشاں میں ایک درخشاں ستارے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اے کے بروہی مزید لکھتے ہیں "جب ہی مستقبل کا غیر جانبدارانہ مؤرخ ہمارے عہد کی تاریخ رقم کرے گا تو بلاشبہ سہروردی کا نام قومی رہنماؤں کی فہرست میں بہت بلند مقام پائے گا۔ انہوں نے قومی تاریخ کے اوراق پر انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔ کسی بھی معیار سے دیکھا جائے سہروردی نے قیامِ پاکستان سے پہلے اور بعد میں جو کردار ادا کیا وہ بلند پایہ مقام کا حامل ہے۔"[356]

جمہوریت ...... برہن کی پکار

سہروردی نے ایک متحدہ اور مستحکم پاکستان کی اہمیت کا ادراک کرتے ہوئے اس خیال کی پرزور تائید کی کہ مغربی پاکستان کے چاروں صوبوں کو آپس میں مدغم کر دیا جائے۔ اسی طرح انہوں نے مشرقی پاکستان کے عوام کو آمادہ کیا کہ وہ اپنی غیر متنازعہ اکثریتِ آبادی کے باوجود اصولِ مساوات کو تسلیم کر لیں۔ پھر انہوں نے ملک کے مختلف مذہبی گروہوں کے درمیان ہم آہنگی کے فروغ کی خاطر مخلوط انتخابات کا اصول متعارف کروایا۔[357] بدقسمتی سے جن لوگوں نے مطالبۂ پاکستان ہی کی مخالفت کی تھی وہ قیامِ پاکستان کے بعد پاکستان کے اجارہ دار بن بیٹھے اور سہروردی کو اسی جذبے اور عزم سے عوام کے بنیادی حقوق کے لئے جدوجہد کرنا پڑی جس استقامت سے انہوں نے برطانوی سامراج سے نجات کے لئے جنگ کی تھی۔ یہ ایک مشکل مہم تھی۔ سہروردی نے خود بھی بارہا کہا تھا کہ جمہوریت کو، جس پر پاکستان کی بقا کا انحصار تھا، اس ملک میں کبھی کام کرنے کا موقع نصیب نہیں ہوا در حقیقت قائدِاعظم نے پاکستان کے سیاسی ڈھانچے

میں نوکر شاہی کو دراندازی کا موقع فراہم کر کے مہلک لغزش کی تھی۔ نوکر شاہی کے یہ کارندے اپنے گھمنڈ میں بار بار حکومتیں بناتے اور توڑتے رہے۔ پہلے غلام محمد نے خواجہ ناظم الدین کو برطرف کیا پھر غلام محمد نے ہی قومی اسمبلی برطرف کی آخر کار سکندر مرزا اور ایوب خاں نے ملی بھگت سے ملک پر فوجی آمریت مسلط کر دی۔[358] پاکستان کے دونوں حصوں میں بسنے والے عوام کی نفسیات بالکل متضاد تھی۔ چنانچہ یہاں جمہوریت کے پھلنے پھولنے کے امکانات معدوم تھے۔ مشرقی پاکستان کے عوام نچلی سطح سے ابھرنے والی جمہوریت کے شائق تھے لیکن مغربی پاکستان کے عوام اس طرزِ حکومت پر زیادہ اعتماد نہیں رکھتے تھے کیونکہ انہیں کبھی اس پر عمل کرنے کا موقع نہیں دیا گیا تھا۔ مغربی پاکستان میں سیاست بڑے بڑے جاگیرداروں کی ذاتی پسند یا ناپسند کے محور پر گھومتی تھی جبکہ مشرقی پاکستان میں جاگیرداروں کا طبقہ ہی سرے سے مفقود تھا۔

چنانچہ ملک بھر میں سہروردی کی موت کا سوگ منایا گیا۔ مرحوم رہنما کی تعظیم میں قومی پرچم بھی سرنگوں ہوا (حزبِ اختلاف کے کسی رہنما کے لئے یہ بہت بڑا اعزاز تھا) لیکن پاکستان نہ بچ سکا۔[359] ان کی موت سے ایوب آمریت کے راستے کا کانٹا تو صاف ہو گیا لیکن وہ تعلق بھی ٹوٹ گیا جس نے ملک کے دونوں حصوں کو باندھ رکھا تھا۔ سہروردی وہ واحد رہنما تھے جو ملک کے دونوں حصوں میں عوام کی ترجمانی کر سکتے تھے اور انہیں ملک کے دونوں حصوں میں یکساں احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ پاکستان کی بقا کی واحد ضمانت کے طور پر انھوں نے بحالئ جمہوریت کے لئے جو اتحاد قائم کیا تھا وہ انکی موت کے فوراً بعد تحلیل ہو گیا۔ ان کی آخری خواہش کے علی الرغم سیاسی جماعتوں کا احیاء عمل میں لایا گیا اور یوں صدر ایوب کو گویا لطیفہ غیبی سے منہ مانگی مراد مل گئی۔ انہیں حق رائے دہی کمیشن کی سفارشات کو بالائے طاق رکھنے اور اپنے آمرانہ اقتدار کو طول دینے کا موقع مل گیا۔

پاکستان میں بحالئ جمہوریت کی اس آخری امید کے اس حسرتناک انجام کے بعد پاکستان کا دولخت ہونا ناگزیر ہو گیا۔ سہروردی نے اپنی یادداشتوں میں بھی اس طرف اشارہ کیا ہے۔ اپنے داماد احمد سلیمان کے نام ایک خط میں انھوں نے لکھا "تم جانو ہم پرانی نسل کے رہنما تو صرف آئینی طور طریقوں پر عمل کرنا جانتے ہیں اور ہم ناکام ہو چکے ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ اب غیر آئینی ہتھکنڈوں پر یقین رکھنے والی قیادت سامنے آئے گی جو ملک کو تباہ کر دے گی اور اس طوفان میں ہم لوگ بھی خس و خاشاک کی طرح بہہ جائیں گے۔"[360]

آخر ہونی ہو کر رہی۔ پاکستان کا چوتھا انقلاب فوج نے تن تنہا برپا کیا۔ جنرل ایوب کی فوجی آمریت کی جگہ لینے والی جنرل یحییٰ کی حکومت نے پاکستان کی 25 سالہ تاریخ میں پہلی بار بالغ حقِ رائے دہی کی بنیاد پر منعقد ہونے والے عام انتخابات میں کامیابی حاصل کرنے والی جماعت عوامی لیگ کے رہنما شیخ مجیب الرحمٰن کو اقتدار منتقل کرنے سے انکار کر کے تصوّرِ پاکستان پر آخری مہلک وار کیا۔ 1969ء میں ملک گیر ہنگاموں کے بعد جنرل یحییٰ خاں نے عنانِ اقتدار سنبھال لی تھی۔[361] ان کی حکومت نے جو لائحہ عمل اختیار کیا اس کے پاکستان پر تباہ کن اثرات مرتب ہوئے۔ انتخابات کے نتائج کو عوام کا حتمی فیصلہ قرار دیکر

انکے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے سے انکار کر کے یحییٰ خاں نے ملک کی تاریخ میں دوسرا قائدِ اعظم بننے کا موقع گنوا دیا۔ اس کی بجائے یحییٰ خاں نے عوام کی اکثریت سے جنگ شروع کر دی۔[36,2] خانہ جنگی دو خود مختار مسلم مملکتوں، پاکستان اور بنگلہ دیش کے قیام پر منتج ہوئی۔ یوں 1946ء کی قراردادِ لاہور کے مقاصد جزوی طور پر حاصل کر لئے گئے تاہم یہ مقصد پرامن طور پر حاصل نہ ہوسکا۔

حصہ دوم

یادداشتیں

فوجی ٹولہ

14ر اگست 1947ء کو معرضِ وجود میں آنے کے بعد سے پاکستان کی سیاست کا جائزہ ثابت کرتا ہے کہ یہ تاریخ صاحبانِ اقتدار اور حکومت کے پالیسی ساز کارندوں کی اس خواہش سے عبارت ہے کہ جب تک ممکن ہو نفاذِ جمہوریت کو التوا میں رکھا جائے۔ بالآخر جب عروسِ جمہوریت وطن کی دہلیز پر آپہنچی اور اس کی بعنوان شائستہ کارپردازی کے تمام لوازم پورے ہو چکے تو اچانک شب خون مار کر وہ شاخ ہی کاٹ ڈالی گئی جس پر آشیانہ تھا۔

ایک ناپاک اتحاد

اس نامسعود حکمتِ عملی کا تازہ ترین اظہار ایک آئینی صدر یعنی میجر جنرل سکندر مرزا اور برّی فوج کے سربراہ جنرل محمد ایوب خاں کی اس ملی بھگت کی صورت میں سامنے آیا ہے جس کے نتیجے میں انہوں نے 1956ء کے آئین کو منسوخ کر دیا در آں حالیکہ ہر دو حضرات نے اس آئین کے تحفّظ کا حلف اٹھا رکھا تھا، وزراء کو برطرف کر دیا، مجالسِ قانون ساز توڑ دیں، تمام سیاسی جماعتوں اور سیاسی سرگرمیوں پر پابندی عائد کر دی، شہری آزادیوں کو معطل کر دیا اور پورے ملک پر صدر اور چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کا مشترکہ اقتدار مسلّط کر دیا گیا۔ ان دونوں حضرات کی قوت کا سرچشمہ وہ مستقل فوج ہے جس میں ملک بھر کی نمائندگی کی بجائے دو مخصوص گروہوں یعنی پنجابیوں اور پٹھانوں کا غلبہ ہے۔ فوج کا نچلا طبقہ بے حد منظم، شجاع اور محبّ وطن ہے۔ لیکن اعلیٰ افسران اسے اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرنا چاہیں تو یہ اطاعت

گزار دم مارنے کی مجال نہیں رکھتے۔ غیر مسلح شہری آبادی کے مقابلے میں یہ فوج جدید اسلحے سے لیس ہے۔ چنانچہ اسے بلاخوفِ مزاحمت کسی بھی موقع پر عوام کے سامنے کھڑا کیا جا سکتا ہے۔ سپاہیوں کی اکثریت کا تعلق جس سماجی طبقے سے ہے اس پر اس قسم کی تلقین بے حد موثر ثابت ہوتی ہے کہ محافظین قوم کی حیثیت سے تہی از اخلاق اور موذی سیاست دانوں اور سیاست کی بیخ کنی کرنا فوج کا مقدس فریضہ ہے۔

فوجی آمریتوں اور فوجی نجات دہندوں کا یہ مرحلہ بظاہر اس عالمی رجحان کی ایک کڑی نظر آتا ہے جس کے مطابق دنیا بھر میں جمہوریتیں کڑی آزمائش سے گزر رہی ہیں فوجی آمریتیں یکے بعد دیگرے اس طرح جمہوریتوں کی جگہ لے رہی ہیں جیسے کچھ عرصہ قبل جمہوریت نے بادشاہتوں اور چند سری حکومتوں کا پودا اکھاڑ پھینکا تھا اور جہاں کہیں عوام نے سر توڑ جدوجہد کے بعد بظاہر جمہوریت بحال کروا بھی لی ہے وہ پوری طرح فوج کی بالادستی سے آزاد نہیں ہو سکے کیونکہ جب فوج کے منہ کو خون لگ جائے تو وہ اپنے طبقاتی اور نوزائیدہ مفادات کی بہتری اسی میں سمجھتی ہے کہ سول حکمرانوں کو دبا کر رکھا جائے۔

چھوٹے بڑے فوجی افسران کو سول انتظامیہ میں ایسے عہدے سونپے گئے جن کے لئے ان کے پاس مطلوبہ اہلیت تھی اور نہ تربیت، حتیٰ کہ انہیں مختلف جرائم کی سماعت اور شدید سزائیں سنانے کے لئے عدالتی اختیارات بھی دیئے گئے۔ ان عدالتوں کے فیصلوں پر نظر ثانی کا فریضہ بھی مختلف درجات کے فوجی افسران ہی انجام دیتے تھے اور یوں مجرمان کی آزمائش شدید سے شدید تر ہوتی جاتی۔ نا صرف ریٹائرڈ فوجی افسران بلکہ حاضر سروس جونیئر اور سینئر فوجی ملازمین اور انکے اہلِ خانہ پر بھی ملازمتیں، زمینیں اور لائسنس نچھاور کیئے گئے۔ ان افراد کو عہدے اور خاندانی رسوخ کی مناسبت سے پرمٹوں اور دیگر مالی فوائد سے نوازا گیا۔

چنانچہ فوج من حیث المجموع ایسے نظام کا تسلسل چاہتی ہے جو اس کے لئے اس قدر سود مند ثابت ہوتا ہے اور یوں تربیت یافتہ افرادی قوت پر مشتمل ایک منظّم ادارہ اپنے مفادات اور مراعات کے تحفّظ نیز ان ناخوشگوار ایّام کی طرف رجعت سے گریز کی خاطر ہر ممکن کوشش پر آمادہ ہو جاتا ہے جب معمولی مشاہرے کے عوض ان سے تقاضا کیا جاتا تھا کہ وہ مادرِ وطن کی سلامتی اور آزادی کے تحفّظ کی خاطر اپنی جانیں خطرے میں ڈال دیں۔ چنانچہ تجربہ بتاتا ہے اور اس ضمن میں مثالوں کی بھی کمی نہیں کہ فوج جب ایک بار اقتدار پر قابض ہو جائے تو پھر درونِ خانہ یا کھلے عام اپنے اقتدار کو دوام دیئے رکھتی ہے۔

مایوسی اور ناکامی

یہ کہنا توقرینِ حقیقت نہیں ہو گا کہ پاکستان کی مختصر تاریخ میں وقتاً فوقتاً جمہوری حکومت کے قیام کے لئے کوششیں نہیں کی گئیں۔ لیکن اس قسم کی تمام کاوشوں کو مایوسی اور ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔

پہلی دستور ساز اسمبلی

برطانوی پارلیمنٹ کے منظور کردہ قانونِ آزادی ہند 1947ء کے نتیجے میں معرضِ وجود میں

آنے والی دستور ساز اسمبلی کو دستور ساز ادارے کے علاوہ پاکستان کی مرکزی مجلسِ قانون ساز کے فرائض بھی سرانجام دینا تھے۔ اس اسمبلی کے اراکین کا انتخاب تقسیم سے قبل منتخب ہونے والی صوبائی مجالس قانون ساز کے ان ارکان نے کیا تھا جن کے حلقہ ہائے انتخاب ریڈ کلف ایوارڈ کی روشنی میں پاکستان کا حصہ قرار پائے تھے۔ چنانچہ دستور ساز اسمبلی کے اراکین کی نمائندہ حیثیت بالواسطہ تھی۔ تقسیم سے سندھ اور شمال مغربی سرحدی صوبے کی مجالسِ قانون ساز کی ہیت ترکیبی میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی (موخرالذکر صوبہ استصوابِ رائے کے نتیجے میں پاکستان میں شامل ہوا تھا) البتہ بنگال اور پنجاب کی مجالسِ قانون ساز بھارت اور پاکستان کے حصے میں آنے والے علاقوں کی مناسبت سے تقسیم ہو گئی تھیں۔ چنانچہ مغربی پنجاب کے حصے میں آنے والے علاقوں کے صوبائی نمائندگان نے مغربی پنجاب کی مجلسِ قانون ساز تشکیل دی اور مشرقی بنگال کو ملنے والے علاقوں کے صوبائی نمائندوں نے مشرقی بنگال کی مجلسِ قانون ساز تشکیل دی۔

ریڈ کلف ایوارڈ میں بنگال اور پنجاب کے مسلمانوں کے ساتھ شدید ناانصافی کی گئی۔ پنجاب میں گورداسپور کا مسلم اکثریتی ضلع بھارت کے حوالے کر دیا گیا اور یوں ایک گزرگاہ فراہم کر کے کشمیر کے ایک حصے کو براہِ راست بھارت سے متّصل کر دیا گیا۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو کشمیر مکمل طور پاکستان سے متّصل رہتا اور مہاراجہ کشمیر کو بھارت سے الحاق کا موقع نہ مل سکتا۔ گورداسپور ضلع پاکستان میں شامل ہونے کی صورت میں کشمیر کا بھارت سے الحاق ریاست کی مذہبی اکثریت اور جغرافیائی اتصال کے دوران اصولوں کی خلاف ورزی قرار پاتا اور بھارت کے لئے پاکستان پر حملہ کئے بغیر کشمیر میں اپنی افواج داخل کرنا ممکن نہ رہتا۔ بنگال میں ریڈ کلف نے جیسور کے مسلم اکثریتی ضلع کو تقسیم کر کے اس کا ایک حصہ مغربی بنگال میں شامل کر دیا حالانکہ اس کی آبادی کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل تھی۔ اس طرح ملدا کا مسلم اکثریتی ضلع مکمل طور پر مغربی بنگال کے حوالے کر دیا گیا اور اس کی تقسیم کی زحمت بھی گوارہ نہ کی گئی جبکہ ضلع کے جنوبی حصے میں مسلمانوں کی غالب اکثریت آباد تھی[1]۔ ضلع سلہٹ کے کچھ حصے بھی بھارت کی نذر کر دیئے گئے یہ ضلع صوبہ آسام کا حصہ تھا۔ ضلع کی اکثریت بنگالی مسلمانوں پر مشتمل تھی۔ قبل ازیں پورے ضلع میں استصواب کروایا گیا تھا جس میں عوام کو بھارت یا پاکستان میں سے کسی ایک مملکت کا انتخاب کرنا تھا۔ استصواب کا نتیجہ پاکستان کے حق میں بر آمد ہوا تھا۔

مشرقی پاکستان کی بے مثال فیاضی

مشرقی بنگال کی اس قطع و برید کے باوجود اس کی آبادی مغربی پاکستان سے زیادہ تھی (44 فیصد کے مقابلے میں 56 فیصد) دستور ساز اسمبلی کے اراکین کو مختلف صوبوں کی آبادی کے تناسب سے منتخب ہونا تھا لہٰذا دستور ساز اسمبلی میں مشرقی بنگال کے اراکین کی اکثریت یقینی تھی۔ تاہم مشرقی بنگال کی صوبائی

مجلسِ قانون ساز کے مسلم ارکان نے پاکستان کے قومی اور مسلمانانِ ہند کے سیاسی مفاد کی خاطر اپنے صوبائی اور علاقائی مفادات کو پس پشت ڈالتے ہوئے بے مثال فیاضی اور قربانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے متعدد غیر بنگالی مسلمانوں کو اپنے ووٹوں سے پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کا رکن منتخب کیا گا۔ ان حضرات کا تعلق شمال مغربی سرحدی صوبے (جہاں آبادی کی مسلم اکثریت کے باوجود صوبائی اسمبلی میں کانگرس کا غلبہ تھا) اور بھارت کے مسلم اقلیتی صوبوں سے تھا انہیں اپنے صوبوں کی مجالسِ قانون ساز سے منتخب ہونے کی امید نہیں تھی اور سندھ، پنجاب اور شمال مغربی سرحدی صوبے کی صوبائی اسمبلیوں کے مسلم ارکان نے اپنے صوبے سے تعلق رکھنے والے امیدواروں کی بجائے ان صاحبان کو منتخب کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ ان حضرات میں نوابزادہ لیاقت علی خاں، آئی ایچ قریشی اور شمال مغربی سرحدی صوبے کے خان عبدالقیوم خان جیسے مسلم لیگی اکابرین سمیت قومی رتبے کے حامل کم وبیش پانچ دوسرے زعماء شامل تھے۔ اس دریادلی کے نتیجے میں دستور ساز اسمبلی میں بنگالی اراکین اقلیت میں رہ گئے تاہم اپنے بہتر سیاسی شعور کی بنا پر اقلیت میں ہونے کے باوصف بنگالی اراکینِ اسمبلی کی کارروائی پر چھائے رہتے تھے۔

آئین کی تشکیل میں پس وپیش

ان دنوں حجّت پیش کی جاتی تھی کہ دستور ساز اسمبلی کے آئین مدّون کرنے اور عام انتخابات کے انعقاد تک آزاد پاکستان کی مرکزی مقنّنہ کی جمہوری تشکیل ممکن نہیں۔ اس وقت تک گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935ء کی ترمیمی شکل اور 1947ء کے قانونِ آزادیٔ ہند سے کام چلایا جائے گا۔ چنانچہ جمہوریت اور جمہوری حکومت کی شرطِ اوّلین یعنی نمائندہ مقنّنہ کے قیام میں آزاد پاکستان کے نئے آئین کی عدم موجودگی کے باعث سب سے پہلی رکاوٹ پڑی۔

فسطائی ذہنیت

پاکستان کے پہلے وزیراعظم، نوابزادہ لیاقت علی خاں آئین کی جلد تشکیل کے حق میں نہیں تھے۔ وہ آل انڈیا مسلم لیگ کے سیکرٹری جنرل رہے تھے، جس نے پاکستان کے لئے جدوجہد کی تھی اور جو پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کے بعد اس پر متصرف ہوئی۔ مسلم لیگ کے صدر قائدِاعظم محمد علی جناح مملکت پاکستان کے گورنر جنرل بنے، در آں حالیکہ ابتدائی طور پر قرار پایا تھا کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن پاکستان اور بھارت کے مشترکہ گورنر جنرل ہوں گے اور قائدِاعظم نے مسلم لیگ کے سیکرٹری جنرل لیاقت علی خاں کو پاکستان کی وزارتِ عظمیٰ سے سرفراز فرمایا۔

مسلم لیگ مسلمانانِ ہند کی نمائندہ جماعت تھی۔ یہ امر 1946ء کے انتخابات میں بنگال اور مسلم اقلیتی صوبوں میں اس کی بھرپور کامیابی نیز سندھ اور پنجاب میں اسے ملنے والی اچھی خاصی حمایت سے ثابت ہوگیا تھا۔ قیامِ پاکستان کے بعد مسلم لیگ پاکستان میں مسلمانوں کی واحد سیاسی جماعت

تھی۔ کانگرس کے مسلم اراکین نے شمال مغربی سرحدی صوبے (جہاں انہیں سرخ پوشوں کے نام سے جانا جاتا تھا) اور سندھ میں خاصی مضبوط حیثیت کے باوجود اجتماعی طور پر پاکستان میں مدغم ہونا قبول کرلیا۔ مشرقی بنگال میں کانگرس جماعت کے اراکین کی اکثریت ہندوؤں پر مشتمل تھی۔ لیاقت علی خاں پاکستان مسلم لیگ کو مسلمانوں کی واحد جماعت کے طور پر دیکھنے کے متمنی تھے۔ اگرچہ قائداعظم محمد علی جناح نے قیامِ پاکستان کے فوراً بعد اپنی پہلی تقریر میں واضح کر دیا تھا کہ آئندہ مسلم لیگ دیگر سیاسی جماعتوں کی طرح ایک سیاسی جماعت ہوگی، اسے مسلمانوں کی واحد جماعت کا درجہ حاصل نہیں ہو گا۔ تاہم لیاقت علی خاں کو احساس تھا کہ نئے آئین کی تشکیل اور عام انتخابات کے انعقاد کے نتیجے میں مسلمانوں کی دیگر سیاسی جماعتیں منصۂ شہود پر نمودار ہو جائیں گی اور مسلم لیگ کی اجارہ داری کو زک پہنچے گی۔ چنانچہ ان کی خواہش تھی کہ ایسی نوبت نہ آئے اور مسلم لیگ کے اقتدار کو جہاں تک ممکن ہو طول دیا جائے غالباً ان کی رائے میں ایسا کرنا استحکام پاکستان کے لئے ضروری تھا۔ لہٰذا آئین کی تشکیل اور عام انتخابات کے انعقاد میں کسی عجلت کی ضرورت نہیں تھی۔ مسلم لیگ کے لئے اپنی شیفتگی میں انہوں نے اس سیاسی جماعت کو ریاست اور حکومت یعنی مسلم لیگ حکومت کے مترادف سمجھنا شروع کر دیا اور اعلان کیا کہ جو شخص سیاسی جماعت مسلم لیگ کی مخالفت کرے گا اور یوں بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر ان کی حکومت پر تنقید کرے گا وہ ریاست سے غدّاری کا مرتکب قرار پائے گا۔ اسی طرح لیاقت علی خاں پر فسطائیت کے الزام کا جواز پیدا ہو گیا۔

دوسری طرف مسلم لیگ نے بھی حکومت کی اندھا دھند حمایت شرع کر دی۔ آزادئ فکر و عمل اور جمہوریت کی تڑپ رکھنے والے افراد کو چن چن کر مسلم لیگ کی رکنیت سے خارج کیا گیا اور مسلم لیگ، مسلمانوں کی عوامی جماعت کی بجائے ایک مخصوص ٹولے میں بدل گئی۔ فسطائی رحجانات راہ پانے لگے۔ مسلم لیگ کے مفاد یافتہ ارکان میں سفارتی مناصب بانٹے گئے ان پر درآمدات کے اجازت نامے 'روٹ پرمٹ'، کاروں بسوں اور ریوالوروں کے لائسنس نچھاور کئے گئے۔ انہیں غیر ملکی زرِ مبادلہ اور تجارتی و صنعتی سہولتوں سے نوازا گیا۔ غرضیکہ حکومت کی مہربانیاں اس مفاد یافتہ ٹولے کا استحقاق قرار پائیں۔ سرمایہ دار طبقے نے مسلم لیگ کی چھتر چھایا میں پناہ لی اور مسلم لیگ کے فنڈ میں روز افزوں اضافہ ہونے لگا۔ مفادات کی اس بر کھا کا زور مغربی پاکستان تک محدود رہا۔ مشرقی بنگال (بعدازاں مشرقی پاکستان) میں مسلم لیگ کے دھان کچھ سوکھے ہی رہے۔

میں نے پورے بنگال میں مسلم لیگ کی بنیاد رکھنے اور اسے منظم کرنے میں بنیادی کردار ادا کیا تھا اور عوام عام طور پر مجھے مسلم لیگ کے معمار کے طور پر جانتے تھے تاہم سیاسی نقطۂ نگاہ میں اختلاف کے باعث مجھے مسلم لیگ کی مخالفت کرنا پڑی۔ مشرقی بنگال کے عوام عام طور سے سرکاری مسلم لیگ کے مخالف تھے تاہم حکومتی نوازشات کی بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے والوں کی بات دوسری تھی کیونکہ سرکاری مسلم لیگ کے ارکان میں مفادات کی بندر بانٹ کا طریقہ مشرقی بنگال میں بھی اختیار کیا گیا تھا۔ کسی کو بھارت سے کپڑا

در آمد کرنے پر اجارہ داری سونپ دی گئی تو کسی کو مغربی پاکستان کے لئے پان بر آمد کرنے کا لائسنس بخش دیا گیا۔ کچھ کو مغربی پاکستان سے نمک منگوانے کے اجازت نامے ملے تو کچھ کو سڑکوں اور دریائی راستوں کے روٹ پرمٹوں سے نوازا گیا۔ تاہم مغربی پاکستان میں تقسیم ہونے والی مراعات کی نسبت مشرقی بنگال کا پلڑا ہلکا رہا جس کا نتیجہ اول الذکر حصے میں سرمائے کے ارتکاز اور سریع الحرکت صنعتی ترقی کی صورت میں سامنے آیا۔ اگرچہ اس ترقی کے ثمرات عام آدمی کی بجائے مخصوص مراعات یافتہ ٹولے تک ہی محدود رہے۔

بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ کا استرداد

مسلم لیگ کی تمام ترناز برداری کے باوجود لیاقت علی خان کو نئے آئین کی تیاری کے لئے کچھ اقدام اٹھانا پڑے۔ ہندوستان نے ابتدائی مراحل میں ہی آئین تیار کر لیا تھا۔ تمام صوبے کے نمائندوں پر مشتمل بنیادی اصولوں کی کمیٹی تشکیل دی گئی۔ جسے نئے آئین کی اساس طے کرنے کا فریضہ سونپا گیا بنیادی اصولوں کی کمیٹی کے متعدد طول وطویل اور ہنگامہ خیز اجلاس منعقد ہوئے کمیٹی کو گوناگوں مسائل کا احاطہ کرنا تھا۔ مثلاً نئی مملکت کا نام کیا ہو گا؟ آیا یہ مملکت اسلامی ہوگی یا نہیں؟ آئین میں کس حد تک اسلامی قوانین کی گنجائش رکھی جائے گی۔ مختلف صوبوں اور قبائلی علاقوں سے منتخب ہونے والے نمائندوں کی تعداد کیا ہوگی۔ آیا ان نمائندوں کی تعداد آبادی کے تناسب سے طے ہوگی یا مشرقی بنگال کے نمائندوں کی تعداد کو کم کرکے مغربی پاکستان کی مجموعی نمائندگی کے برابر کر دیا جائے گا۔

اصول مساوات

علاوہ ازیں کمیٹی کو طرزِ حکومت، طرزِ انتخاب اور سرکاری زبان جیسے اہم مسائل پر بھی اپنی سفارشات پیش کرنا تھیں۔ مزید بر آں ایک اہم سوال یہ تھا کہ مقننہ یک ایوانی ہو یا دو ایوانی اور اگر دو ایوانی مقننہ کے حق میں فیصلہ ہو تو ہر ایوان میں صوبوں کے نمائندوں کی تعداد کیا ہوگی۔

بایں ہمہ بعض مسائل پر کوئی اختلافِ رائے نہیں تھا مثلاً یہ کہ آئین پارلیمانی طرزِ حکومت کا حامل ہو گا سربراہِ مملکت، آئینی سربراہ ہو گا جبکہ وزیرِ اعظم اپنے رفقاء کا انتخاب کرے گا اور فیصلوں کی ذمہ داری مشترکہ طور پر پوری کابینہ پر عائد ہوگی۔ انتخابات حقِ بالغ رائے دہی کی بنیاد پر منعقد ہوں گے۔ ایک مرحلے پر کمیٹی کا کام مکمل تعطل کا شکار ہو گیا کیونکہ مختلف مسلم فرقوں کے علماء کا ایک نیم مذہبی ادارہ اسلامی آئین کے مشمولات طے کرنے میں مشغول تھا۔ بنیادی اصولوں کی کمیٹی نے یکے بعد دیگرے کئی رپورٹیں دستور ساز اسمبلی کے سامنے پیش کیں لیکن کبھی مشرقی پاکستان کے نمائندے انہیں رد کر دیتے اور کبھی یہ رپورٹیں مغربی پاکستان کے نمائندوں کو بارِ خاطر گزرتیں چنانچہ ان رپورٹوں کو نظرِ ثانی کے لئے دوبارہ بنیادی اصولوں کی کمیٹی کو بھیج دیا جاتا۔

سازش اور حیلہ جوئی

دریں اثنا مرکزی حکومت میں چہرے تبدیل ہوتے رہے اور مسلم لیگ کا فاشست عہد اقتدار بلا رکاوٹ جاری رہا۔ اگرچہ اس کا پہلے جیسا بھاؤ نہ رہا کہ حزبِ مخالف کو دیر تک دبائے رکھنا ممکن نہیں تھا۔ جناح (قائداعظم) 11 ستمبر 1948ء کو وفات پا گئے۔ خواجہ ناظم الدین اس وقت مشرقی بنگال کے وزیر اعلیٰ تھے۔ انہیں مسلم لیگ کابینہ کی سفارش پر مملکتِ پاکستان کا گورنر جنرل مقرر کیا گیا۔ نوابزادہ لیاقت علی خاں بدستور وزیراعظم رہے۔ 16 اکتوبر 1951ء کو موخرالذکر کے قتل کے بعد خواجہ ناظم الدین وزیراعظم بن گئے۔ گورنر جنرل کے منصب کے لئے کابینہ نے وزیر خزانہ غلام محمد کا انتخاب کیا ملکہ معظمہ الزبتھ دوم نے اس تقرر کی توثیق کر دی۔

ٹوٹتی بنتی حکومتیں

لیاقت علی خاں اور خواجہ ناظم الدین کے ادوار میں مرکزی حکومت مغربی پاکستان کی صوبائی حکومتوں میں مداخلت کرتی رہی۔ مرکزی حکومت اور مسلم لیگ کے مفادات کی مناسبت سے مختلف صوبوں کے وزراء اعلیٰ تبدیل ہوتے رہے اور وزارتیں بنتی اور ٹوٹتی رہیں۔ حتیٰ کہ سیاسی فضا سازشوں اور حیلہ سازی کے تعفّن سے بوجھل ہو گئی۔

مئی 1953ء میں غیر واضح وجوہات کی بنا پر گورنر جنرل غلام محمد نے ڈرامائی طور پر خواجہ ناظم الدین کو برطرف کر دیا۔ سرکاری طور پر اس اقدام کی وجہ آئین کی تشکیل میں تاخیر قرار دی گئی لیکن غیر سرکاری اطلاعات کے مطابق مرکزی حکومت کی یہ تجویز مہلک ثابت ہوئی کہ فوج کی نفری میں تیس ہزار کی تخفیف کر دی جائے نیز یہ کہ بعض بین الاقوامی طاقتوں کی خواہش تھی کہ پاکستان کو مغربی جمہوریتوں کے زیرِ سایہ لایا جائے اور اس سمت میں پیش رفت کے لئے خواجہ ناظم الدین کو راستے سے ہٹانا ازبس ضروری تھا۔ خواجہ ناظم الدین کا ٹیلیفون منقطع کر دیا گیا اور انہیں ملکہ الزبتھ کے ساتھ رابطہ کرنے سے روک دیا گیا۔ خواجہ ناظم الدین نہ صرف ملکہ الزبتھ سے اپنی برطرفی کے خلاف اپیل کرنا چاہتے تھے بلکہ وہ ملکہ کی ازجملہ ڈومینینز ایک کے وزیراعظم تھے اور اس ناطے سے انہیں ملکہ کا پرنسپل منسٹر ہونے کا اعزاز حاصل تھا۔ وہ اپنی اسی حیثیت میں ملکہ سے درخواست کرنا چاہتے تھے کہ غلام محمد کو گورنر جنرل کے منصب سے برطرف کر دیا جائے۔ خواجہ ناظم الدین مسلم لیگ کے سربراہ تھے اور مسلم لیگی ارکان نے انہیں وزیراعظم پاکستان منتخب کیا تھا۔ مزید برآں چند ہی روز قبل دستور ساز اسمبلی میں مسلم لیگ نے بھاری اکثریت سے خواجہ ناظم الدین کی قیادت پر اپنے اعتماد کا اظہار کیا تھا لیکن ضمیر فروشی اور اخلاقی انحطاط کا اس سے بدتر مظاہرہ کیا ہو سکتا ہے کہ مسلم لیگ نے خواجہ ناظم الدین کی برطرفی کی تائید کی، اظہارِ مسرت کیا اور مسلم لیگ کے کسی حلقے سے کوئی احتجاجی آوازہ تک بلند نہ ہوا۔ غلام محمد نے محمد علی چودھری (جو بعدازاں بوگرا محمد علی یا محمد

علی آف بوگرہ کے نام سے مشہور ہوئے) کو امریکہ سے بلا بھیجا جہاں وہ پاکستان کے سفیر کے طور پر متعین تھے اور انہیں وزیر اعظم مقرّر کر دیا۔ کابینہ بدستور اپنی جگہ پر قائم رہی اور مرکزی مقننہ میں مسلم لیگی اراکین نے چون وچرا کئے بغیر اس تبدیلی کو قبول کر لیا۔

1948ء میں مشرقی بنگال کے وزیرِ اعلیٰ خواجہ ناظم الدین کے گورنر جنرل بننے کے بعد نور الامین کو مشرقی بنگال کا وزیرِ اعلیٰ مقرر کیا گیا اور وہ 1954ء میں صوبائی مجلسِ قانون ساز کے انتخاب تک اس عہدے پر فائز رہے۔ صوبائی مجلسِ قانون ساز کی میعاد بہت پہلے ختم ہو چکی تھی لیکن مرکزی دستور ساز اسمبلی ہر برس کسی نہ کسی بہانے اس کی میعاد میں توسیع کر دیتی تھی۔ مرکز اور مشرقی بنگال میں مسلم لیگ کی حکومتوں کو خطرہ تھا کہ انتخابات کے نتیجے میں مسلم لیگ کا صفایا ہو جائے گا اور یوں مشرقی بنگال کی حکومت مسلم لیگ کے ہاتھ سے نکل جائے گی۔ دراصل ابتدائی مراحل میں ایک ضمنی انتخاب منعقد کرایا گیا تھا جس میں حزبِ مخالف (عوامی لیگ) کے ایک نوعمر مگر ابھرتے ہوئے سیاسی کارکن نے مسلم لیگ کے ایک نامور بلوان کو شکستِ فاش سے دوچار کر دیا تھا۔ اس کے بعد وقتاً فوقتاً نشستیں خالی ہوتی رہیں لیکن حکومت نے ضمنی انتخابات کا خطرہ مول نہیں لیا۔ حتیٰ کہ 1954ء میں صوبائی انتخابات کے انعقاد تک (مسلم لیگ کے لئے بے حد تضحیک اور خفت کے باعث انتخابات کو مزید التوا میں رکھنا ممکن نہیں رہا تھا) مشرقی پاکستان کی صوبائی مجلسِ قانون ساز میں 32 نشستیں خالی ہو چکی تھیں اور ان میں سے کچھ تو سالہا سال سے خالی تھیں۔ اگر ہم اس صورتحال کا برطانوی دور کی جمہوری روایات سے موازنہ کریں جب کسی نشست کے خالی ہوتے ہی ضمنی انتخاب کے انعقاد کے لئے فوری اقدامات کئے جاتے تھے تو ہمیں اندازہ ہو گا کہ محض اپنے اقتدار اور مفادات کو برقرار رکھنے کے لئے مسلم لیگ کس حد تک غیر جمہوری ہتھکنڈے استعمال کر رہی تھی۔

مغربی پاکستان کے قانون ساز اداروں کیلئے انتخابات اور جھرلو

اگرچہ نئے آئین کی تشکیل تک مرکزی مجلسِ قانون ساز (جو دستور یہ کے فرائض بھی انجام دے رہی تھی) کے لئے عام انتخابات کا انعقاد ممکن نہ تھا یا کم از کم یہ جواز ضرور پیش کیا جا رہا تھا لیکن مغربی پاکستان کی صوبائی مجالسِ قانون ساز کی میعاد ختم ہونے پر نئی صوبائی مجالس کے لئے انتخابات منعقد کروائے گئے۔ ان انتخابات میں مسلم لیگ کی کامیابی کے لئے دل کھول کر دھاندلی کی گئی۔ 1951ء میں مغربی پنجاب میں انتخابات منعقد کروائے گئے۔ سردار عبد الرب نشتر، گورنر پنجاب نے بار بار واضح کیا تھا کہ سرکاری حکام انتخابات میں غیر جانبدار رہیں گے تاہم لیاقت علی خان کو اس تجویز سے کچھ ایسا اتفاق نہ تھا۔ یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ سرکاری حکام نے مسلم لیگی امیدواروں کے حق میں بھرپور طریقے سے اپنا اثر و رسوخ استعمال کیا۔ ترغیب و مواعید سے لیکر جبر و تشدد تک ہر حربہ آزمایا گیا۔ سرکاری افسران نے مسلم لیگی امیدواروں کی انتخابی مہم چلائی۔ سرکاری گاڑیوں میں رائے دہندگان کو پولنگ سٹیشنوں تک لے جایا

کیا۔ بعض مقامات پر ایک امیدوار کے ووٹ دوسرے امیدوار کے بیلٹ بکس میں منتقل کر دیئے گئے۔ حتیٰ کہ مخالف امیدواروں کے بیلٹ بکس توڑ کر انتخابی نتائج کو مسخ کرنے سے بھی گریز نہ کیا گیا۔ مخالف جماعتوں میں جناح عوامی مسلم لیگ تھی جس کی صدارت میں کر رہا تھا۔ اس کے علاوہ میاں افتخار الدین کی آزاد پاکستان پارٹی اور جماعت اسلامی بھی میدان میں تھیں۔ اس خوفناک دھاندلی کے باوجود کل 175 نشستوں میں سے میری جماعت نے 32 حلقوں میں کامیابی حاصل کرلی۔ آزاد پاکستان پارٹی دو نشستوں اور جماعت اسلامی بھی غالباً دو نشستوں پر کامیاب ہو گئی۔

اس کے بعد شمال مغربی سرحدی صوبے میں انتخابات منعقد کروائے گئے۔ صوبے کی وزارتِ اعلیٰ خان عبدالقیوم خاں کے پاس تھی جنہوں نے اپنے امیدواروں کے حق میں جبر و استبداد، ناجائز دباؤ اور سرکاری مداخلت کے حربے کھلے بندوں استعمال کئے۔ اگرچہ وہ صوبائی مسلم لیگ کے صدر تھے لیکن انہوں نے مسلم لیگ کے ان امیدواروں کی بھی مخالفت کی جنہیں مسلم لیگ کی مرکزی قیادت نے انکے نامزد کردہ امیدواروں کی بجائے ٹکٹ دیئے تھے۔ خان عبدالقیوم نے وحشیانہ قوت اور سازشوں کے ذریعے اپنے امیدواروں کی کامیابی کو یقینی بنالیا۔ انہوں نے مجھے دھمکی دی کہ اگر میں نے اپنے امیدواروں کی انتخابی مہم چلانے کے لئے شمال مغربی سرحدی صوبے کا رخ کیا تو مجھے گرفتار کر لیا جائے گا۔ شمال مغربی سرحدی صوبے کے انتخابات ہندوستان یا پاکستان کی تاریخ میں بدترین مثال تھے چونکہ انتخابات کے نتیجے میں معرضِ وجود میں آنے والی وزارت مسلم لیگ کی مرکزی وزارت کے تابع تھی اور گھٹیا حربوں کے ذریعے ہی سہی لیکن حزبِ مخالف کو نیست و نابود کر دیا گیا تھا۔ لہٰذا مسلم لیگ کی ہائی کمان نے صوبائی مسلم لیگ کی سرکشی اور شورہ پشتی کی چشم پوشی کرتے ہوئے انتخابی نتائج پر صاد کر دیا۔

بہاولپور میں بھی انتخابات منعقد ہوئے۔ یہاں پر مسلم لیگ کی باگ ڈور حسن محمود کے ہاتھوں میں تھی جنہوں نے انتخابات میں دھاندلی کا فریضہ بعنوانِ شائستہ سرانجام دیا۔ اس کے بعد سندھ میں انتخابات کا کھیل رچایا گیا۔ یہاں پر دھاندلی کی کمیّت و کیفیت دوسرے صوبوں کی نسبت خفیف تھی۔ سندھ میں یوں بھی دھاندلی کی کچھ ایسی ضرورت نہ تھی کیونکہ جاگیردار طبقہ پوری معاشرت پر چھایا ہوا تھا۔ عوامی تحریک کمزور تھی چنانچہ انتخابات میں مفاد یافتہ ٹولے کے خلاف کسی بڑی کامیابی کی امید عبث تھی۔ ان انتخابات کے نتیجے میں قانون ساز مجلسوں میں کوئی تبدیلی رونما نہ ہو سکی۔ مسلم لیگ بدستور برسرِ اقتدار رہی اور جاگیردار طبقہ ایک بار پھر اسمبلیوں میں براجمان ہو گیا۔ البتہ شمال مغربی سرحدی صوبے کو اس ضمن میں استثنا کا درجہ حاصل ہے۔ جہاں خان عبدالقیوم خاں نے روایتی جاگیرداروں کی بجائے ناخواندہ حضرات کی اچھی خاصی تعداد کو کامیاب کروایا تھا تاکہ مجلسِ قانون ساز میں خان صاحب کے اقتدار کی مخالفت کا کوئی امکان باقی نہ رہے۔ مرکز اور صوبوں میں مسلم لیگ کے اقتدار پر کوئی آنچ نہیں آئی تھی۔ لہٰذا مسلم لیگ کی مرکزی حکومت نے ان تمام افعال شنیع کی بھرپور حمایت کی۔

قومی اسمبلی کا انہدام

مئی 1953ء میں خواجہ ناظم الدین کی برطرفی کے بعد سے محمد علی بوگرا وزیر اعظم اور مسلم لیگ

کے صدر چلے آ رہے تھے۔ انہوں نے برطانوی حکومت سے مجوزہ نئے آئین کے تحت پاکستان کو جمہوریہ قرار دینے کی منظوری حاصل کرلی۔ دسمبر 1954ء میں دستور ساز اسمبلی نے نئے دستور پر بحث وتمحیص بھی کرنا تھی لیکن ایک بار پھر بحران پیدا ہو گیا۔ غالباً اکتوبر 1954ء میں وزیر تجارت فضل الرحمٰن اور دیگر وزراء نے گورنر جنرل کے اختیارات میں تخفیف کے لئے بھرپور کوششوں کا آغاز کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ حضرات غلام محمد کی مخدوش دماغی حالت اور جسمانی صحت کے پیشِ نظر بطور گورنر جنرل ان کی اہلیت کو بھی چیلنج کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ اس پر گورنر جنرل نے جوابی کارروائی کر کے کابینہ کو برطرف کر دیا اور قومی اسمبلی توڑ دی یہ امر کبھی واضح نہ ہو سکا کہ خود وزیر اعظم محمد علی بوگرا کس حد تک غلام محمد کے خلاف اس سازش میں شریک تھے۔ غلام محمد کو شبہ تھا کہ وزیر اعظم کو کم از کم اس سازش کی بھنک ضرور پڑ چکی تھی۔ محمد علی بوگرہ اس شک کی تردید کرتے تھے۔ بایں ہمہ انہیں شک کا فائدہ دیتے ہوئے وزراء کی کونسل کا صدر نامزد کیا گیا۔ اب انہیں وزیر اعظم کا درجہ حاصل نہ تھا۔ کابینہ میں نئے وزراء منتخب کئے گئے۔ ان وزراء میں برّی فوج کے سربراہ جنرل ایوب اور مشرقی بنگال کے گورنر میجر جنرل سکندر مرزا شامل تھے۔ ان دونوں کو بالترتیب دفاع اور داخلہ کے قلمدان سونپے گئے۔ 1954ء میں مشرقی بنگال کے صوبائی انتخابات میں مسلم لیگ کو شکست دینے کے بعد میں زیورخ میں اپنا علاج معالجہ کروا رہا تھا۔ یہ انتخابات بالآخر مارچ 1954ء میں منعقد کروائے گئے تھے۔ مسلم لیگ کی مخالف تمام جماعتوں یعنی عوامی لیگ، فضل الحق کی کرشک سرامک پارٹی اور مولانا اطہر علی کی نظام اسلام پارٹی نے مل کر متحدہ محاذ تشکیل دیا۔ اس اتحاد میں میری جماعت عوامی لیگ مضبوط ترین جزو کی حیثیت رکھتی تھی۔ ہمارے درمیان یہ طے پایا تھا کہ میں مشرقی بنگال کی وزارتِ اعلیٰ کے لئے فضل الحق کی حمایت کروں گا اور وہ مرکزی سیاست میں میری قیادت کو قبول کرتے ہوئے میری حمایت کریں گے۔ مولانا بھاشانی اس وقت عوامی لیگ کے صوبائی صدر تھے۔ وزیر اعظم محمد علی بوگرا نے مسلم لیگ کی حمایت میں اپنے تمام تر سرکاری تزک واحتشام کے ساتھ بنگال کا دورہ کر کے جگہ جگہ تقاریر کیں اور اپنے ذاتی روابط کو متحرک کیا۔ مسلم لیگ کی پتلی حالت کے پیشِ نظر محترمہ فاطمہ جناح کو بھی انتخابی جلسوں سے خطاب کے لئے مشرقی بنگال لایا گیا۔ سرکاری حکّام خاص طور پر انسپکٹر جنرل آف پولیس مسٹر ذوہا مسلم لیگ کے امیدواروں کی انتخابی مہم میں حصہ لے رہے تھے۔ ان تمام فوائد کے علی الرغم مسلم لیگ 237 مسلم نشستوں میں سے صرف 9 میں کامیابی حاصل کر سکی[2]۔ متحدہ محاذ کے امیدواروں کے چناؤ، انتخابی جلسوں کے اہتمام، تقاریر نیز تمام انتخابی حلقوں کا دورہ کر کے انتخابی مہم کو منظم کرنے کا بوجھ زیادہ تر مجھے ہی اٹھانا پڑا۔ ضرورت پڑنے پر مولانا بھاشانی اور فضل حق بھی انتخابی حلقوں کا دورہ کرتے رہے تاہم مؤخرالذکر نے خود کو زیادہ تر انہی حلقوں تک محدود رکھا جہاں انکی اپنی جماعت کے ارکان امیدوار تھے۔ مئی 1954ء میں مجھے پیچش کا عارضہ لاحق ہو گیا اور مجھے علاج کی غرض سے زیورخ کے ایک ہسپتال میں داخل ہونا پڑا۔

مسلم لیگ کے خلاف حزبِ مخالف کی نمایاں کامیابی کے باعث مرکزی مقننہ میں مشرقی بنگال سے

تعلق رکھنے والے ارکان اپنی رہی سہی نمائندہ حیثیت بھی کھو بیٹھے لیکن مرکزی حکومت نے مشرقی بنگال کی مجلسِ قانون ساز کو یہ حق دینے سے انکار کر دیا کہ وہ مرکزی مجلسِ قانون ساز میں اپنے نمائندوں کا از سرِ نو انتخاب کریں۔ اسی طرح مرکزی کابینہ میں بھی کسی تبدیلی کی ضرورت محسوس نہ کی گئی اور مسلم لیگ کی شکست کو ایک ایسا واقعہ قرار دیکر نظرانداز کر دیا گیا جس سے مرکزی حکومت یا اس کی پالیسی پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا تھا۔

دفعہ 92 ۔ اے کا نفاذ

انتخاب کے بعد متحدہ محاذ کی طرف سے فضل الحق مشرقی پاکستان کا وزیرِ اعلیٰ نامزد کیا گیا۔ انہوں نے کلکتہ کے ایک جلسۂ عام میں اپنے مخصوص جذباتی اور غیر متوازن لہجے میں ایک ایسی تقریر کر ڈالی جس کا مقصد بھارت کے ہندوؤں سے داد و تحسین کے ڈونگرے وصول کرنا تھا۔ اخبارات کے مطابق انہوں نے کہا کہ وہ پاکستان کا منشائے وجود سمجھنے سے قاصر ہیں اور یہ کہ وہ بنگال کے دونوں حصوں کو متحد کرنے میں اپنی تمام توانائیاں صرف کر دیں گے۔ اس تقریر کی اشاعت کے بعد مشرقی بنگال میں متعدد مقامات پر عوامی اجتماعات میں فضل الحق کی مذّمت کی گئی۔ ایک جلسے کی صدارت مولانا بھاشانی نے بھی کی۔ متحدہ محاذ میں اختلافات کا دروازہ کھل چکا تھا۔ مرکزی حکومت نے فضل الحق کو غدّار قرار دیا۔ انہیں کابینہ سمیت برطرف کر دیا گیا۔ صوبائی اسمبلی معطل کر دی گئی اور صوبے میں آئین کی دفعہ 92۔ اے نافذ کر دی گئی جس کے تحت گورنر جنرل نے صوبے کا اختیار سنبھال کر گورنر کو اپنا نمائندہ مقرر کر دیا۔

وزارتِ دفاع کے سیکرٹری کرنل (بعد ازاں میجر جنرل) سکندر مرزا کو گورنر بنا کر بھیجا گیا۔ انہوں نے اپنے ورود کے ساتھ ہی پبلک سیفٹی ایکٹ کے تحت متحدہ محاذ کے کارکنوں کی ایک بڑی تعداد (غالباً تین ہزار) کو گرفتار کر لیا۔ اس قانون کے تحت کسی بھی شہری کو مقدمہ چلائے بغیر حفاظتی نظر بندی میں رکھا جا سکتا تھا۔ متحدہ محاذ میں عوامی لیگ منظم ترین جماعت تھی لہٰذا گرفتار ہونے والوں کی اکثریت کا تعلق اسی جماعت سے تھا۔ کچھ عرصہ بعد حکومت نے فیصلہ کیا کہ فضل الحق پر غدّاری کے الزام مین مقدمہ چلایا جائے گا لیکن فضل الحق کی اس یقین دہانی پر کہ وہ سیاست سے کنارہ کش ہو جائیں گے۔ اس ضمن میں مزید کارروائی روک دی گئی۔

آمریت سے بچاؤ کی خاطر وزارت قانون کی قبولیت

میرے زیورخ روانہ ہونے سے قبل غلام محمد اور بوگرا محمد علی نے مجھ سے ملاقات کی۔ بعد میں بھی اب میں زیورخ میں بسترِ علالت پر دراز تھا تو متعدد ایلچی بھیج کر مجھ سے درخواست کی گئی کہ صحت یابی کے بعد وطن واپس آ کر مرکزی کابینہ میں شمولیت اختیار کر لوں۔ حکومت کو مرکزی کابینہ کے لئے عوامی حمایت کی شدت سے ضرورت محسوس ہو رہی تھی اور وہ کابینہ میں میری شمولیت کی خاطر مشرقی پاکستان کی

نو منتخب مقننہ کو مرکزی اسمبلی کے لئے از سرِ نو اپنے نمائندے منتخب کرنے کی اجازت دینے پر بھی آمادہ تھے۔ میں 5 دسمبر 1954ء کو پاکستان واپس آیا اس وقت تک پرانی دستور ساز اسمبلی برطرف کی جاچکی تھی۔ پرانی کابینہ برخاست کر کے نئی کابینہ تشکیل دی گئی تھی۔ وطن واپسی کے فوراً بعد مجھ سے رابطہ کیا گیا۔ غلام محمد اور بوگرا محمد علی نے مجھے کابینہ میں شامل کرنے کے لئے مجھ پر یلغار کر دی۔ نئی کابینہ کو "باصلاحیت کابینہ" قرار دیا جارہا تھا۔ ڈاکٹر خاں صاحب کو پہلے ہی کابینہ میں شمولیت پر آمادہ کیا جاچکا تھا۔ ڈاکٹر خاں صاحب تقسیم ہند کے وقت شمال مغربی سرحدی صوبے میں کانگرس وزارت کے وزیر اعلیٰ تھے وہ اس استصواب رائے تک اس عہدے پر فائز رہے تھے جس کے نتیجے میں شمال مغربی سرحدی صوبہ پاکستان کا حصہ بنا۔ ڈاکٹر خاں صاحب سرحد کے سرخ پوش رہنما خان عبدالغفار خاں کے بھائی تھے لیکن ان کے سکندر مرزا کے ساتھ گہرے دوستانہ روابط بھی تھے۔ مشرقی پاکستان سے فضل الحق کی نمائندگی ابوالحسین سرکار کر رہے تھے۔ غلام محمد نے دھمکی دی کہ اگر میں کابینہ میں شامل نہ ہوا تو وہ حکومت فوج کے سربراہ اور وزیر دفاع جنرل محمد ایوب خاں کے سپرد کر دیں گے اور ملک میں فوجی آمریت قائم ہو جائے گی۔ میں دو ہفتوں تک انہیں ٹالتا رہا۔ آخر میں نے وزراء کی کونسل کے صدر محمد علی بوگرا کے ساتھ بطور وزیرِ قانون کام کرنے پر آمادگی ظاہر کر دی۔ اس فیصلے کی ایک وجہ تو فوجی آمریت کے خطرے کو ٹالنا تھا اور ایک سبب یہ بھی تھا کہ غلام محمد نے وعدہ کیا تھا کہ وہ ایک دستور ساز اسمبلی قائم کر کے آئین بحال کر دیں گے بشرطیکہ میں کابینہ میں شامل ہو کر اس معاملے کو اپنے ہاتھ میں لے لوں۔ وزراء کی کونسل کے سربراہ محمد علی بوگرا متحدہ بنگال کے دنوں میں میرے محکمے کے پارلیمانی سیکرٹری رہے تھے۔ پھر جب میں نے وزیرِ اعظم بنگال کا عہدہ سنبھالا تو وہ میرے وزیرِ خزانہ رہے تھے۔

میری جماعت نے کابینہ میں میری شمولیت کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا، لیکن میرا خیال تھا کہ وزارت سے انکار گوناگوں وجوہ کی بنا پر قرینِ مصلحت نہیں تھا۔ میں ایک طرف تو ملک کو فوجی آمریت کے عفریت سے بچانا چاہتا تھا۔ دوسری طرف میں آئین کی بحالی کے لئے مضطرب تھا۔ تمیزالدین خاں پہلے ہی دستور ساز اسمبلی کی برطرفی کے بارے میں ہائیکورٹ سے رجوع کر چکے تھے اس صورتحال سے نپٹنے کے لئے وزارتِ قانون میں ہونے والی قانونی کارروائی اور دیگر اقدامات آئینی ماہرین کے لئے بڑی دلچسپی کے حامل تھے۔ کئی بار ہمیں رات دیر گئے تک کام کرنا پڑتا۔ ایک ممتاز آئینی ماہر کیو سی ڈپلوک کی خدمات بھی حاصل کی گئیں بالآخر سپریم کورٹ نے گورنر جنرل کو تجویز دی کہ وہ سابقہ اسمبلی کی طرز پر نئی دستور ساز اسمبلی تشکیل دیں۔ اس اسمبلی کو پچھلی اسمبلی جیسے اختیارات حاصل ہوں گے تاہم گورنر جنرل کو اختیار دیا گیا کہ وہ ملک کے مفاد میں دستور ساز اسمبلی کے ارکان کی تعداد اور مختلف صوبوں کی نمائندگی میں مناسب ردّوبدل کر سکتے ہیں۔

دوسری دستور ساز اسمبلی

میں پہلے ہی فیصلہ کر چکا تھا کہ آئندہ دستور ساز اسمبلی میں مشرقی بنگال اور مغربی پاکستان کی تمام

انتظامی وحدتوں کی نمائندگی کو یکساں رکھا جائے چونکہ دستور ساز اسمبلی میں نمائندگی کی نوعیت یکسر تبدیل ہو چکی تھی للہٰذا ہمارے خیال میں اسے دستور ساز اسمبلی کا نام نہیں دیا جا سکتا تھا۔ یہ ادارہ اپنی ہئیتِ ترکیبی میں اس اسمبلی سے بالکل مختلف تھا جو قانون آزادی ہند 1947ء کے نتیجے میں قائم ہوئی تھی۔ اس اسمبلی کو دستور ساز کنونشن کا نام دینا زیادہ موزوں معلوم ہوتا تھا تاہم سپریم کورٹ کے مشورے کی روشنی میں ہم نے اسے دستور ساز اسمبلی کا نام ہی دینے کا فیصلہ کیا۔

میں نے ملک کے مغربی اور مشرقی حصے میں بہتر ہم آہنگی کی خاطر مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان میں مساوی نیابت پر آمادگی ظاہر کی تھی۔ علاوہ ازیں اس تجویز سے مغربی پاکستان کے ان خدشات کا ازالہ کیا جا سکتا تھا کہ مشرقی پاکستان اپنی عددی کثرت کے بل بوتے پر مغربی پاکستان پر بالادستی قائم کرے گا۔ سابقہ دستور ساز اسمبلی میں ان خدشات نے کئی ناخوشگوار مباحث اور واقعات کو جنم دیا تھا۔ مجھے یہ توقع بھی تھی کہ مساوی نیابت کے نفاذ سے صوبائی جماعتوں کی جگہ قومی سیاسی جماعتیں منظرِ عام پر آئیں گی۔ مساوی نیابت کے ساتھ حکومت دیگر امور مثلاً سرکاری ملازمتوں، صنعتی ترقی، غیر ملکی امداد، مرکزی حکومت کی مالی تخصیص حتیٰ کہ دفاعی امور وغیرہ میں بھی اصولِ مساوات پر عمل درآمد کی کوشش کرے گی تاہم مجھے مشرقی بنگال کو مساوی نیابت کی افادیت پر قائل کرنے میں خاصی دقت پیش آئی۔ یہ کام جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ مجھے فضل الحق کے علاوہ مولانا بھاشانی کی تنقید کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ انجامِ کار میں اپنی جماعت کے اراکین سے اپنا مؤقف منوانے میں کامیاب ہو گیا۔

21 جون 1955ء کو مختلف صوبوں اور انتظامی وحدتوں نے مرکزی مجلسِ قانون ساز کے لئے اپنے نمائندوں کا انتخاب کیا اور نئی دستور ساز اسمبلی معرضِ وجود میں آ گئی۔ 1949ء میں مجھے دستور ساز اسمبلی کی رکنیت سے محروم کر دیا گیا تھا۔ اب میں دوبارہ اسمبلی کا رکن بننے میں کامیاب ہو گیا چونکہ انتخاب واحد قابلِ تبادلہ ووٹ کے نظام کی بنیاد پر منعقد ہوا تھا۔ للہٰذا مشرقی بنگال سے متحدہ محاذ کے ارکان کی خاصی تعداد منتخب ہونے میں کامیاب ہو گئی۔ مشرقی بنگال قانون ساز اسمبلی میں مسلم لیگ کے ارکان صوبے کے لئے مخصوص 40 نشستوں پر صرف ایک رکن منتخب کر سکتے تھے اور انہوں نے محمد علی بوگرا کو چن لیا۔ فضل الرحمٰن کا تعلق بھی مسلم لیگ سے تھا لیکن وہ کچھ آزاد امیدواروں کی حمایت سے آزاد حیثیت میں منتخب ہو سکے۔ اس امر کو مشرقی بنگال کے اراکینِ اسمبلی کا اعزاز سمجھنا چاہئے کہ وہ بہت کم اپنی وفاداریاں تبدیل کرتے تھے یا اپنی جماعت سے غدّاری کے مرتکب ہوتے تھے۔ 1958ء میں فوجی حکومت نے سیاست دانوں اور ارکانِ اسمبلی پر ذاتی مفادات کی خاطر سیاسی وفاداریاں تبدیل کرنے کا جو الزام عائد کیا تھا وہ مشرقی بنگال کے ارکانِ اسمبلی پر صادق نہیں آتا۔ البتہ مغربی پاکستان مقنّنہ کے جاگیردار ارکان کا دامن اس دھبے سے پاک نہیں کہا جا سکتا۔ سیاسی انحطاط کی یہ علامت خاص طور پر ان دنوں میں سامنے آئی جب ری پبلکن پارٹی اور مسلم لیگ کے درمیان اقتدار کی کشمکش زوروں پر تھی۔

نئی دستور ساز اسمبلی کا اجلاس 7 جولائی 1955ء کو مری کے مقام پر منعقد ہونا تھا۔ 6 جولائی کو گورنمنٹ ہاؤس پر ایک عشائیہ دیا گیا جس میں نواب گورمانی وزیرِ داخلہ میجر جنرل سکندر مرزا، وزیرِ دفاع

جنرل ایوب خاں، ڈاکٹر خاں صاحب اور چودھری محمد علی بھی شریک تھے۔ اس موقع پر فیصلہ ہوا کہ ہم لوگ آپس میں مل بیٹھیں اور آئین کی تشکیل کے ضمن میں متنازعہ مسائل پر غور و فکر کر کے کسی تصفیے کی صورت نکالیں۔ دستور ساز اسمبلی کے اجلاس کے ساتھ ان مذاکرات کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ 13 جولائی کو ایک پانچ نکاتی معاہدہ طے پا گیا جس پر مختلف سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں نے دستخط ثبت کر دیئے۔ مغربی پاکستان کی طرف سے نواب گورمانی، ڈاکٹر خاں صاحب اور چودھری محمد علی نے دستخط کئے۔ محمد علی بوگرہ نے مسلم لیگ کی طرف سے معاہدے پر دستخط کئے۔ فضل الحق کو مشرقی پاکستان کی طرف سے دستخط کرنا تھے لیکن انہوں نے اصرار کیا کہ معاہدے پر عطا الرحمٰن اور ابوالمنصور احمد سے بھی دستخط کروائے جائیں۔ ان حضرات کے دستخط ثبت ہونے کے بعد نواب گورمانی نے فضل الحق کے دستخط حاصل کرنے کی ذمہ داری اٹھائی اور بعدازاں اطلاع دی کہ وہ فضل الحق کے دستخط حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔

معاہدے کے پانچ نکات حسبِ ذیل تھے۔

(1) مغربی پاکستان کی تمام انتظامی وحدتوں کو آپس میں مدغم کر کے ون یونٹ تشکیل دیا جائے گا۔

(2) ملک کے دونوں حصوں کو مکمل علاقائی خود مختاری دی جائے گی۔

(3) دونوں حصوں کے درمیان مساوات کو محض نیابت تک ہی محدود نہیں رکھا جائے گا بلکہ دیگر امور میں بھی مساوات اختیار کی جائے گی۔

(4) انتخابات مخلوط طریقِ انتخاب کے تحت منعقد کروائے جائیں گے۔

(5) اردو اور بنگالی ملک کی سرکاری زبانیں ہوں گی۔

علاوہ ازیں، یہ بھی طے پایا کہ محمد علی بوگرہ مستعفی ہو جائیں گے اور ان کی جگہ مجھے ملک کا اگلا وزیرِ اعظم منتخب کیا جائے گا۔

وزارت عظمیٰ کی پیشکش اور خفیہ ہاتھ

16 جولائی 1955ء کو غلام محمد لندن سے واپس کراچی پہنچ گئے۔ 5 / اگست 1955ء کو انہیں خرابیٔ صحت اور امورِ مملکت کی انجام دہی کے ناقابل ہونے کی بنا پر سبکدوش ہونے پر مجبور کر دیا گیا۔ میجر جنرل سکندر نے قائم مقام گورنر کی حیثیت سے غلام محمد کی جگہ لے لی۔ 7 / اگست کو چودھری محمد علی مسلم لیگ کے قائد چن لئے گئے نیز مسلم لیگ نے فیصلہ کیا کہ بوگرا مستعفی ہو جائیں نیز گورنر جنرل سے درخواست کی جائے کہ سہروردی یعنی مجھے اگلا وزیر اعظم نامزد کیا جائے۔ اگلے روز چودھری محمد علی نے اعلان کیا کہ دستور ساز اسمبلی میں عوامی لیگ اور مسلم لیگ کا اتحاد قائم ہو گیا ہے نیز ایک قرارداد کے ذریعے مجھے اگلی کابینہ میں وزیر اعظم تجویز کیا گیا۔ یہ تمام بندوبست اس قدر حتمی اور سرکاری معلوم ہو رہا تھا کہ بی بی سی نے اگلے وزیر اعظم کے طور پر میرا نام بھی نشر کر دیا۔ گورنر جنرل سکندر مرزا کی منظوری حاصل

کرنے کے بعد محمد علی مجھ سے ملاقات کرنے آئے اور انہوں نے رسمی طور پر مجھے وزارتِ عظمیٰ کی پیشکش کی ہم نے وزراء کے انتخاب اور محکموں کی تقسیم کے بارے میں گفت وشنید شروع کر دی۔ اس سلسلے میں چودھری محمد علی نے مجھ سے کئی بار ملاقات کی۔

بایں ہمہ گورنر جنرل سکندر مرزا اسمبلی میں مسلم لیگ کی بھاری اکثریت کے ہاتھوں اس فیصلے کو قبول کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ وگرنہ انہیں میرے انتخاب پر سخت اعتراض تھا۔ افواہ تھی کہ سکندر مرزا نے میری نامزدگی کی مخالفت کرتے ہوئے یہ بھی کہا تھا کہ مجھے وزیرِاعظم بننے کے لئے ان کی لاش پر سے گزرنا ہو گا۔ غالباً اس عناد کی وجہ یہ تھی کہ اگست 1955ء میں جب غلام محمد کی جگہ سکندر مرزا کو گورنر جنرل منتخب کیا جا رہا تھا تو میں نے کابینہ کے رکن کی حیثیت سے ان کی بھرپور حمایت نہیں کی تھی۔ یاد رہے کہ وہ اس وقت وزیرِ داخلہ کے طور پر کابینہ کے رکن تھے جبکہ ان کے دم ساز اور مربی کمانڈر انچیف ایوب خاں وزیرِ دفاع تھے ان دونوں نے محمد علی بوگرا کو انگیخت دی کہ گورنر جنرل دماغی اور جسمانی طور پر اپنے فرائض انجام دینے کے قابل نہیں رہا تھا۔ گورنر جنرل کا نطق سوائے اس کی سیکرٹری کے ہر شخص کے لئے ناقابلِ فہم ہو چکا تھا۔ ان دونوں نے تجویز کیا کہ ایک میڈیکل بورڈ گورنر جنرل کا معائنہ کرے اور غیر تسلی بخش نتائج کی صورت میں گورنر جنرل سے استعفیٰ طلب کر لیا جائے۔ محمد علی بوگرا نے خاصی آہ وبکا اور ردّ و کد کے بعد اس مشورے پر عمل کیا ملکہ الزبتھ دوم سے غلام محمد کے جانشین کی توثیق کے لئے کابینہ کی سفارش درکار تھی۔ کمانڈر انچیف ایوب نے سکندر مرزا کے حق میں بھرپور مہم چلائی۔ یہ امر عوام کے علم میں ہے کہ ایوب خاں کے امیدوار سکندر مرزا کو کابینہ سے نامزدگی کی سفارش کے حصول میں مزید ایک ووٹ کی ضرورت تھی اور ایوب خاں نے دباؤ کے ذریعے یہ ووٹ حاصل کیا۔ مسلم لیگ کو بطور وزیرِاعظم میری نامزدگی کی منظوری دینے کے فوراً بعد سکندر مرزا نے اس فیصلے کو سبوتاژ کرنے کے لئے جوڑ توڑ شروع کر دیئے۔ سکندر مرزا نے چند روز قبل فضل الحق کو غدّار قرار دیا تھا۔ اب اسی فضل الحق کے پاس ایلچی روانہ کئے اور بطور وزیرِاعظم چودھری محمد علی کی حمایت کے عوض مرکز میں وزارتِ داخلہ کی پیشکش کی گئی۔ فضل الحق کو اس پیشکش کی صورت میں یہ موقع نظر آیا کہ سیاست میں بطور مرکزی وزیر واپسی کی صورت میں وہ گویا ان لوگوں کو مسکت جواب دیں گے جنہوں نے انہیں غدّار قرار دیکر ان کی مذمّت کی تھی۔ چنانچہ فضل الحق نے ترنت یہ پیشکش قبول کر لی حالانکہ 1954ء میں متحدہ محاذ کی تشکیل کے وقت طے پایا تھا کہ وہ مرکز میں میری حمایت کریں گے۔ اسی اثناء میں سکندر مرزا نے چودھری محمد علی پر جال پھینکا اور انہیں وزارتِ عظمیٰ کی پیشکش کی۔

سکندر مرزا نے اس مغالطہ آمیز استدلال کو ہوا دینا شروع کی کہ پاکستان میں یہ روایت قائم ہونی چاہئے کہ اگر گورنر جنرل کا تعلق بنگال سے ہو تو ایک دوسرے بنگالی یعنی مجھے وزیرِاعظم نہیں بننا چاہئے بلکہ وزیرِاعظم کا تعلق مغربی پاکستان سے ہونا چاہئے۔ سکندر مرزا کا دعویٰ تھا کہ وہ بنگال سے تعلق رکھتے ہیں کیونکہ ان کا سلسلۂ نسب میر جعفر سے جا ملتا تھا جنہیں پلاسی کے مقام پر سراج الدولہ سے غدّاری کے صلے میں

لارڈ کلائیو نے بنگال کا نواب ناظم بنایا تھا۔ تاہم سکندر مرزا نے کبھی اپنے آبائی قصبے مرشد آباد میں پاؤں تک نہیں رکھا تھا چنانچہ بنگال سے ان کا تعلق اور بنگالی ہونے کا دعویٰ محل نظر تھا مستقبل میں وقتی مفادات کے پیشِ نظر سکندر مرزا نے یہ دعویٰ واپس بھی لے لیا۔ وہ غالباً بمبئی میں پیدا ہوئے تھے۔ ساری عمر بنگال سے باہر بسر کی۔ کچھ عرصہ فوج میں رہے۔ پٹھانوں کے ساتھ ایک جھڑپ میں زخمی ہونے کے بعد پولیٹیکل سروس میں چلے گئے اور اپنی پیشہ ورانہ زندگی کا غالب حصہ قبائلی علاقوں میں انگریزوں کے پولیٹیکل ایجنٹ کی حیثیت سے پٹھانوں کے ساتھ گزارا۔ وہ روانی سے پشتو بول سکتے تھے اور انہوں نے موزوں ترغیبات پیش کرنے اور ایک فریق کو دوسرے فریق سے بھڑا دینے کے فنِ لطیف میں خاصا کمال پیدا کیا تھا۔

چودھری محمد علی نے کچھ ہچکچاہٹ سے کام لیا کیونکہ انہوں نے خود مجھے وزارتِ عظمیٰ کی پیشکش کی تھی لیکن بالآخر اس ترغیب کا حجم ان کی استقامت سے بہت بڑا ثابت ہوا۔ مسلم لیگ کو اپنی قرارداد واپس لیکر چودھری محمد علی کو وزارتِ عظمیٰ اور فضل الحق کو وزارتِ داخلہ کی پیشکش کرنے پر آمادہ کر لیا گیا۔ پوری کابینہ تبدیل کر دی گئی میں نے وزارت سے استعفیٰ دے دیا اور حزب اختلاف کا قائد بن گیا۔ مجھے وزیر قانون کے طور پر ملنے والی رہائش گاہ میں بدستور قیام کرنے کی اجازت دے دی گئی اور اس مکان کو سرکاری طور پر قائدِ حزب اختلاف کی رہائش گاہ قرار دیدیا گیا۔ چودھری محمد علی نے کچھ پارلیمانی روایات قائم کیں۔ مجھ سے براہِ راست تعلق رکھنے والی روایت یہ تھی کہ قائدِ حزب اختلاف کی حیثیت کو سرکاری طور پر تسلیم کر کے اسے مفت رہائش اور فون کی سہولت مہیا کی گئی۔ ایوان میں کارروائی کے بارے میں حزب اختلاف سے صلاح مشورے کی روایت ڈالی گئی۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ آیا اس عہدے کے لئے کچھ مشاہرہ تجویز بھی کیا گیا تھا یا نہیں تاہم میں نے اس سلسلے میں کوئی رقم وصول نہیں کی اور نہ ہی ایسا کرنے کا کوئی ارادہ رکھتا تھا۔

ون یونٹ ...... مشرقی پاکستان کے خلاف متحدہ محاذ

اب ہم مشرقی اور مغربی پاکستان میں سیاست کی پریشان حالی کی طرف آتے ہیں جس کی اگر مکمل نہیں تو زیادہ تر ذمّہ داری ضرور سکندر مرزا پر عائد ہوتی ہے۔

چودھری محمد علی نے سب سے پہلے جن اقدامات کا بیڑا اٹھایا ان میں سے ایک یہ تھا کہ مغربی پاکستان کے تمام صوبوں کو ایک وحدت میں مدغم کر دیا جائے[3]۔ یہ امر قابلِ افسوس ہے کہ انگریزوں نے جس تجویز پر انتظامی سہولت کے خیال سے غور کیا تھا اسے مشرقی پاکستان کے خلاف بداعتمادی، شکوک وشبہات اور عناد کے پیشِ نظر زندہ کیا جا رہا تھا۔ خیال یہ تھا کہ مشرقی پاکستان کی بالادستی کے خطرے کا مقابلہ کرنے کی صرف ایک ہی صورت تھی اور وہ یہ کہ مغربی پاکستان کو ایک مضبوط اور متحد وحدت میں ڈھال دیا جائے۔ اگرچہ مشرقی پاکستان نے مساوی نیابت کے اصول کو تسلیم کر کے اپنی اکثریت قربان کر دی تھی لیکن وہ کسی بھی وقت مغربی بازو کے کسی چھوٹے صوبے کو اپنے ساتھ ملا کر مغربی پاکستان پر غلبہ حاصل کر سکتا تھا۔

مغربی پاکستان میں صوبائی مناقشوں اور تلخیوں کے مدّنظر چودھری محمد علی اس خطرے کو زیادہ بعید از امکان نہیں سمجھتے تھے۔ ماضی میں چند مواقع پر شمال مغربی سرحدی صوبے کے رہنما خان عبدالقیوم خان نے بنگالی نمائندوں کے ساتھ مل کر پنجابی گروپ کی تجاویز کی مخالفت کی تھی۔ ان واقعات کی چبھن چودھری محمد علی کے دل و دماغ کو مضطرب کیئے دیتی تھی اور وہ انہیں مغربی پاکستان کے مفادات سے غدّاری سمجھتے تھے۔ چودھری محمد علی نے کچھ ایسا انتظام کیا کہ مغربی پاکستان کی ہر صوبائی مجلسِ قانون ساز نے تقریباً متفقہ طور پر ادغام کے حق میں قرار داد منظور کر دی۔ سندھ کے وزیر اعلیٰ ایوب کھوڑو تھے۔ وہاں کی اسمبلی میں اس قرارداد کی منظوری کے لئے دھونس اور دھمکیوں سے کام لیا گیا اور کچھ ارکان کو گرفتار بھی کیا گیا۔ شمال مغربی سرحدی صوبے میں پولیس کے ایک سابق انسپکٹر جنرل سردار عبدالرشید وزیر اعلیٰ تھے۔ اس صوبے کی اسمبلی سے ون یونٹ کی حمایت میں قرار داد کے حصول کے لئے یہ جھوٹا وعدہ استعمال کیا گیا کہ پشاور کو مغربی پاکستان کا صدر مقام بنایا جائے گا۔ دستور ساز اسمبلی میں ون یونٹ بل خاصے ہنگامے کے بعد منظور ہو سکا۔

شمال مغربی سرحدی صوبے کے سردار عبدالرشید نے صوبائی مجلسِ قانون ساز میں صوبوں کے ادغام کی حمایت کی تھی۔ جب انہیں برطرف کیا گیا تو انہوں نے ایک خفیہ دستاویز کا انکشاف کیا جو ممتاز خاں دولتانہ کی تخلیق تھی۔ اس دستاویز میں دعویٰ کیا گیا تھا کہ صوبوں کے ادغام سے نہ صرف مغربی پاکستان بلکہ پورے پاکستان میں پنجاب کی بالادستی یقینی ہو جائے گی۔ اس مقصد کی پردہ پوشی کے لئے مناسب ہو گا کہ دستور ساز اسمبلی میں مغربی پاکستان کے صوبوں کے ادغام کی قرارداد پنجاب کی بجائے دوسرے صوبوں کے نمائندے پیش کریں اور وہی لوگ اس کی تائید کریں۔ چھوٹے صوبوں کو اس تجویز کی حمایت پر راغب کرنے کے لئے چودھری محمد علی نے تجویز پیش کی کہ صوبہ پنجاب کے نمائندے 40 فیصد نمائندگی پر آمادہ ہو جائیں حالانکہ مغربی پاکستان میں پنجاب کی آبادی کا تناسب 56 فیصد تھا۔ دراصل صوبہ پنجاب سے باہر بھی بہت سے علاقوں میں پنجابیوں کی اکثریت آباد تھی اور ان آباد کار پنجابیوں کے ذریعے چھوٹے صوبوں سے بھی پنجابی امیدوار منتخب کئے جاسکتے تھے۔ سردار عبدالرشید نے پر زور طریقے سے صوبوں کے ادغام کی مخالفت کی۔

میں نے ادغام کی تجویز کی اس بنیاد پر مخالفت کی کہ اس تجویز کی مناسب طور پر تشہیر نہیں کی گئی تھی اسے عوامی تائید حاصل نہیں ہو سکی تھی۔ مزید یہ کہ پنجاب کے علاوہ دیگر صوبوں کی مجالس ہائے قانون ساز میں اس تجویز کی منظوری دھونس اور جھوٹے وعدوں کے ذریعے حاصل کی گئی تھی۔ میری رائے تھی کہ اس تجویز کی اچھی طرح تشہیر کر کے اس کے فوائد و عواقب کو سامنے لایا جائے اور قانون سازی سے پہلے عوامی تائید کو یقینی بنایا جائے۔ انتظامی سطح پر اس منصوبے کے حق میں مشترک دریاؤں، سڑکوں، ریلوں اور نظام آبپاشی کے حوالے سے دلائل دیئے جاسکتے تھے مزید یہ کہ اس سے سندھی اور پنجابی، بلوچی اور پنجابی اور پٹھان اور پنجابی کے درمیان موجود تلخیوں اور عناد کو کم کرنے میں مدد مل سکتی تھی۔ میں نے خیال ظاہر

کیا کہ اگر صوبوں کو مدغم کر کے انتظامی وحدت قائم کی جاتی ہے تو پھر اس منصوبے کو کام کرنے کا موقع ملنا چاہئے لیکن مناسب عوامی تائید کی عدم موجودگی میں خدشہ تھا کہ یہ بندوبست جلد ہی درہم برہم ہو جائے گا اور مغربی پاکستان کے مختلف نسلی گروہوں میں مزید تلخیوں کو جنم دے گا۔

زور دار مخالفت کے باوجود وحدتِ مغربی پاکستان کا قانون منظور کر لیا گیا۔ شمال مغربی سرحدی صوبے کے ڈاکٹر خاں صاحب نے وحدت مغربی پاکستان کی ڈٹ کر حمایت کی اگر چہ انکے بھائی اور سرخ پوش رہنما خان عبدالغفار خان اس تجویز کے کٹر مخالف تھے میں نے اپنی تقریر کے دوران ڈاکٹر خاں صاحب کو خبردار کیا کہ وہ مسلم لیگ کے وعدوں کے جھانسے میں نہ آئیں۔ مسلم لیگ نے ڈاکٹر خاں صاحب سے وعدہ کیا تھا کہ چھوٹے صوبوں کے بارے میں پنجاب کی نیک نیتی کی ضمانت کے طور پر انہیں مغربی پاکستان کا وزیر اعلیٰ بنا دیا جائے گا۔ میں نے اس یقین کا اظہار کیا کہ مسلم لیگ بالآخر ان سے دھوکہ کرے گی۔ ظاہر ہے کہ ڈاکٹر خاں صاحب نے جواب میں مجھے اپنے کام سے کام رکھنے کا مشورہ دیا۔ چودھری محمد علی نے مسلم لیگ کے پارلیمانی قائد اور وزیر اعظم کی حیثیت سے ایوان میں ایک بار پھر اس وعدے کا اعادہ کیا۔

مختلف کالعدم مجالس ہائے قانون ساز کے ارکان نے مغربی پاکستان کی نئی مقنّنہ کا انتخاب کیا ان ارکان کو ضلعی بنیادوں پر انتخابی حلقوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ سوات، دیر، امب، بلوچستان کی ریاستوں اور قبائلی علاقوں کے لئے مخصوص نمائندگی رکھی گئی تھی۔ ڈاکٹر خاں صاحب کو مغربی پاکستان کا وزیر اعلیٰ اور نواب مشتاق حسین گورمانی کو گورنر مقرّر کیا گیا۔

وحدتِ مغربی پاکستان کے قانون کی منظوری کے بعد چودھری محمد علی نے پاکستان کے آئین کی تشکیل پر بھرپور طریقے سے توجّہ کی۔ اس مقصد کے لئے کیمبرج کے ایک ممتاز آئینی ماہر سر آئیور جیننگز کی خدمات حاصل کی گئیں۔ آئین کی منظوری کے باوجود اسکے نفاذ کو 23 مارچ 1956ء تک مؤخر کر دیا گیا کیونکہ 1940ء میں اسی تاریخ کو مسلم لیگ کے اجلاس میں وہ بنیادی قرارداد منظور کی گئی تھی جس نے آگے چل کر مطالبہ پاکستان کو جنم دیا۔ پاکستان ایک جمہوریہ بن گیا۔ سکندر مرزا اب تک گورنر جنرل چلے آرہے تھے اب انہیں 1956ء کے آئین کے تحت صدر منتخب کیا گیا۔ ڈاکٹر خاں صاحب کا شمار سکندر مرزا کے قریبی دوستوں میں ہوتا تھا۔ اسے سکندر مرزا کی بدقسمتی سمجھنا چاہئے کہ جب وہ ڈاکٹر خاں صاحب کی ہر طرح مدد کر چکے تو موخرالذکر کے قتل سے کچھ عرصہ قبل دونوں کے درمیان اختلافات نمودار ہو گئے۔

ری پبلکن پارٹی کی متذبذب تخلیق

میری پیش گوئی سچ ثابت ہوئی۔ مغربی پاکستان کی نئی مقنّنہ میں مسلم لیگ پارٹی سرکشی پر اتر آئی۔ مسلم لیگ نے دعویٰ کرنا شروع کیا کہ مغربی پاکستان کی نوتشکیل شدہ مقنّنہ میں ارکان کی اکثریت کا تعلق

مسلم لیگ سے ہے اور ان ارکان کو جن ارکانِ اسمبلی نے منتخب کیا تھا خود انہیں بھی مسلم لیگی امیدواران کی حیثیت سے دھاندلی کے ذریعے کامیاب کروایا گیا تھا چنانچہ یہ امر قرینِ انصاف نہیں کہ ایسی اسمبلی کا وزیرِ اعلیٰ غیر مسلم لیگی اور غیر جماعتی شخص یعنی ڈاکٹر خاں صاحب کو مقرر کیا جائے۔ چنانچہ مسلم لیگ نے مطالبہ کیا کہ ڈاکٹر خاں صاحب استعفیٰ دیں یا انہیں برطرف کیا جائے اور ان کی جگہ مسلم لیگ پارٹی کے قائد کو وزیرِ اعلیٰ مقرر کیا جائے۔

اس تجویز کے محرک میاں ممتاز خاں دولتانہ اور موید سردار بہادر خاں تھے جو کمانڈر انچیف ایوب خاں کے چھوٹے بھائی تھے۔ سردار بہادر خاں مغربی پاکستان صوبائی اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی کے قائد تھے۔ اگر یہ تحریک منظور ہو جاتی تو قدرتی طور پر انہیں صوبے کا وزیرِ اعلیٰ منتخب کیا جاتا۔ وزیرِ اعظم چودھری محمد علی نے مسلم لیگی ارکان سے درخواست کی کہ وہ اس مطالبے پر زور نہ دیں کیونکہ اس سے ان یقین دہانیوں کی خلاف ورزی ہوگی جو انہوں نے ایوان میں ڈاکٹر خاں صاحب کو کروائی تھیں۔ ان مواعید ہی کی بنیاد پر ڈاکٹر خاں صاحب نے وحدتِ مغربی پاکستان کے قانون کے لئے ازحد ضروری حمایت بہم پہنچائی تھی۔ مغربی پاکستان صوبے کی بنیاد اسی قانون پر تھی۔ چودھری محمد علی نے یہ دلیل بھی پیش کی کہ اگر ڈاکٹر خاں صاحب کو برطرف کر دیا گیا تو اس سے سہروردی کی (یعنی میری) بات سچ ثابت ہو جائے گی۔ مسلم لیگ کے وقار کو دھچکا پہنچے گا اور سہروردی کے قدوقامت میں اضافہ ہو جائے گا اور یہ نہایت نامناسب صورتحال ہوگی۔

تاہم مغربی پاکستان کے مسلم لیگی ارکانِ اسمبلی اپنی ضد پر اڑے رہے اور ڈاکٹر خاں صاحب کو اپنے تحفظ کے لئے اپنی سیاسی جماعت تشکیل دینا پڑی۔ یہ جماعت مسلم لیگ کے ان ارکان پر مشتمل تھی جو یہ سمجھتے تھے کہ چوودھری محمد علی کی طرف سے دی گئی ضمانت کا احترام کرتے ہوئے ڈاکٹر خاں صاحب کی حمایت کرنی چاہیے۔ یوں مسلم لیگ پارٹی دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ نئی جماعت کو ری پبلکن پارٹی کا نام دیا گیا۔ عام طور پر خیال کیا جاتا تھا کہ صدر سکندر مرزا نے ڈاکٹر خاں صاحب کو بچانے کے لئے نئی جماعت کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ ری پبلکن پارٹی کے قیام کا ایک ضمنی نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ صدر سکندر مرزا کے ہاتھ میں مغربی پاکستان کی ایک ایسی سیاسی جماعت آ گئی جسے وہ حسبِ ضرورت اپنے مقاصد کے لئے استعمال کر سکتے تھے۔ اتفاق سے ری پبلکن پارٹی کے ارکان کی اکثریت تقسیمِ ہند سے قبل یونینسٹ پارٹی کی ہمنوا رہی تھی۔ یونینسٹ پارٹی میں جاگیرداروں کی اکثریت تھی جو روایتی طور پر برسرِ اقتدار فریق کا ساتھ دیتے ہیں۔ سپیکر کے انتخاب کے موقع پر طاقت کی پہلی آزمائش سامنے آئی۔ چیئرمین کے فیصلہ کن ووٹ کی مدد سے ری پبلکن امیدوار کامیاب ہو گیا۔ مرکزی دستور ساز اسمبلی میں بھی مسلم لیگ پارٹی مندرجہ بالا خطوط پر دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔

اقلیتی سرکار وزارت

سکندر مرزا نے فضل الحق کو مرکزی وزیرِ داخلہ بنا کر مشرقی پاکستان میں متحدہ محاذ کو مزید زک

پہنچائی۔ فضل الحق کی جماعت کرشک سرامک پارٹی کا نہ تو کوئی منشور تھا اور نہ کوئی اصول۔ یہ جماعت دراصل فضل الحق کی ذاتی جماعت تھی اب اسے صدر کی جماعت کا درجہ حاصل ہو گیا اور جماعت کے ارکان صدر کے اشاروں پر چلنے لگے۔ چودھری محمد علی کے وزیر اعظم بننے کے بعد مشرقی بنگال میں دفعہ 92۔ اے کا نفاذ واپس لے لیا گیا اور فضل الحق کے نامزد کردہ امیدوار ابوالحسین سرکار کو وزیر اعلیٰ مقرر کر دیا گیا۔ عوامی لیگ کے حزبِ اختلاف میں ہونے کے باعث سرکار کی حیثیت خاصی ڈانواں ڈول تھی۔ انہوں نے اپنے اقتدار کو برقرار رکھنے کا یہ ڈھنگ نکالا کہ صوبائی اسمبلی کا اجلاس بلانے سے انکار کر دیا۔

مارچ 1956ء کو صوبائی اسمبلی کا بجٹ اجلاس بلایا جانا تھا لیکن چودھری محمد علی نے غیر معمولی قدم اٹھاتے ہوئے یہ اجلاس تین ماہ کے لئے مؤخر کر دیا۔ باہمی گٹھ جوڑ کے ذریعے ابوالحسین سرکار کو عارضی طور پر برطرف کر دیا گیا۔ گورنر نے تین ماہ کے مالی تخمینے کی منظوری دیدی۔ چند روز بعد ابوالحسین کو پھر سے بحال کر دیا گیا۔ بالآخر تین ماہ کی میعاد ختم ہونے پر جب اسمبلی کا بجٹ بلایا گیا تو بجٹ پر بحث اور اس کی منظوری کے لئے صرف چار روز دیئے گئے۔ یہ تماشا تمام پارلیمانی روایات کے منافی تھا۔ برطانوی عہد میں بھی بجٹ پر پہلے چار روز میں ابتدائی بحث ہوتی تھی اور شق وار بحث کے لئے پندرہ دن تفویض کئے جاتے تھے چونکہ تقسیم کے بعد ایوان کی کارروائی کے اصول وضوابط طے نہیں کئے گئے تھے لہٰذا ابوالحسین سرکار نے صورتحال کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بجٹ پر بحث کے ان دونوں مراحل کو صرف چار روز میں نبٹانا چاہا۔ سپیکر عبدالحکیم نے غالباً سرکار کے ساتھ ملی بھگت کے باعث بجٹ پر بحث کی اجازت دینے سے انکار کر دیا اور ایوان کا اجلاس آئندہ احکامات تک ملتوی کر دیا۔ سرکار کو ایک بار پھر عارضی طور پر برطرف کر دیا گیا۔ صوبائی اسمبلی معطل کر دی گئی۔ دفعہ 92۔ اے نافذ کر دی گئی اور گورنر نے پہلے کی طرح بجٹ کی توثیق کر دی۔ یہ کھڑاگ فضل الحق اور ابوالحسین کو بہت مرغوب تھا کیونکہ اس طرح مجلسِ قانون ساز کے اجلاس سے بچا جا سکتا تھا۔ تین روز بعد ابوالحسین سرکار کو ایک بار پھر وزیر اعلیٰ مقرر کر دیا گیا اس سارے کھیل میں سازش اور حیلہ جوئی کا عنصر اس قدر نمایاں تھا کہ چودھری محمد علی کو خفیف ہو کر اصرار کرنا پڑا کہ ابوالحسین اگست 1956ء کے آخر تک صوبائی اسمبلی سے بجٹ کی منظوری حاصل کریں۔ سرکار آخری لمحے تک بجٹ کی منظوری کے لئے مجلسِ قانون ساز کا سامنا کرنے سے کتراتے رہے حتیٰ کہ صدر سکندر مرزا کے لئے بھی انہیں مزید تحفظ دینا ممکن نہ رہا۔

مشرقی پاکستان میں اس بحران کے شانہ بشانہ مغربی پاکستان میں مسلم لیگ اور ری پبلکن پارٹی کے درمیان کشاکش زور پکڑتی جارہی تھی۔ مشرقی پاکستان کا بحران صوبائی حکومت کی تبدیلی پر منتج ہوا اور مغربی پاکستان کی کشمکش مرکزی حکومت کے لئے جان لیوا ثابت ہوئی۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ ابوالحسین نے مشرقی پاکستان کے ارکانِ اسمبلی کی حمایت حاصل کرنے کے لئے وہی حربے استعمال کئے جو مغربی پاکستان میں ڈاکٹر خاں صاحب نے اختیار کئے تھے۔ انتظامی ضرورت کو مدِنظر رکھے بغیر راتوں رات وزارتیں تخلیق کی گئیں اور ارکانِ اسمبلی کو پارلیمانی سیکرٹری بنایا گیا۔ البتہ ہر دو حضرات میں یہ فرق ضرور تھا

کہ ڈاکٹر خاں صاحب مارچ 1957ء تک بڑی باقاعدگی سے مجلسِ قانون ساز کا سامنا کرتے رہے جبکہ سرکار کو اس ناخوشگوار فریضے سے مسلسل گریز رہا۔

وزیر اعظم پاکستان

مغربی پاکستان کی صورتحال کے باعث چودھری محمد علی عجیب مخمصے میں الجھ کر رہ گئے۔ انہیں مسلم لیگ نے وزارتِ عظمیٰ کے لئے منتخب کیا تھا لیکن وہ اپنے اقتدار کے تسلسل کے لئے صدر سکندر مرزا کے مرہونِ منت تھے۔ موخرالذکر نے چودھری محمد علی سے مطالبہ کیا کہ وہ مسلم لیگ چھوڑ کر ری پبلکن پارٹی میں شامل ہو جائیں کیونکہ یہ جماعت ان یقین دہانیوں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے تشکیل دی گئی تھی جو چودھری محمد علی نے ڈاکٹر خاں صاحب کو کروائی تھیں نیز یہ کہ مسلم لیگ نے چودھری محمد علی کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی تھی۔ لہٰذا اس کی رکنیت اختیار کئے رکھنا غیر مناسب تھا۔ تاہم چودھری محمد علی دبدھا کا شکار ہو گئے۔ کبھی وہ مسلم لیگ چھوڑ کر ری پبلکن پارٹی میں شمولیت کا فیصلہ کرتے تو کبھی انہیں مسلم لیگ سے علیحدہ ہونا سوہانِ روح نظر آتا۔ بالآخر انہوں نے مسلم لیگ سے اپنے تعلق کو برقرار رکھنے کا فیصلہ کیا۔ اس پر صدر سکندر مرزا نے انہیں حکم دیا کہ وہ استعفیٰ دے دیں ورنہ انہیں برطرف کر دیا جائے گا۔ چودھری محمد علی نے استعفیٰ دینے پر آمادگی ظاہر کر دی اس پر صدر سکندر مرزا نے فوراً مشرقی پاکستان کا رخ کیا، جہاں میں ان دنوں قیام پذیر تھا اور مجھے اپنے طیارے میں کراچی لے آئے۔ چودھری محمد علی نے خاصے تذبذب کے بعد استعفیٰ دیدیا۔ سکندر مرزا نے 12 ستمبر 1956ء کو مجھے وزیر اعظم مقرر کر دیا۔ مرکزی مجلس قانون ساز میں عوامی لیگ ایک اقلیتی جماعت تھی اور اس کے ارکان کی تعداد صرف 14 تھی سات ہندو ارکان کی حمایت کے بعد میرے پاس کل آراء کی تعداد 21 ہو گئی تاہم 80 ارکان پر مشتمل ایوان میں اکثریت حاصل کرنے کے لئے مجھے مزید 20 آراء کی ضرورت تھی، یہ کمی ری پبلکن پارٹی کے ارکان اور کچھ آزاد ارکان نے پوری کر دی اور کل ملا کر 47 سے 50 تک ارکان نے مجھے اپنی حمایت کا یقین دلایا۔ مسلم لیگ اور فضل الحق کی جماعت حزبِ اختلاف قرار پائیں جبکہ مسلم لیگ کے چند دیگر قائدِ حزبِ اختلاف تسلیم کر لئے گئے۔

مشرقی پاکستان میں ابوالحسین سرکار 6 ستمبر 1956ء کو استعفیٰ دے چکے تھے ان کی جگہ صوبائی مجلسِ قانون ساز میں عوامی لیگ کے قائد عطاالرحمٰن خاں کو مشرقی پاکستان کا وزیر اعلیٰ منتخب کیا گیا۔ میں نے مرکز میں جو کابینہ تشکیل دی اس میں پانچ وزراء کا تعلق مشرقی پاکستان سے تھا جبکہ پانچ وزراء مغربی پاکستان سے لئے گئے۔ ڈاکٹر خاں صاحب بدستور مغربی پاکستان کے وزیر اعلیٰ کے عہدے پر فائز رہے۔

مغربی پاکستان کی صوبائی اسمبلی میں مسلم لیگ اور ری پبلکن پارٹی کے درمیان مسلسل محاذ آرائی ہو رہی تھی۔ ارکان بار بار اپنی وفاداریاں تبدیل کرتے تھے۔ ڈاکٹر خاں صاحب کے لئے ری پبلکن پارٹی کے

سربراہ اور وزیرِ اعلیٰ کے طور پر اپنی حیثیت برقرار رکھنے کا یہی طریقہ باقی رہ گیا تھا کہ وہ اپنے وزراء، نائب وزراء اور پارلیمانی سیکرٹریوں کی تعداد میں اضافہ کرتے چلے جائیں۔ حتیٰ کہ جو ارکان ایک یا دو ارکان اسمبلی کی حمایت حاصل کر لیتے انہیں کسی نہ کسی عہدے سے نواز دیا جاتا۔ وزراء اور پارلیمانی سیکرٹریوں کی یہ فوجِ ظفر موج انتظامی ضروریات سے تجاوز کرتے کرتے سیاسی فضیحت کی حدوں کو چھونے لگی۔ اس کے باوجود ڈاکٹر خاں صاحب مارچ 1957ء میں صوبائی بجٹ پاس نہ کروا سکے۔ بالآخر انہوں نے اجلاس کے التوا کا مشورہ دیدیا۔ آئین کی دفعہ 92۔ اے نافذ کر دی گئی اور بجٹ کی توثیق کر دی گئی۔ ڈاکٹر خاں صاحب نے مطالبہ کیا کہ انہیں مغربی پاکستان کے وزیرِ اعلیٰ کے طور پر بحال کیا جائے۔ چودھری محمد علی نے ایسے حالات میں ابوالحسین کو دو مرتبہ بحال کیا تھا لیکن میں نے اصرار کیا کہ ڈاکٹر خاں صاحب ارکانِ اسمبلی کے دستخطوں سے ایوان میں اپنی اکثریت ثابت کریں۔ وہ ایسا کرنے میں ناکام رہے لہٰذا میں نے انہیں بحال کرنے سے معذوری ظاہر کر دی۔ در آں حالیکہ مجھے وزیرِ اعظم کے منصب پر برقرار رہنے کے لئے مرکزی اسمبلی میں ری پبلکن پارٹی کی حمایت کی ضرورت تھی۔ جنوری 1957ء میں مجھے دولتِ مشترکہ کے وزراءِ اعظم کی کانفرنس میں شرکت کے لئے لندن جانا پڑا۔ میری عدم موجودگی میں صدر سکندر مرزا نے قائم مقام وزیرِ اعظم ابوالمنصور احمد سے مغربی پاکستان کی صوبائی وزارت بحال کروالی۔ سردار عبدالرشید کو وزیرِ اعلیٰ مقرر کیا گیا۔

نیشنل عوامی پارٹی (نیپ) سے تعلق رکھنے والے دس ارکان کے ایک گروہ نے مسلم لیگ اور ری پبلکن پارٹی کے درمیان عملی طور پر فیصلہ کن حیثیت اختیار کر لی۔ بظاہر مغربی پاکستان بلکہ پورے پاکستان کی قسمت ان حضرات کے ہاتھوں میں تھی۔ اگر یہ گروہ مسلم لیگ کی طرف جھک جاتا تو سردار عبدالرشید کا دھڑن تختہ ہو جاتا اور اگر یہ افراد سردار عبدالرشید کی پشت پناہی کرتے تو ان کا اقتدار ناقابل تسخیر نظر آنے لگتا۔

نیپ کا مضبوط داخلی گروہ

یہاں اگر نیشنل عوامی پارٹی کے قیام کے پس منظر اور اس جماعت کی پالیسی کا جائزہ لیا جائے تو غیر مناسب نہ ہو گا۔ اگرچہ یہ گریز کچھ تفصیل کا متقاضی ہے اور ہمیں مشرقی و مغربی پاکستان میں سیاسی حالات اور سیاسی جماعتوں پر بھی ایک نظر ڈالنا پڑے گی۔

پہلی دستور ساز اسمبلی میں جسے مرکزی قانون ساز اسمبلی کا درجہ بھی حاصل تھا حزبِ اختلاف کے دیگر ارکان کے علاوہ دو قد آور زعماء بھی شامل تھے ایک آزاد پاکستان پارٹی کے رہنما میاں افتخار الدین تھے اور دوسرے سرخ پوش رہنما خان عبدالغفار خاں۔ میاں افتخار الدین با اثر اخبارات (انگریزی روزنامہ "پاکستان ٹائمز" اور اردو روزنامہ "امروز") کے مالک تھے یہ اخبارات اشتراکیت نواز اور سامراج مخالف خیالات کے پرچارک تھے۔ اردو کے عظیم ترین زندہ شعراء میں ایک فیض احمد فیض ان

اخبارات کے مدیر تھے۔ فیض احمد فیض ترقی پسند رجحانات کے حامل تھے اور کمیونسٹ ہونے کی کی شہرت رکھتے تھے۔

تقسیم سے قبل مارچ 1947ء میں میاں افتخار الدین پہلے شخص تھے جنہوں نے ملکملک خضر حیات خاں کی یونینسٹ وزارت کے خلاف اور مطالبۂ پاکستان کی حمایت میں مسلم لیگ کی طرف سے گرفتاری پیش کی تھی۔ میاں افتخار الدین کو ہندوؤں اور سکھوں میں بھی خاصی مقبولیت حاصل تھی۔ ا ان کی تقلید میں دوسرے مسلمانوں کو بھی پرامن طور پر یونینسٹ حکومت کے خلاف تحریک چلانے کا حوحوصلہ ملا۔ خاں مدوٹ، میاں ممتاز دولتانہ اور اگر میں غلطی نہیں کرتا تو بیگم شاہنواز سمیت کئی سرکردہ افراد جیل پہنچ گئے۔ چنانچہ میاں افتخار الدین کو روسی رجحانات کے باوجود محبِ وطن پاکستانی سمجھا جاتا تھا۔ ذی ثروت ہونے کے علاوہ وہ بڑی دلنواز شخصیت کے حامل تھے۔ ان کی راست بازی اور بے باکی شکک وشبہے سے ماوراء تھی۔ تاہم وہ کوئی موثر جماعت تشکیل دینے میں ناکام رہے۔ روشن خیالی کے باعث کمیونسٹوں، نیم اشتراکی، دانشوروں اور کیمونزم کے حامی مزدوروں میں ان کی خاصی حمایت پا پائی جاتی تھی۔ 1951ء میں پنجاب کی صوبائی مجلسِ قانون ساز کے انتخاب میں انکی جماعت کے صرف دو امیدوار کامیاب ہو سکے۔ ایک وہ خود تھے اور دوسرے انکے اخبارات کے سرمایہ کار۔ مرکزی منقننہ میں وہ اپنی جماعت کے واحد نمائندے تھے۔ خاں عبدالغفار خان کانگرس میں شامل تھے اور انہنہوں نے مطالبہ پاکستان اور اس استصواب رائے کی مخالفت کی تھی جس کے نتیجے میں شمال مغربی سرحدی صصوبہ پاکستان میں شامل ہوا۔ وہ ایک طاقتور لیکن پرامن تنظیم "سرخ پوش" کے رہنما تھے اور انہیں سرحدی گاندھی کے نام سے جانا جاتا تھا۔ پاکستان کی مرکزی مقننہ کے رکن کی حیثیت سے انہوں نے اعلان کیا کہ اگراگرچہ انہوں نے تصورِ پاکستان کی مخالفت کی تھی لیکن انہوں نے قیامِ پاکستان کو دل وجان سے تسلیم کر لیا ہے اور شمال مغربی سرحدی صوبے کے پاکستان میں شامل ہونے کے بعد وہ خود کو پاکستان کا وفادار شہری سمجھتے ہیں۔ بایں ہمہ انہوں نے مطالبہ کیا کہ جن علاقوں میں پٹھانوں کی اکثریت آباد ہے انہیں ملا کر پٹھانستان یا پختونستان کے نام سے پاکستان کا خود مختار صوبہ تشکیل دیا جائے۔ اس مجوزہ صوبے کی حدود کا کبھی واضح طور پر تعین نہیں کیا گیا لیکن بظاہر اس میں درج ذیل علاقے شامل کئے جاتے ہیں۔

(1) شمال مغربی سرحدی صوبے کے وہ علاقے جہاں پر پٹھانوں اور قبائلی گروہوں کی غالب اکثریت پائی جاتی ہے۔

(2) پنجاب کے چند اضلاع جہاں پر اکثریت کی زبان پشتو ہے۔

(3) بلوچستان کا شمالی حصہ جو نسلی اور لسانی اعتبار سے پٹھان ہے اور دیگر پٹھان قبائلی کی طرح سرحد پار افغانستان میں پٹھانوں سے گہرے تعلقات رکھتا ہے۔

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ مغربی پاکستان کی دیگر قومیتوں یعنی پنجابیوں اور سندھیوں کی نسبت پٹھان بہتر سیاسی شعور رکھتے ہیں۔ سندھ کے وہ علاقے جنہیں جرائم کے حوالے سے ناقابلِ رشک شہرت

کا حامل سمجھا جاتا ہے' معاشرتی تعلقات کے حوالے سے پسماندہ بلکہ وحشیانہ خصوصیات کے حامل کہے جا سکتے ہیں۔ ان علاقوں میں کسانوں کی رگِ جاں مقامی جاگیرداروں کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ وفاداری اور اطاعت کے بندھنوں میں جکڑے ہوئے ان کسانوں کو رسہ گیری یا عورتیں اغوا کرنے کی غرض سے قریبی جاگیرداروں کے علاقے میں بھیجا جاتا ہے 'ڈاکے' 'قتل' عورتوں کے خلاف جرائم اور خاندانی دشمنیاں روزمرہ کا معمول ہیں۔ سیاسی شعور نام کو نہیں پایا جاتا۔ مجرمانہ سرگرمیوں میں ملوث ہونے کے باعث یہ وڈیرے دیہات کے معمولی پولیس اہلکاروں کی کفش برداری پر مجبور ہوتے ہیں۔ مقامی سرکاری حکام کے ساتھ ان جاگیرداروں کے گہرے روابط ہوتے ہیں اور یہ لوگ نوکر شاہی کے احکامات سے سرتابی کی مجال نہیں رکھتے۔ ان تمام خرابیوں کے باوجود سندھ کے کسان بڑے معقول اور کھرے لوگ ہیں اگر انہیں جرائم کے لئے بیرونی انگیخت بہم نہ پہنچائی جائے تو خاصی پرامن زندگی گزارتے ہیں جس میں کبھی کبھی دیہات کے معمولی دنگے فساد کی رنگ آمیزی شامل ہوتی رہتی ہے۔ سندھ کے ہاری کی نسبت پنجاب کا کسان زیادہ آسودہ حال ہے۔ سندھ کا ہاری معاشی طور پر پسا ہوا انسان ہے جس کے جسم و جان وڈیرے کے پاس رہن رکھ دیئے گئے ہیں لیکن شہری علاقوں میں خاص طور پر پنجاب میں' نہایت اعلیٰ معیار کے حامل تعلیمی 'ٹیکنیکی' طبّی' زرعی اور ثقافتی ادارے قائم ہیں جہاں سے فارغ التحصیل ہونے والے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور تربیت یافتہ افراد ملکی بندوبست اور قومی زندگی کے مختلف شعبوں میں شرکت کی صلاحیتوں سے پوری طرح بہرہ ور ہوتے ہیں۔ جاگیردار اشرافیہ تیزی سے مہذّب معاشرے کے طور طریقے اختیار کر رہی ہے۔ جدوجہدِ آزادی اور سیاسی جماعتوں کی مساعی کے زیرِ اثر کسانوں میں تیزی سے سیاسی شعور بیدار ہو رہا ہے۔ بدقسمتی سے حکومت اور ماہرینِ تعلیم کی سرتوڑ کوششوں کے باوجود سندھ میں ترقی کی رفتار کچھ زیادہ حوصلہ افزاء نہیں رہی۔ جاگیردار اشرافیہ ابھی تک خاصی طاقتور ہے۔ صوبے کی مخصوص نیم مذہبی فرقہ وارانہ عصبیتوں نے صورتِ حال کو اور بھی پیچیدہ کر رکھا ہے۔

دوسری طرف پٹھان حرّیت اور آزادی کی روایات سے سرشار ہیں۔ قبائلی علاقوں میں پٹھانوں نے انگریزوں کے خلاف مسلسل مزاحمت کی تھی۔ اس جنگ کو قبائلی سرداروں سے معاہدوں' ذاتی تعلقات اور رشوتوں کے ذریعے عارضی طور پر سرد کیا جاتا تھا لیکن یہ آگ بار بار بھڑک اٹھتی تھی۔ شہری علاقوں میں عوام نے کانگرس کے انگریز دشمن نظریات کو سینے سے لگایا چنانچہ یہ لوگ سیاسی تنظیم اور شعور کے نہایت اعلیٰ معیار سے بہرہ مند ہیں۔ خود مختار صوبے کے مطالبے کی تہہ میں یہ اندیشہ پنہاں تھا کہ پنجابی عوام مرکزی حکومت میں بالادستی حاصل کرلیں گے اور غیر پنجابی صوبے خسارے میں رہ جائیں گے۔ پٹھانستان تحریک کو شہری علاقوں کے علاوہ قبائلی خطّے میں بھی بڑی مقبولیت حاصل ہوئی حالانکہ حکومتِ پاکستان نے قبائلی سرداروں کو بھاری مالی امداد سے نوازا تھا۔ تاہم جب افغانستان نے اس تحریک کی حمایت شروع کی تو اسے خاصا دھچکا پہنچا۔ حکومتِ پاکستان اور کئی پٹھانوں سمیت پاکستانی عوام کو یہ کہنے کا موقع مل گیا کہ پٹھانستان کا مطالبہ علیحدگی پسند مقاصد سے عبارت ہے اور اس مطالبے کے حامی دراصل پاکستان کے پٹھان علاقوں

کو افغانستان میں شامل کرنا چاہتے ہیں۔ ہندوستان نے پراپیگنڈے کے علاوہ ایجنٹوں اور روپے پیسے سے اس تحریک کی جو امداد کی اس نے اس استدلال کو اور بھی تقویت بخشی کہ پختونستان کی تحریک علیحدگی پسند نوعیت کی حامل ہے۔

افغانستان نے دعویٰ کیا کہ پٹھانوں کی اکثریت اس کی حدود میں آباد ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ پٹھانوں کی اکثریت پاکستان میں آباد ہے۔ افغانستان کو تاریخی لحاظ سے پٹھانوں پر حقِ اقتدار رکھنے کا بھی دعویٰ تھا۔ اس کی بنیاد اس دلیل پر تھی کہ افغانوں نے شمالی ہندوستان کو فتح کیا تھا۔ افغانستان نے پٹھانستان یا پختونستان تحریک کی حوصلہ افزائی کی۔ مالی امداد بہم پہچانے کے علاوہ پاکستان کے خلاف زہر افشانی بھی کی گئی جس کے نتیجے میں کابل اور جلال آباد میں پاکستان کے سفارت خانے اور قونصلیٹ پر حملے کیے گئے اور ریڈیو کے ذریعے مطالبہ کیا گیا کہ افغانوں کو آزادی دی جائے۔ خان عبدالغفار خان نے دعویٰ کیا کہ ان کا افغانستان حکومت کی طرف سے چلائی جانے والی مہم سے کوئی تعلق نہیں بلکہ اس مہم سے انہیں خاصی پریشانی کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے کیونکہ انہوں نے پختونستان کے جس خود مختار صوبے کا مطالبہ کیا ہے اسے پاکستان کا اٹوٹ انگ سمجھنا چاہئے۔ بایں ہمہ پاکستان حکومت بضد رہی کہ یہ ایک علیحدگی پسند تحریک ہے کیونکہ خان عبدالغفار خاں نے قیامِ پاکستان کی مخالفت کی تھی۔ کانگریسی ہونے کے ناطے خان عبدالغفار خاں کی ہمدردیاں ابھی تک بھارت کے ساتھ ہیں اور اسی تعلق کی بنا پر بھارت پختونستان تحریک کی حمایت کر رہا ہے۔ یہ دعویٰ بھی کیا گیا کہ خاں عبدالغفار نے فقیر ایپی کے ذریعے ذاتی طور پر حکومتِ افغانستان سے رابطہ کر رکھا ہے وہ ایک غدّار ہیں اور ان کی تردید پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ خان عبدالغفار خاں مرکزی اسمبلی میں حزبِ اختلاف کے ایک اہم ستون کا کردار ادا کر رہے تھے۔ حتیٰ کہ انہیں پبلک سیفٹی ایکٹ کے تحت مقدمہ چلائے بغیر نظر بند کر دیا گیا۔ بلوچستان کے عبدالصمد خاں اچکزئی، سندھ سے شیخ عبدالمجید سندھی اور جی ایم سید سمیت حزبِ اختلاف کے کئی نامور رہنما اسمبلی سے باہر تھے۔ ان رہنماؤں کی اکثریت نے کانگرس کی ہمنوائی میں مطالبۂ پاکستان کی مخالفت کی تھی اور اب مسلم لیگ حکومت کی مخالفت کر رہے تھے۔ پاکستان کے قیام کے بعد نیشنل عوامی پارٹی کی اعلیٰ قیادت انہی لوگوں کے پاس آئی اور انہوں نے نیپ میں ایک مضبوط داخلی گروہ تشکیل دیا۔

اہم کردار

اصل موضوع سے مزید گریز کرتے ہوئے اب مجھے پاکستان میں اپنی جماعت کے بارے میں کچھ کہنا ہے کیونکہ میری جماعت نے نیپ کی تشکیل پر گہرا اثر ڈالا تھا۔ اس ضمن میں مجھے نہ چاہتے ہوئے بھی اپنی سیاسی سرگرمیوں کا ایک مختصر سا خاکہ بیان کرنا ہو گا۔ یہ وہ موضوع ہے جس پر بات کرنے سے میں نے ہمیشہ گریز کیا ہے اور پاکستان کے حکمران، خاص طور پر مغربی پاکستان کے حکمران ان پہلوؤں سے کم ہی

واقف ہیں اور جو جانتے ہیں وہ انہیں نظرانداز کرنے میں ہی مصلحت سمجھتے ہیں۔ اگرچہ بہت سے لوگ اس حقیقت سے آشنا ہیں کہ میں نے پاکستان کے قیام میں اہم کردار ادا کیا تھا لیکن بعدازاں کچھ ایسے حالات پیدا ہوئے کہ میں لیاقت علی خاں کی حکومت کی مخالفت کرنے پر مجبور ہو گیا۔

ہندوستان کو پاکستان اور انڈین یونین (بعدازاں جسے سرکاری طور پر بھارت کا نام دیا گیا) میں تقسیم کرنے کے تنازعے پر لفظوں کی جنگ جاری تھی کہ 1946ء میں ہندوستان بھر میں تقسیم کے سوال پر عام انتخابات کروائے گئے۔ ان انتخابات کے نتائج پر پاکستان کی تخلیق کا انحصار تھا۔ اس وقت مسلمان دو جماعتوں میں تقسیم تھے۔ پہلی جماعت آل انڈیا مسلم لیگ تھی جس کی سربراہی محمد علی جناح کر رہے تھے' یہ جماعت مکمل طور پر مسلمان تنظیم تھی۔ دوسری جماعت انڈین نیشنل کانگرس تھی۔ یہ ایک غیر فرقہ وارانہ تنظیم تھی لیکن اس کے ارکان کی اکثریت ہندو تھی اور اس جماعت کی قیادت مہاتما گاندھی کر رہے تھے۔ ایک زمانے میں جناح خود بھی کانگرس کے ایک اہم رکن رہے تھے لیکن بعدازاں نظریاتی اختلافات کی بنا پر انہوں نے کانگرس سے علیحدگی اختیار کر لی۔

مسلمان ایک عرصے سے محسوس کر رہے تھے کہ انہیں انتظامیہ اور اقتدار میں شرکت سے محروم رکھا جا رہا ہے۔ علاوہ ازیں مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان نظریۂ حیات' مذہبی عبادات اور رسوم کے حوالے سے ناقابلِ تصفیہ اختلافات تھے جو اکثر خون ریز فرقہ وارانہ فسادات پر منتج ہوتے تھے۔ دونوں فرقوں کی معاشی حالت میں بھی واضح تفاوت تھا۔ مسلمانوں کی اکثریت مزدوروں اور کسانوں یعنی محنت کشوں پر مشتمل تھی۔ اس معاشی تفریق کے علاوہ اس احساس نے کہ کچھ عرصہ قبل مسلمان اس ملک کے حکمران تھے' مذہبی اور سماجی اختلافات کو گویا مہمیز لگا دی۔

جب یہ امکانات روشن ہوئے کہ ہندوستان کو جلد ہی سوراج اور بعدازاں آزادی مل جائے گی تو مسلمانوں نے محسوس کیا کہ ہندوستان کی آبادی کے بڑے حصے یعنی ہندوؤں کے ساتھ کسی افہام و تفہیم پر پہنچے بغیر وہ ہندو اکثریت کے بوجھ تلے پس کر رہ جائیں گے۔ اگرچہ کانگرس ایک غیر فرقہ وارانہ جماعت تھی اور اس کی صفوں میں محمد علی جناح کے کینڈے کے مسلم عمائدین بھی شامل تھے لیکن اسے پرجوش مسلمانوں کا اعتماد حاصل نہیں تھا۔ قومی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے والے مناقشوں کو ختم کرنے کے لئے مسلم لیگ اور کانگرس نے 1916ء میں لکھنؤ کے مقام پر ایک معاہدہ کیا جس کی رو سے ہندو مسلمانوں کو جداگانہ انتخاب کا حق دینے پر آمادہ ہو گئے۔ مسلمان مسلم اکثریتی صوبوں میں کچھ نشستوں سے دستبردار ہو گئے حالانکہ آبادی کے تناسب سے ان نشستوں پر ان کا استحقاق تھا' اس کے عوض مسلم اقلیتی صوبوں میں مسلمانوں کی نمائندگی میں اضافہ کر دیا گیا۔ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1919ء جس میں سوراج کی طرف پیش رفت کے لئے دوسطحی حکومت کا تصوّر متعارف کروایا گیا تھا' اس معاہدے کی بنیاد پر مدّون کیا گیا تھا۔

شمال مغربی سرحدی صوبے اور سندھ جیسے بعض علاقوں میں جو زیادہ وسیع نہیں تھے مسلمانوں کی

بھاری اکثریت آباد تھی۔ بنگال اور پنجاب میں ان کی اکثریت کا تناسب خاصا کم تھا (44 فیصد کے مقابلے میں 56 فیصد) آسام میں مسلمانوں کی تعداد 40 فیصد تھی۔ اضلاع متحدّہ میں مسلمان کل آبادی کا 18 فیصد تھے جبکہ باقی صوبوں میں مسلمانوں کی تعداد بے حد معمولی تھی۔ جنگِ عظیم اوّل کے اختتام پر ترکی تقسیم کر دیا گیا اور ہندوستان میں دو بھائیوں مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی نے تحریکِ خلافت کی نیو اٹھائی۔ یہ صحیح معنوں میں مسلمانوں کی عوامی تحریک تھی اس لحاظ سے مسلم لیگ سے مختلف تھی جسے زیادہ سے زیادہ متوسّط اشرافیہ اور دانشوروں کی تحریک کہا جا سکتا تھا۔

مہاتما گاندھی چند سال پہلے ہندوستان واپس آ گئے تھے۔ انہوں نے خلافت تحریک کے ساتھ تعاون کر کے انڈین نیشنل کانگرس کو بھی عوامی تحریک کے قالب میں ڈھال دیا اور یوں برطانوی راج کو ہندوؤں اور مسلمانوں کے مشترکہ طوفان کا سامنا کرنا پڑا۔ مہاتما گاندھی کو یقین تھا کہ تحریکِ خلافت میں مسلمانوں کا ساتھ دینے سے وہ سوراج کے لئے جدوجہد میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو متحد کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے جس کے بعد دونوں فرقوں کے باہمی اختلافات طے ہو جائیں گے۔ گاندھی کا ترکِ موالات کا منصوبہ جناح کو پسند نہ آیا اور انہوں نے کانگرس سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اتحاد کی زبردست خواہش کے باوجود جلد ہی ہندوؤں اور مسلمانوں کے اختلافات دوبارہ منظرِ عام پر آ گئے اور انکے حل کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ 1926ء میں کلکتہ کے فسادات اسی حقیقت کا اظہار تھے۔ ان اختلافات کو طے کرنے کے لئے بہت سی کوششیں کی گئیں، دونوں فرقوں کے متبائن حقوق کے افہام وتفہیم کے لئے بہت سی کانفرنسیں منعقد ہوئیں۔ مگر ان سے کوئی نتیجہ بر آمد نہ ہو سکا۔ بالاخر آل انڈیا مسلم لیگ نے جسے مسلمانانِ ہند کی ترجمان جماعت ہونے کا دعویٰ تھا۔ 1946ء میں لاہور کے مقام پر اپنے اجلاس میں اعلان کیا کہ ہندوستان کے مسلمان ایک فرقہ نہیں بلکہ علیحدہ قوم ہیں نیز یہ مطالبہ کیا گیا کہ جن باہم متصل علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے انہیں خود مختاری دے دی جائے۔ حاصل کلام یہ کہ مسلم لیگ نے ہندوستان کی تقسیم کا مطالبہ کیا۔

1946ء کے انتخابات کو اس امر کا تعین کرنا تھا کہ آیا مسلمان واقعی ہندوستان کی تقسیم اور دو خود مختار مملکتوں بھارت اور پاکستان کے قیام کے حق میں ہیں۔ اگر وہ تقسیم چاہتے تھے تو انہیں مسلم لیگ کے امیدوار کو ووٹ دینا تھا اور اگر وہ متحدہ ہندوستان کے حق میں تھے تو انہیں کانگرس کے نامزد کردہ مسلمان امیدوار کے حق میں رائے دینا تھی۔ یا پھر پنجاب میں انہیں یونینسٹ پارٹی کے مسلمان امیدوار کو ووٹ دینا تھا۔ ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں پر مشتمل یونینسٹ پارٹی بھی تقسیمِ ہندوستان کی مخالف تھی۔ مسلمانوں کی رائے کا تعین کرنا آسان تھا کیونکہ انتخابات جداگانہ طریقِ انتخاب کے تحت منعقد ہو رہے تھے اور مسلمانوں کو صرف مسلم امیدواروں کو ووٹ دینا تھا۔ قدرتی طور پر توقع کی جا رہی تھی کہ مسلم اکثریتی صوبوں کے مسلمان مسلم لیگ کے حق میں رائے دیں گے کیونکہ تقسیم کی صورت میں ان مسلمانوں کو فائدہ پہنچ سکتا تھا۔ اسی طرح امید کی جا رہی تھی کہ مسلم اقلیتی صوبوں میں مسلمان کانگرس کے مسلمان

امیدواروں کے حق میں تقسیم کے خلاف ووٹ دیں گے کیونکہ تقسیم کی صورت میں ان علاقوں کے مسلمانوں کو ہندو اکثریت کے رحم وکرم پر رہنا تھا لیکن ان صوبوں کے مسلمانوں کو امید دلائی گئی کہ خصوصی مراعات کے ذریعے ان کے حقوق کا تحفّظ کیا جائے گا' مزید بر آں امید کی جا رہی تھی کہ ہندوستان کے وسیع علاقے مثلاً بنگال اور پنجاب کے مکمل صوبے اور شاید آسام بھی پاکستان کا حصہ ہوں گے۔ خیال کیا جاتا تھا کہ ان صوبوں کی مسلم اکثریت کے درمیان ہندوؤں کی اچھی خاصی تعداد کی موجودگی میں ہندوستان کے مسلمانوں سے بہتر سلوک کی ضمانت مل سکے گی۔

جناح نے بھی اعلان کیا تھا کہ پاکستان صرف مسلم اکثریتی علاقوں کے مسلمانوں کا نہیں بلکہ ہندوستان کے دس کروڑ مسلمانوں کا وطن ہو گا۔

تعجّب انگیز امر ہے کہ مسلم اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں نے پوری طرح سے یہ جانتے ہوئے بھی کہ پاکستان کے قیام کی صورت میں وہ ہندوستان میں مخاصم ہندو اکثریت کے درمیان بالکل بے یارومددگار رہ جائیں گے۔ اور ہندو انہیں پاکستان کی حمایت کرنے پر کبھی معاف نہیں کریں گے' مسلم لیگ کے امیدواروں کو صد فیصد کامیابی دلائی۔ یہ امر ہمیشہ مسلم اقلیتی صوبوں کے ان بدقسمت مسلمانوں کے لئے باعث عزو شرف اور ان کی عظمت' جرأت اور قربانی کا زندہ وجاوید ثبوت رہے گا جنہیں پاکستان میں مفادات کی فصل کاٹنے والے مسلم اکثریتی صوبوں کے مسلمانوں نے آسانی سے فراموش کر دیا۔

شمال مغربی سرحدی صوبے میں 85 فیصد آبادی مسلم تھی لیکن یہاں پر مسلمان رائے دہندگان نے کانگرس کے مسلمان امیدواروں کی بھاری اکثریت کو کامیاب کروایا اور ان ارکان نے غالباً ڈاکٹر خاں صاحب کی قیادت میں کانگرسی وزارت تشکیل دی۔ سندھ میں آبادی کا تناسب 75 فیصد تھا لیکن یہاں پر بھی نصف نشستوں پر کانگرس کے امیدوار کامیاب ہو گئے۔ چنانچہ کانگرس نے سندھ میں بھی وزارت قائم کی بعدازاں کانگرسی وزیر اعلیٰ اللہ بخش کے قتل کے بعد سر غلام حسین ہدایت اللہ نے مسلم لیگی وزارت تشکیل دی۔ پنجاب میں غیر مسلموں کے مقابلے میں مسلمانوں کا تناسب تقریباً بنگال جیسا تھا یعنی 44 فیصد کے مقابلے میں 56 فیصد یہاں پر مسلمانوں کے ووٹ یونینسٹ امیدواروں اور مسلم لیگی امیدواروں کے درمیان بٹ کر رہ گئے اور ملک خضر حیات خاں ٹوانہ کی قیادت میں یونینسٹ وزارت قائم ہو گئی۔ مسلم اکثریتی صوبوں میں بنگال واحد صوبہ تھا جہاں مسلم لیگ کے ارکان بھاری تعداد میں کامیاب ہوئے اور مسلم لیگ وزارت قائم ہوئی۔ مجھے وزیر اعلیٰ چنا گیا۔

میں 1937ء سے آل انڈیا مسلم لیگ کی بنگال شاخ کا سیکرٹری چلا آ رہا تھا چنانچہ مسلم لیگ کی طرف سے بنگال میں انتخابات کا سارا بوجھ مجھے اٹھانا پڑا۔ میں نے 1920ء میں سیاست کا آغاز کیا جب مجھے بنگال کی مجلس قانون ساز کا رکن چنا گیا۔ میں نے خلافت تنظیم میں شمولیت اختیار کر لی اور کئی سالوں تک کلکتہ خلافت کمیٹی کا سیکرٹری رہا۔ میں نے ابتدائی مراحل میں کانگرس سے ڈھیلی ڈھالی وابستگی اختیار کر رکھی تھی۔ میں کلکتہ کا ڈپٹی میئر تھا اور دیش بندھو سی آر داس میئر تھے۔ داس بندھو عظیم ترین بنگالی

تھے، بلکہ کہنا چاہئے کہ مجھے جن لوگوں سے ملاقات کا اعزاز نصیب ہوا ہے وہ ان میں عظم ترین ہندوستانی تھے۔ ان کا مرتبہ کسی صورت مہاتما گاندھی سے کم نہیں تھا۔ وہ صاحبِ بصیرت تھے، مکمل طور پر فرقہ پرستی کی لعنت سے پاک تھے۔ خامی کی حد تک فیّاض تھے، جرأتمند تھے اور ملک وقوم کے لئے قربانی دینے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ ان کی دانشورانہ استعداد اور پیش بینی کی صلاحیت نہایت اعلیٰ درجے کی تھی۔ وکیل کے طور پر وہ گراں قدر معاوضہ طلب کرتے اور ساری کمائی وطن پر نچھاور کر دیتے تھے۔ زندگی کے آخری ایّام میں انہوں نے وکالت ترک کر کے خود کو پوری طرح ملک وقوم کی خدمت کے لئے وقف کر دیا چنانچہ جب ان کا انتقال ہوا تو وہ بری طرح قرض کے بوجھ تلے دب چکے تھے بہت سوں کی طرح مجھے بھی یقین ہے کہ اگر وہ زندہ رہتے تو انہوں نے ہندوستانی قوم کی رہنمائی اس طور سے کی ہوتی کہ ہندو مسلم تعلقات کو زہر آلود کرنے والے اختلافات اور تلخیاں دور ہو جاتیں۔ یہ ان اختلافات کو بروقت اور منصفانہ طور پر طے نہ کرنے کا نتیجہ تھا کہ ہندوستان تقسیم ہوا اور پاکستان معرضِ وجود میں آیا۔

دیش بندھو 1925ء میں سورگ باش ہوئے جے ایم سین گپتا نے بحثیت میئر ان کی جگہ سنبھالی اور میں بدستور ڈپٹی میئر کے طور پر کام کرتا رہا۔ مئی 1926ء میں کلکتہ میں فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑے جن میں اتنے وسیع پیمانے پر تشدّد کا مظاہرہ دیکھنے میں آیا جس کی اس سے پہلے کوئی نظیر نہیں ملتی۔ ہندو ایک مسجد کے سامنے باجے بجانے پر مصر تھے اس پر مسلمانوں میں اشتعال پھیل گیا اور فسادات شروع ہو گئے۔ ہندوؤں نے مطالبہ کیا کہ میں مظلوم مسلمانوں کی قانونی یا اخلاقی اعانت بھی نہ کروں۔ کلکتہ کی آبادی میں مسلمان صرف 22 فیصد تھے اور انہیں ہندو پولیس کھلم کھلا ہراساں کر رہی تھی۔ ہندوؤں کے اس غیر منصفانہ مطالبے اور اس پر کئے جانے والے اصرار سے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ہندو مسلم اتحاد کے شبدوں میں کوئی حقیقت نہیں نیز یہ کہ ہندو فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی قیمت کے طور پر مسلمانوں سے مکمل اطاعت کے طلب گار ہیں۔ کلکتہ کے واقعات کی روشنی میں ہندو مسلم مخاصمت کے مختلف اسباب کا جائزہ لینے کے لئے شملہ میں ایک اتحاد کانفرنس منعقد ہوئی جس کی صدارت مہاراجہ الور نے کی۔ اس کانفرنس کے دوران مجھے پہلی بار جناح سے بالمشافہ رابطے کا موقع ملا۔ یہ کانفرنس بے نتیجہ ثابت ہوئی۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ اگر مسلمان اپنی بقا اور ترقی کے خواہشمند ہیں تو انہیں اپنے قدموں پر کھڑا ہو کر اپنے جداگانہ مفادات کا تحفّظ تلاش کرنا چاہئے۔

میں نے بڑی تعداد میں مزدوروں اور ملازمین کی تنظیمیں قائم کیں۔ کچھ تنظیموں کی نوعیت فرقہ وارانہ تھی اور کچھ تنظیموں میں یہ امتیاز روا نہیں رکھا گیا تھا۔ ان تنظیموں میں جہازیوں، ریلوے ملازموں، پٹ سن اور کپاس کے کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں، رکشہ کھینچنے والوں، ہتھ گاڑی والوں، بیل گاڑی والوں اور خانساموں کی تنظیمیں شامل تھیں ایک موقع پر تو 36 تنظیمیں اس ایوانِ محنت کی رکن بن چکی تھیں جسے میں نے کمیونسٹ مزدوروں کے مقابلے میں قائم کیا تھا۔ میں نے سرخ کی بجائے نیلا پھریرا رائج کیا۔ 1928ء میں نہرو رپورٹ منظرِ عام پر آئی جس میں مسلمانوں کے لئے مخصوص نشستوں کے ساتھ

مخلوط انتخابات کی وکالت کی گئی تھی۔ میں نے اس رپورٹ کی مخالفت کی۔ 1933ء میں گول میز کانفرنس کے موقع پر مجھے آل انڈیا مسلم کانفرنس کی طرف سے شہادت دینے کا موقع ملا۔ ہزہائی نس سر آغا خان مسلم کانفرنس کے صدر تھے۔

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935ء کے نفاذ کے بعد میں نے بنگال میں انتخاب لڑنے کے لئے آزاد مسلم پارٹی کی بنیاد رکھی اور دو آنہ چندہ برائے رکنیت کی بنیاد پر مسلمانوں کو منظم کرنے لگا۔ میں نے پورے بنگال میں تنظیمی کمیٹیوں کا وسیع جال بچھادیا اور انتخاب کے لئے امیدواروں کا چناؤ کرلیا۔ جناح عملی طور پر لندن میں قیام پذیر ہو کر پریوی کونسل میں قانونی پریکٹس کررہے تھے۔ اس موقع پر وہ واپس ہندوستان آگئے اور انہوں نے مسلم لیگ کی قیادت سنبھال کر اسے بھی دو آنہ چندہ برائے رکنیت کے ساتھ عوامی تنظیم میں بدل دیا۔ ان کی درخواست پر میں نے بڑی ہچکچاہٹ اور گہرے غور وفکر کے بعد اپنی تنظیم کو آل انڈیا مسلم لیگ میں مدغم کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ مجھے آل انڈیا مسلم لیگ کی بنگال صوبائی شاخ کا سیکرٹری مقرر کیا گیا۔ اس کے بعد میں نے 1946ء میں پاکستان کی قسمت کا فیصلہ کرنے والے عام انتخابات تک بنگال کے تمام انتخابات میں مسلم لیگ کی انتخابی مہم منظم کی۔

بنگال میں فضل الحق کی کرشک سرامک پارٹی 1946ء کے انتخابات میں مسلم لیگ اور مطالبۂ پاکستان کی مخالفت میں ہراول دستے کا کردار کررہی تھی۔ ان کا رویّہ کچھ وضاحت کا متقاضی ہے وہ ایک بھرپور شخصیت کے مالک تھے اور ان کی سیاسی زندگی بھی بڑی ہنگامہ پرور رہی۔ 1873ء میں پیدا ہونے والے فضل الحق مشرقی بنگال کے دیہاتی علاقوں سے اپنے دیرینہ تعلق کی بنا پر بنگال کے نامور ترین اور محبوب ترین رہنماؤں میں ایک تھے۔ ان کی ذات میں ذکاوت، غیر معمولی یادداشت، تبحرِ علمی جیسی خوبیاں مجتمع ہوگئی تھیں۔ انسانی کردار اور اجتماعی نفسیات کے بارے میں انہیں بڑی بصیرت حاصل تھی۔ اس پر مستزاد یہ کہ بنگالی زبان پر انہیں عبور حاصل تھا اور وہ شعلہ بیان خطیب تھے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ جدھر چاہتے بنگالی عوام کے جذبات کا رخ بدلنے پر قدرت رکھتے تھے۔ ان کی شخصیت میں ایسا جادو تھا کہ انکے شدید ترین مخالف بھی انکے روبرو ریشہ خطمی ہوجاتے تھے۔ 1906ء میں مسلم لیگ کی تشکیل کے بعد سے وہ مسلم لیگ سے وابستہ تھے۔ وہ ہندوستان کی مسلم سیاست میں پیش پیش رہے اور انہوں نے 1916ء میں لکھنؤ کے مقام پر ان مذاکرات میں بھی شرکت کی تھی۔ جس کے نتیجے میں مسلم لیگ اور کانگرس کے درمیان معاہدۂ لکھنؤ طے پایا تھا۔ 1919ء کی اصلاحات کے بعد سریندر ناتھ بینرجی نے بنگال میں جو وزارت تشکیل دی فضل الحق اس میں وزیرِ تعلیم تھے۔ وزیرِ تعلیم کی حیثیت سے انہوں نے گورنمنٹ اسلامیہ کالج کلکتہ کی بنیاد رکھی جس کے ذریعے بہت سے مسلم طلبہ کو جنہیں دوسرے کالجوں میں داخلہ نہیں مل سکتا تھا، اعلیٰ تعلیم کے حصول کا موقع ملا۔ اس سے ان کی شہرت وقار اور مقبولیت کو گویا پر لگ گئے۔

1935ء کے ایکٹ کے ذریعے دو سطحی حکومت کے خاتمے کے بعد 1937ء میں پہلی بار

انتخابات منعقد ہوئے۔ فضل الحق نے کرشک سرامک پرجا پارٹی کے سربراہ کی حیثیت سے انتخابات میں حصہ لیا۔ مجھے ان کی جماعت کی مخالفت کا ناخوشگوار فریضہ انجام دینا پڑا۔ فضل الحق نے ذاتی طور پر دو حلقوں سے کامیابی حاصل کی جن میں سے ایک حلقے میں انہوں نے خواجہ ناظم الدین کو شکست دی تھی۔ مجھے بھی دو حلقوں سے کامیابی ملی۔ میں نے اپنی محفوظ ترین نشست[4] خواجہ ناظم الدین کے لئے خالی کر دی اور وہ ضمنی انتخابات کے ذریعے مجلس قانون ساز کے رکن بن گئے۔ مسلم لیگ کی 39 نشستوں کے مقابلے میں کرشک پرجا پارٹی نے 36 نشستوں پر کامیابی حاصل کی[5]۔ فضل الحق نے ہندوؤں کے ساتھ اتحاد کے لئے گفت وشنید شروع کر دی۔ اس خطرے کو دور رکھنے کے لئے مسلم لیگ نے انہیں پیشکش کی کہ اگر وہ مسلم لیگ کے ساتھ اتحاد کر لیں تو وزارتِ اعلیٰ انکی جماعت کو دے دی جائے گی۔ اس طرح مسلم ارکان کے ایک طاقتور گروہ کی حمایت سے وہ بنگال کے وزیرِ اعلیٰ بن گئے۔ مسلم لیگ کے ساتھ روابط کے احیاء کے نتیجے میں انہوں نے 1940ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے تاریخ ساز اجلاس لاہور میں شرکت کی جہاں انہیں قرار داد لاہور پیش کرنے کا اعزاز بخشا گیا۔ 1941ء میں انہوں نے دفاعی کونسل کی رکنیت کے بارے میں مسلم لیگ کی حکم عدولی کی نیز ان پر جناح کے بارے میں ناشائستہ زبان استعمال کرنے کا الزام لگایا گیا۔ 7 دسمبر 1941ء کو ان کی کابینہ کے مسلم لیگی وزراء مستعفی ہو گئے۔ فضل الحق نے ہندو مہا سبھا کے ساتھ اتحاد قائم کر کے نئی وزارت تشکیل دے لی۔ 1943ء میں وہ مستعفی ہو گئے۔ 1946ء میں انہوں نے کرشک پرجا پارٹی کے رہنما کی حیثیت سے انتخابات میں حصہ لیا۔

1946ء میں مسلم لیگ کی کامیابی

1946ء کے انتخابات میں مسلم لیگ نے بنگال میں فیصلہ کن کامیابی حاصل کی۔ 250 نشستوں کے ایوان میں مسلمانوں کے لئے 119 نشستیں مخصوص تھیں۔ مسلم لیگ نے 114 نشستوں پر کامیابی حاصل کی۔ فضل الحق صرف 5 نشستیں حاصل کر سکے۔ خصوصی حلقوں سے منتخب ہونے والے چار ارکان بھی مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ فضل الحق کانگرس کے ساتھ حزبِ اختلاف میں جا بیٹھے کیونکہ میں نے مسلم لیگ کی کامیابی میں بنیادی کردار ادا کیا تھا لہٰذا ارکانِ جماعت نے مجھے ناظم الدین کے مقابلے میں متحدہ بنگال کی وزارتِ اعلیٰ کے لئے منتخب کیا جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے۔ بنگال واحد مسلم اکثریتی صوبہ تھا جس میں مسلم لیگی وزارت قائم ہوئی۔ اپریل 1946ء میں دہلی کے مقام پر مسلم لیگ کا ایک کنونشن طلب کیا گیا۔ میں نے مجلسِ قانون ساز کے ارکان کی ایک بڑی تعداد کے ساتھ اس میں شرکت کی۔ جناح نے ریلوے سٹیشن پر میرا استقبال کر کے میری عزت افزائی کی۔ مجھے کنونشن میں کلیدی قرارداد پیش کرنے کا اعزاز بھی حاصل ہوا۔ تاہم بنگال میں میری وزارتِ اعلیٰ کا دور ایک پر آشوب عہد ثابت ہوا کیونکہ ہندوؤں کو بنگال میں ایک مضبوط اور مستحکم مسلم لیگی وزارت کا قیام گوارا نہیں تھا۔ خاص طور پر جبکہ

آزادی کی منزل قریب آرہی تھی اور ہندوستان کی قسمت پر بحث ومباحثہ ہو رہا تھا۔ مسلم لیگ کی اعلیٰ قیادت نے 16 / اگست 1946ء کو یومِ راست اقدام قرار دیا تھا۔ کلکتہ کے ہزاروں مسلمانوں نے ایک مکمل طور پر پرامن عوامی جلسے میں شرکت کر کے یہ دن منانا چاہا لیکن ہندوؤں نے غالباً پہلے سے ہنگامہ آرائی کی بھرپور تیاری کر رکھی تھی چنانچہ اچانک مسلمانوں پر حملے شروع کر دیئے گئے۔ بعدازاں یہ فسادات مغربی بنگال کے کچھ ایسے اضلاع میں بھی پھیل گئے جن کی آبادی میں ہندوؤں کی اکثریت تھی۔ فسادات کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لئے مجھے دن رات کام کرنا پڑا۔ ہندوؤں نے غالباً شمالی ہندوستان میں اپنے انتہا پسند ہم مذہبوں کی شہ پر مسلمانوں کے قتلِ عام کی منصوبہ بندی کر رکھی تھی اور مناسب موقع کی تلاش میں تھے لیکن حکومت نے ان کوششوں کو ناکام بنا دیا۔

کلکتہ میں فسادات کا ردِّعمل مشرقی بنگال کے مسلم اکثریتی ضلع نواکھلی میں ظاہر ہوا۔ کلکتے میں ہندوؤں نے مساجد پر حملے کر کے نمازیوں کو حالتِ نماز میں شہید کر ڈالا تھا۔ ہلاک ہونے والوں میں کچھ امام اور مؤذن بھی شامل تھے جن کا تعلق نواکھلی سے تھا۔ مسلمانوں نے انتقام کے طور پر متعدد ہندو دیہات کو نذرِ آتش کر دیا۔ تقریباً 282 ہندو قتل ہوئے اور چار عورتیں اغواء ہوئیں جن میں تین کو بعدازاں برآمد کر لیا گیا۔ امرت بازار پتریکا سمیت کانگرس نواز اخبارات نے کانفرنس کی بنگال شاخ کے سیکرٹری کا بیان شہ سرخیوں کے ساتھ شائع کیا جس میں کہا گیا تھا کہ 50000 ہندو قتل کر دیئے گئے ہیں اور ان گنت عورتیں اغواء کر لی گئیں ہیں۔ اس قسم کی اطلاعات سے مشتعل ہو کر ہندوؤں نے اضلاعِ متحدہ کے قصبے گڑمکھ تسوار اور پورے صوبہ بہار میں مسلمانوں کو تہہ تیغ کرنا شروع کر دیا۔ اطلاعات کے مطابق مردوں، عورتوں اور بچوں سمیت تقریباً ایک لاکھ مسلمانوں کو ناقابلِ یقین درندگی اور بہیمیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے قتل کر دیا گیا۔ ہندوؤں کے مشتعل ہجوم چار روز تک بہار کے دیہاتی علاقوں میں دندناتے رہے۔ قتل وغارت گری، لوٹ مار، آتش زنی اور عصمت دری کا بازار گرم رہا۔ فسادیوں کو مکمل اطمینان تھا کہ بہار حکومت اور ہندو پولیس ان کی راہ میں حائل نہیں ہو گی بلکہ ان کی پشت پناہی کی جائے گی اور یہ اطمینان کچھ ایسا بلاجواز نہیں تھا۔ برطانوی فوجیوں کی ایک کمپنی کی آمد کے بعد ہی فسادات پر قابو پایا جا سکا۔ پنڈت جواہر لال نہرو کی تعریف کرنی چاہئے کہ وہ بہار میں ایک مشتعل ہندو ہجوم کے سامنے ڈٹ کر کھڑے ہو گئے اور انہیں حکم دیا کہ وہ فسادات سے باز آ جائیں۔ ورنہ وہ گولی چلانے کا حکم دیدیں گے۔ وہ اس وقت ہندوستان کے (عبوری) وزیرِاعظم تھے۔ میں نے خواجہ ناظم الدین کے مشورے کو نظرانداز کرتے ہوئے بہار سے بنگال میں داخل ہونے والے بہاری مسلمانوں کو پناہ دی اور ان کی ہر ممکن مدد کی۔[6] اس سے ہندو مزید برافروختہ ہوئے لیکن جب تک میں اقتدار میں تھا وہ کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

ہندوستان اور اس کے ساتھ بنگال کی تقسیم کے لئے 15 / اگست 1947ء کی تاریخ طے کی گئی تھی۔ اگست کے آغاز ہی سے ہندوؤں نے کلکتہ کی مسلمان آبادیوں میں مار دھاڑ اور لوٹ مار کی منظم مہم شروع کر دی۔ مسلمان پولیس سمیت مسلمان افسران مشرقی بنگال روانہ ہو چکے تھے یا ہونے والے تھے لہٰذا

کلکتہ میں پولیس کی نفری صد فیصد ہندوؤں پر مشتمل رہ گئی تھی۔ میں نے مقامی پولیس میں بھرتی کرنے کے لئے پنجاب سے مسلح سپاہی منگوائے تھے کیونکہ اس کے علاوہ کلکتہ کے فسادات پر قابو پانے کا کوئی راستہ باقی نہیں رہا تھا لیکن اب یہ نفری بھی مشرقی بنگال جا چکی تھی۔ کلکتہ میں برطانوی افواج کی جگہ بھی ہندوؤں نے لی تھی چنانچہ ہندوؤں کا خیال تھا کہ اب مسلمانوں کے قتلِ عام کے لئے راستہ صاف ہو چکا ہے۔

میں چھ یا سات اگست کو مسلم لیگ کی مجلسِ عاملہ کے اجلاس میں شرکت کے لئے کراچی آیا تاہم میں نے بنگال کی صورتحال کے بارے میں مسلسل رابطہ قائم کئے رکھا جو تیزی سے بگڑتی جا رہی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ کلکتہ اور مغربی بنگال کے چند دوسرے اضلاع میں مسلمان بہت بڑے خطرے سے دوچار ہو چکے ہیں کیونکہ ہندوؤں نے ارادہ کر لیا ہے کہ مسلمانوں کو مغربی بنگال سے نکلنا ہو گا۔ ورنہ انہیں نیست و نابود کر دیا جائے گا میں نے محسوس کیا کہ مجھے آزمائش کی اس گھڑی میں مسلمانوں کے ساتھ ہونا چاہئے۔ جناح نے بے حد شفقت اور نوازش سے کام لیتے ہوئے مجھے گشتی سفیر اور اپنا ذاتی ایلچی مقرّر کرنے کی پیشکش کی تا کہ دنیا بھر میں حکومتوں کو پاکستان کے منشائے ظہور سے آگاہ کیا جا سکے لیکن میں نے بنگال کے مسلمانوں کے بارے میں اپنے فرض کا احساس کرتے ہوئے معذوری ظاہر کر دی۔ انہوں نے مجھ سے یہاں تک کہہ دیا کہ میں واپس کلکتہ جانے کی بجائے کراچی ہی سے عکسی ہندو وزیرِ اعلیٰ پی سی گھوش کو اقتدار منتقل کر دوں جنہیں تقسیم کے بعد مغربی بنگال کا وزیرِ اعلیٰ بننا تھا۔ میں نے لیاقت علی خاں سے اس تجویز کا ذکر کیا۔ انہوں نے کہا کہ اگر جناح یہ پیشکش انہیں کرتے تو خوشی سے اچھل پڑے ہوتے میں نے انہیں بتانا چاہا کہ یہ عہدہ انکے مناسب حال نہیں ہے کیونکہ انہیں یقینی طور پر پاکستان کا وزیرِ اعظم بننا ہے۔ اس پر لیاقت علی خاں کا جواب سن کر میں حیران رہ گیا۔ لیاقت علی خاں نے بتایا کہ جناح نے ابھی تک ان سے وزارتِ عظمیٰ کے بارے میں ایک لفظ تک نہیں بولا یہ اگست کی نو تاریخ کا واقعہ ہے۔

فرقہ وارانہ ہم آہنگی

مجلسِ عاملہ کے اجلاس کے بعد میں طیّارے کے ذریعے واپس کلکتے پہنچا جہاں مجھے خبر ملی کہ یکے بعد دیگرے مسلمان آبادیوں پر حملے کئے جا رہے ہیں۔ مسلمانوں کو منظّم طریقے سے قتل کیا جا رہا ہے۔ مزاحمت کرنے والے مسلمانوں پر گولیاں چلا کر ہندو پولیس گویا فسادیوں کی مدد کر رہی ہے۔ میں سیدھا مہاتما گاندھی کے پاس گیا جو ان دنوں کلکتہ کے نواحی علاقے سودھ پور میں قیام پذیر تھے۔ میں نے گاندھی جی سے درخواست کی کہ وہ قتلِ عام کو روکنے کے لئے اپنا اثر و رسوخ استعمال کریں۔ میں نے مہاتما گاندھی کے نواکھلی تک سفر کی غرض سے ایک ٹرین کا بندوبست کر رکھا تھا لیکن اب میں نے ان پر زور دیا کہ وہ نواکھلی کا دورہ ملتوی کر دیں۔ میں نے دو گھنٹے تک ان کے سامنے حالات کی تصویر کشی کی اور کہا کہ اگر وہ انسانیت اور انصاف پر یقین رکھتے ہیں تو یہ ان کا فرض بنتا ہے کہ کلکتہ میں ٹھہر کر قتلِ عام کی روک تھام اور

فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے قیام میں مدد دیں۔ میں نے ان سے اپیل کی کہ اگر وہ ہندوستان اور پاکستان میں اقلیتوں کی بقا کے خواہش مند ہیں اور اگر وہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان امن کے متمنی ہیں تو انہیں کلکتہ میں رکنا چاہئے میں نے خیال ظاہر کیا کہ اگر کلکتہ اور اسکے گردونواح میں مسلمانوں کو ملیامیٹ کر دیا گیا یا انہیں نکل بھاگنے پر مجبور کر دیا گیا تو اس کا ردِّ عمل مشرقی بنگال میں ظاہر ہو گا اور وہاں کے ہندوؤں کو ایسے ہی سلوک کا سامنا کرنا پڑے گا۔ مشرقی بنگال میں ہندوؤں کی تعداد مغربی بنگال کے مسلمانوں سے چار گنا زیادہ ہے۔ مشرقی بنگال کے ہندوؤں میں صاحبِ ثروت لوگوں ' ساہو کاروں ' جاگیرداروں کاروباری لوگوں ' تاجروں ' ڈاکٹروں ' پروفیسروں اور اساتذہ کی بڑی تعداد شامل ہے جبکہ مغربی بنگال کے مسلمان عام طور پر مفلوک الحال کسان ہیں جن کے پاس کوئی زرعی اراضی نہیں ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ مشرقی بنگال سے آنے والے صاحبِ حیثیت لوگوں کے لئے جگہ پیدا کرنے کی خاطر یقیناً آسام ' بہار ' اضلاع متحدہ اور غالباً دوسری جگہوں پر بھی مسلمانوں کے لئے عرصۂ حیات تنگ کیا جائے گا اور پورا ملک خوفناک افراتفری کی لپیٹ میں آجائے گا۔

ہندوستان میں امن مشن

میری معروضات کے دوران گاندھی نے بہت کم مداخلت کی اور خاموشی سے میری بات سنتے رہے۔ بالآخر وہ اپنی مقدور بھر کوشش کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ بشرطیکہ میں بھی ان کے ساتھ رہوں اور ہم کلکتہ کی سب سے زیادہ متاثرہ آبادیوں میں سے ایک یعنی بیلیا گھاٹ میں ٹھہریں گے۔ فی الحقیقت گاندھی کی آمادگی انکی عالی حوصلگی کا ثبوت تھی کیونکہ انہیں اس راہ کی مشکلات اور خطرات کا بخوبی احساس تھا۔ میں فی الفور گاندھی کا ساتھ دینے پر تیاّر ہو گیا لیکن انہوں نے اصرار کیا کہ چونکہ اس ضمن میں میری جان کو خطرہ درپیش ہو گا لہٰذا مجھے اپنے والد اور اپنی بیٹی سے اجازت لینی چاہیے۔ اگلے دن میں اس خستہ سی عمارت میں گاندھی کے ساتھ آملا جو علاقے کے مسلمانوں نے مہیّا کی تھی اور انکے ساتھ تعجّب انگیز اجتماعات میں شریک ہونے لگا۔ اس دوران میں ناقابلِ یقین بلکہ ناقابلِ تصوّر مناظر دیکھنے میں آئے۔ ہم نے ان گنت محلّوں میں جلسے منعقد کئے۔ اپنی ہیئتِ ترکیبی میں یہ اجتماعات گاندھی کی پرارتھنا سے مشابہ تھے۔ گاندھی نے پرارتھنا کیلئے اجتماعات کی روایت قائم کی تھی جن میں انکے چند ہندو پیروکار شریک ہوتے تھے لیکن اب ان اجتماعات کی نوعیت یکسر بدل گئی تھی۔ معمول کے مطابق دعائیہ کلمات کے بعد گاندھی اور میں ان اجتماعات سے خطاب کرتے عورتوں اور مردوں کے ان مخلوط اجتماعات میں لاکھوں ہندوؤں اور مسلمانوں نے مکمل بھائی چارے اور افہام و تفہیم کی فضا میں شرکت کی۔ ماحول کی کایا کلپ ہونے لگی۔ تلخی ' نفرت ' قتل و غارت اور لوٹ مار کی جگہ فرقہ وارانہ ہم آہنگی قائم ہونے لگی۔ بایں ہمہ ابتدائی مراحل میں میری جان لینے کی کچھ کوششیں کی گئیں لیکن میں خوش قسمتی سے بچ نکلا۔ 15 اگست کو یوم آزادی بڑی دھوم دھام سے منایا گیا۔ ہندو اور مسلمان قریب ایک سال سے ایک دوسرے کے خلاف صف آراء

تھے۔ اب متحارب فریقین سے تعلق رکھنے والے مرد، عورتیں اور بچے پھلوں اور تحائف کے ساتھ ایک دوسرے کے گھروں میں جاتے دیکھے گئے۔ فی الاصل ایک معجزہ برپا ہو چکا تھا۔ گویا کسی نے جادو کی چھڑی گھما کر آفت زدہ بنگال میں امن قائم کر دیا ہو۔ بنگال کے عوام آگ اور خون کے اس ہولناک اور وحشیانہ طوفان کی زد سے بچ نکلے جس میں پنجاب، پنجاب کی سکھ ریاستیں، ریاست الور، ریاست بھارت پور اور دہلی کا شہر ڈوب چکا تھا۔ 3 ستمبر کو بیلیا گھاٹ میں ایک ناخوشگوار واقعہ رونما ہوا۔ خوش قسمتی سے اس کی نوعیت زیادہ سنجیدہ رخ اختیار نہ کر سکی۔ لیکن پھر بھی اسکے اثرات کلکتہ کے کچھ علاقوں میں پھیل گئے۔ اس واقعے کے پیچھے ہندو مہاسبھا کا ہاتھ تھا جسکے رضا کاروں نے خود گاندھی جی پر بھی ایک کینہ پرور حملہ کرنے سے گریز نہ کیا۔ گاندھی جی نے مرن برت کا اعلان کر دیا۔ خطرناک حد تک موت کے قریب پہنچنے کے باوجود گاندھی جی نے مرن برت ختم کرنے سے انکار کر دیا۔ حتیٰ کہ میں نے انہیں یقین دلایا کہ ہندو واقعی اپنے کئے پر شرمسار ہیں نیز یہ کہ حکومت اور پولیس نے مستقبل میں ایسے واقعات کی روک تھام کے لئے جو اقدامات کیے ہیں میں ان سے مطمئن ہوں۔ گاندھی جی کو اصرار تھا کہ میرے اظہارِ اطمینان تک وہ مرن برت ختم نہیں کریں گے۔ یہ گاندھی جی کی وسعتِ قلبی اور عظمتِ کردار تھی کہ وہ ہر جلسے میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی کا پرچار کرتے ہوئے بھائی چارے اور رواداری کی نئی فضا کا سہرا میرے سر باندھتے اور کہتے کہ اگر میں ان کے ساتھ نہ ہوتا تو وہ کچھ بھی حاصل نہ کر پاتے۔

کلکتہ میں ہماری کامیابی سے پورے بنگال میں خوشگوار اثرات مرتب ہوئے۔ بنگال میں قیامِ امن کے بعد گاندھی جی نے دہلی کا رخ کیا جہاں وحشیانہ طور پر مسلمانوں کا منظم قتل عام جاری تھا۔ گاندھی جی نے مجھے بتایا کہ میرا ان کے ساتھ دہلی جانا ہمارے معاہدے میں شامل نہیں تھا تاہم اگر میں ان کے ساتھ چلوں تو انہیں مسرّت ہوگی۔ میں نے ان کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا۔ جمعیت علمائے ہند کا ایک وفد روزانہ مجھ سے اور مہاتما گاندھی سے ملاقات کرتا تھا۔ لہٰذا مجھے فرقہ وارانہ صورتحال سے آگاہی ملتی رہی تھی۔ جمعیت کے سیکرٹری مولانا حفیظ الرحمٰن نے ہندوستان رہ جانے والے بدقسمت مسلمانوں کے مفادات کی نگہداشت کی ہر ممکن کوشش کی۔ گاندھی جی اکثر میری معروضات پر توجّہ دیتے تھے میرا خیال ہے کہ دہلی کی مساجد کو سکھ شرنارتھیوں سے خالی کروانے میں میری مساعی کو بھی کچھ نہ کچھ دخل تھا۔ گاندھی جی کو اس مقصد کے لئے مرن برت رکھنا پڑا تھا۔

اسی طرح میں سمجھتا ہوں کہ دہلی، ریواڑی، گڑ گاؤں اور دہلی کے ارد گرد دوسرے مقامات کے مسلمانوں کے تحفّظ میں بھی میں نے تھوڑا بہت ہاتھ بٹایا۔ میں نے ان تمام جگہوں کا دورہ کیا تھا میں نے مشرقی اور مغربی پنجاب سے جان بچا کر نکلنے والے مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں کے قافلوں کا مشاہدہ کیا۔ مسلمان پناہ گزینوں کے کیمپوں کا دورہ کیا۔ جالندھر ڈویژن اور انبالہ ڈویژن خاص طور پر ہوشیار پور، جالندھر، قادیان، پانی پت اور کرنال کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں سے پناہ گزینوں کی امداد اور تحفّظ کے بارے میں بات چیت کی۔ میری درخواست پر مہاتما گاندھی نے بھارتی کابینہ پر زور دیا کہ

معاہدے کے مطابق 50 کروڑ روپے حکومتِ پاکستان کے حوالے کیئے جائیں۔ سردار پٹیل نے یہ بہانہ بنا کر رقم کی ادائیگی روک لی تھی کہ یہ دولت کشمیر کے محاذ پر صرف کی جائے گی۔ میں نے گاندھی جی کی توجہ ان اطلاعات کی طرف بھی دلائی کہ ڈوگرا فوجیوں نے ان مسلمان افسروں کے خاندانوں کو قتل کر دیا ہے، جو سرکاری حفاظت میں سری نگر سے پاکستان جارہے تھے۔ بعد میں شیخ عبداللہ نے بھی ان اطلاعات کی تصدیق کی۔ گاندھی جی نے مسئلہ کشمیر کے تصفیے کے لئے تجویز پیش کی کہ مہاراجہ پاکستان اور بھارت دونوں ممالک سے الحاق کر لے۔ میں نے یہ تجویز چودھری ظفراللہ خاں کے گوش گزار کر دی جو ہندوستان کی شکایت کا جواب دینے اقوامِ متحدہ جارہے تھے۔ بدقسمتی سے یہ تجویز پاکستانی حکومت سے شرف قبولیت حاصل نہ کر سکی۔ گاندھی جی کے ساتھ قیام کے دوران فراغت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے اقلیتوں کے حقوق کا ایک منشور تیاّر کیا جس سے ہندوستان میں مسلمانوں اور پاکستان میں ہندوؤں کے حقوق کا تحفّظ ممکن ہو سکتا تھا[7] اس تمام عرصے کے دوران میں مسلسل دہلی، لاہور، کراچی اور کلکتہ کے درمیان سفر کرتا رہا۔ اس معاملے پر مہاتما گاندھی سے بات چیت کے بعد میں نے جناح سے رابطہ قائم کیا اور انکی رائے اور منظوری کا خواستگار ہوا۔ ان کا فوری ردِّعمل یہ تھا کہ مجھے پہلے بھارتی رہنماؤں کی منظوری حاصل کرنی چاہئیے۔ مہاتما گاندھی کے علاوہ پنڈت نہرو اور سردار پٹیل نے بھی میرے مسودے پر صاد کر دیا جب میں نے دوبارہ جناح سے رابطہ کیا تو انہوں نے کہا کہ وہ اس معاملے پر غور کرنے سے پہلے مہاتما گاندھی کی تحریری منظوری چاہتے ہیں۔ تاہم انہوں نے تسلیم کیا کہ ایسا منشور ایک مفید دستاویز ثابت ہو سکتا ہے۔ مہاتما گاندھی نے مسودے کو تحریری طور پر اشیرباد دے دی۔ اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کرتا تو اس منظوری کی عبارت کا مفہوم یہ تھا کہ گاندھی جی کو اس مسودے سے اتفاق ہے اگرچہ یہ ضرورت سے کچھ زیادہ مفصّل ہے۔ علاوہ ازیں گاندھی نے اس ضمن میں اپنے شک کا اظہار کیا کہ جناح سنجیدگی سے اس پر عمل کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

مجھ سے غلطی یہ ہوئی کہ میں نے گاندھی جی کی تحریری منظوری جناح کو دکھادی وہ اسے دیکھتے ہی بھڑک اٹھے اور دستاویز پر غور کرنے سے انکار کرتے ہوئے مجھے واپس تھمادیا۔ اگلے روز جناح نے مجھ سے وہ دستاویز واپس مانگی اور کہا کہ وہ خاص طور پر گاندھی کی تحریر پڑھنا چاہتے ہیں۔ مجھے معلوم تھا کہ اگر وہ دستاویز جناح کے قبضے میں چلی گئی تو وہ غیظ و غضب میں آکر مہاتما گاندھی سے ایک اور مناقشہ شروع کر دیں گے اور اس اہم معاملے پر تصفیے کی تمام امیدیں غارت ہو جائیں گی۔ بھارت اور پاکستان کے تعلقات میں مزید پیچیدگی پیدا ہوگی اور دونوں رہنماؤں کے درمیان پہلے سے موجود شکر رنجی میں اضافہ ہو گا۔ چنانچہ میں نے دستاویز جناح کے حوالے کرنے سے معذوری کا اظہار کیا اور کراچی سے رخصت ہو گیا۔ اس حکم عدولی پر جناح نے کبھی مجھے معاف نہ کیا۔

اپنی گزشتہ پیشکش کے علاوہ جناح نے مجھ پر التفات کرتے ہوئے مجھے یکے بعد دیگرے وزارتِ آباد کاری، اقوامِ متحدہ میں پاکستان کے مستقل مندوب، مشرقِ وسطیٰ کے ممالک میں سفارت حتیٰ کہ وزیرِ دفاع بننے کی پیشکشیں کیں۔

میرا خیال تھا کہ میرا پہلا فرض یہ ہے کہ مجھے پاکستان اور ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے قیام کے لئے ہر ممکن سعی کرنی چاہئے چنانچہ مجھے ان تمام پیشکشوں پر معذرت کرنا پڑی۔ مزید بر آں جب میں نے مہاتما گاندھی سے درخواست کی تھی کہ وہ کلکتہ میں فرقہ وارانہ امن وہم آہنگی کے لئے کوششیں کریں تو انہوں نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ میں کم از کم ایک برس تک پاکستان یا ہندوستان میں وزارت قبول نہیں کروں گا۔ میں نے برضا و رغبت اس عہد پر قائم رہنے کا وعدہ کیا تھا۔

30 جنوری 1948ء کو ایک متشدد اور انتہا پسند تنظیم راشٹریہ سیوک سنگھ کے ایک رکن نے مہاتما گاندھی کو قتل کر دیا۔ قاتل کا خیال تھا کہ گاندھی جی ناجائز طور پر مسلمانوں کی حمایت کرکے ہندوؤں کے مفادات کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ قاتل نے بیان دیا کہ مہاتما گاندھی کے بعد قتل کئے جانے والوں میں میرا نام دوسرے نمبر پر تھا اور تیسرا پنڈت نہرو کا تھا۔ میں تقسیم کے بعد ہندوستان اور پاکستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان بڑھتی ہوئی کشیدگی پر بے حد مضطرب تھا۔ فسادات کے ہولناک ترین مظاہرے پنجاب میں وقوع پذیر ہوئے بالاخر لیاقت علی خاں اور سردار پٹیل کے درمیان ایک معاہدہ طے پا گیا جس کے مطابق مشرقی پنجاب کے تمام مسلمانوں کو پاکستان منتقل ہونا تھا اور مغربی پنجاب سے تمام ہندوؤں اور سکھوں کو مغربی پنجاب بھیجا جانا تھا لیکن بھارت کے دوسرے علاقوں میں مسلمانوں پر وقفے وقفے سے حملے جاری تھے اور وہ بڑی تعداد میں پاکستان کا رخ کر رہے تھے۔

پاکستان کو یہ اعزاز جاتا ہے کہ تقسیم کے فوراً بعد دونوں ممالک میں برپا ہونے والی افراتفری کے نتیجے میں بھی قتل و غارت گری کے اکا دکا واقعات پیش آئے لیکن گرد و غبار بیٹھنے کے بعد اور فوری مسائل کے تصفیے کے بعد پاکستان میں فرقہ وارانہ ماحول مکمل طور پر پر امن ہو گیا اور کہیں سے فسادات کی اطلاع نہ ملی۔ چنانچہ پاکستان سے ہندوؤں کے بڑے پیمانے پر نقل مکانی کرنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ تاہم یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ مرکزی حکومت نے ہندوؤں کو نقل مکانی سے روکنے اور پاکستان میں قیام پر راغب کرنے کے لئے کوئی خاص کوشش نہ کی۔ میرے خیال میں ہندوستانی مسلمانوں کے مفاد کا تقاضا تھا کہ پاکستان میں ہندوؤں کے ٹھہرنے کی حوصلہ افزائی کی جاتی۔ اس ضمن میں ایک نیم دلانہ کوشش اس وقت کی گئی جب آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے سیکرٹری اچاریہ کرپلانی کو سندھ آنے کی دعوت دی گئی۔ تاکہ وہ ہندوؤں سے درخواست کریں کہ بلا جواز نقل مکانی سے گریز کیا جائے۔ عوامی اجتماعات میں اچاریہ کرپلانی نے ہندوؤں سے پاکستان میں رکنے کی درخواست کی لیکن موقر اطلاعات کے مطابق انہوں نے نجی طور پر ہندوؤں سے کہا کہ ہندوستان منتقل ہو جانا ان کے مفاد میں ہو گا۔ اور یہ کہ پاکستان میں رکے رہنا حماقت ہو گی چنانچہ

ہندوؤں کی بڑی تعداد کراچی اور سندھ سے رخصت ہو گئی۔ مغربی پاکستان میں ہندوؤں کی آبادی بے حد معمولی رہ گئی۔ ان میں سے بھی زیادہ تر سندھ کے ایک یا دو اضلاع میں مرتکز تھے۔

مشرقی بنگال میں امن مشن

مشرقی بنگال میں ہندوؤں کی ایک بڑی تعداد آباد تھی۔ ان میں کھاتے پیتے زمیندار' ساہو کار' سرکاری ملازمین' تاجر' دکاندار' ہنرمند' ماہرینِ زراعت اور بے زمین مزارعے سبھی شامل تھے۔ علاوہ ازیں اہم پیشہ ورانہ شعبوں مثلاً طب' تعلیم اور قانون میں ہندوؤں کی بڑی تعداد پائی جاتی تھی۔ افسر طبقے کے ہندوستان چلے جانے کے بعد کھاتے پیتے اور پڑھے لکھے لوگ بھی مشرقی بنگال سے رختِ سفر باندھنے لگے۔ نقل مکانی کرنے والوں کی تعداد بڑھنے لگی کیونکہ ہندوؤں کے نچلے طبقوں میں بھی اضطراب پھیل گیا تھا میں نے محسوس کیا اگر ہم مشرقی بنگال کے ہندوؤں کے مفادات اور انسانیت کے تقاضوں کو فراموش کر بیٹھے ہیں تو بھی پاکستانی قوم اور ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمانوں کا مفاد اسی میں ہے کہ اس رجحان پر قابو پایا جائے۔ نوجوان اور مستعد بنگالی ہندو کلکتہ کے مختلف علاقوں میں گاندھی آشرم قائم کر رہے تھے۔ میں نے بھی فرقہ وارانہ بھائی چارے کے فروغ کے پیشِ نظر ان اداروں سے رابطہ قائم کر رکھا تھا جہاں ہندو سماجی اور سیاسی فرض کے طور پر مسلمانوں کو تحفّظ کی ضمانت دے رہے تھے۔ ہندو رہنما صرف ہندوستان پر اثرانداز ہو سکتے تھے۔ مسلمانوں کا بھی فرض تھا کہ وہ پاکستان میں اپنے ہم مذہبوں کو فرقہ وارانہ انتہاپسندی سے باز رکھیں۔

میں نے اسی نقطۂ نظر سے مشرقی بنگال سے فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی تحریک شروع کی۔ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ وزیرِ اعلیٰ خواجہ ناظم الدین اور انکے وزراء کا خیال تھا کہ مشرقی بنگال میں ہندوؤں کے رہنے کا کوئی جواز نہیں ہے اور یہ کہ انہیں نقل مکانی سے روکنے کی کوشش نہیں ہونی چاہئے۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک با اثر وزیر کو اصرار تھا کہ مشرقی بنگال سے ہندوؤں کو زبردستی باہر نکال دینا چاہئے۔ ان حضرات کو اس حقیقت کا قطعاً احساس نہیں تھا کہ ایسے اقدام سے مغربی بنگال اور بھارت کے دوسرے علاقوں میں رہنے والے مسلمانوں پر کیسے تباہ کن اثرات مرتب ہوں گے۔ خواجہ ناظم الدین کا یہ بھی خیال تھا کہ ہندو مسلم کشیدگی نفرت کی ان حدوں کو چھو چکی ہے کہ مشرقی بنگال کے مسلمان فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی تحریک کو مسترد کر دیں گے اور ہندو بھی سہروردی کے (یعنی میرے) اخلاص پر یقین نہیں کریں گے اور میرا مشن ناکامی سے دوچار ہو جائے گا۔ یہ امر اطمینان بخش تھا کہ ان کا نقطۂ نظر غلط ثابت ہوا۔ مسلمانوں نے ایک بار پھر اس عالی ظرفی اور رواداری کا ثبوت دیا جس کے بارے میں مجھے ہمیشہ اعتماد رہا تھا۔

پورے مشرقی بنگال میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے فقید المثال جوش و جذبے اور غیر معمولی تعداد میں میرے جلسوں میں شرکت کی۔ میرا دورہ بھرپور طریقے سے کامیاب ہوا اور ہر جگہ مسلمانوں نے مجھے یقین

دلایا کہ وہ اپنے ہندو ہمسایوں کے ساتھ پرامن طور پر رہیں گے اور ان پر آنچ نہیں آنے دیں گے اور پھر ان مسلمانوں نے اپنے کئے پر عمل کر کے دکھا دیا۔ اسی طرح ہندوؤں نے عہد کیا کہ وہ مشرقی بنگال میں ہی رہیں گے۔ میرے دورے کی بے نظیر کامیابی سے خواجہ ناظم الدین اور انکے وزراء کی نیندیں اڑ گئیں۔ میں دیہاتی علاقے میں ایک امن جلسے سے خطاب کے لئے ڈھاکہ سے روانہ ہونے والا تھا کہ مجھے صوبائی حکومت نے مشرقی بنگال سے نکل جانے کا پروانہ تھما دیا۔ میں ان دنوں مشرقی بنگال میں مستقل رہائش اختیار کرنے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس حکم نامے کے بعد اس منصوبے پر پانی پھر گیا۔ تاہم میں نے امن اور بھائی چارے کے جو بیج بوئے تھے وہ برگ و بار لا کر رہے۔ میری صوبہ بدری کے بعد ہندوؤں کا اخراج پھر سے شروع ہو گیا لیکن تھوڑے ہی عرصے میں صورتِ حال معمول پر آ گئی اور نقل مکانی کا رجحان ختم ہو گیا۔ آج بھی مشرقی پاکستان میں ہندوؤں کی ایک بڑی تعداد امن و آشتی سے رہ رہی ہے۔ یہ صورتحال بھارت کے لئے ایک سبق کا درجہ رکھتی ہے جہاں اطلاعات کے مطابق آزادی کے بعد 520 مسلم کش فسادات برپا ہو چکے ہیں جبکہ پاکستان میں ایسے صرف تین واقعات رونما ہوئے ہیں۔

اسمبلی کی رکنیت سے محرومی

کلکتہ میں قیام کے باوجود میں پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کا رکن تھا چونکہ ابھی تک شہریت کے قوانین نہیں کئے گئے تھے۔ لہٰذا میں کلکتہ میں رہتے ہوئے بھی کراچی میں پاکستان دستور ساز اسمبلی کی رکنیت برقرار رکھ سکتا تھا۔ مجھے بعض بنیادی نوعیت کے معاملات پر حکومتِ پاکستان کی پالیسی سے اختلاف تھا اور میں نے اس اختلاف کا برملا اظہار کیا۔ میں سمجھتا تھا کہ حکومت کو چاہئے کہ اقلیتوں کو شکوک و شبہات کی نظر سے دیکھنے اور انہیں غدّاری کے الزامات سے ہراساں کرنے کی بجائے انہیں تحفّظ کی ضمانت دے ان کی حوصلہ افزائی کرے کہ وہ پاکستان سے رخصت نہ ہوں اور یہ ان کی فلاح و بہبود پر توجّہ کی جائے۔ میری نظر میں اقلیتی فرقوں سے تعلق رکھنے والے افراد بھی پاکستان میں برابر کے شہری ہیں اور انہیں وہی حقوق ملنے چاہیں جن کا مسلمانوں کو مستحق سمجھا جاتا ہے' ایسی پالیسی سے ہندوستان میں رہنے والے مسلمانوں کی حیثیت پر بہت مثبت اثرات مرتب ہوتے۔ علاوہ ازیں مجھے لیاقت علی خان کے اس خیال سے اتفاق نہیں تھا کہ مسلم لیگ کو پاکستان میں مسلمانوں کی واحد سیاسی جماعت ہونا چاہئے اور یہ کہ مسلم لیگ وزارت کی مخالفت کرنے والا ہر مسلمان ملک کا غدّار تھا۔ میری رائے تھی کہ جمہوری ملک میں حزبِ اختلاف بھی اتنی ہی اہم ہوتی ہے جتنی حکومت۔ سیاسی جماعتوں کو قائم ہونے اور کام کرنے کی اجازت دیئے بغیر اور جمہوری روایات پر عمل کئے بغیر کوئی حکومت جمہوری کہلانے کی مستحق نہیں ہو سکتی۔ مجھے دستور ساز اسمبلی کی رکنیت سے محروم کرنے کے لئے 1948ء میں ایک قانون نافذ کیا گیا جس کے مطابق اسمبلی کا سپیکر کسی بھی ایسے رکن کو اسمبلی کی رکنیت سے محروم کر سکتا تھا جس نے پاکستان کے کسی حصے میں رہائش اختیار کر کے کم از

کم چھ ماہ تک ملک میں قیام نہ کیا ہو۔ دراں حالیکہ ابھی تک پاکستان میں شہریت کے قوانین بھی نافذ نہیں کیئے گئے تھے مشرقی بنگال میں میرے ایک دوست نے فوری طور پر اپنی جائیداد میرے نام منتقل کر کے قانون کا تقاضا پورا کر دیا۔ لیکن مجھے سرکاری طور پر مشرقی بنگال میں داخل ہونے سے روک کر یہ دروازہ بھی بند کر دیا گیا۔ قائدِ اعظم دستور ساز اسمبلی کے سپیکر بھی تھے جب تک وہ زندہ رہے میرے خلاف کوئی قدم اٹھانے سے گریز کیا گیا۔ انکے انتقال کے کچھ عرصے بعد میں نے اعلان کیا کہ میں 5 مارچ 1949ء کو مستقل طور پر مغربی پاکستان میں منتقل ہو جاؤں گا۔ یہ خبر سنتے ہی لیاقت علی خاں نے دستور ساز اسمبلی کے سپیکر مولوی تمیز الدین کو اشارہ کیا اور 26 فروری 1949ء کو دستور ساز اسمبلی میں میری رکنیت ختم کر دی گئی۔[9]

تحریک جمہوریت

مغربی پاکستان آنے کے بعد میں نے عوامی مسلم لیگ کے نام سے ایک سیاسی جماعت تشکیل دینے کا فیصلہ کیا۔ میں نے یہ تجویز پہلے بھی کئی پاکستانی دوستوں کے سامنے رکھی تھی۔ اس جماعت کے دروازے پاکستان کے تمام مسلمان شہریوں پر کھلے تھے تاکہ ایک بار پھر سے جناح کے زمانے کی مسلم لیگ کی طرح مسلمانوں کی ایک عوامی جماعت قائم ہو سکے۔ لیاقت علی خاں نے ردِ عمل کا اظہار کرتے ہوئے مجھے "غدّار" اور ہندوستان کا ایجنٹ" قرار دیا اور کئی ایسے ناشائستہ الفاظ استعمال کیئے جو انہیں زیب نہیں دیتے تھے۔ انہوں نے دھمکی دی کہ وہ حزبِ اختلاف کو "اپنی ایڑی تلے کچل دیں گے"[10] اس بات کا سہرا پاکستانی مسلمانوں کے سر پر باندھنا چاہئے کہ انہوں نے وقت کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے اس چیلنج کو قبول کیا۔ لیاقت علی خاں کی دشنام طرازی نے میری جماعت اور حزبِ اختلاف کی تشکیل میں کسی بھی دوسرے امر سے بڑھ کر مدد کی۔

حزب اختلاف کا قیام

مغربی پاکستان میں حزبِ اختلاف کا قیام بے حد دشوار تھا تاہم سرکاری مسلم لیگ نے جسے جیبی مسلم لیگ بھی کہا جاتا تھا متعدد اہم اور با اثر افراد کو اپنی رکنیت سے خارج کر رکھا تھا اور ان سے بعض کو حکومت کے اقدامات پر نکتہ چینی کرنے کی پاداش میں پبلک سیفٹی ایکٹ کے تحت بغیر مقدمہ چلائے نظر بند بھی رکھا گیا تھا۔ ان افراد کے تعاون سے ہمارا کام قدرے آسان ہو گیا۔

مشرقی پاکستان کے مسلمان مجھے بہت اچھی طرح جانتے تھے لہٰذا وہاں عوامی مسلم لیگ کو فی الفور عوامی پزیرائی حاصل ہو گئی۔ مجھے بنگال میں کام کرتے ہوئے اتنا عرصہ ہو چکا تھا کہ میرے کارکنوں کی دوسری پشت جوان ہو چکی تھی اور پھر مسلم لیگ کو منظم کرتے ہوئے میں نے عوام میں بارہ سال گزارے تھے۔ ظاہر ہے

کہ دستور ساز اسمبلی میں عوامی لیگ کا کوئی نمائندہ نہیں تھا یہ جماعت 1949ء میں قائم ہوئی تھی اور اسمبلی سے باہر حزب اختلاف کا کردار ادا کر رہی تھی۔ مسلم لیگ کے ساتھ پہلی بار 1951ء میں معرکہ ہوا جب پنجاب کی مجلس قانون ساز کے لئے انتخابات کروائے گئے۔ میں نے اپنی تنظیم کو نواب ممدوٹ کی جماعت جناح مسلم لیگ کے ساتھ مدغم کر دیا تھا۔ چنانچہ ہم نے جناح عوامی مسلم لیگ کے نام سے امیدوار کھڑے کئے۔ نواب ممدوٹ کے والد نواب افتخار الدین خان کی بدولت جناح تقسیم سے قبل پنجاب میں مسلم لیگ کی بنیاد رکھنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ پنجاب میں مسلم لیگ کی سیاسی ساکھ قائم کرنے میں نواب ممدوٹ نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ قیامِ پاکستان کے بعد انہیں مغربی پنجاب کا وزیر اعلیٰ منتخب کیا گیا۔ انکے ایک وزیر میاں ممتاز خاں دولتانہ انہیں پچھاڑ کر وزارتِ اعلیٰ اور صوبائی مسلم لیگ پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ نواب ممدوٹ سرکاری مسلم لیگ سے نکل کر اپنی سیاسی جماعت تشکیل دینے پر مجبور ہو گئے۔ 1951ء میں پنجاب کے صوبائی انتخابات کے دوران ہمیں پہلی بار اپنی قوت آزمانے کا موقع ملا۔ اگر اس حقیقت کو مدِّ نظر رکھا جائے کہ حکومت نے مسلم لیگ کے مخالف امیدواروں کو شکست دینے کے لئے اپنے تمام ذرائع اور سرکاری مشینری کو کھلم کھلا استعمال کیا تو ہماری کامیابیوں کو خاصا اہم سمجھا جا سکتا ہے۔

میں اپنی جماعت کا سربراہ اور مرکزی ترجمان تھا لہٰذا مجھے انتخابات سے پنجاب کے عوام کو اپنی پالیسی سے متعارف کروانے کا موقع ملا۔ میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پنجاب کے تقریباً تمام حلقوں کا دورہ کیا اور ایسے مقامات پر بھی گیا جہاں صوبے کے کسی رہنما نے کبھی قدم نہیں رکھا تھا۔ کچھ عرصے بعد افسوس ناک طور پر نواب ممدوٹ اور ہمارے راستے الگ الگ ہو گئے۔ نواب ممدوٹ کا خیال تھا کہ اگلے بیس برس تک مسلم لیگ کو شکست دینے کا کوئی امکان نہیں ہے اور وہ حزبِ اختلاف کی بے ثمر سیاست کر کے اپنے اور اپنے بچوں کے مستقبل کو تاریک نہیں کرنا چاہتے تھے۔ مسلم لیگ اپنے حامیوں پر جائیدادوں، پرمٹوں اور دیگر نوازشات کی جو بارش کر رہی تھی۔ نواب صاحب کو اس سے محروم رہنا گوارا نہیں تھا۔ متحدہ پنجاب میں نواب ممدوٹ زرعی اراضی کے اعتبار سے سب سے بڑے جاگیر دار تھے لیکن ان کی ساری جائیداد مشرقی پنجاب میں تھی اور انہیں تقسیم کے نتیجے میں اپنی ساری جائیداد سے ہاتھ دھونے پڑے۔ قدرتی طور پر نواب صاحب حکومتی نوازشات کو اپنا استحقاق سمجھتے تھے اور حزبِ اختلاف میں ہونے کے باعث احساسِ محرومی کا شکار ہو رہے تھے۔

جناح مسلم لیگ کی علیحدگی کے بعد میری جماعت پھر سے عوامی مسلم لیگ رہ گئی بعد ازاں میں نے "مسلم" کا لفظ بھی حذف کر دیا کیونکہ میرا خیال تھا کہ پاکستان کے عوام ہندوؤں کے ساتھ مشترک شہریت سے مانوس ہوتے جا رہے ہیں مزید براں پاکستان کے استحکام و ترقی کے لئے ضروری ہے کہ پاکستان کے تمام شہری بلا امتیازِ مذہب مشترک سیاسی پلیٹ فارم پر ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں چنانچہ عوامی لیگ کے دروازے غیر مسلموں پر بھی کھول دیئے گئے مجھے امید تھی کہ ایک روز جداگانہ طرزِ انتخاب کو از کارِ

رفتہ قرار دیکر مخلوط طرزِ انتخاب رائج کیا جائے گا اور ہندو مسلمانوں کے ساتھ مل کر مشترکہ امیدواروں کے لئے ووٹ دے سکیں گے یہ تصور مسلم لیگ پر نہایت گراں گزرتا تھا۔

پنجاب کے بعد شمال مغربی سرحدی صوبے میں انتخابات منعقد ہوئے لیکن وہاں میرے داخلے پر پابندی عائد کر دی گئی۔ بہاولپور میں انتخابات کے نتیجے میں میری جماعت کے کچھ امیدوار مجلسِ قانون ساز تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئے سندھ کے جاگیردار وڈیروں کے خلاف کوئی کامیابی حاصل کرنا کارے دارد ثابت ہوا۔ ان انتخابات سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ میں نے صوبوں کے دورے کر کے عوامی اجتماعات میں تقریریں کیں جگہ جگہ عوامی لیگ کی شاخیں قائم ہوئیں عوامی لیگ کو نئے کارکن میسّر آئے اس کے علاوہ مجھے مقامی حالات سے آگاہی ہوئی اور عوام مجھ سے متعارف ہوئے مشرقی بنگال میں عوامی لیگ دن دوگنی رات چوگنی ترقی کر رہی تھی۔ میں نے مولانا بھاشانی کو مشرقی بنگال عوامی لیگ کا صدر مقرر کیا تھا۔ مولانا بھاشانی سے میری پہلی ملاقات 1931ء میں سراج گنج کے مقام پر ہوئی تھی۔ جہاں میں شمالی بنگال میں سیلاب کی تباہ کاریوں سے متاثرہ افراد کی اعانت کے لئے دورہ کر رہا تھا۔ وہ صحیح معنوں میں ایک شعلہ بیان مقرر تھے اور ان کی تشبیہات میں بڑی عوامی کشش تھی۔ عوامی لیگ کو اسی طرح یونین' تھانہ' سب ڈویژن' ضلع اور صوبے کی سطح پر منظم کیا گیا جس طرح میں نے مسلم لیگ کی تنظیم کی تھی بعض مقامات پر تو عہدے داروں سمیت مسلم لیگ کی پوری شاخ نے عوامی لیگ میں شمولیت کا اعلان کر دیا۔

جمہوریت کے تحفظ کے لئے فوجی معاہدے

1954ء کے آغاز میں پاکستان نے امریکہ کے ساتھ باہمی دفاعی امداد کے معاہدے پر دستخط کئے۔ امریکہ سے فوجی امداد کے بدلے میں پاکستان نے اقرار کیا کہ اپنے دفاع کے علاوہ خطّے میں قیام امن اور آزاد دنیا کے تحفّظ کے لئے اعلیٰ معیار کی فوجی قوّت قائم کی جائے اس کے علاوہ پاکستان دو دفاعی معاہدوں یعنی معاہدۂ بغداد اور سیٹو کا رکن بن گیا۔ یوں امریکہ اور دولتِ مشترکہ کے رکن ممالک سے پاکستان کو بھاری دفاعی اور اقتصادی امداد ملنے لگی۔

تقسیم کے بعد پاکستان کو بھارت سے اپنے حصے میں آنے والے فوجی اور سول سازو سامان کی پوری مقدار نہیں مل سکی تھی۔ چنانچہ پاکستان کو ریاست کے ہر شعبے میں بالکل ابتدائی سطح سے قومی تعمیر کا کام کرنا پڑا۔ اس پر مزید بدقسمتی یہ ہوئی کہ پاکستان کے حصے میں آنے والے علاقے اقتصادی لحاظ سے پسماندہ تھے۔ جہاں صنعتوں کا وجود نام کو نہیں تھا۔ پاکستان کے پاس شجاع فوج تو موجود تھے مگر اسلحے کے نام پر ہمارے پاس کچھ نہیں تھا۔ پاکستان کی ترقیاتی ضروریات اور دفاعی کمزوری کے باعث یہ ضروری ہو گیا تھا کہ ایسی عالمی طاقتوں سے رجوع کیا جائے جو ہم سے ہمدردانہ رویّہ رکھتی ہوں اور جن کے لئے ہمارا سیاسی نقطۂ نظر قابلِ قبول ہو ہندوستان کے پاس اسلحہ سازی کے پندرہ کارخانے تھے اس کے علاوہ کار' ٹرک' ہوائی جہاز

بنانے کے کارخانے، فولاد کے کارخانے اور دیگر صنعتی وسائل کی کچھ کمی نہ تھی۔ اتنے طاقتور اور مخاصم ہمسایہ ملک کے ساتھ باعزت طور پر زندہ رہنے کے لئے ضروری تھا کہ ہم اپنی دفاعی کمزوری کو جلد از جلد دور کریں۔

برس ہا برس تک برطانوی تعلیم و تربیت کے زیر اثر رہنے کے باعث عوام میں جمہوریت اور قانون کی حکمرانی کی محبت جڑ پکڑ چکی ہے۔ اور انہیں شہری آزادیوں پر پابندیوں اور آمریت سے طبعی طور پر نفور ہے۔ اس کے علاوہ انگریزوں نے ہمیں بہترین انتظامی، عدالتی اور فوجی اداروں سے روشناس کروایا چنانچہ آزادی کے بعد سے لاشعوری طور پر عوام انگریزوں کے بارے میں دوستانہ رجحانات رکھتے ہیں اور مغربی جمہوریت کی طرف ان کا میدان بالکل واضح ہے۔ اشتراکی معاشروں میں مذہب اور تصورِ خدا سے گریز سرکاری پالیسی کا حصہ ہے، سماجی زندگی میں تنوّع مفقود ہے اور فرد کو مکمل طور پر معاشرے کا مطیع ہونا پڑتا ہے۔ یہ تمام تصوّرات مسلمانوں کے لئے بارِ خاطر ہیں علاوہ ازیں اشتراکی معاشروں میں عملِ تطہیر، سیاسی وجوہات کی بنا پر مخالفین کے قتل، اذیت گاہوں اور مبیّنہ غیر ملکی جاسوسوں کے خلاف مضحکہ خیز مقدمات کی اطلاعات کے نتیجے میں عوام نے فوراً ان معاہدوں کو قبول کر لیا جن کے تحت امریکہ ہمیں گراں قدر فوجی سازوسامان اور اضافی پرزے مہیّا کر رہا تھا۔ پاکستان اپنی پتلی معاشی حالت کے مدِ نظر ایسا اسلحہ خریدنے کا تصوّر بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ان معاہدوں کے نتیجے میں ہم اس قابل ہو گئے کہ اپنا دفاع کر سکیں اور اشتراکی اثرونفوذ نیز دیگر ملک دشمن عناصر کا مناسب سدّباب کر سکیں۔

ان معاہدوں سے ہمیں دیگر ممالک سے روابط پیدا کرنے اور ترقیاتی منصوبے شروع کرنے میں بھی مدد ملی مشترکہ دفاعی مشقیں بھی کی گئیں اور اشتراکی اثرونفوذ پر قابو پانے کے لئے ایک مبسوط حکمتِ عملی تشکیل دی گئی۔ آہستہ آہستہ ہمیں امریکہ، دوسرے دوست ممالک اور دولتِ مشترکہ کے ممالک سے مالی و ٹیکنیکی اعانت ملنے لگی۔ تاکہ ہم صنعتی ترقی کی بنیاد رکھ سکیں، مختلف شعبوں میں خود کفالت حاصل کر سکیں اور اپنی اقتصادی ضروریات پوری کرنے کے لئے ملکی وسائل کو ترقی دے سکیں۔ مجھے اس ضمن میں کوئی شک نہیں کہ معاہدۂ بغداد اور سیٹو کے بغیر ہم کبھی اس قدر امداد حاصل نہ کر پاتے۔ کچھ حلقے ان معاہدوں پر اکثر نکتہ چینی کرتے ہیں لیکن انہیں معاہدوں کے طفیل عملی طور پر یہ ثابت کیا جاسکا کہ غیر اشتراکی معاشرے اشتراکی خطرے کے خلاف مشترکہ حکمتِ عملی اختیار کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ دراں حالیکہ سوویت یونین اور اس کے گماشتہ ممالک معاہدۂ وارسا کے نام سے ایک جارحانہ اور دفاعی معاہدے سے منسلک ہیں اور اس معاہدے کی گرفت اتنی بے لچک ہے کہ جب ہنگری نے معاہدے سے دست کش ہونے کی کوشش کی تو سوویت یونین نے فوجی قوت کے ذریعے ہنگری کی مزاحمت کو کچل کے رکھ دیا۔ علاوہ ازیں سوویت یونین اور چین بھی دفاعی معاہدے کر چکے ہیں۔ لیکن اشتراکی ممالک نے سیٹو اور سینٹو کے مکمل طور پر دفاعی اور حقیقی بحران کی صورت میں مشکوک افادیت کے حامل معاہدوں کے خلاف سخت اعتراضات کئے اور انہیں امنِ عامہ کے لئے خطرہ قرار دیا۔

امریکہ نے پاکستان کو ہتھیار فراہم کرتے ہوئے شرط عائد کی تھی کہ ان ہتھیاروں کو صرف اشتراکی جارحیت کے خلاف استعمال کیا جائے گا۔ روس خود کو معاہدۂ بغداد کا ہدف قرار دیتا تھا۔ اودھر چین کا خیال تھا کہ معاہدۂ سیٹو دراصل اس کے خلاف ایک سازش ہے۔ معاہدۂ بغداد کو بہانہ بنا کر بھارت ان وعدوں سے پھر گیا جو اس نے کشمیر کے بارے میں اقوامِ متحدہ میں کئے تھے' ادھر پاکستان بھی اس شرط کی عملی افادیت سمجھنے سے قاصر تھا جب کراچی میں معاہدۂ بغداد کا اجلاس منعقد ہوا تو میں نے بحیثیتِ صدر اجلاس سے سوال کیا کہ اگر ہم پر بھارت کی طرف سے حملہ کر دیا جائے تو ہم امریکی اور غیر امریکی ہتھیاروں میں کیسے تمیز کر سکیں گے۔ ہم تو مادرِ وطن کے دفاع میں ہر ممکن وسائل کو بروئے کار لائیں گے[11] اس کے علاوہ یہ کون کہہ سکتا ہے کہ اگر بھارت نے ہمارے خلاف جارحیت کا ارتکاب کیا تو اس کے پیچھے اشتراکی انگیخت نہیں ہو گی۔ اشتراکی ممالک ہم سے مخاصمانہ رویہ رکھتے ہیں ادھر بھارت ایک طرف روس اور چین سے پینگیں بڑھا رہا ہے دوسری طرف سرپرستانہ انداز میں امریکی امداد بھی قبول کر رہا ہے۔ امریکی بھارت کو غیر جانبدار رکھنے کی کوشش میں زبردستی اس کے حلق میں امداد انڈیل رہے ہیں[12]

الغرض کہ یہ معاہدے اشتراکی ممالک اور بھارت کو بہت ناگوار گزرے اور اندرونِ ملک اشتراکی رجحان کے حامل عناصر کو گویا حکومت کی مذمت کرنے کا بہانہ ہاتھ آ گیا اُس وقت حزبِ اختلاف میں عوامی لیگ مضبوط ترین جماعت تھی عوامی لیگ نے صورتِ حال کا بھرپور فائدہ اٹھایا اور جلد ہی اشتراکیت نواز حزبِ اختلاف اور غیر اشتراکیت نواز حتیٰ کہ اشتراکیت مخالف حزبِ اختلاف میں فرق کرنا مشکل ہو گیا۔ 1955ء میں میرے وزارت سے علیحدہ ہونے کے بعد مولانا بھاشانی کو گویا اپنے جوہر دکھانے کا موقع مل گیا یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی کہ مولانا بھاشانی کمیونسٹوں اور اشتراکیت نواز عناصر سے میل جول رکھتے تھے۔ انہوں نے بیرونِ ملک متعدد امن کانفرنسوں میں بھی شرکت کی تھی۔ ان کانفرنسوں کی سرپرستی اشتراکی ممالک کیا کرتے تھے۔ مولانا بھاشانی کے حامیوں نے انہیں خوب بانس پر چڑھا رکھا تھا اور ماؤزے تنگ سے ان کا تقابل کر کے ان کی خود پسندی کو خوب خوب ہوا دی جاتی تھی۔ یہ بات ہمیشہ ایک راز رہی کہ امریکہ نے امن کانفرنسوں کا اہتمام کرنے کی بجائے یہ میدان روس اور اشتراکی جماعتوں کے لئے کیوں خالی چھوڑ دیا تھا۔ اس سے عوام کو یہ تاثر ملتا کہ موخرالذکر گروہ امن کا پرچارک ہے جبکہ امریکہ اور مغرب کی دیگر جمہوریتیں جنگ کی طلبگار ہیں پاکستان میں حزبِ اختلاف نے عوام میں اس تاثر کو پھیلانا شروع کر دیا کہ امریکہ کی فوجی امداد مسلم لیگ کی فسطائی حکومت کو مقبولیت بخشنے کی غرض سے دی جا رہی ہے اور اس حکومت کو جسے نوکر شاہی' فوج' جاگیرداروں اور صنعت کاروں کی پشت پناہی حاصل ہے۔ عوام کے خلاف مسلح کیا جا رہا ہے۔

امریکہ اور حکومتِ پاکستان کی خارجہ پالیسی کو خاص طور پر ہدف بنایا گیا' مولانا بھاشانی نوجوانوں' طالبِ علموں' کمیونسٹوں' اشتراکیت نوازوں اور حقیقی محبِ وطنوں کی اچھی خاصی حمایت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس وقت شیخ مجیب الرحمٰن جیسے نوجوان تاثر پذیر رہنما اور مشرقی پاکستان کے مؤقر

ترین اور مقبول ترین بنگالی روزنامے کے مدیر تفضّل حسین عرف مانک میاں جیسے سیاسی دانشور بھی حزبِ اختلاف کے نقطۂ نظر کی حمایت کر رہے تھے۔ میں خود بھی حزب اختلاف میں تھا اور اس مہم کی زیادہ کھل کر مخالفت نہیں کر سکتا تھا تاہم میں نے عوام کو خبردار کیا کہ وہ خارجہ پالیسی کے بارے میں جوش کی بجائے ہوش سے کام لیں۔ حزبِ اختلاف کو پاکستان کی ضروریات کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں تھیں اور ہم لوگ خارجہ پالیسی پر زیادہ تیقن کے ساتھ تنقید کرنے سے قاصر تھے کیونکہ ہمیں کبھی خارجہ پالیسی پر اعتماد میں لیا ہی نہیں گیا تھا اور ملک کو کلی طور پر ایک جماعتی نظام کے تحت چلایا جارہا تھا۔ حکومت نے بھی اس ضمن میں زیادہ مستعدی سے کام نہیں لیا۔ حکومت نے حزبِ اختلاف کی تنقید کو لایعنی سمجھتے ہوئے نظرانداز کر دیا کیونکہ یہ مخالفت مشرقی پاکستان سے کی جارہی تھی اور مرکزی حکومت کی تمام پالیسیاں مغربی پاکستان کی ضروریات، خواہشات اور رائے عامہ کو مدّنظر رکھتے ہوئے تشکیل دی جاتی تھیں۔ فی الحقیقت یہ کہنا زیادہ غلط نہیں ہوگا کہ دنیا کے سامنے مغربی پاکستان کو ہی اصل پاکستان کے طور پر پیش کیا جاتا تھا۔ اور امداد دینے والے ممالک بھی مغربی پاکستان کو پیش نظر رکھتے تھے۔ مشرقی پاکستان کا کوئی پُرسانِ حال نہیں تھا یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ غیر ملکی زعمائے کے دوروں کا اہتمام مرکزی حکومت کرتی تھی اور ان سربراہان مملکت کو مغربی پاکستان کے چیدہ چیدہ مقامات تک ہی محدود رکھا جاتا تھا حکومت نے خارجہ پالیسی کو اس قدر اخفا میں رکھا تھا کہ عام طور پر یہ تاثر لیا جاتا تھا کہ حکومت اپنی خارجہ پالیسی پر شرمسار ہے۔ اور اس کا جواز پیش کرنے سے قاصر ہے۔ اقتصادی اعانت کے ضمن میں بھی بڑی حیص بیص کے بعد کسی مناسب اظہار تشکّر کے بغیر بیرونی امداد کی اطلاعات شائع کروائی جاتی تھیں جن سے قطعاً اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ دوست ممالک خاص طور پر امریکہ، پاکستان کی کس قدر گراں قدر اعانت کر رہے ہیں۔ درحقیقت حکومت نے اشتراکیت نواز، مغرب مخالف اور امریکہ مخالف مہم کا توڑ کرنے کی کوئی خاص کوشش نہ کی۔

جب میں نے 12 ستمبر 1956ء کو وزیرِ اعظم کا عہدہ سنبھالا تو میں نے فیصلہ کیا کہ میرا پہلا فرض پاکستان کے سیاسی ماحول میں تبدیلی لانا ہوگا۔ تاکہ عوام کی حمایت حاصل کی جاسکے کیونکہ صرف عوام کی حمایت کے بل بوتے پر ہی میں اس منصب کے لئے اپنے استحقاق کا جواز پیدا کر سکتا تھا۔ میں نے ڈھاکہ یونیورسٹی کے ایک اقامتی ہال میں طلباء کے سامنے تقریر کرتے ہوئے پہلی بار خارجہ پالیسی پر اپنے خیالات کا اظہار کیا، مجھے زیادہ ہم خیال سامعین کا مجمع میسّر نہیں تھا۔[13] تاہم منطقی استدلال کی مدد سے میں تقریر کے خاتمے تک طلباء کی حمایت حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا، شیخ مجیب الرحمٰن میری جماعت میں چوٹی کے تنظیم کار ہیں۔ ان کا کمال یہ ہے کہ وہ پورے صوبے میں کارکنوں سے لیکر رہنماؤں تک سب سے بالمشافہ رابطہ کرنے کی صلاحیت سے مالامال ہیں۔ تفضّل حسین اپنے بنگالی روزنامے "اتفاق" میں اپنی زوردار تحریروں کے ذریعے بنگالی عوام کی رائے کا رخ کسی بھی سمت موڑ دینے پر قدرت رکھتے ہیں۔ ان دونوں حضرات نے میرے نقطۂ نظر کو تسلیم کرتے ہوئے میری حمایت کی، اس کے بعد میں نے صوبے کا دورہ کیا اور عوام نے مجھے اپنے اعتماد سے نوازا۔ مولانا بھاشانی نے قائل ہونے سے انکار کر دیا۔ انہوں

نے ضلع تنگیل کے گاؤں کاگماری میں بڑی دھوم دھام سے ہندوپاک ثقافتی میلے کا اہتمام کیا تھا جو کئی روز تک جاری رہا وہاں پر ہمارے درمیان گھمسان کارن پڑا۔[14] عوامی لیگ کے دو مسلسل اجلاسوں میں مجھے مولانا بھاشانی کے 35 ووٹوں کے مقابلے میں 800 آراء ملیں۔ مولانا بھاشانی کو اپنی کامیابی کا یقین تھا۔ اس نتیجے کے بعد وہ کافی عرصے تک آئندہ لائحہ عمل کے بارے میں ڈانواڈول۔

نیپ کا بلیک میل

مغربی پاکستان حزبِ اختلاف کے رہنماؤں نے جن میں خان عبدالغفار خان، شیخ عبدالمجید سندھی اور جی ایم سید شامل تھے، بہت پہلے مجھ سے رابطہ کر کے میری قیادت میں عوامی لیگ میں شمولیت پر آمادگی ظاہر کی تھی تاہم میرا خیال تھا کہ ابھی مجھے یہ پیش کش قبول نہیں کرنی چاہئے کیونکہ میں مستند پاکستان نواز عناصر کی ایک عوامی جماعت تشکیل دینے کا ارادہ رکھتا تھا اور ان میں سے کچھ رہنماؤں کا ماضی میری جماعت کے فروغ میں مانع ہو سکتا تھا۔ مولانا بھاشانی کے عوامی لیگ سے علیحدہ ہونے پر ان صاحبان کو موقع مل گیا کہ انہیں اپنی جماعت کی سربراہی پیش کریں جسے نیشنل عوامی پارٹی (نیپ) کا نام دیا گیا۔ مغربی پاکستان میں اس جماعت کے ارکان کی اکثریت کٹر کانگریسی مسلمانوں پر مشتمل تھی۔ جبکہ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان میں، کمیونسٹ، نیم کمیونسٹ اور کٹر امریکہ مخالف عناصر اس جماعت میں شامل تھے۔ نیشنل عوامی پارٹی نے ایک کل پاکستان جماعت کی شکل اختیار کر لی مشرقی پاکستان کی مجلس قانون ساز میں نیشنل عوامی پارٹی کا کوئی رکن نہیں تھا۔ مرکزی اسمبلی میں اس جماعت کی نمائندگی صرف ایک رکن تک محدود تھی، تاہم مغربی پاکستان کی صوبائی اسمبلی میں نیشنل عوامی پارٹی کے دس ارکان تھے جنہوں نے نیپ کا پارلیمانی گروپ تشکیل دیا اور ان حضرات کے مدِ نظر صرف ایک مقصد تھا یعنی ون یونٹ کی تنسیخ۔ اس گروہ نے مسلم لیگ اور ری پبلکن پارٹی کی آویزش سے فائدہ اٹھایا۔ مسلم لیگ سے نیپ نے رابطہ قائم کر کے پیش کش کی کہ اگر نیپ کے ارکان ری پبلکن وزارت کے خلاف عدم اعتماد میں مسلم لیگ کا ساتھ دیں تو مسلم لیگ ون یونٹ کی تنسیخ کے حق میں رائے دینے کے لئے تیار ہے۔ نیپ کے ارکان کی مدد سے مسلم لیگ ری پبلکن پارٹی کو شکست دے سکتی تھی۔ اس پیش کش پر مسلم لیگ کی طرف سے صوبائی پارلیمانی پارٹی کے سربراہ سردار بہادر خان اور مسلم لیگ کے سیکرٹری قاضی عیسیٰ نے دستخط کئے۔

اس گراں قدر دستاویز سے مسلح ہو کر نیپ نے ری پبلکن پارٹی سے رابطہ قائم کیا اور اپنے تعاون کی قیمت دریافت کی۔ نیپ کے ارکان کو بخوبی علم تھا کہ مسلم لیگ کی طرف سے ون یونٹ کے خلاف قرارداد کی حمایت کروا لینا کافی نہیں ہو گا کیونکہ اصل فیصلہ مرکزی اسمبلی نے کرنا تھا اور وہاں کی باگ ڈور ری پبلکن پارٹی کے پاس تھی۔ ری پبلکن پارٹی نے نیپ کو یقین دہانی کروائی کہ وہ نہ صرف صوبائی مجلس قانون ساز میں ون یونٹ کے خلاف قرارداد کی حمایت کرنے پر تیار ہے بلکہ اسے مرکزی اسمبلی سے بھی پاس کروانے

کا ذمّہ لیتی ہے، سردار عبدالرشید نے ری پبلکن پارٹی کی طرف سے اس پیش کش پر دستخط کیے۔ مسلم لیگ اور ری پبلکن پارٹی دونوں نے نیپ کو پیش کش کی کہ وہ صوبائی وزارت میں حسبِ دلخواہ نمائندگی حاصل کر سکتی ہے۔ ری پبلکن پارٹی کو اعتماد تھا کہ وہ مجھے ون یونٹ کی مخالفت پر مجبور کر سکتی ہے۔ میں نے اس دھونس میں آنے سے انکار کر دیا۔ میرا خیال تھا کہ اقتدار کی کشمکش میں ون یونٹ ہر سودے بازی سے سیاست اور جمہوریت کی سبکی ہو رہی ہے۔ آخر انہی جماعتوں نے میاں ممتاز خان دولتانہ اور ڈاکٹر خان صاحب کی قیادت میں ون یونٹ کے منصوبے کو عملی جامہ پہنایا تھا۔ مزید براں اقتدار کے کوئے ملامت میں پندار کا صنم کدہ ویران کرنے سے پہلے ری پبلکن پارٹی اور مسلم لیگ کو نیشنل عوامی پارٹی کا نام تک سننا گوارہ نہیں تھا۔

مغربی پاکستان کی دونوں اہم سیاسی جماعتیں اس حد تک اخلاقی انحطاط کا شکار ہو چکی تھیں کہ انہیں کسی اصول کی مٹی پلید کرنے میں عار نہیں تھا۔ میں نے ان حالات میں مناسب سمجھا کہ عوام سے براہِ راست رابطہ قائم کر کے ان کا ردِّعمل معلوم کیا جائے۔ عوام نے میری پر زور حمایت کی۔ میں نے ری پبلکن پارٹی کے بارے میں اپنا لہجہ ممکنہ حد تک نرم رکھا اور اس سے درخواست کی کہ نیپ کے محض دو ارکان کے ہاتھوں اس طرح زبوں و خوار نہ ہو۔ ڈاکٹر خان صاحب کو اپنی جماعت کے بارے میں میرا رویّہ قطعاً پسند نہ آیا۔ بلاشبہ ان کا خیال تھا کہ میں ان کی جماعت کے مفادات پر ضرب لگا رہا ہوں۔ مفاد پرست عناصر نے میری تقاریر رنگ آمیزی کے ساتھ ان کے گوش گزار کیں جس سے وہ اور بھی مشتعل ہو گئے۔ ری پبلکن پارٹی نے اپنے بند اجلاس میں مغربی پاکستان کے گورنر نواب مشتاق حسین گورمانی کے خلاف قرارداد بھی منظور کی اور الزام لگایا کہ وہ مسلم لیگ کے ساتھ مل کر ری پبلکن پارٹی کے خلاف جوڑ توڑ کر رہے ہیں۔ میری رائے میں گورنر کا رویّہ ان کے منصب کے منافی تھا۔ چنانچہ میں نے ان سے استعفیٰ طلب کر کے ایک بزرگ سول سرونٹ اختر حسین کو گورنر مغربی پاکستان مقرر کر دیا۔ سرکاری ملازمت کے دوران ان کا ریکارڈ بڑا صاف ستھرا رہا تھا۔ متوازن دل و دماغ کے حامل اختر حسین اپنے رفقا میں بڑے احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔

استعفیٰ

ڈاکٹر خان صاحب کی شہ پر صدر سکندر مرزا نے مجھ سے استعفیٰ طلب کر لیا تاہم انہوں نے مجھ سے اگلے روز ملاقات کی خواہش کا بھی اظہار کیا تاکہ اختلافات پر افہام و تفہیم کی کوشش کی جا سکے۔ میں اصولوں پر سمجھوتہ کرنے اور بلیک میل ہونے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ میں نے صدر سکندر مرزا سے مطالبہ کیا کہ وہ اسمبلی کا اجلاس طلب کریں مجھے یقین تھا کہ میں اعتماد کا ووٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ سکندر مرزا نے مجھے بعد میں بتایا کہ اگلے روز ڈاکٹر خاں صاحب صبح کے اخبارات لیکر ان کے پاس پہنچے اور انہیں میرے مطالبے سے آگاہ کیا۔ ابھی تک انہوں نے میرا خط نہیں کھولا تھا۔ لہٰذا انہیں اس پر غور کر

کے افہام و تفہیم کی صورت نکالنے کا موقع نہیں ملاتھا۔ اخبارات میں میرے مطالبے کی خبر پڑھ کر سکندر مرزا بھنا گئے اور انہوں نے پارلیمنٹ کا اجلاس بلانے سے انکار کر دیا۔ 1956ء کے آئین کی ایک شق کے ذریعے صدر کو اختیار دیا گیا تھا کہ اگر وہ سمجھے کہ کوئی وزیر ایوان کا اعتماد کھو بیٹھا ہے۔ اسے برطرف کر سکتا ہے۔ آئین کی اس شق کا سہارا لیکر سکندر مرزا نے میرے استعفیٰ کا مطالبہ کیا اور دھمکی دی کہ حکم عدولی کی صورت میں وہ مجھے برطرف کر دیں گے میں نے کچھ تو برطرفی کی ذلّت سے بچنے کے لئے استعفیٰ دیدیا اور جزوی طور پر میں یہ بھی بتانا چاہتا تھا کہ پاکستان میں ایسے وزراء کی کمی نہیں جو اصولوں کی خاطر عہدے تیاگ دینے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ سکندر مرزا نے اگلے وزیر اعظم کے انتخاب تک مجھے بدستور وزیر اعظم کے فرائض سرانجام دینے کی ہدایت کی۔ اس اثناء میں انہوں نے پیر صاحب مانکی شریف کے ذریعے مصالحت کی پیشکش بھی کی۔ تاہم چھ روز بعد انہوں نے میرا استعفیٰ منظور کر کے مسلم لیگ پارلیمانی پارٹی کے قائد چندری گر کو وزیر اعظم مقرر کر دیا۔ ری پبلکن پارٹی نے اس اقدام کی حمایت کی۔

طریق انتخاب کا مسئلہ

ستمبر 1956ء میں اقتدار سنبھالنے کے بعد میں نے اپنے بیان میں اعلان کیا تھا کہ میرے پیشِ نظر سب سے مقدّم کام عام انتخابات کا جلد از جلد انعقاد ہو گا۔ میرے بہت سے دوستوں نے مجھے کہا تھا کہ میں نے یہ اعلان کر کے اپنی وزارت کی تقدیر پر مہر لگادی ہے۔ کیونکہ جو لوگ حقیقی اقتدار پر قابض ہیں اور انتظامیہ ' فوج ' جاگیرداروں ' سرمایہ داروں اور مفاد یافتہ عناصر کی تاریں اپنی مرضی سے ہلا سکتے ہیں ' وہ کبھی عام انتخابات کے انعقاد اور جمہوریت کے قیام کی اجازت نہیں دیں گے۔ رائے عامہ مکمل طور پر حکومت کی خارجہ پالیسی کی مخالف تھی 'میں نے عوام سے اپنی خارجہ پالیسی کے لئے حمایت حاصل کر کے اطمینان بخش طور پر ایک مشکل مرحلہ سر کر لیا۔ پہلی بار اسمبلی میں خارجہ پالیسی پر کھل کے بحث و تمحیص ہوئی اور تمام پہلوؤں کو کسی اخفاء کے بغیر کھنگالا گیا۔ ملک کی تاریخ میں پہلی بار قوم کو خارجہ پالیسی پر اعتماد میں لیا گیا۔ پارلیمنٹ اور عوام نے خارجہ پالیسی کی توثیق کی 'اب عام انتخابات کا مسئلہ درپیش تھا۔ آئینی طور پر صدر کو چیف الیکشن کمشنر کے تقرّر کا اختیار حاصل تھا۔ جن صاحب کو اس منصب پر فائز کیا گیا تھا انہیں مطلوبہ مستعدی سے ضروری انتظامات و اقدامات کرنے پر آمادہ کرنے میں کابینہ کو بڑی دقّت کا سامنا کرنا پڑا حالانکہ میں چیف الیکشن کمشنر کے راستے کی تمام رکاوٹیں یکے بعد دیگرے دور کر رہا تھا۔ تاہم ایک اصول طے کیئے بغیر انتخابی فہرستوں کی مناسب تیاری ممکن نہیں تھی اور وہ یہ کہ انتخابات مخلوط طریق انتخاب کی بنیاد پر منعقد ہوں گے۔ یا جداگانہ طرز انتخاب کا اصول اپنایا جائے گا۔

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935ء کے تحت مرکزی اور صوبائی مجالسِ قانون ساز کے انتخابات کے لئے جداگانہ طریق انتخاب طے کیا گیا تھا اور پاکستان میں تمام صوبائی مجالسِ قانون ساز کے انتخابات

بھی جداگانہ طریق کی بنیاد پر منعقد ہوئے تھے۔ یہ طریقِ انتخاب صرف مجالسِ قانون ساز کے لئے موزوں تھا کیونکہ کم از کم بنگال کی حد تک تمام بلدیاتی اداروں مثلاًیونین بورڈ' میونسپل کمیٹیوں 'ضلع بورڈ اور ضلعی سکول بورڈ کے تمام انتخابات مخلوط طرزِ انتخاب کی بنیاد پر منعقد ہوتے تھے جس زمانے میں مسلمان متحدہ ہندوستان میں اپنے حقوق کی جنگ لڑ رہے تھے' میں نے کبھی جداگانہ انتخابات کے مطالبے سے سرِمو انحراف نہیں کیا بلکہ اس کا پرزور حامی رہا۔ کیونکہ مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ اسی صورت میں ممکن تھا کہ انہیں اپنی مرضی کے نمائندے منتخب کرنے کا حق دیا جائے تاہم قیامِ پاکستان کے بعد پاکستان میں مسلمانوں کی بھاری اکثریت کے پیش نظر اس طریقِ انتخاب کی ضرورت باقی نہ رہی۔ اگر کسی کو جداگانہ طرز انتخاب یا خصوصی نمائندگی کا مطالبہ کرنے کی ضرورت ہو سکتی تھی تو وہ ہندو تھے لیکن ہندوؤں نے مسلمانوں کے ساتھ تعاون اور اکثریتی فرقے کے ساتھ خیر سگالی کے اظہار کی خاطر اس حق سے دستبردار ہونے کا فیصلہ کیا۔ ہندوؤں کا خیال تھا کہ وہ اکثریتی فرقے کے تعاون سے زیادہ بہتر طور پر اپنے جان و مال اور مفادات کا تحفظ کر سکیں گے۔

میرا نقطہ نظر یہ تھا کہ ایک مستحکم پاکستانی قومیت کی تشکیل کے لئے جس میں معاشرے کے تمام حصے مشترک قومی مقاصد کے لئے جدوجہد کر سکیں 'مخلوط طرزِ انتخاب از بس ضروری تھا۔ لیکن مسلم لیگ نے جداگانہ طرزِ انتخاب کو برقرار رکھنے پر اصرار کیا اور اسے اسلام کا لازمی حصہ قرار دیا۔ پاکستانی قومیت کی تخلیق مسلم لیگ کا دردِ سر نہیں تھا۔ مسلم لیگ کے مدِ نظر ایک ہی مقصد تھا اور وہ یہ کہ مسلمانوں کے انتہا پسندانہ جذبات بھڑکا کر مسلم عوام کی حمایت کی جائے 'جماعت اسلامی نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ مخلوط انتخابات سے بنگال میں مسلمانوں کے مفادات کو نقصان پہنچے گا ان کے دلائل اور اعداد و شمار مغالطہ آمیز اور متبائن ثابت ہوئے اور بلدیاتی اداروں کے مخلوط انتخابات سے ان کی تکذیب ہو گئی۔ آئین کی متعلقہ شق طے کرنے سے قبل وزیرِ اعظم چودھری محمد علی نے مشرقی اور مغربی پاکستان کی صوبائی مجالسِ قانون ساز کی رائے طلب کی تھی مشرقی پاکستان کی صوبائی مجلسِ قانون ساز نے بھاری اکثریت سے مخلوط انتخابات کے حق میں رائے دی جبکہ مغربی پاکستانی کی صوبائی مجلس قانون ساز نے بھرپور طریقے سے جداگانہ طریقِ انتخاب کی حمایت کی۔ بالا آخر آئین میں طریقِ انتخاب کے تعین کا اختیار صوبائی مجالس قانون ساز کے حوالے کر دیا گیا میں مرکزی اسمبلی سے آئین کی اس شق میں ترمیم کروا کے ملک کے دونوں حصوں میں مخلوط طرزِ انتخابات کے نفاذ میں کامیاب ہو گیا۔ اس سے مختلف فرقوں کے تعین 'فرقہ وارانہ نمائندوں کی تعدادِ مختلف فرقوں کے لئے انتخابی حلقوں کے تعین 'علیحدہ علیحدہ انتخابی فہرستوں کی تیاری اور الگ الگ انتخابی مراکز کے قیام سے نجات مل گئی۔ اس کی بجائے ہر انتخابی حلقے کی ایک ہی مشترکہ انتخابی فہرست تیار کی گئی۔ اس سے ایک بڑا پیچیدہ مذہبی تنازعہ بھی طے ہو گیا کہ آیا احمدی (جنہیں قادیانی بھی کہا جاتا ہے) مسلمان ہیں یا نہیں۔ اس تنازع پر لاہور 'ملتان اور دیگر جگہوں پر بہت سی جانیں ضائع ہو چکی تھیں۔ مسلمانوں کے ایک بڑے حصے کا خیال تھا کہ احمدی مسلمان نہیں ہیں لہٰذا مسلم انتخابی فہرستوں میں

احمدیوں کے ناموں کا اندراج نہیں ہونا چاہئے مطالبہ کیا گیا کہ احمدیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے اور اگر حکومت انہیں خصوصی نمائندگی دینے کا ارادہ رکھتی ہے تو جداگانہ طرزِ انتخاب کے تحت دیگر غیر مسلم اقلیتوں کی طرح احمدیوں کے لئے علیحدہ انتخابی فہرستیں تیار کی جائیں۔ بایں ہمہ احمدی مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے تھے اور انہیں اصرار تھا کہ انہیں مسلمان قرار دیکر ان کے نام مسلم انتخابی فہرستوں میں درج کئے جائیں' اس تنازعے پر شدید فسادات شروع ہو گئے۔ بہت سی جانوں کے اتلاف کے بعد لاہور میں مارشل لاء نافذ کر دیا گیا۔ مخلوط طرزِ انتخاب میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان کوئی امتیاز روا نہیں رکھا گیا تھا۔ اور کسی اقلیت کے لئے مخصوص نشستوں کی گنجائش نہیں تھی چنانچہ ایک خطرناک مذہبی مناقشہ خود بخود طے ہو گیا۔

صدر سکندر مرزا کو مخلوط انتخابات کے بارے میں میرے نقطۂ نگاہ سے مکمل اتفاق تھا اور میرے علم کے مطابق کمانڈر انچیف ایوب خان بھی مخلوط انتخابات کے حامی تھے' انتخابی فہرستیں مخلوط انتخابات کے لحاظ سے ہی تیار کی گئیں تاہم 18 اکتوبر 1957ء کو وزیر اعظم مقرر ہوتے ہی چندریگر نے حکم دیا کہ انتخابی فہرستوں کو جداگانہ انتخاب کی ضروریات کے مطابق فرقہ وارانہ بنیادوں پر الگ الگ کر دیا جائے۔ انہوں نے اعلان کیا کہ وہ ایک مقررہ تاریخ تک جداگانہ طرزِ انتخاب کے لئے آئین میں متعلقہ ترمیم کروائیں گے یا استعفیٰ دے دیں گے۔[15] ابتداء میں ری پبلکن پارٹی نے مخلوط انتخابات کے حق میں میرے نقطۂ نگاہ کی حمایت کی' تاہم صدر سکندر مرزا جداگانہ انتخاب کے لئے چندریگر کے مطالبے کی تائید کرنے لگے اور بعض روایات کے مطابق انہوں نے ری پبلکن پارٹی کی تاریں ہلا دیں کہ مسلم لیگی وزیر اعظم کی حمایت کی جائے تاہم مسلم لیگ اس پر قناعت کرنے کو تیار نہیں تھی اور اس نے مغربی پاکستان میں ری پبلکن کی صوبائی وزارت میں نقب لگانے کی کوشش کی۔

مرکز میں مسلم لیگ اور ری پبلکن پارٹی کے درمیان جو معاہدہ ہوا تھا صوبے کی سطح پر اس کا اعادہ نہ ہو سکا۔ ری پبلکن پارٹی نے بحران سے نپٹنے کے لئے تجویز پیش کی کہ وہ مشرقی پاکستان میں طریقِ انتخاب کے ضمن میں رائے عامہ اور عوام کے مفادات کا جائزہ لینے کے لئے ایک تحقیقی کمیٹی مشرقی پاکستان روانہ کرے گی چندریگر نے استعفیٰ دینے کی موعودہ تاریخ کو ملتوی کر دیا ری پبلکن پارٹی کی تحقیقی کمیٹی کے دورے کے دوران مشرقی پاکستان میں فریقین نے زبردست مظاہرے کئے اور طریق انتخاب کے بارے میں مختلف نقطۂ منظر کے حامل گروہوں میں چھوٹے موٹے تصادم بھی ہوئے بالا آخر ری پبلکن پارٹی نے مخلوط طرزِ انتخاب کے حق میں فیصلہ دے دیا اور چندریگر کی حمایت کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ قیاس کرنا غلط نہیں ہو گا کہ اگرچہ یہ فیصلہ میرے حق میں جاتا تھا لیکن ری پبلکن پارٹی نے یہ فیصلہ اپنے مفادات کے پیشِ نظر کیا تھا۔ چندریگر نے 11 دسمبر 1957ء کو استعفیٰ دے دیا۔

صدر سکندر مرزا نے چندریگر کا استعفیٰ منظور کر کے اس امید پر انہیں پھر وزارت تشکیل دینے کی دعوت دے دی کہ وہ ری پبلکن پارٹی میں جوڑ توڑ کر کے چندریگر کے لئے مطلوبہ حمایت حاصل کر لے

میں کامیاب ہو جائیں گے'سکندر مرزا مسلم لیگ کی حمایت میں ری پبلکن پارٹی کو تحلیل کرنے پر بھی تیار تھے۔ چونکہ ری پبلکن پارٹی نے مخلوط انتخابات کی حمایت کی تھی لہٰذا میں نے اسے یقین دلایا کہ میں اور میرے ارکان اس کی حمایت کریں گے اگرچہ میں خود یا میری جماعت کا کوئی رکن وزارت قبول نہیں کرے گا۔

صدر سکندر مرزا سر توڑ کوشش کے باوجود ری پبلکن پارٹی کا کوئی رکن توڑنے میں کامیاب نہ ہو سکے عوامی لیگ اور ری پبلکن پارٹی بڑی استقامت سے اپنے نقطۂ نظر پر قائم رہیں چندریگر ایوان میں اکثریت کا اعتماد رکھنے والی وزارت تشکیل دینے میں ناکام ہو گئے اور انہیں دوبارہ مستعفی ہونا پڑا ری پبلکن پارٹی اور عوامی لیگ نے ملک فیروز خان نون کو اپنا قائد نامزد کیا تھا چنانچہ انہیں وزیر اعظم منتخب کیا گیا چندریگر کے من مانے فیصلے کے نتیجے میں انتخابی فہرستیں رد کر دی گئیں تھیں لہٰذا انہیں پھر سے تیار کرنا پڑا مجھے امید تھی کہ عام انتخابات مارچ 1957ء تک منعقد ہوں گے لیکن محولہ بالا حالات میں یہ امید نقش بر آب ثابت ہوئی۔ پھر الیکشن کمیشن نے مارچ 1958ء کی تاریخ دی لیکن نئی انتخابی فہرستوں کی تیاری کے باعث انتخابات ایک بار پھر ملتوی کرنا پڑے'یہ صورتِ حال ان عناصر کو نہایت مرغوب تھی جو عام انتخابات سے بچنا چاہتے تھے بالآخر الیکشن کمیشن نے فروری مارچ 1959ء میں عام انتخابات کے انعقاد کے لئے تمام انتظامات مکمل کر لئے۔

سیاست میں مذہب کی دراندازی

سیاسی جماعتوں نے انتخابی حلقوں سے رجوع کرنے کے لئے لنگر اٹھا لئے۔ خان عبدالقیوم خان مسلم لیگ کی قیادت کر رہے تھے اور اس جماعت کے پیشِ نظر صرف ایک مقصد تھا یعنی حصولِ اقتدار۔ مسلم لیگ نے اعلان کیا کہ اگر مرکز اور مغربی پاکستان صوبائی اسمبلی میں اسے کامیابی نہ ملی تو خون کے دریا بہا دیئے جائیں گے۔ 1956ء کے آئین میں پاکستان کو اسلامی جمہوریہ پاکستان کا نام دیا گیا تھا'آئین میں متعدد مقامات پر قرآن اور سنت کا حوالہ دیا گیا اور کہا گیا تھا کہ اسلامی قانون کے ان دو سر چشموں کے منافی کوئی قانون منظور نہیں کیا جائے گا اور پہلے سے منظور شدہ قوانین کو قرآن و سنت کے سانچے میں ڈھالا جائے گا اس کے باوجود مسلم لیگ نے مغربی پاکستان کے مسلمانوں کی سستی حمایت حاصل کرنے کی غرض سے مذہبی انتہاپسندی اور اسلام کا نام استعمال کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا مسلم لیگ کی انتخابی مہم اس قدر دھواں دھار اور متشدد رنگ لئے ہوئے تھی کہ دوسری غیر انتہاپسند جماعتوں کے لئے پرامن طریقے سے اپنے جلسے منعقد کرنا مشکل ہو گیا'مرکزی حکومت نے تشدد کی ان دھمکیوں کے ردِ عمل میں کوئی قدم نہ اٹھایا اور ہاتھ پر ہاتھ دھرے تماشا دیکھتی رہی۔

ری پبلکن پارٹی کا بنیادی ہدف یہ تھا کہ مسلم لیگ کی مزاحمت کی جائے اور ایسی جماعتوں کو اقتدار میں آنے سے روکا جائے جو زرعی اصلاحات کے نفاذ اور جاگیرداروں کی مراعات یافتہ حیثیت پر ضرب لگانے کا

ارادہ رکھتی ہوں۔ مشرقی پاکستان میں زرعی اصلاحات کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ فی الحقیقت مشرقی پاکستان کے قوانینِ اراضی میں ایسی تبدیلیوں کی ضرورت تھی جن سے متوسط طبقے کو بالکل ختم ہونے سے بچایا جاسکے۔ تاہم مغربی پاکستان میں جاگیردار طبقہ خاصا طاقتور تھا چنانچہ زرعی اصلاحات کا مطالبہ زور پکڑتا جارہا تھا۔ ری پبلکن پارٹی میں دقیانوسی خیالات کے حامل جاگیرداروں کی اکثریت تھی اور وہ اصلاحات کے اٹھتے ہوئے طوفان کے آگے بند باندھنے کے لئے مضطرب تھے۔ مغربی پاکستان میں ری پبلکن پارٹی کی کامیابی کو یقینی بنانے کے لئے سرکاری ملازمین کے تبادلے کیے گئے حتیٰ کہ سکولوں کے عملے، پٹواریوں اور محکمہ آبپاشی کے ملازمین کے بھی تبادلے کردیئے گئے۔ ان لوگوں کو کسانوں میں بڑے اثرورسوخ کا حامل سمجھا جاتا تھا۔ معاملہ اتنا بڑھا کہ مجھے صدر سکندر مرزا سے اس دھاندلی کو رکوانے کی درخواست کرنا پڑی۔ میں نے انہیں خبردار کیا کہ قوم قیامِ پاکستان کے بعد سے ان انتخابات کا انتظار کررہی ہے اور آئندہ تعمیر و ترقی کی تمام امیدیں ان انتخابات سے وابستہ ہیں۔ میں نے پیش گوئی کی کہ اگر انتخابات آزادانہ اور منصفانہ نہ ہوئے تو ملک میں زبردست طوفان اٹھ کھڑا ہوگا اور فوجی انقلاب کے علاوہ بحران پر قابو پانے کا کوئی راستہ باقی نہیں رہے گا۔ جماعت اپنے خود ساختہ تصورات پر مبنی اسلامی آئین کے حق میں بھرپور مہم چلا رہی تھی۔ اس کے بانی مولانا مودودی یہ ثابت کرنے کی کوشش کررہے تھے کہ جمہوریت اور فلاحی ریاست کے تمام جدید تصوّرات اسلامی تصورِ ریاست میں سموئے جاسکتے ہیں۔ ان کا المیہ یہ تھا کہ انہوں نے تصورِ پاکستان کی مخالفت کی تھی اور یہ اعلان کیا تھا کہ جنگِ کشمیر کو جہاد قرار نہیں دیا جاسکتا۔ (یہ سوال اپنی جگہ قائم ہے کہ تنازعۂ کشمیر کو کس حد تک جنگ قرار دیا جاسکتا تھا) اس کے علاوہ ان کی اپنی تنظیم پر بھی الزام عائد کیا جاتا تھا کہ اسے فسطائی خطوط پر استوار کیا گیا ہے چنانچہ ایک منظم جماعت ہونے کے باوجود جماعتِ اسلامی کی مقبولیت ایک انتہا پسند حلقے تک محدود تھی۔ اگر صدر ایوب نے اپنے دورِ اقتدار میں جماعتِ اسلامی کے خلاف ظالمانہ حربے استعمال نہ کئے ہوتے تو اس جماعت کی مزید مقبولیت کے امکانات ختم ہوچکے ہوتے۔ اس زمانے میں جماعت میں ایک داخلی پھوٹ کو ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ اس بحران سے جماعت کی شہرت کو نقصان پہنچا تھا۔ جماعت کو دعویٰ تھا کہ اس کے ارکان نیک، خداترس اور صالح لوگ ہیں جبکہ غیر از جماعت افراد ان خوبیوں سے تہی ہیں نیز یہ کہ جس شخص کو امیرِ جماعت اسلامی ایک کامیاب امیدوار سمجھ کر جماعت میں لے لیں وہ یکایک ان خوبیوں سے متصف ہوجاتا ہے۔ ان دعووں پر خاصی تنقید کی جاتی تھی اور یہ تنقید کچھ بے جواز بھی نہیں تھی۔ جماعت کے پرکشش اسلامی نعروں کے باوجود جو لوگ سیاست کو مذہب کے تابع کرنے کے مخالف ہیں وہ جماعت اسلامی کے بھرے میں نہیں آسکتے۔ سیاست کو مذہب سے الگ رکھنے کی وجہ یہ نہیں کہ مذہب میں داخلی تضادات پائے جاتے ہیں بلکہ یہ حقیقت ہے کہ مذہب کی مختلف تعبیرات کی جاسکتی ہیں۔

اسلام میں متعدد مسالک اور فرقے پائے جاتے ہیں۔ سنی، شیعہ اور اہلِ حدیث بڑے بڑے فرقوں میں شمار کئے جاتے ہیں ایک ہی فرقے میں مختلف مکتبہ ہائے فکر بھی پائے جاتے تھے۔ مثلاً بریلوی یا دیو

بندی۔ قادیانیوں نے معاملات کو اور بھی پیچیدہ کر دیا کیونکہ انہیں دعویٰ تھا کہ صرف وہی صحیح مسلمان ہیں جبکہ دیگر مسلمان سرے سے انہیں مسلمان تسلیم نہیں کرتے تھے بلکہ مرتد قرار دیتے تھے ہر فرقہ اور مسلک سختی سے اپنے عقائد پر کار بند تھا اور خاص طور پر مغربی پاکستان کی فضا اکثر خون ریز فسادات سے مکدّر رہتی تھی۔ چنانچہ مسئلہ یہ تھا کہ کس فرقے کی تعبیر کو حقیقی اسلام قرار دیا جائے۔ اگر اکثریتی فرقے یعنی سنّیوں یا حنفیوں کے عقائد کو قبول کرنا ہو تو کس مکتبِ فکر کی تعبیرات قبول کی جائیں، یہ سوال بھی پیدا ہوتا تھا کہ دوسرے فرقے کے عقائد کو کس بنا کر رد کیا جائے کیوں کہ وہ لوگ بھی اپنے عقائد پر سمجھوتہ کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ سیاست میں افہام و تفہیم کا تصوّر پایا جاتا ہے لیکن مذہب میں عقائد کی بنا پر سمجھوتے کے بارے میں سوچا بھی نہیں جاسکتا بہت سے لوگوں کا خیال تھا کہ سیاست میں مذہب پر ضرورت سے زیادہ زور دینا خطرناک ہو گا کیونکہ وقت کے ساتھ ساتھ نئے ثقافتی، سماجی، سیاسی اور معاشی حالات پیدا ہو چکے ہیں اور ان معاملات کے بارے میں مذہب سے رہنمائی محض تاویل آرائی ہو گی اور تاویلات میں اختلافِ رائے کے امکان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

مغربی پاکستان میں ون یونٹ کی تنسیخ میں ناکامی کے بعد نیپ کا زور ختم ہو چکا تھا۔ اس کے بہت سے ارکان اپنے حلقوں میں خاصے با اثر تھے لیکن یہ لوگ منظّم نہیں تھے۔ نیشنل عوامی پارٹی نے اپنے انتخابی منشور کا اعلان بھی نہیں کیا تھا۔

عوامی لیگ نے مخلوط طرزِ انتخاب کی بنیاد پر پاکستانی قومیت کا غیر فرقہ وارانہ تصوّر پیش کیا، عوامی لیگ نے صاف ستھری سیاست اور مغربی پاکستان میں خاصی کڑی نوعیت کی زرعی اصلاحات کی تجویز پیش کی، میں نے دونوں کے حصول کے لئے اسلام کے استعمال پر شدید اعتراض کیا۔ میرے خیال میں انتخابی مہم کی بنیاد انتہاپسندانہ مذہبیت کی بجائے منطق، استدلال اور پختہ سیاسی شعور پر ہونی چاہئے۔ میرے خیال میں اسلام کے نام پر عوام سے مخاطب ہونے والی جماعتوں کا مقصد عوام کے جذبات کا استحصال ہوتا ہے۔ اگر ان جماعتوں کو عوام کے ووٹ مل سکیں تو انہیں اس امر کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی کہ ان کی سیاست سے غیر مسلموں اور اقلیتوں میں احساسِ عدم تحفّظ پیدا ہوتا ہے یا یہ کہ مذہبی اور فرقہ وارانہ تعصّبات سے بھرپور سیاسی نعروں سے ملک کے امن و امان کو خطرات لاحق ہوتے ہیں۔

میرے خیال میں اسلام کو سیاسی اختلافات سے ماوراء ہونا چاہئے اور اسے مختلف سیاسی جماعتوں سے تعلق سے قطعِ نظر تمام مسلمانوں کے ایک باہمی تعلق کی بنیاد سمجھنا چاہئے۔ اس امر میں کوئی شک نہیں کہ ایک ایسے ملک میں جہاں مسلمان بھاری اکثریت میں پائے جائیں، قرآن و سنت پر مبنی اسلام کے اصولوں مثلاً انصاف، صداقت، رواداری وسیع تر معنوں میں سخاوت اور سماجی فلاح و بہبود سے انحراف ممکن نہیں۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق ہر حکمران کا فرض ہے کہ اپنے شہریوں کو خوراک، رہائش، لباس، تعلیم اور طبّی سہولتوں کے علاوہ دیانتداری سے روزی کمانے کے ذرائع مہیّا کرے۔ سماجی بہبود کو اسلامی تصوّرات میں بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اسلامی تصوّرِ ریاست انہیں اصولوں سے ترتیب پاتا ہے اور ان پر

زور دینا محض زبانی نعروں اور خطیبانہ گھن گرج سے کہیں زیادہ با معنی اور باجواز ہے۔ یہ وہ منشور ہے جس پر اسلامی مملکت کے غیر مسلم شہریوں کو بھی اعتراض نہیں ہو سکتا۔ دوسری طرف اسلام کے کھوکھلے نعروں سے ہندو بالخصوص مشرقی پاکستان کے ہندو خائف ہو جاتے ہیں۔ دوسری طرف پاکستان میں اسلام کے شدت پسند نقطہ نظر کے فروغ اور ہندوؤں سے مفتوح رعایا جیسے سلوک سے ہندوستان کے انتہا پسند ہندوؤں کو رام راج کا جواز میسّر آجاتا ہے اور وہ جوشِ انتقام میں ہندوستان کے مسلمانوں کو دوسرے درجے کا شہری بنانے پر تل جاتے ہیں۔

ری پبلکن پارٹی کے لئے عوامی لیگ کی حمایت

اب تک میں ملک فیروز خان نون کی حکومت کی حمایت کر رہا تھا لیکن میں نے اپنی جماعت کے ارکان کو وزارت میں شمولیت کی اجازت نہیں دی تھی۔ میرے لئے ناقابلِ فہم اسباب پر ملک فیروز خان نون کا اصرار بڑھتا گیا کہ عوامی لیگ وزارت میں شامل ہو جائے میں نے انہیں خبردار کیا کہ ایسی صورت میں ان کی وزارتِ عظمیٰ خطرے میں پڑ جائے گی۔ لہٰذا وہ عوامی لیگ کی پارلیمانی حمایت پر قناعت کریں، میں نے انہیں بتایا کہ اہم محکموں کے علاوہ عوامی لیگ کے ارکان وزارت قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوں گے کیونکہ اگر مشرقی پاکستان کے وزراء کو غیر اہم محکمے دیئے گئے تو مشرقی پاکستان کے عوام اپنی اہانت محسوس کریں گے۔ دوسری طرف ری پبلکن پارٹی کے وزراء پر کلیدی وزارتوں سے علیحدگی گراں گزرے گی۔ ملک فیروز خان نون نے وعدہ کیا کہ محکموں کو منصفانہ طریقے سے تقسیم کیا جائے گا۔ اور مجھ سے یہ منوانے میں کامیاب ہو گئے کہ عوامی لیگ کے ارکان کو کابینہ میں شمولیت کی اجازت دے دی جائے گی۔ میری توقعات کے عین مطابق ری پبلکن وزراء نے کلیدی محکموں کے قلمدان چھوڑنے سے انکار کر دیا اور ملک فیروز خان نون عوامی لیگ کے وزراء کو غیر اہم محکموں کے قلمدان سونپنے پر مجبور ہو گئے۔

صدر سکندر مرزا ایک طرف تو کابینہ کو برطرف کر کے مارشل لاء نافذ کرنے کی منصوبہ بندی کر رہے تھے۔ دوسری طرف مجھ سے اصرار کر رہے تھے کہ عوامی لیگ کے ارکان کو کابینہ میں شمولیت کی اجازت دے دوں۔ ادھر فوجی انقلاب کی غرض سے فوجی دستے دارالحکومت میں جمع کئے جا رہے تھے۔ میری جماعت کے وزراء نے محسوس کیا کہ وزیر اعظم نے ان کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی ہے۔ چنانچہ وہ عہدے سنبھالنے سے پہلے ہی مستعفی ہو گئے۔ تاہم عوامی لیگ نے ملک فیروز خان نون کی وزارت کے لئے اپنی حمایت واپس نہ لی۔ صدر سکندر مرزا اور فوج کے سربراہ جنرل ایوب خان کو آئین کی معطلی اور مارشل لاء کے نفاذ جیسے انتہائی اقدامات کے لئے ٹھوس وجوہات کی اس قدر شدت سے ضرورت محسوس ہو رہی تھی کہ انہوں نے اپنے اقدامات کا جواز پیش کرتے ہوئے عوامی لیگ کے وزراء کے استعفوں کا بھی حوالہ دیا۔

سکندر کی سیاست کا گورکھ دھندا

مشرقی پاکستان کی صوبائی اسمبلی کی عمارت میں ایک شرمناک واقعہ پیش آیا۔ چند ارکان نے ڈپٹی

سپیکر پر کرسیوں اور دیگر آلات سے حملہ کر دیا' انہیں شدید زخمی حالت میں ایوان سے باہر لے جایا گیا لیکن وہ اندرونی زخموں سے ہونے والے جریانِ خون کے باعث جانبر نہ ہو سکے۔ میجر جنرل سکندر مرزا نے 1955ء میں فضل الحق کو مرکزی وزیرِ داخلہ بنا کر ان کی جماعت کرشک سرامک پارٹی کو اپنی آغوش میں لے لیا تھا۔ وہ کرشک سرامک پارٹی کے ارکان سے خفیہ ملاقاتیں کرتے' ان کی ناز برداریاں کرتے اور اس جماعت کو اپنے مفادات کے لئے استعمال کرتے۔ میرے بحیثیتِ وزیر اعظم مرکز میں اقتدار سنبھالنے سے قبل مشرقی پاکستان میں فضل الحق کے نامزد کردہ ابو الحسین سرکار وزیرِ اعلیٰ تھے اور کرشک سرامک پارٹی صوبے کے سیاہ و سفید کی مالک تھی۔ ابو الحسین سرکاری ایوان کا سامنا کر کے بجٹ پاس کروانے سے قاصر رہے تھے۔ چنانچہ انہوں نے استعفیٰ دے دیا۔ میرے برسرِ اقتدار آنے سے چند روز قبل عوامی لیگ کے عطاالرحمٰن خان کو وزیرِ اعلیٰ مقرّر کیا گیا تھا۔ سکندر مرزا نے سیاست کا ایسا گورکھ دھندہ پھیلایا تھا کہ مغربی پاکستان میں ان کی پروردہ جماعت ری پبلکن پارٹی مرکزی اسمبلی میں میری حمایت کر رہی تھی۔ جبکہ مشرقی پاکستان میں ان کی لے پالک جماعت کرشک سرامک پارٹی مرکز میں میری مخالفت کر رہی تھی اور مشرقی پاکستان کی صوبائی مجلسِ قانون ساز میں یہ جماعت عوامی لیگ کی وزارت کے مقابلے میں حزبِ اختلاف کا کردار ادا کر رہی تھی۔ جب محولہ بالا واقعہ پیش آیا اس وقت سکندر مرزا ملک فیروز خان نون سے پیچھا چھڑانے کی فکر میں تھے اور اس سلسلے میں مشرقی پاکستان میں کوئی ناگہانی واقعہ ان کی مشکل آسان کر سکتا تھا۔ ڈپٹی سپیکر پر حملے سے ایک روز قبل عطاالرحمٰن کی حکومت نے صوبائی اسمبلی کے سپیکر پر جانبداری اور غیر ذمہ دارانہ رویّے کا الزام عائد کیا۔ سپیکر کا تعلق کرشک سرامک پارٹی سے تھا۔ اسمبلی میں خاصا ہنگامہ ہوا اور سپیکر کو اپنی جان بچا کر بھاگنا پڑا۔ حکومت کے حامی ارکان نے اصرار کیا کہ سپیکر کو دوبارہ اپنی نشست سنبھالنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ اگلے روز سپیکر اسمبلی میں پہنچ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ اور انہوں نے ایوان میں داخل ہونے کی کوئی کوشش نہ کی' ان کی جگہ ڈپٹی سپیکر نے اجلاس کی صدارت کی۔

صوبائی حکومت کو اطلاع ملی تھی کہ گزشتہ شام کرشک سرامک پارٹی کے ارکان نے ایک اجلاس میں فیصلہ کیا تھا کہ اگر ڈپٹی سپیکر نے اسمبلی کے اجلاس کی صدارت کرنا چاہی تو انہیں کسی قیمت پر اس کی اجازت نہیں دی جائے گی بلکہ انہیں مار پیٹ کر بھگا دیا جائے گا۔ بظاہر حکومت کو یہ فیصلہ کرنا تھا کہ یا استعفیٰ دے دیا جائے یا اس چیلنج کا مقابلہ کیا جائے' ایک اور متبادل یہ تھا کہ صدر گورنر کو ہدایت کریں کہ وہ آئین کی دفعہ 193 کے تحت صوبے کا اقتدار سنبھال لیں اور صدر کے نمائندے کے طور پر حکومت چلائیں۔

میں اس روز ڈھاکہ میں تھا' میں نے کراچی فون کر کے صدر سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا اگرچہ کرشک سرامک پارٹی کے رہنما با آسانی صدر سے شرفِ رابطہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے تھے میں نے وزیر اعظم سے بات کی وہ بھی کراچی میں تھے۔ وزیر اعظم نے بتایا کہ دفعہ 193 کے نفاذ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اور یہ کہ ہمیں ہنگامے اور تشدد کے چیلنج کا سامنا کرنا چاہئے ورنہ مہذّب اور

جمہوری حکومت کا مستقبل تاریک ہو جائے گا۔ صوبائی وزیر نے پولیس کو حکم دیا کہ انسپکٹر جنرل پولیس کی نگرانی میں اسمبلی کے باہر موجود رہے اور تشدد کا اشارہ پاتے ہی اسمبلی میں گھس جائے۔ دوسری طرف وزیر اعلیٰ نے اپنے ارکان کو خبردار کیا کہ وہ مکمل خاموشی کا مظاہرہ کریں اور تشدد کا جواب تشدد سے دینے کی کوشش نہ کریں تاکہ ان پر ایوان میں ہنگامہ آرائی کرنے کا الزام عائد نہ کیا جاسکے۔ تاہم ڈپٹی سپیکر نے جیسے ہی ایوان میں داخل ہونے کی کوشش کی حزبِ اختلاف کے ارکان نے ان پر کرسیاں پھینکنا شروع کر دیں۔ کرسیوں کے علاوہ بھی جس شے پر ان کا ہاتھ پڑا اٹھا کر دے ماری گئی۔ بدقسمتی سے ڈپٹی سپیکر کے محافظ انہیں بچانے کی بجائے ایک طرف ہو گئے اور ڈپٹی سپیکر کرسیوں کی زد میں اکیلے رہ گئے۔ عام حالات میں حزبِ اقتدار کے ارکان نے آگے بڑھ کر حزبِ اختلاف کو حملے سے روکا ہوتا لیکن وہ اطمینان سے بیٹھے ہر لحہ پولیس کے اندر داخل ہونے کا انتظار کرتے رہے۔ پولیس منصوبے کے مطابق بروقت اندر داخل نہ ہو سکی۔ چند لمحوں کی تاخیر کے بعد جب پولیس ایوان میں پہنچی تو ڈپٹی سپیکر مہلک طور پر زخمی ہو چکے تھے۔ یہ ایک افسوس ناک حادثہ تھا کیونکہ ڈپٹی سپیکر زخموں کی تاب نہ لا کر خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

اس امر سے قطعِ نظر کہ صدر سکندر مرزا اس صورتِ حال سے مکمل آگاہی رکھتے تھے یا نہیں' افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اگر حزبِ اختلاف کو صدر کی پشت پناہی کا یقین نہ ہوتا تو کرشک سرامک پارٹی کے ارکان نے کبھی اس قدر بے دھڑک اور بے خوف ہو کر یہ ظالمانہ اور وحشیانہ قدم نہ اٹھایا ہوتا۔ کہا جاتا ہے کہ صدر دانستہ طور پر مشرقی پاکستان میں کوئی ایسی ناگہانی صورت حال پیدا کرنا چاہتے تھے جس کی آڑ لیکر آئین منسوخ کیا جاسکے کیونکہ وہ یہ قدم اٹھانے کا فیصلہ پہلے ہی کر چکے تھے اور اس ضمن میں تمام انتظامات بھی مکمل ہو چکے تھے۔

انقلاب اکتوبر

فروری مارچ 1959ء میں عام انتخابات کے انعقاد کے پیشِ نظر میں نے ملک کے دونوں حصوں میں انتخابی دوروں اور جلسوں کا تفصیلی پروگرام تیار کر لیا تھا۔ ان دوروں کو اکتوبر 1958ء میں شروع ہو کر پانچ ماہ تک جاری رہنا تھا۔ میں دو جلسے کر چکا تھا۔ پہلا جلسہ کوئٹہ میں ان دنوں میں ہوا جب ملک فیروز خان نون کے احکامات پر خان آف قلات کو حراست میں لیا گیا تھا اور دوسرا جلسہ جیکب آباد میں منعقد ہوا۔ یہ دونوں جلسے میری توقعات سے بڑھ کر کامیاب رہے تھے۔ اسی اثناء میں خبر پہنچی کہ آئین منسوخ کر دیا گیا ہے اور صدر نے ملک کا اختیار سنبھال لیا ہے، کابینہ برطرف کر دی گئی ہے، اسمبلی برخاست کر دی گئی ہے اور مارشل لاء نافذ کر دیا گیا ہے۔

7 اکتوبر 1958ء کو صدر سکندر مرزا نے ایک فرمان جاری کیا جس میں ان انتہائی اقدامات کا جواز پیش کرتے ہوئے ملک کو درپیش مسائل گنوائے گئے تھے اس اعلان میں شامل کئی سیاسی خرابیاں ایسی تھیں

جن کا ذکر میں نے بھی اپنی تقاریر میں کیا تھا۔ لیکن ان بیماریوں کا علاج یہ ہرگز نہیں تھا کہ جمہوریت کا مکمل طور پر گلا گھونٹ دیا جائے۔ فی الحقیقت ان مسائل کا حل یہ تھا کہ دستور اور قانون کے اندر رہتے ہوئے حقیقی اور آزاد جمہوریت کو قائم ہونے دیا جائے۔ سیاستدانوں' سیاسی جماعتوں اور خود سیاست کو ایک ہی سانس میں پاکستان کے تمام مسائل کا ذمّہ دار ٹھہراتے ہوئے اعلان کیا گیا کہ پاکستان میں جمہوریت ناکام ہو چکی ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ پاکستان میں جمہوریت کو کبھی کام کرنے کا موقعہ ہی نہیں دیا گیا۔

قیامِ پاکستان کے بعد سے ایک بار بھی پارلیمینٹ کے لئے عام انتخابات منعقد نہیں ہوئے تھے۔ ملک میں ایک بار بھی ایسی حکومت قائم نہ ہو سکی جسے عوام کے نمائندوں کا اعتماد حاصل ہوتا اور جو مؤثر طور پر سربراہِ مملکت یا فوج کی طرف سے کسی غیر آئینی مداخلت کا مقابلہ کرنے کی سکت رکھتی۔

صدر سکندر مرزا نے ایک پریس کانفرنس منعقد کی جس میں چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل ایوب خان بھی شریک ہوئے'صدر نے شیخی بگھارتے ہوئے انقلاب کے لئے منصوبہ بندی کی تفاصیل بیان کیں اور کہا کہ اس سلسلے میں ضروری فوجی نقل و حرکت تین ہفتوں سے جاری تھی۔ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے کہا "فوجی انقلاب کے لئے منصوبہ بندی کچھ عرصہ پہلے مکمل ہو چکی تھی لیکن اسے عملی جامہ پہنانے کے وقت کا تعین صدر کو کرنا تھا"۔

فوجی بغاوت کا جواز پیش کرنے کے بعد (بغاوت کو انقلاب کا نام دیا جا رہا تھا) صدر سکندر مرزا نے اعلان کیا کہ وہ مارشل لاء کو غیر ضروری طور پر طول دینے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے اور جتنی جلدی ممکن ہوا جمہوریت بحال کر دیں گے۔ البتہ جمہوریت پر کچھ موزوں پابندیاں عائد کی جائیں گی۔ مزید یہ کہ وہ قابلِ اعتماد سیاستدانوں سے رابطہ رکھیں گے۔

بعد ازاں باوثوق ذرائع سے پتہ لگا کہ سکندر مرزا نے بغاوت کا یہ کھیل مرکز میں ملک فیروز خان نون کی چھٹی کرانے کے لئے رچایا تھا۔ صدر ان کی جگہ نواب مظفر علی قزلباش کو وزیرِ اعظم بنانا چاہتے تھے'نواب قزلباش اس وقت مغربی پاکستان کے وزیرِ اعلیٰ تھے اور ری پبلکن پارٹی سے تعلق رکھتے تھے۔ میری وزارتِ عظمیٰ کے دوران بھی صدر اس شخص کو نائب وزیرِ اعظم مقرر کرنا چاہتے تھے۔ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے فوراً صدر کی تردید کی اور صدر کی موجودگی میں زور دیکر اعلان کیا کہ سیاستدانوں سے کوئی تعلق نہیں رکھا جائے گا نیز یہ کہ مارشل لاء حکام "گندگی کے مکمل خاتمے تک" بحالیٔ جمہوریت کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔ نقطۂ نظر کا یہ اختلاف دونوں پریس کانفرنسوں میں منظرِ عام پر آیا۔ حتیٰ کے یہ بات بالکل واضح ہو گئی کہ دونوں کے راستے جدا ہونے میں زیادہ وقت نہیں لگے گا۔

ایک اور انقلاب اکتوبر

انقلاب کے دونوں قائدین کے باہمی داؤ پیچ کے بارے میں وثوق سے کچھ کہنا ممکن نہیں۔ تاہم افواہوں کے مطابق' اور بعض خاصے ٹھوس شواہد سے ان افواہوں کی تصدیق ہوتی ہے۔ صدر' چیف

مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر کا کانٹا نکالنے کی فکر میں تھے۔ انہوں نے فضائیہ کے ایک افسر کے ذریعے، جسے بعد ازاں ترقّی دی گئی، فوج کے نئے سربراہ، جنرل موسیٰ سے رابطہ قائم کیا اور انہیں اس ضمن میں ضروری اقدامات کرنے کی ہدایت کی۔[17] صدر سکندر مرزا کی بدقسمتی یہ تھی کہ وہ جو کچھ کرنا چاہتے تھے وہ ان کے قریبی عملے کے بھی علم میں تھا اور چیف مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر کو ان تمام حالات وواقعات سے خفیہ طور پر مطلع رکھا جا رہا تھا۔ ان حالات میں صدر سکندر مرزا چیف مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر پر مؤثر وار کرنے سے قاصر تھے۔
27 اکتوبر 1958ء کو چیف مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر نے ڈرامائی طور پر اپنے چار سینئر ترین جرنیلوں کو صدر سے فوری طور پر استعفیٰ طلب کرنے بھیجا۔ ان جرنیلوں نے پستول تان رکھے تھے۔[18] صدر اور ان کی اہلیہ کو گرفتار کر کے کوئٹہ روانہ کر دیا گیا۔ بعد ازاں خاصی سبکی کے بعد انہیں لندن بھیج دیا گیا۔ جنرل محمد ایوب خان نے چیف مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر کے علاوہ صدر کا عہدہ بھی سنبھال لیا۔ سابق صدر سکندر مرزا کو سابق صدر یا گورنر جنرل کے لئے منظور شدہ مشاہرے (دو ہزار روپیہ ماہانہ) کے علاوہ سابق فوجی افسر کے طور پر بھی پنشن ملنے لگی۔ کہا جاتا ہے کہ امریکی سفیر لانگلے کی مداخلت پر سکندر مرزا کے خلاف انتہائی قدم اٹھانے سے گریز کیا گیا۔ سفیر موصوف سکندر مرزا سے قریبی ارتباط رکھتے تھے۔

چنانچہ 27 اکتوبر سے ایک اور "شاندار" انقلاب اکتوبر کا آغاز ہوا۔

اصلاحات کی برکھا اور جمہوریت کے سوکھے دھان

انقلاب سے کچھ ایسی تبدیلیوں کا آغاز ہوا جو اس قابل بھی نہیں ہیں کہ ان کا ذکر کیا جائے کیونکہ ان سے پاکستان میں جمہوریت کی تاریخ پر کوئی اثرات مرتب نہ ہو سکے سوائے صدر ایوب کے اس بیان کے جس میں انہوں نے کہا تھا کہ وہ ملک میں ایسی جمہوریت نافذ کریں گے جسے عوام سمجھ سکیں اور جو "قوم کی نفسیات سے لگا کھاتی ہو" صدر نے اعتراف کیا کہ وہ ملک وقوم کو درپیش مشکلات سے نابلد ہیں اور مختلف مسائل پر مشاورت کی غرض سے ان گنت کمیٹیاں اور کمیشن قائم کر دیئے۔ مختلف کمیشنوں کی اس ارزانی سے کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہو سکا۔

انتظامیہ کی استعدادِ کار میں اضافے کی غرض سے ایک اہم تبدیلی یہ کی گئی کہ اسسٹنٹ سیکرٹریوں کی بجائے سیکشن افسروں کا نیا نظام متعارف کروایا گیا۔ اس سے انتظامیہ کے اخراجات میں توقع کے مطابق کمی واقع ہوئی اور نہ مستعدی میں اضافہ ہو سکا۔ البتہ اس سے افراتفری میں ضرور اضافہ ہوا۔ فائلوں کا سراغ لگانا دشوار ہو گیا اور کئی دستاویزات سرے سے گم ہو گئیں۔ تعلیمی کمیشن نے ایک رپورٹ تیار کی جس میں خوشحال ممالک کے ترقّی یافتہ تعلیمی نظاموں کو اناپ شناپ طریقے سے سمو دیا گیا تھا۔ صدر نے بڑے جوش وخروش سے تعلیمی کمیشن کی رپورٹ کی تائید کی تاہم طلباء، اساتذہ اور والدین نے مجوّزہ نظامِ تعلیم کا ایسا سواگت کیا کہ اسے منسوخ کرنا پڑا۔ اس رپورٹ پر جزوی اور عبوری عمل درآمد سے تعلیمی نظام میں ایسی افراتفری پیدا ہوئی کہ طلباء کی ہڑتالیں اور مظاہرے آئے دن کا معمول بن گئے۔

اصلاحات کاایک اہم حصہ نوکر شاہی کو اوپر سے لیکر نیچے تک نا اہل اور بد دیانت عناصر سے پاک کرنا تھا۔ جن افسروں کے اپنے کام کا جائزہ اعلیٰ کمیٹیاں لے رہی تھیں انہیں اپنے ماتحتوں کے کام کا جائزہ لینے کی ذمّہ داری سونپ دی گئی۔ چنانچہ جو افسران بذاتِ خود نااہلی اور بد دیانتی کے باعث بر طرف کئے جارہے تھے وہ اپنے ماتحت عملے کے خلاف رپورٹیں تیاّر کر رہے تھے۔ اور ان رپورٹوں کو تسلیم کیا جارہا تھا۔ ایسے حالات میں انصاف کی کیا توقع کی جاسکتی تھی۔ چنانچہ بہت سے افسران انتقام کا نشانہ بنے۔ البتہ یہ سچ ہے کہ کچھ ایسے نا اہل افسروں کو بر طرف کیا گیا جنہیں سول سروس کے قواعد و ضوابط کے مطابق تحفّظ حاصل تھا اسی طرح کچھ ایسے بد دیانت افسروں کو بھی ملازمت سے فارغ کیا گیا جن کے خلاف عام حالات میں بد دیانتی کے الزامات کو ثابت کرنا ممکن نہ ہوتا۔ تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ بہت سے نا اہل اور مشکوک افسران اس تطہیر سے بچ نکلے اور ترقیاں پاتے رہے۔ اس امتیازی سلوک کا بنیادی سبب انتظامیہ میں موجود گروہ بندی تھا۔ جس گروہ کو صدر کا اعتماد میسر تھا اس کی مستعدی شک و شبہے سے بالا قرار دے دی گئی۔ انتظامیہ میں چوٹی کے حکاّم کو بھی اپنی صوابدید کے مطابق احکامات صادر کرنے کی مجال نہیں تھی۔ فائلیں مقرّرہ طریقہء کار کی بجائے دستی طور پر حرکت کرنے لگیں۔ کسی افسر کی مٹھی گرم کئے بغیر اس سے کوئی کام لینا ممکن نہ رہا۔ یقیناً کچھ قابلِ احترام افسروں کو استثنیٰ کا درجہ بھی حاصل تھا۔ تاہم انتظامیہ کی استعدادِ کار میں یقیناً انحطاط نظر آنے لگا۔ انتظامیہ کی تمام سطحوں پر ناقابلِ تصوّر پیمانے پر بد عنوانی فروغ پاگئی۔ رشوت ستانی اور اقرباپروری اس قدر عام ہو گئی گویا کسی کو باز پرس کا خوف نہیں رہا تھا۔ محکمہ انسدادِ رشوت ستانی کو سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کیا جانے لگا یا اس کے ذریعے چھوٹے چھوٹے اہل کاروں کا معمولی رشوت لینے پر مواخذہ کیا جاتا تاکہ محکمے کا جواز بر قرار رہے۔

بالا آخر سیاست دانوں کی بھی باری آگئی۔ مارچ 1959ء میں پبلک آفیسرز ڈسکوالیفکیشن آرڈر (پوڈو) کے نام سے ایسے سیاستدانوں کے خلاف قانون نافذ کیا گیا جنہوں نے عوامی نمائندگی کے عہدوں پر فائز ہوتے ہوئے بد عنوانی کا ارتکاب کیا ہو۔ اس قانون کے مطابق غیر جانبدار عدالتی ٹریبونل قائم کئے جانا تھے جن میں کوئی بھی شہری اپنی شکایت دائر کر سکتا تھا چنانچہ اندیشہ پیدا ہوا کہ سرکار کے منظورِ نظر اصحاب بھی اس قانون کی زد میں آسکیں گے لہٰذا اس قانون کے متعلقہ قواعد و ضوابط کی تشکیل یا ٹریبونلوں کے قیام کے سلسلے میں کوئی قدم نہ اٹھایا گیا اور جواز پیش کیا گیا کہ حکومت طریقہء کار کو سادہ کرنے اور انصاف کی فوری فراہمی کو یقینی بنانے کے اقدامات پر غور کر رہی ہے جب کئی ماہ گزرنے کے باوجود ایک بھی ٹریبونل قائم نہ کیا گیا تو ثابت ہو گیا کہ یہ جواز محض عذر لنگ تھا۔ اس قانون کی جگہ الیکٹو باڈیز ڈسکوالیفکیشن آرڈر (ایبڈو) جاری کیا گیا جس کے مطابق صرف حکومت کو اختیار دیا گیا کہ وہ کسی شخص کے خلاف عدالت سے رجوع کر سکے گی۔ اس طرح ایک طرف تو اپنے منظورِ نظر افراد کے تحفّظ کو یقینی بنالیا گیا دوسر سیاسی مخالفین کے خلاف انتقامی کارروائی کا دروازہ کھول دیا گیا اس قانون کے مطابق ٹریبونل آزاد تھے اور ان میں عدالتوں کے ججوں کی بجائے فوجی افسران کو بالادستی حاصل تھی ایبڈو کے تحت چید

سیاستدانوں کے خلاف ان احکامات کی بنیاد پر مقدمات چلائے گئے جو انہوں نے زمانہ اقتدار میں صادر کئے تھے۔ مبینہ طور پر یہ احکامات بد عنوانی ، اقربا پروری یا اصول و ضوابط کی خلاف ورزی (بد انتظامی) سے عبارت تھے۔ موخر الذکر اصطلاح کو جان بوجھ کر مبہم اور غیر واضح رکھا گیا تھا۔

ٹریبونل مرکز اور دونوں صوبوں کے لیئے قائم کئے گئے گویا ٹریبونلوں کی کل تعداد تین تھی۔ ہر ٹریبونل میں عدالت کے ایک جج کو سربراہ کا درجہ حاصل تھا۔ دوسرا رکن کوئی ریٹائرڈ سرکاری افسر تھا۔ تیسرا اور سب سے اہم رکن فوج کا کوئی نمائندہ ہوتا تھا یہ تیسرا رکن عدالت کی کارروائی کا رخ متعین کرتا تھا اور اس کی رائے بالآخر فیصلے کا روپ دھارتی تھی اور یہ رائے ہمیشہ استغاثے کے حق میں جاتی تھی۔ جن سیاستدانوں پر اس قانون کے تحت مقدمات چلائے جاتے تھے انہیں متعلقہ فائلوں تک رسائی کا موقع دیا جاتا تھا طریقہ کار یہ تھا کہ عدالت میں متعلقہ فائلیں سیاستدانوں کے سامنے رکھ دی جاتی تھیں انہیں نوٹ لینے یا تفصیل سے مطالعہ کرنے کا وقت یا موقع نہیں مل سکتا تھا۔ سیاستدانوں کو اپنے دفاع کے لئے وکلاء کی خدمات حاصل کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ قانون کے مطابق سزا قبول کر لینے کی صورت میں عدالتی کارروائی کا جھنجھٹ ختم ہو جاتا تھا۔ عدالتی کارروائی پر اصرار کرنے والے سیاستدان یہ خطرہ مول لیتے تھے کہ ان سے وہ مالی نقصان بھی پورا کیا جائے گا جو ٹریبونل کی رائے میں سیاستدان کی بدانتظامی کے باعث قومی خزانے کو اٹھانا پڑا تھا زیادہ تر سیاستدان اپنے دفاع کی ذہنی اور جسمانی کوفت سے بچنے کے لئے سزا قبول کر لیتے تھے یوں بھی مقدمات کو ناگزیر طور پر ان کے خلاف ———————————— فیصلہ ہونا تھا اور اس قسم کی قانونی کارروائی کا سیاستدانوں کو کوئی تجربہ نہیں تھا۔ چند ہی سیاستدانوں نے مقدمے کا سامنا کرنے کی جرأت رندانہ دکھائی اور میرے علم کے مطابق صرف ایک سیاستدان کو بری ہونے کا اعزاز ملا اگرچہ انہیں بھی خاصی ذہنی اور مالی صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں۔ مقدمے سے بچنے کے لئے جرم کا اقرار کرنے والوں یا مقدمے کی کارروائی کے نتیجے میں مجرم قرار پانے والوں کو 31 دسمبر 1966ء تک ہر قسم کا انتخاب لڑنے کے لئے نا اہل قرار دے دیا جاتا تھا۔

مخفف کے طور پر ایسے سیاستدانوں کو ایبڈو زدہ کا نام دیا گیا عمومی طور پر سیاست دانوں کے خلاف نہایت معمولی اور پھس پھسے الزامات عائد کئے گئے جو ایوب خان کے اپنے عہد میں پائے جانے والے حالات میں اور بھی بے ضرر اور بے وقعت نظر آتے ہیں، سیاست سے جبری کنارہ کشی کی یہ سزا ان سیاستدانوں کو بھی دی گئی جو کبھی پبلک سیفٹی ایکٹ کے تحت بغیر مقدمہ چلائے نظر بند کئے گئے تھے خواہ انہیں ماضی کی کسی بھی حکومت نے کتنی ہی مختصر مدد کے لئے نظر بند کیوں نہ کیا ہو۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بہت سے سیاستدان جو ہر طرح سے مجرمانہ ماضی کے حامل تھے، پبلک سیفٹی ایکٹ کی زد سے بچے رہنے کی بنا پر مامون قرار پا گئے۔ بعد ازاں ایک صدارتی حکم کے ذریعے ان حضرات کی گلو خلاصی کر دی گئی جن کی نظر بندی کی معیاد چھ ہفتے یا اس سے کم رہی تھی، یہ ترمیمی صدارتی حکم صدر کے ایک خاص حواری کو انتخاب

لڑوانے کی غرض سے صادر ہوا تھا۔

قانون سازی کا ایک بظاہر قابلِ تعریف پہلو زرعی اصلاحات سے تعلق رکھتا تھا تاہم مارشل لاء حکومت کا یہ دعویٰ محلِ نظر ہے کہ ملک میں کوئی جمہوری حکومت ایسی زرعی اصلاحات نافذ نہیں کر سکتی تھی یہ درست ہے کہ پیش آمدہ عام انتخابات کے بارے میں کسی کو یہ خوش فہمی نہیں تھی کہ مغربی پاکستان کے طاقتور جاگیردار (اگرچہ کسانوں پر ان کا رعب و دبدبہ کم ہو رہا تھا) منتخب نہیں ہو سکیں گے مغربی پاکستان میں ری پبلکن حکومت اس سلسلے میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت کرنے کو تیّار نہیں تھی۔ جماعت اسلامی بھی جاگیرداروں کی طرف دار سمجھی جاتی تھی اور اس نے نجی جائیداد کو قومی تحویل میں لینا غیر اسلامی قرار دیدیا تھا۔ زرعی اصلاحات کے بارے میں مسلم لیگ کا رویّہ گول مول تھا۔ بایں ہمہ مغربی پاکستان میں عوامی لیگ نے بنیادی نوعیت کی زرعی اصلاحات کا واضح منصوبہ تیّار کر رکھا تھا۔ دانشوروں، متوسط طبقے، چھوٹے زمینداروں کسانوں اور زرعی مزدوروں کے لئے اس منشور میں بڑی کشش تھی۔ اگر انتخابات اپنے وقت پر منعقد ہوتے تو غالب امکان یہ تھا کہ مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ بھاری اکثریت سے کامیاب ہوتی، مغربی پاکستان میں بھی عوامی لیگ کو کچھ نہ کچھ نشستیں مل جاتیں (خود مجھے مغربی پاکستان میں تمیں فی صد نشستوں کی امید تھی) چنانچہ نیشنل عوامی پارٹی کے کامیاب امیدواروں اور مسلم لیگ کے روشن خیال ارکان کی مدد سے ہم نے زرعی اصلاحات کے پروگرام کو عملی جامہ پہنا دیا ہوتا۔ مارشل لاء کی نافذ کردہ زرعی اصلاحات کے باوجود جاگیرداروں کے پاس اچھی خاصی زرعی اراضی باقی رہ گئی۔

کافی عرصے سے یہ محسوس کیا جا رہا تھا کہ مغربی پاکستان میں زرعی اصلاحات ناگزیر ہو چکی ہیں۔ زرعی اصلاحات کا بنیادی مقصد زرعی اراضی کی حدّ ملکیت کا تعین تھا۔ بہت سے سیانے جاگیرداروں نے حالات کا رخ بھانپ کر اپنی زمینیں رشتے داروں اور قابلِ اعتماد مزارعوں کے نام منتقل کر دی تھیں۔ چنانچہ کاغذی طور پر یہ افراد حدِ ملکیت سے کم اراضی کے مالک قرار پا گئے جبکہ حقیقت یہ تھی کہ ان جاگیرداروں کی کل جائیداد میں ذرا بھر بھی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ مہاجر زمینداروں کو زرعی اراضی کے زیادہ سے زیادہ 36000 یونٹ تفویض کئے گئے تھے۔ 36000 یونٹ نہری علاقے کے 500 ایکڑ رقبے کے برابر ہوتے تھے جبکہ بارانی علاقوں میں یہ حدّ ملکیت 1000 سے 1200 ایکڑ تک اراضی پر مشتمل ہوتی تھی۔ مارشل لاء حکومت نے زرعی اصلاحات کیلئے اسی معیار کو اختیار کر لیا اس کے علاوہ ہر جاگیردار کو 18000 یونٹ تک زرعی اراضی اپنے زیرِ کفالت افراد میں تقسیم کرنے یا پھلوں کے باغات کیلئے وقف کرنے کا اختیار دیا گیا۔ مزید بر آں کچھ جاگیرداروں کو مویشی پالنے اور گھوڑوں کی افزائش کیلئے جو اراضی تفویض کی گئی تھی اسے زرعی اصلاحات سے مستثنیٰ قرار دے دیا گیا اس مقصد کیلئے زمینداروں کو وسیع قطعاتِ اراضی سے نوازا گیا تھا۔

مجموعی طور پر زرعی اصلاحات کے نتیجے میں حکومت صرف 750000 ایکڑ، قابلِ کاشت اراضی جاگیرداروں سے واپس لینے میں کامیاب ہو سکی۔ جاگیرداروں نے زیادہ تر بنجر، ناقابلِ کاشت اور ناقابلِ

استعمال اراضی حکومت کے حوالے کی جسے بے زمین کسانوں میں تقسیم کرنا بے معنی ہوتا۔ حکومت کو ملنے والی کل اراضی 2350000 ایکڑ تھی اس میں سے 400000 ایکڑ اراضی کاشت کے قابل نہیں تھی۔ 1200000 ایکڑ اراضی قابلِ کاشت تھی مگر سیم وتھور اور دریائی کٹاؤ کے باعث بنجر ہو چکی تھی یعنی صرف 750000 ایکڑ اراضی قابلِ کاشت تھی اس میں سے بھی صرف 420000 ایکڑ زیرِ کاشت لائی گئی۔

گذشتہ حکومتوں کے دوران آبپاشی کے جو منصوبے شروع کئے گئے تھے اب انہیں مکمل کیا گیا۔ ملک بھر میں خاص طور پر سندھ میں غیر مزروعہ کے وسیع قطعات زیرِ کاشت لائے گئے۔ ماضی کے برے زمانوں میں یہ قانون منظور کیا گیا تھا کہ سندھ کی غیر مزروعہ اراضی کسی ایسے شخص کو تفویض کی جا سکتی جس کا نام پہلے سے زمیندار کے طور پر سندھ کے لگان گزاروں کی فہرست میں شامل نہ ہو۔ چنانچہ سندھ میں ایک ذیل قسم کے زمیندار سے چھوٹے چھوٹے قطعات اراضی فوجی افسران کے نام منتقل کروائے گئے تاکہ ان کے نام سندھ کے زمینداروں کی فہرست میں شامل ہو سکیں چنانچہ غیر حاضر زمینداروں کا ایک نیا طبقہ معرض وجود میں آیا جو زرعی اصلاحات کے تحت مقرّر کردہ حدِ ملکیت سے زیادہ زرعی اراضی کا مالک نہیں ہو سکتا تھا۔ مغربی پنجاب میں واقع ضلع ہزارہ سے تعلق رکھنے والے صدر ایوب خاں سندھ میں ایسی زرعی اراضی کے مالک بن بیٹھے۔ بے حد زرخیز زرعی اراضی اعلیٰ فوجی افسران اور ان کے خوش نصیب اہلِ خانہ کیلئے وقف ہو گئی‘ خاص طور پر فوجی شوگر مل کے اردگرد واقع زمینیں فوجی حکام کو عطا ہوئیں۔ زیادہ تر جنرلوں اور نچلے درجے کے افسران کو ان کے مناصب کی مناسبت سے آسان شرائط پر زرعی اراضی سے نوازا گیا‘ وسیع قطعاتِ اراضی سابق فوجی افسروں کیلئے مخصوص کر دیئے گئے۔ سابق فوجی ملازمین کیلئے امداد باہمی کے ادارے قائم کئے گئے جن کے ذریعے انہیں غیر مزروعہ اراضی کو زیرِ کاشت لانے کی سہولتیں اور مالی اعانت فراہم کی جاتی تھی اس کے علاوہ سندھ میں کچھ زرعی اراضی پٹھان قبائلیوں کیلئے مخصوص کر دی گئی کیونکہ قبائلی علاقے میں قابلِ کاشت اراضی کی خاصی قلت پائی جاتی ہے۔ مشرقی پاکستان سے آنے والے آباد کاروں کو بھی بقدر سد رمق زرعی اراضی وقف کی گئی۔ تین سال تک یہ لوگ اس بنجر اور نا قابلِ کاشت زمین میں سر پھوڑتے رہے۔ بالآخر انہوں نے اس بھاری پتھر کو چوم کر چھوڑ دیا۔ غالباً بعد میں ان آباد کاروں کو بہتر اراضی الاٹ کرنے کا فیصلہ کیا گیا مگر دستاویزاتِ ملکیت تیار نہ ہو سکیں کیونکہ سندھیوں نے اپنی زمینوں سے دستبردار ہونے سے انکار کر دیا۔

مجموعی طور پر ان الاٹمنٹوں سے سندھیوں میں غم وغصے کے جذبات نے جنم لیا کیونکہ سندھ کے وسیع قطعاتِ اراضی سندھ کے بے زمین ہاریوں میں تقسیم کرنے کی بجائے غیر سندھیوں کے حوالے کر دیئے گئے تھے۔ اس غم وغصے کے نتیجے میں سندھ نے متفقہ طور پر ون یونٹ کی تنسیخ کا مطالبہ شروع کر دیا کیونکہ ون یونٹ نے ہی اس استحصال کی راہ ہموار کی تھی۔

مارشل لاء حکومت نے مسئلۂ سندھ طاس اور مغربی پاکستان سے گزرنے والے دریاؤں کے پانی کا تنازعہ اس طرح حل کیا کہ پاکستان تین دریاؤں یعنی راوی‘ ستلج اور بیاس کے پانیوں کے بارے میں

ہندوستان کے حق میں دستبردار ہو گیا۔ اس کے عوض سندھ، جہلم اور چناب پر پاکستان کا حق تسلیم کر لیا گیا اس میں بھی موخرالذکر دریا کو وادیٔ کشمیر کی ضروریات پوری کرنے کے بعد پاکستانی سرزمین کو سیراب کرنا تھا۔ اسی معاہدے کے نتیجے میں پیدا ہونے والی آبی قلّت کو بند باندھ کر اور رابطہ نہریں تعمیر کر کے پورا کیا جانا تھا۔ اس منصوبے پر خاصی لاگت آنا تھی تا کہ آبپاشی کی ان ضروریات کو پورا کیا جا سکے جنہیں قبل ازیں ان تین دریاؤں کے پانی سے پورا کیا جاتا تھا جو سندھ طاس معاہدے کے نتیجے میں بھارت کی نذر کر دیئے گئے۔

آبپاشی کیلئے بند اور نہریں تعمیر کرنے کے مصارف کیلئے عالمی بینک اور دوست ممالک نے دستِ تعاون دراز کیا کیونکہ بھارت نے ناقابلِ ذکر حد تک معمولی امداد کے علاوہ اعانت کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔لاگت کے جن اندازوں کی بنیاد پر مختلف ممالک نے امداد کی حامی بھری تھی وہ اصل ضروریات سے کہیں ناکافی ثابت ہوئے[19]۔ منصوبوں کے آغاز کے ایک یا دو سال بعد ہی یہ حقیقت منظرِ عام پر آ گئی کہ غیر ملکی اعانت میں کم از کم دوگنا اضافہ کرنا ہو گا۔ مغربی پاکستان کیلئے یہ زندگی یا موت کا سوال تھا لیکن دوسرے ممالک کیلئے بھی ایک حد سے زیادہ مالی اعانت دینا ممکن نہیں تھا چنانچہ ایک بند (تربیلا بند) کی تعمیر ترک کرنا پڑی۔ یہ بند آبپاشی کے منصوبے کا لازمی جزو تھا اور اس کے بغیر قومی خزانے کی دولت کا مسلسل زیاں ہوتا رہے گا۔

کہا جاتا ہے کہ یہ معاہدہ امریکہ کی دوستانہ مداخلت کے باعث طے پایا تھا۔ مغربی پاکستان میں عوام کا عمومی ردِّعمل یہ تھا کہ اس قسم کا معاہدہ کہیں بہتر شرائط پر بہت پہلے طے پا سکتا تھا اور مارشل حکومت نے اس ضمن میں کوئی بڑا تیر نہیں مارا تھا۔ فی الاصل یہ امریکہ کی پالیسی کا ایک حصّہ تھا کہ بھارت اور پاکستان کے درمیان کشیدگی کی کچھ وجوہات کو دور کیا جائے۔ پاکستان کو اس سے کوئی فائدہ پہنچنے کی بجائے الٹا نقصان ہوا۔ اس کیلئے اپنے نظامِ آبپاشی کو وسعت دینا ممکن نہ رہا، نیز مغربی پاکستان کی معیشت اچھے خاصے خطرے سے دوچار ہو گئی۔ کچھ رابطہ نہروں نے کام شروع کرتے ہی دونوں کناروں پر واقع وسیع اراضی کو سیم زدگی کے ذریعے ناقابلِ کاشت بنا دیا، اندیشہ ہے کہ جب مزید اور کہیں بڑی رابطہ نہریں کام شروع کریں گی تو مزید علاقے سیم کی زد میں آ جائیں گے۔ ایک طرف تو ان نہروں کیلئے اچھی خاصی زمین وقف کی گئی ہے دوسرے ان کے نتیجے میں زرعی اراضی کو ازسرِ نو قابلِ کاشت بنانے کے مسائل اٹھ کھڑے ہوں گے۔

وفاقی دارالحکومت کو کراچی سے راولپنڈی سے متّصل ایک علاقے اسلام آباد میں منتقل کرنا مارشل لاء انتظامیہ کے ابتدائی اقدامات میں سے ایک تھا۔ صدر کے نافذ کردہ آئین میں ایک شق کے ذریعے اس اقدام کو آئینی تحفّظ فراہم کیا گیا۔ اسلام آباد کے وفاقی دارالحکومت کے طور پر کام شروع کرنے سے قبل عبوری عرصے کیلئے راولپنڈی کو وفاقی دارالحکومت قرار دیا گیا۔ اس غیر ضروری اسراف اور شاہ خرچی کا جواز یہ پیش کیا گیا کہ کراچی کی آب و ہوا میں اعصاب پر برا اثر پڑتا ہے اور اسلام آباد کی خنک آب و ہوا میں

انتظامیہ کی استعدادِ کار پر خوشگوار اثر پڑے گا۔ مزید برآں دارالحکومت کو ایسی جگہ پر ہونا چاہیے جہاں حکومت رائے عامہ سے رابطہ برقرار رکھ سکے لیکن انتظامیہ کے ارکان کیلئے کاروباری طبقے سے زیادہ میل جول کے مواقع میسّر نہ آسکیں۔ ان میں سے کوئی بھی دلیل درست نہیں تھی سوائے اس کے کہ اسلام آباد میں حکومت رائے عامہ سے مکمل طور پر کٹ کر سازشوں کی آماجگاہ اور جوڑ توڑ کا گڑھ بن جائے گی۔ ساحلِ سمندر پر واقع کراچی کا موسم معتدل ہے اور صرف ایک یا دو مہینوں کیلئے گرم یا ناخوشگوار ہوتا ہے جبکہ راولپنڈی کی طرح اسلام آباد کا موسم سردیوں میں انتہائی سرد اور گرمیوں میں انتہائی گرم ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ مشرقی پاکستان سے تعلق رکھنے والے حکام کیلئے اسلام آباد کا موسم قطعاً ناقابلِ برداشت ہوتا ہے۔ مشرقی پاکستان سے تعلق رکھنے والے ملازمین کو جب مناسب رہائش اور کپڑوں کے بغیر راولپنڈی منتقل کیا گیا تو انہیں بڑی تکلیف کا سامنا کرنا پڑا۔ اطلاعات کے مطابق کچھ ملازمین پہلے موسمِ سرما میں نمونیے کا شکار ہو کر موت کے منہ میں چلے گئے۔ سرکاری افسران سے تاجروں کے میل جول پر بھی کوئی اثر نہ پڑا بلکہ عبوری دارالحکومت راولپنڈی کی غلام گردشوں میں تاجر اور بھی بے دھڑک ہو کر سرکاری ملازمین سے ملنے لگے۔

راولپنڈی اور اسلام آباد کے شہریوں کو پینے کا پانی مہیّا کرنے کیلئے اچھی خاصی لاگت کے ساتھ راول ڈیم تعمیر کیا گیا۔ اس ڈیم کی افتتاحی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے صدر فیلڈ مارشل ایوب خاں نے اس اقدام کے اصل اسباب میں سے ایک کو بے نقاب کیا۔ صدر نے کہا " آخر مجھے وفاقی دارالحکومت کو کراچی سے اسلام آباد منتقل کرنے پر تنقید کا نشانہ کیوں بنایا جاتا ہے اگر میری خواہش تھی کہ وفاقی دارالحکومت اس جگہ سے قریب ہو جہاں میں نے اپنی زندگی کے 35 برس گزارے ہیں تو اس میں کونسی برائی تھی"؟۔ (راولپنڈی پاکستانی فوج کا ہیڈ کوارٹر ہے جہاں پر فوجی افسران اور سپاہیوں کی خاصی تعداد پورے فوجی ساز و سامان کے ساتھ موجود رہتی ہے)۔ امرِ واقعہ یہ ہے کہ یہ دلیل بڑی سکت تھی یعنی یہ کہ ملک کے برسرِ اقتدار صدر نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ جس شہر میں بسر کیا ہو ملک کا دارالخلافہ وہیں منتقل کر دیا جائے۔

عام خیال یہ تھا کہ دارالحکومت کی تبدیلی میں صدر کے مدِّ نظر دو مقاصد تھے۔ ایک طرف تو صدر فوج پر براہِ راست نظر رکھنا چاہتے تھے دوسری طرف وہ کابینہ اور انتظامیہ کو مستقل طور پر فوج کے دباؤ میں رکھنا چاہتے تھے۔ اگر اسلام آباد میں مکمل طور پر پارلیمانی جمہوریت قائم ہو بھی جائے تو ہمسایہ شہر راولپنڈی میں موجود فوج کی مداخلت یا اثر و نفوذ یا نگرانی کے اندیشے سے آزاد ہو کر حکومت چلانا ممکن نہیں ہو گا۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ پورے ملک میں دارالحکومت کی تبدیلی کو ناگواری کی نظر سے دیکھا گیا حتیٰ کہ پنجاب کے دانشور حلقوں میں بھی اس اقدام کو پذیرائی نہ مل سکی حالانکہ وفاقی دارالحکومت کے پنجاب میں منتقل ہو جانے سے اس صوبے کی اہمیت میں اضافے کی توقع تھی، پاکستان اس عیّاشی کا متحمّل نہیں ہو سکتا تھا۔ قومی خزانے کو سماجی بہبود اور ترقیاتی منصوبوں پر خرچ کرنے کی بجائے حکمرانوں کے دماغ کی ترنگ کے تابع کر دیا

گیا تھا۔ اس اقدام سے ملکی مفادات کو گہرا نقصان پہنچا کیونکہ مشرقی پاکستان کے عوام اس اقدام کو فوجی بالادستی کے دوام کی پیش بندی سمجھتے ہوئے اس کی دوٹوک مذمّت کر رہے تھے۔

آئندہ آئین کے بارے میں صدر کو سفارشات پیش کرنے کی غرض سے سپریم کورٹ کے ایک نامور ریٹائرڈ جج کی سربراہی میں ایک کمیشن قائم کیا گیا۔ کمیشن نے ملک بھر کا دورہ کر کے بہت سے افراد کے خیالات معلوم کئے۔ میں نے کمیشن کی درخواست پر اپنے خیالات بیان کرنے سے معذوری کا اظہار کیا کیونکہ مجھے یقین تھا کہ اس کمیشن کی سفارشات کو درخود اعتنا نہیں سمجھا جائے گا اور بالآخر آئین کے نام پر صدر کے اپنے تصوّرات قوم پر مسلّط کر دیئے جائیں گے۔ کمیشن کی رپورٹ کو مبیّنہ طور پر کابینہ کی ایک جائزہ کمیٹی کے سپرد کر دیا گیا۔ کابینہ کمیٹی کی نظرثانی کے بعد صدر ایوب خاں نے بنفسِ نفیس آئین کو آخری شکل دی۔ یہ آئین 2 فروری 1962ء کو شائع کیا گیا اور 8 جون 1962ء کو نافذ کر دیا گیا اسی روز نئے آئین کے تحت راولپنڈی میں مرکزی قانون ساز اسمبلی کا اجلاس منعقد ہونا تھا۔

مارشل لاء اٹھالیا گیا۔ نئے آئین کو آئین کمیشن کی سفارشات سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ جن دنوں آئین کمیشن ملک کے طول وعرض میں آئین کے بارے میں رائے عامہ کا جائزہ لے رہا تھا ان دنوں صدر نے متعدد تقاریر میں آئین کے بارے میں اپنے خیالات عالیہ کا اظہار کیا تھا۔ نئے آئین کو صدر کے انہی افکار کی روشنی میں مدون کیا گیا تھا۔ صدر نے کہا تھا "ہمیں بالغ رائے دہی کی بنا پر براہِ راست انتخابات کی بجائے بنیادی جمہوریتوں کے ذریعے بالواسطہ انتخابات کا طریقہ اپنانا چاہیئے اگر کمیشن نے مقنّنہ کیلئے براہِ راست انتخابات کی سفارش کر دی تو بھی کابینہ اس تجویز سے اتفاق نہیں کرے گی"۔ ایک اور موقع پر صدر نے کہا "ہمیں صدارتی طرزِ حکومت اختیار کرنا چاہیئے جس میں صدر حقیقی طور پر اختیارات کا سرچشمہ ہو"۔ صدر نے آئین کی بعض دفعات کو انتظامی معاملات میں مقنّنہ کی مداخلت روکنے کیلئے "حدود وقیود" سے تعبیر کیا۔

قانون سازی کے شعبے میں بھی انتظامیہ کو قانون کے نفاذ کیلئے اختیارات ملنے چاہئیں۔ آئین کا صرف ایک پہلو ایسا تھا جس میں صدر نے اپنے خیالات میں تبدیلی کی زحمت گوارا کی' وہ بھی شاید اس لئے کہ اس خاص معاملے میں صدر کی رائے نہایت غیر عملی تھی اور اس میں مشرقی اور مغربی پاکستان میں حائل جغرافیائی فاصلے کو بالکل مدِنظر نہیں رکھا گیا تھا۔ صدر وفاقی نظام اور صوبائی اسمبلیوں کے سخت مخالف تھے اور صوبائی اسمبلیوں کو افراتفری اور عدم استحکام کا بنیادی سبب سمجھتے تھے' انہیں علامتی طور پر وفاقی نظام قبول کرنا پڑا اگرچہ انہوں نے مرکزی یا صوبائی مقنّنہ کو بالکل بے اختیار رکھا اور صوبائی خود مختاری بھی صرف نام کی حد تک ہی وجود رکھتی تھی۔ بہت سے اہم شعبے نیم خود مختار اداروں کے پاس تھے اور ان اداروں کو عملی طور پر مرکزی حکومت چلاتی تھی۔ صدر کو اپنے وسیع تجربے' بے پایاں علم' بے خطا بصیرت اور پاکستانی عوام کی نفسیات کے عمیق ادراک کی بنا پر ہر معاملے میں حرفِ آخر کا درجہ عطاء کیا گیا۔ آئین میں چونکہ پارلیمانی جمہوریت کی گنجائش نہیں تھی للذا اسے "صدارتی" طرزِ حکومت کا نام دیا گیا ورنہ صدر کو ایک

آمرِ مطلق کے تمام اختیارات حاصل تھے۔

مارشل لاء کے نفاذ کے بعد ملک بھر میں بد عنوانی سمگلنگ ' ذخیرہ اندوزی اور دیگر جرائم کی سماعت کیلئے فوجی عدالتیں قائم کی گئیں ان میں سے کچھ افعال کو مارشل ضوابط کے تحت پہلی بار جرم قرار دیا گیا تھا اور باقی کو محض فوجی عدالتوں کے دائرۂ اختیار میں شامل کر دیا گیا تھا۔ ان فوجی عدالتوں کو شدید سزائیں سنانے کے اختیارات دیئے گئے تھے۔ فوجی عدالتوں کے فیصلوں پر مارشل لاء کے اعلیٰ حکام نظرِ ثانی کر کے جرمانوں کی مقدار اور قید کی معیاد میں تخفیف کرنے کا اختیار رکھتے تھے۔ مارشل لاء کے اعلیٰ تر حکام ان نظرِ ثانی شدہ سزاؤں میں مزید تخفیف یا انہیں مکمل طور پر ختم کرنے کا بھی اختیار رکھتے تھے۔ نظرِ ثانی کے ان اختیارات کو مناسب مواقع اور موزوں وجوہات کی بنا پر حرکت میں لایا جاتا تھا۔ ایک مختصر سے عرصے کیلئے سماج دشمن سرگرمیوں میں کمی واقع ہوئی لیکن بہتری زیادہ دیر برقرار نہ رہ سکی جلد ہی انتظامیہ کی تمام سطحوں پر بد عنوانی اور اقرباء پروری تمام حدیں پھلانگ گئی۔ بعض حکّام پر بد عنوانی کے ایسے ایسے الزامات سامنے آئے جن کے سامنے گذشتہ حکومتوں کے افعال بازیچۂ اطفال نظر آنے لگے۔ ماضی کے بد نام ترین سیاستدانوں کو مارشل لاء حکومت کے عام کارندوں کے مقابلے میں فرشتے کہا جاسکتا تھا۔

انقلابی اصلاحات کا ایک اہم نتیجہ وکلاء اور جج صاحبان کے وقار میں کمی تھا۔ صدر کو وکلاء سے خاصی چڑ تھی اور وہ قانون سے تعلق رکھنے والوں پر سب وشتم کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وکلاء معاشرے کی تلچھٹ ہیں اور ان کی زندگی کا واحد مقصد اپنے مؤکلین کی کھال اتارنا ہوتا ہے' یہ لوگ جج صاحبان کو گمراہ کر کے انصاف کی فراہمی میں رکاوٹیں کھڑی کرتے ہیں۔ اگر صدر ایوب کے اختیار میں ہوتا تو انہوں نے وکلاء کو صفحۂ ہستی سے مٹا ڈالا ہوتا۔ مارشل لاء حکومت نے بنیادی جمہوریتوں کی عدالتوں ' ایبڈو ٹربیونلوں اور سرسری سماعت کی فوجی عدالتوں میں وکلاء کے پیش ہونے پر پابندی عائد کر دی۔ عدلیہ کے بارے میں صدر ایوب کے جذبات کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے پے در پے صدارتی حکم جاری کئے جن کے تحت انتظامیہ کے احکامات کے قانونی جواز کو کسی عدالت حتیٰ کہ ہائی کورٹ یا سپریم کورٹ میں بھی زیرِ بحث نہیں لایا جاسکتا تھا۔ سول اور فوجداری قوانین میں بغیر سوچے سمجھے ایسی ترامیم کی گئیں جن سے انصاف کے تقاضے پامال ہونے لگے اور ان غیر ماہرانہ ترامیم میں مزید ترامیم کی ضرورت پیش آنے لگی۔

حکومتِ پاکستان اور فورڈ فاؤنڈیشن نے مل کر ملک کے دونوں حصوں میں پاکستان زرعی اکادمی کے نام سے مشترکہ آزمائشی منصوبے شروع کئے۔ یہ منصوبے مارشل حکومت کے ان اقدامات میں سے ایک تھے جن سے مثبت توقعات وابستہ کی جاسکتی تھیں[20]۔ مشرقی پاکستان میں زرعی اکادمی کا ہیڈ کوارٹر کومیلا کے مقام پر قائم کیا گیا اور سول سروس کے اہل ترین افراد میں سے ایک کو اکادمی کا ڈائریکٹر مقرّر کیا گیا یہ صاحب انتظامی صلاحیتوں 'قوتِ متخیّلہ اور تیز فہمی جیسی خوبیوں کے مالک تھے۔ میرے علم کے مطابق انہیں بعد میں پلاننگ کمیشن کا نائب صدر بھی بنایا گیا تھا۔ فورڈ فاؤنڈیشن نے ٹیوب ویلوں کی تنصیب' بیجوں کی

کاشت، چھوٹے پیمانے پر آبپاشی کے منصوبوں اور اسی قسم کے ترقیاتی کاموں کیلئے گراں قدر مالی اور تکنیکی امداد فراہم کی۔ یہ منصوبہ ان علاقوں کے لئے نہایت مفید ثابت ہوا جہاں اس پر عمل در آمد کیا گیا۔ اس منصوبے سے ثابت ہوا کہ اگر کسانوں کی مناسب رہنمائی کی جائے اور انہیں اعتماد میں لیتے ہوئے جدید تکنیک کے بارے میں انہیں معلومات فراہم کی جائیں تو ان کے معیارِ زندگی میں معتد بہ اضافہ ممکن ہے۔

اس منصوبے کی بنیاد اجتماعی کاشت کاری پر رکھی گئی تھی اس سے نہ صرف زرعی پیداوار میں اضافہ ہوا بلکہ کاشت کاروں کیلئے اپنی بچت بینک میں جمع کر کے دیہی صنعتیں شروع کرنے کے بھی دروازے کھل گئے۔ پانچ سالہ منصوبے کے تیسرے سال تک اکادمی اس قابل ہو گئی کہ امدادِ باہمی کی تنظیم کے بارے میں ٹھیک ٹھیک مشاورت کر سکے نیز دیہی منصوبوں کیلئے ذمہ دار افسروں کی تربیت کا اہتمام کر سکے۔ اگر اکادمی کو مناسب طریقے سے آگے بڑھایا گیا تو اس سے ملک کو بے حد فائدہ پہنچ سکے گا، اگر اس منصوبے کی مناسب حوصلہ افزائی کی گئی تو یہ ان منصوبوں سے کہیں زیادہ منافع بخش ثابت ہو گا جو محض امیر کو امیر تر اور غریبوں کو غریب تر کرنے کی خدمت سر انجام دیتے ہیں۔ مشرقی پاکستان زرعی اکادمی کی کامیابی میں فورڈ فاؤنڈیشن کی طرف سے تعینات چند ماہرینِ زراعت کے علاوہ سپاہِ امن کے مٹھی بھر لیکن دھن کے پکّے رضا کاروں کے علم، مشاورت اور محنتِ شاقہ کو بے حد دخل تھا۔ میں نے ہمیشہ اس خیال کی تائید کی ہے کہ ملکی تعمیر و ترقی کیلئے منصوبہ بندی کرتے وقت زراعت اور اس کے تمام شعبوں کی ترقی کو بنیادی اہمیت ملنی چاہئے۔

سول سروس کی حوصلہ شکنی

مارشل لاء حکومت نے (جسے انقلابی حکومت بھی کہا جاتا تھا) حکومتی مشینری کو بھرپور طریقے سے اپنے مفادات کے لئے استعمال کیا۔ اس حکومت نے وردی اتار کر سویلین چولا پہن لیا تو بھی حالات میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہو سکی۔ انڈین سول سروس میں یہ روایت چلی آ رہی تھی کہ افسر شاہی کو سیاست میں ملوث ہونے کی اجازت نہیں دی جاتی تھی تاہم اس میں کوئی شک نہیں کہ تحریک پاکستان کے دوران سول سروس کے کچھ مسلمان افسروں نے مسلمان عوام کو مسلم لیگ اور مطالبہ پاکستان کی حمایت پر راغب کیا تھا۔ اسی طرح سول سروس کے ہندو ارکان نے بھی کانگرس کی حمایت کی تھی۔ یوں اس روایت کو شدید دھچکا پہنچا۔

لیکن معاملات کی اہم نوعیت کے پیش نظر افسران اس روایت شکنی کو روا سمجھتے تھے۔ خوش قسمتی سے سول سروس میں مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی جبکہ بنگال اور مسلم اقلیتی صوبوں میں تو مسلمان افسروں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ یوں بھی موخر الذکر صوبوں میں ایسی مداخلت کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ چنانچہ اس روایت سے انحراف انہی علاقوں تک محدود رہا جو بالآخر مغربی پاکستان کا حصہ بنے۔[21] قیام پاکستان کے

بعد یہ افسران پھر سے انتظامی فرائض سرانجام دینے لگے اور واقعہ یہ ہے کہ ان افسروں کی لگن اور بے لوث خدمت کے بغیر نوزائیدہ مملکت کو درپیش مسائل پر قابو پانا ممکن نہ تھا۔ بدقسمتی سے مسلم لیگ وزارت نے جو پاکستان میں اقتدار کی مالک ٹھہری اور جس نے اپنے مفادات کی خاطر مغربی پاکستان میں کئی صوبائی وزارتوں کا کریا کرم کیا تھا، 1951ء سے 1953ء تک مغربی پاکستان کی صوبائی مجالس قانون ساز کیلئے انتخابات میں سرکاری افسروں اور حکومتی مشینری کو بھرپور طریقے سے استعمال کیا۔ انتخابات کے بعد حالات معمول پر آگئے لیکن مارشل لاء حکومت نے افسر شاہی کو اس بے رحمی سے استعمال کیا اور اس کے اخلاقی انحطاط کو اس سطح تک پہنچا دیا کہ انتظامی ڈھانچے سے اس کے اثراتِ نامسعود کو ختم ہونے میں ایک زمانہ لگے گا۔ مشرقی پاکستان کے افسران چند جانی پہچانی گندی مچھلیوں کے استثنیٰ کے ساتھ جماعتی سیاست سے الگ تھلگ رہے تھے لیکن اب انہیں بھی اپنے اصلی انتظامی فرائض کی بجائے انقلابی حکومت کے سیاسی مفادات کو فروغ دینے پر مجبور کیا گیا۔

ملک بھر میں سرکاری افسروں کو انقلابی حکومت کے گن گانے کی مہم سونپ دی گئی۔ ضلعی انتظامیہ کے اعلیٰ حکام سے لے کر معمولی کارندوں تک ہر سرکاری ملازم کو ان گنت جلسوں سے خطاب کرنا پڑتا تھا۔ ان تقاریر کا بنیادی مقصد گذشتہ حکومتوں، سیاستدانوں اور عوامی قائدین میں کیڑے نکالنا تھا۔ اخلاقی انحطاط کے بدترین مظاہروں میں بھی کبھی سرکاری افسروں کو اس حد تک سیاست میں ملوث نہیں کیا گیا تھا اور ماضی کی کسی حکومت نے مذکورہ بالا طریقوں سے سرکاری افسران کو استعمال کرنے کی جسارت نہیں کی تھی۔ انہیں بنیادی جمہوریتوں کی مختلف سطحوں پر حکومت کے حق میں قرار دادیں منظور کروانے کیلئے استعمال کیا گیا تاکہ حکومت کی مقبولیت کا بھرم رکھا جاسکے۔ عام طور پر سرکاری افسر اپنے اصل فرائض سرانجام دینے کی بجائے نئی حکومت کے سیاسی اللّوں تللّوں میں ہی الجھے رہتے تھے۔ فی الحقیقت سرکاری افسروں کو اپنے دفاتر میں بیٹھنے کا وقت ہی نہیں ملتا تھا بلکہ وہ سارا وقت انقلابی حکومت کی سیوا میں گزارتے تھے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ضلعی انتظامیہ کا بیڑا غرض ہو گیا حالانکہ یہ ادارہ عوامی بہبود کیلئے بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔

ماضی میں روایتی طور پر گورنر کو غیر جانبدار اور غیر سیاسی عہدے دار سمجھا جاتا تھا لیکن اب گورنر بھی سیاسی اکھاڑے میں اتر آئے اور علی الاعلان سیاست میں حصہ لینے لگے۔ مغربی پاکستان کے گورنر اور صدر ایوب کا باہمی ارتباط کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھا دونوں نے شانہ بشانہ ظلم و تعدی اور جور و ستم کے کئی ہفت خواں سر کئے۔ مشرقی پاکستان بھی اس عذاب سے محفوظ نہ رہ سکا۔ انقلاب کے بعد سابق انسپکٹر جنرل پولیس ذاکر حسین مشرقی پاکستان کے پہلے گورنر بنائے گئے۔ انہوں نے بڑے خضوع و خشوع سے عوام پر جبر و استبداد کے پہاڑ توڑنے کا فریضہ ادا کیا۔ اس خدمت کے صلے میں انہیں مرکزی وزیر داخلہ بنایا گیا اور جنرل اعظم خاں نے ان کی جگہ مشرقی پاکستان میں گورنر کا منصب سنبھالا۔ جنرل اعظم وزیر آباد کارٹی کی حیثیت سے خاصے کامیاب رہے تھے اور انہوں نے مغربی پاکستان میں کچھ مقبولیت حاصل کر لی تھی۔ یہ

صورتِ حال صدر کو ایک آنکھ نہ بھائی اور جنرل اعظم خاں کو ان کے احتجاج کے باوجود مشرقی پاکستان کا گورنر مقرر کر دیا گیا۔ جنرل اعظم خاں ایک متنازعہ شخصیت بن گئے۔ مشرقی پاکستان میں ان کی ابتدائی تقاریر میں مارشل لاء کی روایتی اکڑفوں کی جھلک نمایاں تھی تاہم انہیں مشرقی پاکستان کے عوام کی غربت' آلام' ناگہانی آفات کے مقابلے میں ان کے صبرواستقامت نیز ان سے روا رکھی جانے والی عدم توجہی نے خاصا متاثر کیا۔ چنانچہ انہوں نے بڑے جوش و جذبے سے عوام کی بہتری کیلئے کام شروع کیا۔ انہوں نے بہت سے عوامی اجتماعات سے خطاب کر کے عوام سے کئی وعدے کئے۔ بدقسمتی سے مرکزی حکومت کے عدم تعاون اور مالی وسائل کی کمی کے باعث وہ اپنے وعدوں پر عمل در آمد کرنے سے قاصر رہے۔

اگرچہ اس وقت مشرقی پاکستان کے عوام میں جنرل اعظم خاں کی مقبولیت کا خاصا ڈھنڈورا پیٹا جا رہا تھا لیکن اس میں صرف ایک حد تک ہی حقیقت تھی' ان کی دیانت داری' اخلاص اور عوام کی خدمت کیلئے ان کی خواہشات پر کسی کو شک نہیں تھا۔ تاہم جب عوام نے دیکھا کہ وہ بڑی آسانی سے وعدے تو کر لیتے ہیں لیکن انہیں عملی جامہ پہنانے کی اہلیت نہیں رکھتے تو ان کا تاثر مجروح ہونے لگا۔ با ایں ہمہ 30 جنوری 1962ء کو کراچی میں میری گرفتاری اور نظربندی کے بعد ان کی مقبولیت میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ عوام خاص طور پر نوجوان اور طالبِ علموں نے میری رہائی کا مطالبہ کیا۔ میری گرفتاری کے کچھ ہی عرصہ کے بعد صدر نے ڈھاکہ کا دورہ کیا تو یہ مطالبہ کچھ متشدد اور توہین آمیز مظاہروں کی شکل اختیار کر گیا۔ کہا جاتا ہے کہ جنرل اعظم نے میری گرفتاری پر اعتراض کیا تھا کیونکہ صدر اور وزیر داخلہ نے یہ فیصلہ کرتے وقت انہیں اعتماد میں نہیں لیا تھا۔ جنرل اعظم خاں کا کہنا تھا کہ اس گرفتاری سے مشرقی پاکستان میں سب سے زیادہ ردِّعمل کا اندیشہ تھا للذا مشرقی پاکستان کے گورنر سے اس ضمن میں مشورہ کیا جانا چاہئے تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جنرل اعظم خاں نے مرکزی حکومت کی ہدایت کے باوجود احتجاجی طلباء پر گولی چلانے یا تعزیری کارروائی کرنے سے انکار کر دیا تھا' بالآخر انہیں سبکدوش کر دیا گیا۔ انہیں مشرقی پاکستان سے رخصت ہوتے وقت جس قدر والہانہ عزت ملی وہ مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے کسی سرکاری یا غیر سرکاری شخص کے حصے میں نہیں آئی۔ جنرل اعظم خاں کے بعد جی ایم فاروق کو گورنر مقرّر کیا گیا۔ فاروق نے واپڈا اور پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن کے سربراہ کی حیثیت سے ترقیاتی شعبے میں شاندار خدمات سرانجام دیں تھیں۔ گورنر مقرر ہوتے ہی انہوں نے مشرقی پاکستان میں ترقیاتی کاموں پر توجّہ دینی شروع کی۔ انہوں نے حالات کے مطالعے سے جو حقیقت دریافت کی وہ ہمیں ہمیشہ سے معلوم تھی یعنی یہ کہ مشرقی پاکستان کی ترقّی کو بری طرح نظرانداز کیا گیا ہے۔ انہوں نے ریلوے شاہراہوں اور آبی آمدورفت برقی توانائی اور بجلی گھروں کی تعمیر و ترقی چھوٹی' بڑی صنعتوں کے قیام نیز ماہی گیری' زراعت اور جنگلات کی ترقی کیلئے جو منصوبے تیاّر کئے انہیں عملی جامہ پہنانے کیلئے مالی وسائل کی ضرورت تھی اور مرکزی حکومت مطلوبہ مقدار میں مالی اعانت بہم پہنچانے پر تیاّر نہیں تھی۔

طلباء نے ڈھاکہ اور پورے مشرقی پاکستان میں فوجی حکومت کی تعلیمی اصلاحات کے خلاف زبردست مظاہرے کئے۔ ان تعلیمی اصلاحات میں عوام کی اقتصادی حالت کو مدِّنظر رکھے بغیر ان پر ناقابل

برداشت مالی بوجھ ڈالا گیا تھا اگرچہ یہ مظاہرے مکمل طور پر پرامن تھے لیکن ناقابلِ فہم وجوہات کی بنا پر ایسٹ پاکستان رائفلز اور مسلح پولیس کو طلباء کی سرکوبی کیلئے طلب کیا گیا۔ بدقسمتی سے متعدد مقامات پر تصادم کے نتیجے میں کئی طالب علم جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

اس خطرناک صورتِ حال سے عہدہ برآ ہونے کے دو ہی راستے تھے۔ تدبّر سے کام لے کر افہام و تفہیم کی راہ نکالی جاتی یا وسیع پیمانے پر جبر و تشدد سے کام لیا جاتا۔ غلام فاروق نے پہلے راستے کا انتخاب کیا اور ٹیلی فون پر صدر سے منظوری حاصل کر لی صدر اس وقت لندن میں تھے۔ سختی سے احتراز کرنے پر بعد ازاں غلام فاروق کے کان اینٹھے گئے تاہم ان کی جبری سبکدوشی کی اصل وجہ یہ تھی انہوں نے اپنی ذات اور اپنے منصب کو صدر کی مجوزہ سیاسی جماعت مسلم لیگ (کنونشن) سے وابستہ کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ صدر کی خواہش تھی کہ گورنر درونِ خانہ اور کھلے عام جائز اور ناجائز ہر ممکن طریقے سے کنونشن مسلم لیگ کی حمایت کریں اور صوبے کا دورہ کر کے مسلم لیگ (کنونشن) کے حق میں مہم چلائیں۔ فاروق نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا اور انہیں مستعفی ہونا پڑا۔ ان کی جگہ ایک مرکزی وزیر عبدالمنعم خاں کو گورنر مقرر کر دیا گیا۔ غلام فاروق کی رخصتی کے بعد گورنر کا ایک ہی فرض ٹھہرا اور وہ یہ کہ صدر کی سیاسی جماعت کے حق میں جلسے منعقد کئے جائیں اور سرکاری ملازمین کی مدد سے کنونشن مسلم لیگ کو منظّم کیا جائے۔ وزراء کو صدر خود مقرر کرتے تھے اور وہ مجلسِ قانون ساز کے سامنے جوابدہ نہیں تھے لہٰذا وہ زیادہ وقت صدر کے گن گانے اور صدارتی جماعت کنونشن مسلم لیگ کو عوام سے متعارف کروانے میں صرف کیا کرتے تھے۔ یہ دیکھتے ہوئے سرکاری افسران بھی پیچھے نہ رہے اور تمام سرکاری سہولتوں اور انتظامی ڈھانچے کی مدد سے صدر کے حق میں سیاسی مہم چلانے لگے۔ سرکاری افسران قومی اور صوبائی اسمبلیوں کیلئے ضمنی انتخابات کے دوران صدارتی جماعت کے امیدواروں کی کامیابی کیلئے بنیادی جمہوریتوں کے رائے دہندگان پر دباؤ ڈالنے کا کام بھی کرتے تھے۔ وزراء کو دفتری امور کیلئے وقت ملتا تھا اور نہ انہیں اس کی خواہش تھی۔ انہیں سیکرٹریوں کے احکامات میں مداخلت کی اجازت نہیں تھی اور وہ دراصل صدر کے افسران تعلقات عامہ سے زیادہ حیثیت کے مالک نہیں تھے۔

عوامی سرمائے کا بے دریغ زیاں

اس سے قبل کسی حکومت نے ذاتی تشہیر اور اپنی عذر خواہی کیلئے قومی خزانے کو اس بے دردی سے نہیں لوٹا تھا۔

انقلاب کے فوراً بعد صدر نے خصوصی طور پر تیار کردہ ٹرینوں پر مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کا دورہ کیا۔ ان ٹرینوں کو بڑی سنجیدگی سے "پاک جمہوریت" کا نام دیا گیا تھا۔ (یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ اس سے پاکستانی جمہوریت مراد تھی یا "مقدس" جمہوریت) اس دورے پر ان کے ذاتی عملے کے علاوہ ملکی اور غیر ملکی صحافیوں کا ایک جم غفیر بھی ان کے ساتھ تھا جسے شاہانہ تواضع سے سرفراز کیا جاتا تھا۔

بیرونی دنیا کو مارشل لاء حکومت کی حیرت انگیز مقبولیت سے آگاہ کرنے والے سربر آوردہ قلم کاروں کو تحائف سے لاد دیا جاتا تھا۔ دوسرے "شاندار" انقلاب کی تعریف وثناء میں ادارہ برائے قومی تعمیرِ نو کی طرف سے شائع ہونے والے مواد کے پلندوں پر اٹھنے والی قومی دولت، اخبارات کا منہ بند رکھنے کیلئے دی جانے والی رشوت، نیز فوجی حکومت کے زریں کارناموں کی تفاصیل شائع کرنے والے بیرونی اخبارات کو ملنے والے تشہیری اخراجات کا محتاط اندازہ دماغ ماؤف کر دیتا ہے۔ ریڈیو بھی وقت کی راگنی چھیڑنے لگا۔ ملک بھر میں مقرّروں اور گلوکاروں کا گویا سیلاب آگیا۔ فلم اور ڈرامے کی دنیا کے نامور لوگ پورے ملک میں گھوم پھر کر حکومت کی ڈفلی بجانے لگے۔ سینما گھروں کو حکومت کی تشہیری فلمیں دکھانے پر مجبور کیا گیا اور یہ سب شاہ خرچیاں سرکاری خزانے کے بل بوتے پر کی گئیں۔

اگر ہم سرکاری افسروں کی تنخواہوں کا حساب لگائیں جو اپنے انتظامی فرائض کو پسِ پشت ڈال کر بر سرِ اقتدار حکومت کا پرچار کرنے میں مصروف رہے یا صدر، گورنر اور وزراء کی فوجِ ظفر موج کے دوروں پر اٹھنے والے مصارف اور ضائع ہونے والے وقت کا تخمینہ لگائیں تو ہم عوامی سرمائے کے زیاں کا بہتر اندازہ کر سکیں گے۔ فوجی حکومت نے اپنی مقبولیت کیلئے یا صدر اور اس کی سیاسی جماعت کی حمایت میں جو دولت صرف کی، کوئی سیاسی حکومت اس قسم کے کاموں پر اس کا ایک شمہ بھی خرچ کرنے کی ہمّت نہیں کر سکتی۔

ایوب کے نفاذ اسلام منصوبے پر تنقید

اقتدار میں انقلابی حکومت سیاسی مقاصد کیلئے اسلام کا نام استعمال کرنے کے خلاف تھی لیکن آگے چل کر عوامی تائید اور مقبولیت کے حصول میں مایوس ہو کر صدر ایوب نے آخری حربے کے طور پر اسلام کے ضابطۂ حیات پر زور دینا شروع کر دیا اور قوم کو تلقین کرنے لگے کہ وہ اسلام کے ابدی اصولوں کی پابندی کرے۔ (اسلامی اصولوں یا اسلامی ریاست کے بارے میں دوٹوک روّیئے کی عدم موجودگی میں یہ حوالے خاصے مبہم تھے تاہم ان سے عوام کے مذہبی جذبات کو ضرور ابھارا جا سکتا تھا جو بآسانی مذہبی انتہاپسندی کا رنگ اختیار کر سکتے ہیں) ایک زمانہ تو ایسا آیا جب صدر کی کوئی تقریر اسلام کے استحصال سے خالی نہیں ہوتی تھی۔ در آں حالیکہ انقلابی حکومت نے بر سرِ اقتدار آکر فوری طور پر جو قدم اٹھائے ان میں ایک ملک کے نام سے متعلق تھا۔ 1956ء کے آئین میں ملک کو "اسلامی جمہوریہ پاکستان" قرار دیا گیا تھا۔ انقلابی حکومت نے اسے تبدیل کر کے صرف پاکستان رہنے دیا تاہم سستی مقبولیت کی خواہش کے سامنے یہ روّیہ برقرار نہ رہ سکا۔ صدر کا خیال تھا کہ اپنی تقاریر میں جہاں تہاں "اسلام" یا "اسلامی روح" یا "اسلامی طرزِ حیات" کا حوالہ دے دینا کافی ہو گا۔ انہیں قطعاً اندازہ نہیں تھا کہ وہ جس سیلاب کا دروازہ کھول رہے ہیں اس پر بند باندھنا خود ان کیلئے بھی ممکن نہیں رہے گا۔ ان کی اس حرکت سے شہ پانے والے اس قدر آگے نکل جائیں گے کہ خود صدر کو ان کی گوشمالی کرنا پڑے گی۔ 1962ء کے آئین میں صدر نے

بین بین راستہ اختیار کرنے کی کوشش کی۔ یہ آئین ایک بنیادی فرق کے علاوہ 1956ء کے آئین کا چربہ تھا' یہ بنیادی فرق طرز حکومت سے تعلق رکھتا تھا۔ موخرالذکر آئین میں پارلیمانی طرزِ حکومت تجویز کیا گیا تھا جبکہ 1962ء کا آئین بظاہر صدارتی طرزِ حکومت کے نسخے پر مبنی تھا لیکن دراصل اس میں مطلق العنان آمریت کے تمام اجزاء موجود تھے۔ 1956ء کے آئین میں 5 مقامات پر قرآن وسنت کو اسلام کی بنیاد قرار دیا گیا تھا جبکہ 1962ء کے آئین سے یہ تمام حوالے حذف کر دیئے گئے۔ 1956ء کے آئین میں ایک ادارے کے قیام کی تجویز دی گئی تھی جسے ایک برس کے اندر اندر تمام موجودہ قوانین کو قرآن وسنّت سے ہم آہنگ کرنے کیلئے سفارشات پیش کرنا تھیں۔ سپریم کورٹ کے ایک ریٹائرڈ جج کی سربراہی میں یہ ادارہ فی الواقع قائم بھی کیا گیا اور اس میں علماء کے علاوہ تمام شہریوں کو بھی نمائندگی دی گئی۔ اس ادارے کی تیاّر کردہ رپورٹ پر کمیٹی میں شامل اہم عالم دین کو شدید اعتراضات تھے چنانچہ اسی رپورٹ کو شائع کرنے کی بجائے طاقِ نسیاں کی نذر کر دیا گیا۔

1962ء کے آئین میں اسلامی نظریاتی مشاورتی کونسل کے قیام کا اہتمام کیا گیا' کسی مجوزّہ قانون کے مذہبی بنیادوں پر چیلنج ہونے کی صورت میں کونسل کو مقننّہ کی رہنمائی کرنا تھی۔ علاوہ ازیں کونسل کو یہ دیکھنا تھا کہ آیا کسی قانون سے اسلامی فقہ یا احکاماتِ اسلامی کی خلاف ورزی تو نہیں ہوتی۔ صدر کا خیال تھا کہ عوام اس سمجھوتے کو قبول کرلیں گے لیکن ایک بار اسلام کے استحصال کی نظیر قائم کرنے کے بعد صدر ایوب کیلئے ان حضرات کے خلاف مزاحمت کرنا دشوار ہو گیا جو اس موضوع پر کہیں زیادہ عبور رکھتے تھے اور مذہبی مناقشہ بازی کے میدان کے شہسوار تھے۔ صدر ایوب کو اعلان کرنا پڑا کہ مملکت کا گذشتہ نام بحال کر دیا جائے گا۔ آئین میں قرآن وسنّت کے تمام حوالے از سرِنو داخل کیے جائیں گے۔ نیز قانون سازی کی تمام تجاویز کو منظوری کیلئے اسلامی نظریاتی کونسل کے حضور پیش کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ اسلامی نظریاتی کونسل کو تمام موجودہ قوانین کو "اسلامی روح" سے ہم آہنگ کرنے کی ذمہّ داری سونپی جائے گی۔

ناطقہ ان تجاویز کے قابلِ عمل ہونے کے بارے میں سر بگریباں ہے۔ تاہم "پاکستان ٹائمز" (یکم مئی 1963ء) کے مطابق صدر نے ایک جلسے سے خطاب کرتے ہوئے ان تمام امور پر روشنی ڈالی۔ ہندوستان کی جنگی تیاّریوں کا حوالہ دینے کے بعد انہوں نے سیاستدانوں کی خبرلی اور ان کے خلاف زبانِ طعن دراز کی۔ اس زہر افشانی کے دوران انہوں نے چار قومی مقاصد کا ذکر فرمایا۔ پہلا مقصد یہ تھا کہ "ہمیں مسلمانوں کی طرح جینا چاہئے اور عقل کے بھرپور استعمال کے بغیر یہ مقصد حاصل نہیں کیا جا سکتا"۔ (باقی تین مقاصد بھی ایسے ہی تہی از مغز اور ناقابلِ ذکر تھے)۔ انہوں نے اس الزام کی تردید کی کہ حکومت اسلام کو مسخ کر رہی ہے۔ "موجودہ حکومت صرف اور صرف اسلام سے قوّتِ محرکہ اور رہنمائی حاصل کرنا چاہتی ہے۔ ہم صحیح اسلامی روح بیدار کرنے پر زیادہ سے زیادہ توجّہ مرتکز کر رہے ہیں اور (ہماری نظر میں) اسلامی روح ہم آہنگی' سمجھوتے اور محبت کے اصولوں سے عبارت ہے"۔

قانون سازی کے شعبے میں تمام قوانین کو اسلامی نظریاتی کونسل سے منظور کروایا جاتا ہے۔ پہلے سے موجود

قوانین کو بھی اسلام سے ہم آہنگ کرنے کی غرض سے مشاورتی کونسل کے سپرد کیا جارہا ہے"۔ ان تمام غیر واضح، مبہم اور کھوکھلے بیانات کے بار آور ہونے کی توقع عبث تھی اور ان میں سے کسی پر بھی عمل در آمد نہ ہو سکا۔ اسلام کا اس سے زیادہ استحصال کیا ہو سکتا ہے؟ بااین ہمہ اس سے "شاندار" انقلابِ اکتوبر کے اصولوں سے ایک اور انحراف کی مثال سامنے آ گئی۔ تاہم یہ معاملہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا۔ اسلامی اور غیر اسلامی کی بحث بڑی متنازعہ فیہ ہے اور اس میں کسی ایک فیصلے یا تعبیر کو حتمی قرار دینا کارِ دارد ہے۔ آئین میں کہا گیا تھا کہ۔

○ ...... پہلے سے قائم شدہ ادارہ برائے تحقیقاتِ اسلامی تمام ضروری معلومات حاصل کر کے اسلامی نظریئے کی مشاورتی کونسل کو اپنی رائے سے آگاہ کرے گا۔

○ .... کونسل ادارہ برائے تحقیقاتِ اسلامی کی رائے سے اختلاف کر سکے گی اور اپنی رائے مقنّنہ کے سامنے رکھ دے گی۔

○ .... مقنّنہ زیرِ بحث موضوع پر دونوں اداروں سے اختلاف کرتے ہوئے اپنی رائے کے مطابق قانون سازی کا اختیار رکھے گی۔

○ .... صدر کو بھی مندرجہ بالا اداروں سے اختلاف کرنے اور اپنی رائے قائم کرنے کا اختیار حاصل ہو گا۔

سیاسی جماعتوں کے قانون 1962ء کے تحت اسلامی نظریہ حیات کے منافی مقاصد کی حامل کسی سیاسی جماعت کو کام کرنے کی اجازت نہیں ہو گی اور اس اہم سوال کا فیصلہ سپریم کورٹ کرے گی۔ ادھر علماء نے بھی اپنے نقطہ نگاہ کے مطابق ایک ادارہ تشکیل دے ڈالا اور دعویٰ کیا کہ اسلام سے متعلقہ مسائل پر اسی ادارے کی رہنمائی حتمی تصوّر کی جائے گی۔

قوم کو اس افراتفری کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ اسلام کو غیر ذمّہ دارانہ طور پر قومی معاملات میں ملوث کرنے پر کئی تنازعے اٹھ کھڑے ہوئے۔ سنی علماء کے دو کلیدی مکتبہ ہائے فکر یعنی دیوبندیوں اور بریلویوں کے درمیان تصادم میں کئی جانیں ضائع ہوئیں۔ شیعہ اور سنی فرقوں کے درمیان اختلاف کی دبی ہوئی چنگاریاں بھڑک اٹھیں۔ سندھ کے دور افتادہ پسماندہ دیہات سے لے کر لاہور جیسے جدید شہر تک خونریز فسادات پھوٹ پڑے۔ مذہبی انتہاپسندی کا جن بوتل سے باہر آ چکا تھا اور کسی کو علم نہیں تھا کہ یہ سیلاب بلا کس کس کے گھر جائے گا۔ اس سارے قضیے کی ذمّہ داری صدر پر عائد ہوتی تھی۔ احمدیوں (قادیانیوں) اور دوسرے مسلمانوں کا تنازعہ کا گڑھا مردہ با آسانی پھر سے زندہ کیا جا سکتا تھا۔ ایک مولوی نے جو اپنی خوشامد' منافقت اور موقعہ پرستی کے طفیل صدر کے مقرّبانِ خاص میں شامل ہو گیا تھا' مطالبہ کرنا شروع کر دیا کہ جداگانہ طرزِ انتخاب کو اسلام کے جزولاینفک کے طور پر دوبارہ بحال کیا جائے۔ اس مطالبے کے جواب میں وزیرِ قانون نے واضح روّیہ اختیار کرنے سے گریز کیا۔ در آں حالیکہ انقلابی حکومت نے اب تک دو ٹوک طریقے سے مخلوط طریق انتخاب کی حمایت کی تھی۔ اور حکومت کی طرف سے بنیادی

جمہوریتوں کے انتخابات سے لے کر مجالسِ قانون ساز اور صدر کے انتخابات تک مخلوط طرزِ انتخاب سے ہی کام لیا گیا تھا۔

امریکی امداد اور مشرقی پاکستان کی حق تلفی

توقعات کے عین مطابق انقلابی حکومت کا لبادہ اوڑھنے والی فوجی آمریت نے تمام جمہوری آزادیوں اور بنیادی حقوق کا گلا گھونٹ دیا۔ تمام سیاسی جماعتوں پر پابندی عائد کر دی گئی۔ سیاسی اجتماعات اور تقریر کا حق چھین لیا گیا۔ مزدوروں کی تنظیموں کو پابہ زنجیر کر دیا گیا۔ ہڑتالوں کو غیر قانونی قرار دے دیا گیا۔ آزادئی صحافت پر پہرے بٹھا دیئے گئے اور حکومت پر تنقید کو 14 سال قید بامشقت کا سزاوار جرم قرار دے دیا گیا۔ ادارہ برائے قومی تعمیرِ نو دھڑا دھڑ چاپلوسی کے شاہکار شائع کر رہا تھا اور اخبارات اپنی تصانیف کے اقتباسات سے کالے کئے جاتے تھے۔ مشرقی پاکستان کے چیف سیکرٹری نے گاہے بگاہے صحافیوں سے ملاقات کی اختراع نکالی اور ڈنڈے کی بجائے استدلال سے کام لینے کی راہ اختیار کی۔

ڈھاکہ سے شائع ہونے والا بنگالی روزنامہ "اتفاق" واحد اخبار تھا جو کبھی کبھار حکومتی اقدامات پر ہلکی پھلکی تنقید کرنے کی جسارت رکھتا تھا۔ اس اخبار کی اشاعت میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا۔ تفضّل حسین (مانک میاں) کا شمار مشرقی پاکستان کے ممتاز ترین سیاسی دانشوروں میں ہوتا تھا۔ عوام میں ان کے اثر ونفوذ اور ان کی تحریروں کے علاوہ ان کی شخصیت کو بھی خاصا دخل تھا۔ میرے وزیرِ اعظم بننے سے قبل وہ امریکہ کے کٹر مخالف تھے لیکن بعد ازاں انہوں نے زیادہ متوازن نقطۂ نظر اختیار کر لیا۔ امریکہ کی متعدد عالمی پالیسیوں کا نقّاد ہونے کے باوجود وہ عمومی طور پر پاکستان کیلئے امریکی امداد اور امریکی عوام کے اخلاص کے معترف تھے۔ امریکہ کو اپنے نقطۂ نگاہ کے فروغ کیلئے اصل حقائق کی بجائے حالات کی مسخ شدہ عکاسی میں باک نہیں تھا اور دنیا بھر میں دانشور حلقے اس روّیئے کے شاکی رہتے تھے۔ مغربی جمہوریتوں کی طرف ان کے روز افزوں میلان کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ وہ اشتراکیت سے خائف' بدگمان بلکہ باقاعدہ متنفر ہونے لگے۔ کیونکہ وہ اس طرزِ حکومت کو جمہوری آزادیوں کے منافی سمجھتے تھے۔ آخر میں ان کا روّیہ یہ تھا کہ اگر ہمیں اشتراکیت اور مغربی جمہوریتوں میں سے کسی ایک کا ہی انتخاب کرنا ہے تو پھر مغرب کا جمہوری نظام بمراحل بہتر ہے تاہم وہ امریکی طرزِ حیات کی اندھی تقلید کے بہر حال مخالف رہے۔

اگر امریکہ دانستہ یا نادانستہ طور پر کسی ملک میں جمہوریت کش حکومت کے ہاتھ مضبوط کرے تو ہمیں کیا کرنا چاہیئے؟۔ یہ سوال کئی ممالک میں عوامی اور جمہوری تحریکوں کے سامنے آیا ہے اور خود امریکہ سمیت کسی سے اس کا شافی جواب بن نہیں پڑا۔ آخر یہ استدلال کس حد تک قابلِ اطلاق ہو سکتا ہے کہ امریکہ کی اقتصادی اور فوجی امداد کسی حکومت کی بجائے بالآخر ملک کے عوام کے کام آتی ہے۔ یہ امداد بہر حال برسرِ اقتدار حکومت کے حوالے کی جاتی ہے۔ امریکہ زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتا ہے کہ امداد کے استعمال کے بارے میں عمومی خطوط پر رہنمائی کر دے۔ اس مشاورت کو رد بھی کیا جا سکتا ہے اور یہ کہ اس

قسم کی رہنمائی اور ہدایات کو متعلقہ ملک کے داخلی معاملات اور خود مختاری کے مترادف بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔

اگر یہ امداد آمرانہ حکومتوں کے ہاتھ مضبوط کرے یا فوجی، عوامی اور جمہوری تحریکوں کے خلاف استعمال کی جائے تو امریکہ اس ضمن میں کچھ نہیں کر سکتا۔ کوئی حکومت خواہ کتنی ہی جمہوریت کش کیوں نہ ہو اگر وہ اشتراکیت مخالف یا غیر جانبدار یا واقعی اشتراکی نہ ہو تو امریکہ اس خدشے کے پیشِ نظر اس کی امداد بند کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا کہ امریکی امداد کو سیاسی محرکات سے وابستہ نہ سمجھ لیا جائے یا یہ امداد بند ہونے کی صورت میں متعلقہ حکومت اشتراکیت کی آغوش میں نہ چلی جائے بلکہ بعض استثنائی حالات میں تو امریکہ کو اشتراکیت نواز حکومتوں کو بھی امداد دینا پڑتی ہے۔ چنانچہ اس امداد کو اصل مقاصد کی بجائے کارِ دیگر کیلئے استعمال کرنا زیادہ بعید از قیاس نہیں ہوتا بلکہ ضائع بھی کیا جاسکتا ہے۔ جمہوریت کے علمبردار ملک کے لئے یہ روّیہ کس حد تک قابلِ جواز ہے اس کے جواب میں اختلافِ رائے ہو سکتا ہے۔ قوم پرست عناصر کو اصرار ہے کہ امریکہ کو یہ مالی اعانت بحالیٔ جمہوریت کے ساتھ مشروط رکھنی چاہئے اگرچہ اقتصادی امداد کی بندش کو مستحسن نہیں کہا جاسکتا تاہم امریکہ کو شخصی اور مستبد حکومتوں کے ہاتھ مضبوط کرنے سے گریز کرنا چاہئے ورنہ امریکہ کو براہِ راست آمریتوں کی حوصلہ افزائی اور جمہوری تحریکوں کی حوصلہ شکنی کا مرتکب ٹھہرایا جاسکتا ہے۔

مانک میاں کو اس صورتِ حال پر شدید اعتراض تھا اور بلاشبہ اس ضمن میں وہ پورے مشرقی پاکستان کی ترجمانی کا فرض ادا کر رہے تھے کہ امریکی پوری طرح سے یہ علم رکھنے کے باوجود مرکزی حکومت کو براہِ راست امداد فراہم کرتے ہیں کہ یہ اعانت صرف مغربی پاکستان میں استعمال کی جائے گی اور اس طرح مشرقی پاکستان کی حق تلفی کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ ایک دفعہ مشرقی پاکستان میں صحافیوں سے بات چیت کرتے ہوئے امریکی سفیر نے اشارہ کیا کہ امریکہ مشرقی پاکستان کی ترقّی میں اعانت کرنے کیلئے تیّار ہے۔ اس پر غالباً مرکزی حکومت کے اشارے پر مغربی پاکستان کے اخبارات نے یک زبان ہو کر واویلا مچانا شروع کر دیا کہ امریکہ کو امداد کے استعمال کے بارے میں ہدایات دینے کا کوئی حق نہیں ہے اور یہ کہ امریکی سفیر کا بیان پاکستان کے داخلی امور میں مداخلت کے مترادف ہے۔ تعجّب انگیز طور پر مشرقی پاکستان میں نیپ کے سیکرٹری محمود علی نے بھی امریکی سفیر کے بیان کی مذمّت کی۔ ایک تو انہیں امریکہ کی ٹانگ کھینچنے کا موقع ہاتھ آیا تھا دوسرے وہ پاکستان کی آزادی، وقار اور استحکام کے بارے میں متفکر محبِ وطن کے طور پر شہیدوں میں نام لکھانے کے متمنی تھے۔ مانک میاں نے جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے امریکی سفیر کے خیالات کی تائید کی اور ان کے نقطۂ نگاہ کو ڈھاکہ ہائی کورٹ کے وکلاء کی تنظیم بار لائبریری سمیت صوبے بھر میں پذیرائی ملی۔ کچھ عرصے بعد حکومت کی انتظامی پالیسیوں پر مبیّنہ تنقید کے الزام میں فوجی حکومت نے مانک میاں پر مقدمہ چلایا لیکن استغاثہ کی نا اہلی کے باعث مانک میاں بری ہو گئے۔

مشرقی پاکستان میں صحافت پابہ زنجیر

تاہم حکومت مانک میاں پر مقدمے سے مطمئن نہ ہو سکی۔ مانک میاں کچھ عرصے سے مطالبہ کر رہے تھے کہ حکومت سرکاری اشتہارات کے ضمن میں مشرقی پاکستان کے اخبارات کو مغربی پاکستان کے اخبارات کے مساوی درجہ دے اور اخبارات کی اشاعت کے تناسب سے اشتہارات تقسیم کئے جائیں۔ انہوں نے "اتفاق" کے مقابلے میں کہیں کم اور بعض حالات میں بالکل معمولی اشاعت کے حامل مگر حکومت کے ثناء خواں اور کاسہ لیس اخباروں کو سرکاری اشتہارت سے سرپرستی بخشنے کی سرکاری پالیسی پر کڑی تنقید کی۔ علاوہ ازیں مغربی پاکستان کے اخبارات کیلئے اشتہارات کے نرخ مشرقی پاکستان کے اخبارات کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھے۔ مثال کے طور پر انگریزی روزنامے "ڈان" کو ایک انچ جگہ کیلئے 23 روپے اور اردو روزنامے "جنگ" کو ایک انچ جگہ کیلئے 16 روپے ادا کئے جاتے تھے۔ جبکہ مشرقی پاکستان میں روزنامہ "اتفاق" کیلئے ایک انچ جگہ کا نرخ صرف ساڑھے چار روپے مقرّر کیا گیا تھا۔ خاصی ردوّکد کے بعد "اتفاق" کیلئے اشتہاروں کے نرخ میں معمولی اضافہ کر کے غالباً چھ روپے فی انچ دیئے جانے لگے اور یوں مانک میاں اپنے کارکن صحافیوں کی تنخواہوں میں وہ اضافہ کرنے کے قابل ہو سکے جو ایک صدارتی حکومت کے تحت اخبارات کے مالکان پر لازم قرار دیا گیا تھا۔ بادی النظر میں یہ صدارتی حکم مشرقی پاکستان کے اخبارات کی کمر توڑنے کیلئے جاری کیا گیا تھا کیونکہ اپنے ملازمین کی تنخواہوں میں اضافے کی تمام تر خواہش کے باوجود مشرقی پاکستان میں اخباری مالکان سرکاری اشتہارات کے بغیر مجوّزہ اضافہ کرنے سے قاصر تھے چنانچہ ان کیلئے دو ہی راستے تھے' اخبارات کے معیار میں کمی کی جائے یا انہیں بالکل ہی بند کر دیا جائے۔ اشتہارات کے نرخوں میں اضافے کے ساتھ اسی سانس میں فوجی حکومت نے حکم دیا کہ حکومتی پالیسیوں سے اظہارِ اختلاف کی جرأت رکھنے والے چار اخبارات کو سرکاری اور نیم سرکاری اداروں کے اشتہارات کی فراہمی روک دی جائے۔ ان اخبارات میں "اتفاق" "سنگ باد" اور "پاکستان آبزرور" شامل تھے۔ روزنامہ اتفاق کی روز افزوں اشاعت 30000 کے لگ بھگ پہنچ چکی تھی۔ ان اخبارات کی بجائے مسلم لیگ کنونشن کے نوزائیدہ ترجمان "جہل" اور دیگر سرکار نواز اخبارات مثلاً - آزاد' "دی مارننگ نیوز" اور "دی ایسٹرن اگیزمینر " جیسے اخبارات پر سرکاری اشتہارات کی بارش ہونے لگی۔ موخر الذکر اخبار وزیرِ اطلاعات کی ملکیت تھا اور اس کی اشاعت صرف 200 تھی۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اشتہارات کی بندش کا حکم صدر ایوب نے 1962ء کے آئین کے نفاذ سے قبل بنفسِ نفیس جاری کیا تھا تاہم رسمی طور پر کابینہ کے حلف اٹھانے کے بعد یہ حکم وزارتِ اطلاعات کی طرف سے جاری کیا گیا۔ بااین ہمہ موخر الذکر نے اس حکم سے برأت کا اظہار کیا۔

صدر نے یہ کہہ کر اس غیر منصفانہ 'کجرو اور امتیازی حکم کی توجیہہ پیش کی تھی کہ حکومت قابلِ اعتماد اخبارات کو سرپرستی مہیّا کرنے میں حق بجانب ہے۔ نیز یہ کہ "حکومت ان اخبارات کو کیسے قابلِ اعتماد

سمجھ سکتی ہے جو حکومت کے اقدامات میں مین میخ نکالتے ہیں۔ چنانچہ حکومت ان ناقابل اعتماد اداروں سے کاروباری تعلق منقطع کرنے اور اپنے حامی اخبارات کو سرکاری اشتہارات سے نوازنے کا استحقاق رکھتی ہے" یقیناً کچھ لوگ اس روّیئے کو رشوت اور بدعنوانی قرار دیں گے کیونکہ اشتہارات کے حوالے سے حکومت اور اخبارات کے تعلق کو محض ایک عام اشتہار دہندہ اور اخبارات کے کاروباری تعلق کی اصطلاحات میں نہیں سمجھا جاسکتا۔ اخبارات کی سرپرستی کے اس اعلانیہ اظہار کا نتیجہ سوائے اخبارات کے اخلاقی انحطاط اور تعلق کے فروغ کے اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ اس دوران میں مانک میاں نے "ڈھاکہ ٹائمز" کے نام سے انگریزی ہفت روزے کا آغاز کیا جس میں مشرقی پاکستان کے حالات وواقعات پر دستاویزی مضامین شائع کئے جاتے تھے۔

جمہوریت کا ڈھونگ

اب میں صدر کے ایک اہم کارنامے کی طرف آتا ہوں اس انتہائی متنازعہ اقدام کا دنیا بھر میں کرائے کے ذرائع ابلاغ کے ذریعے دانش کی معراج اور پاکستان جیسے تیرہ نصیب اور گم کردہ راہ ملک کیلئے امرت دھارے کے طور پر ڈھنڈورا پیٹا گیا۔ پاکستان کے خیر خواہ جمہوری ممالک کیلئے اس مغالطہ آمیز استدلال کے پار جھانکنا آسان نہیں تھا کہ پاکستان کے کم سواد اور کم فہم عوام کو برائے نام جمہوریت کے نام پر مسلسل رہنمائی اور موزوں تربیت فراہم کی جارہی ہے۔ میرا اشارہ بنیادی جمہوریت کے اس نظام کی طرف ہے جس پر صدر ایوب کو بڑا ناز تھا وہ اسے ایسا الہامی نسخہ سمجھتے تھے جس کے ذریعے تاریخ میں پہلی بار عوام کو حکومت اور انتظامیہ میں شامل کیا جاسکے گا، بلکہ عوام خود ہی حکومت کہلا سکیں گے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ منصوبہ ادارہ برائے قومی تعمیرِ نو کے پہلے ڈائریکٹر بریگیڈئر ایف آر خاں کے ذہن رسا پر نازل ہوا تھا۔ صدر ایوب کی تمام پالیسیوں اور اقدامات کے پیچھے انہی ذات شریف کا دستِ مبارک کار فرما تھا۔ بریگیڈئر خاں نے بہت پر پرزے نکال لئے تو انہیں پہلے تنزلی کا سامنا کرنا پڑا اور پھر یک بینی ودو گوش ملازمت سے نکال باہر کئے گئے۔ ان کے اس زوال میں ان الزامات کو بھی دخل تھا جو انھوں نے صدر کے ایک چہیتے وزیر کے خلاف عائد کئے تھے۔ بریگیڈئر خاں اس منظورِ نظر کو وزارتِ اعلیٰ کے منصب کیلئے نا اہل سمجھتے تھے۔

بنیادی جمہوریتوں کے نظام کو بیک وقت دوہرے مقاصد پورے کرنا تھے ایک طرف تو فوجی آمریت کے نام سے بدکنے والے دوست ممالک کی خاطرِ جمعی کے لئے جمہوریت کا ڈھونگ کھڑا ہو جاتا، دوسری طرف صدر کو بیٹھے بٹھائے غیر سرکاری ملازمین کی ایسی سیاسی جماعت میسّر آجاتی جسے مختلف ہتھکنڈوں کے ذریعے اپنے اقتدار کی طوالت کیلئے استعمال کیا جاسکتا تھا۔ اس پر مزہ یہ کہ اس سیاسی جماعت کو سیاست کے جراثیم سے مکمل طور پر پاک رہنا تھا۔

اس نظام کا بنیادی خیال بنگال کے دیہات میں یونین بورڈ کے نام سے مقامی سطح پر کام کرنے والے خود مختار اداروں سے لیا گیا۔ بنگال میں چند دیہات کو ملا کر یونین کا نام دے دیا جاتا ہے۔ ہر یونین بورڈ میں

اوسطاً پندرہ دیہات شامل ہوتے ہیں اور کل آبادی 12000 کے قریب پہنچتی ہے' ہر یونین کو تین وارڈوں میں تقسیم کیا جاتا ہے اور ہر وارڈ کے مکین دوہری نیابت کے تحت دو نمائندوں کا انتخاب کرتے ہیں۔ یونین بورڈ میں تین نمائندے حکومت کی طرف سے نامزد کئے جاتے ہیں یہ تین نمائندے چھ منتخب نمائندوں کے ساتھ مل کر یونین بورڈ تشکیل دیتے ہیں اور اپنے سربراہ کا انتخاب کرتے ہیں۔ حکومت کے نمائندے مفید تعاون بہم پہنچانے کی بجائے حکومت کے گماشتوں کا کردار ادا کرتے تھے چنانچہ عطاء الرحمٰن خاں کی عوامی لیگ وزارت نے نامزدگیوں کا طریقہ ختم کرنے کا فیصلہ کیا۔ نئے نظام کے تحت تین وارڈ 9 نمائندوں کا انتخاب کرتے تھے نیز چیئرمین اور وائس چیئرمین کا انتخاب بھی یونین کے تمام رائے دہندگان براہِ راست کرتے تھے چنانچہ بورڈ کے تمام گیارہ ارکان منتخب نمائندے ہوتے تھے۔

یونین بورڈ مقامی نوعیت کے امور مثلاً چوکیداری' دیہی ذرائع آمدورفت چھوٹے موٹے ترقیاتی کاموں اور دیہات کے تعلیمی اداروں کا بندوبست کرتے تھے۔ مقامی محصولات کی آمدنی سے ان اخراجات کا پورا ہونا دشوار تھا لیکن بعد ازاں انہیں محصولات عائد کرنے کا اختیار دے دیا گیا تھا۔ یونین بورڈ کے چیئرمین کو عام طور پر عوام کا اعتماد حاصل ہوتا تھا اگرچہ اس میں استثنیٰ کی گنجائش تھی۔ مغربی پاکستان میں ایسے مقامی اداروں کی کوئی روایت نہیں ملتی۔ دیہاتی علاقوں میں پنچائتوں کا نظام پایا جاتا تھا تاہم انہیں مقامی انتظامی اداروں کی بجائے سماجی اداروں کا درجہ حاصل تھا۔

بنیادی جمہوریتوں کے نظام کے تحت مشرقی پاکستان کے دیہات میں 1500 اور مغربی پاکستان کے دیہات میں 1000 افراد پر مشتمل آبادی کو ایک یونٹ قرار دیا گیا۔ ہر یونٹ کو ایک نمائندہ منتخب کرنے کا اختیار دیا گیا۔ دس یونٹ مل کر ایک یونین کونسل تشکیل دیتے تھے۔ ہر یونین کونسل میں 5 نمائندے حکومت کی طرف سے نامزد کئے جاتے تھے یہ پندرہ نمائندے مل کر ایک چیئرمین کا انتخاب کرتے تھے۔ شہروں کیلئے بھی اسی قسم کا نظام وضع کیا گیا تھا البتہ یہاں پر مختلف یونٹوں کو ملا کر یونین کونسل کی بجائے یونین کمیٹی قائم کی جاتی تھی۔ یہ بنیادی جمہوریتوں کی سب سے نچلی سطح تھی۔

اصولی طور پر ہر صوبے میں کونسلوں اور کمیٹیوں کی تعداد 4000 تھی یعنی ملک کے ہر حصے میں بنیادی جمہوریتوں کے 40000 نمائندے منتخب کئے جاتے تھے۔ در حقیقت ان یونٹوں کی حد بندی بے حد افراتفری میں کی گئی تھی اور یہ اعداد و شمار محض تخمینے کی حیثیت رکھتے تھے۔ یونین کونسل اور یونین کمیٹی سے اوپر مشرقی پاکستان میں تھانہ کونسل اور مغربی پاکستان میں تحصیل کونسل کا درجہ آتا تھا۔ یونین کونسلوں اور یونین کمیٹیوں کے منتخب چیئرمین علاقے کی تھانہ کونسل یا تحصیل کونسل کے رکن قرار پاتے تھے۔ علاوہ ازیں مساوی تعداد میں حکومت کے نمائندے ان کونسلوں کیلئے نامزد کئے جاتے تھے۔ تحصیل دار کو تحصیل کونسل یا تھانہ کونسل کا سربراہ مقرّر کیا جاتا تھا ان کونسلوں کو کسی قسم کے انتظامی امور کی ذمّہ داری نہیں سونپی گئی تھی بلکہ ان کی حیثیت محض نگران اداروں کی تھی۔ ان کونسلوں کے بعد یعنی بنیادی جمہوریتوں کی تیسری سطح پر ضلع کونسل قائم ہوتی تھی جس کی سربراہی ڈپٹی کمشنر کرتا تھا۔ اس کونسل میں سرکاری ملازمین

اور غیر سرکاری افراد کی تعداد یکساں ہوتی تھی۔ ضلع کونسل کے تمام ارکان کو حکومت نامزد کرتی تھی البتہ ان ارکان میں ایک چوتھائی تعداد یونین کونسلوں یا یونین کمیٹیوں کے سربراہوں کی ہوتی تھی۔ اس کے بعد یعنی چوتھی سیڑھی پر ڈویژن کونسل کا قیام عمل میں لایا جاتا تھا۔ ڈویژن کونسل میں بھی تمام ارکان حکومت منتخب کرتی تھی اور اس میں بھی سرکاری ملازمین اور غیر سرکاری افراد کی تعداد یکساں ہوتی تھی۔ ڈویژن کونسل کو انتظامی امور سرانجام دینے کی بجائے محض نچلے اداروں کی نگرانی کرنا ہوتی تھی۔ ان سب سے اوپر صوبائی ترقیاتی مشاورتی کونسل تھی جس کی سربراہی گورنر کرتا تھا۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس کونسل کے بھی تمام ارکان حکومت نامزد کرتی تھی۔ نصف ارکان سرکاری ملازمین ہوتے تھے اور نصف ارکان شہری آبادی سے نامزد کئے جاتے تھے۔ کل ارکان کا چھٹا حصہ یونین کونسلوں یا یونین کمیٹیوں کے منتخب سربراہوں پر مشتمل ہوتا تھا۔

اس نظام کا اعلان اس وقت کیا گیا جب لوگ مارشل لاء کے نفاذ سے سہمے ہوئے تھے۔ یونین کونسلوں اور یونین کمیٹیوں کا انتخاب بھی اس وقت منعقد کیا گیا جب مارشل لاء کی چھتری تلے سرکاری ملازمین انتہائی طاقتور ہو چکے تھے اور ان پر رائے عامہ کا کوئی دباؤ نہیں تھا۔ انتخابات کیلئے پرانی انتخابی فہرستوں کو استعمال کیا گیا تاہم اعلان کیا گیا کہ مقامی حکّام کسی شخص کی سابقہ سیاسی وابستگی کی بناء پر بحیثیت امیدوار یا رائے دہندہ اس کا نام انتخابی فہرست سے خارج کرنے کے مجاز ہوں گے۔ کسی ناپسندیدہ شخص کو منتخب ہونے کے بعد بھی نا اہل قرار دیا جا سکتا تھا۔ نا اہلی یا برطرفی کے ممکنہ اسباب کی ایک طویل فہرست شائع کی گئی۔ سیاسی جماعتوں پر پابندی عائد تھی اور کسی کو ان کا ذکر تک کرنے کی اجازت نہیں تھی البتہ سیاسی جماعتوں پر زبانِ طعن دراز کرنے کیلئے کسی کی اجازت کی ضرورت نہیں تھی۔ صرف وہی اشخاص کسی حلقے سے بطور امیدوار انتخاب لڑنے کا استحقاق رکھتے تھے جن کا نام حلقے کی انتخابی فہرست میں بطور رائے دہندہ درج تھا۔ چنانچہ مقامی سربر آوردہ اشخاص کی بالادستی کو کسی بیرونی مداخلت کا خدشہ نہیں تھا۔

مارشل لاء کے بھرپور استبداد کے علاوہ ان ذلت آمیز شرائط کے باعث عزتِ نفس کا احساس رکھنے والے افراد کیلئے انتخاب میں حصہ لینا ممکن نہ رہا۔ بے شک کچھ معتبر حضرات نے انتخابات میں حصہ لیا اور کامیاب بھی ہوئے تاہم منتخب ارکان کی اکثریت ایسی تھی جو کسی غیر جانبدار اور منصفانہ انتخاب میں کامیاب ہونے کا تصوّر بھی نہیں کر سکتی تھی۔ ان میں بہت سے مختلف جرائم کی بناء پر سزائیں کاٹ چکے تھے یا مشکوک چال چلن کے باعث پولیس کی نگرانی میں رہتے تھے۔ بنیادی جمہوریتوں کے کچھ ارکان پولیس کے گماشتے یا مخبر تھے۔ بہت سے حلقوں میں کسی شخص نے کاغذات نامزدگی جمع نہ کروائے اور مقامی حکّام کو مناسب امیدوار تلاش کرنے میں خاصی دقت پیش آئی اور یہ امیدوار بلا مقابلہ منتخب ہو گئے۔ جہاں مقابلے کی نوبت آئی وہاں لوگوں کی بے حد معمولی تعداد نے ووٹ ڈالے اور رائے دہندگان کو جبراً انتخابی سٹیشنوں

تک لے جایا گیا تاہم رائے دہندگان کی محدود تعداد کے پیشِ نظر بعض حلقوں میں ان گنت امیدوار کھڑے ہو گئے۔ ایسے حالات میں منتخب ہونے والے افراد کو عوامی نمائندے تو نہیں کہا جا سکتا تھا البتہ یہ امید ضرور کی جا سکتی تھی کہ یہ لوگ مقامی حکّام کے احکامات سے سرِمو انحراف نہیں کریں گے اور دل وجان سے صدر کی حمایت کریں گے۔

انتخابات کے مخصوص حالات سے قطعِ نظر اس قدر محدود انتخابی حلقوں کے باعث معزز اور صاحبِ کردار افراد کے منتخب ہونے کی توقع عبث تھی ایسے افراد عام طور پر وسیع حلقوں میں اثرونفوذ کے مالک ہوتے ہیں۔ محدود انتخابی حلقوں میں عام طور پر مقامی سطح کے غنڈے اور اوباش لوگ منتخب ہوتے ہیں جو اپنے مجرمانہ کردار کے باعث پولیس کے دباؤ کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ مغربی پاکستان میں ایسے افراد کو قبائلی ' فرقہ وارانہ ' برادری ' خاندانی اور جاگیردارانہ روابط اور تعلقات کی پشت پناہی مل سکتی ہے۔ چنانچہ یہ نظام نمائندہ اداروں کے طور پر بنگال کے یونین بورڈوں سے بہتر ہونے کی بجائے بدتر ثابت ہوا۔ علاوہ ازیں اس نظام کی مختلف سطحوں پر نامزدگیوں کی بھرمار نے گویا بیڑا ہی غرق کر دیا۔

فوجی انقلاب کا سیاسی نقطہ نظر عوام کے بارے میں بداعتمادی نیز ان کی ذہانت ' دیانت داری اور سوجھ بوجھ کی تحقیر کے جذبات سے عبارت تھا اور بنیادی جمہوریتوں کا نظام ایسے سیاسی نقطۂ نگاہ کا منطقی نتیجہ تھا۔ بنیادی جمہوریتوں کے بارے میں حکومت کی طرف سے شائع کردہ ایک چھوٹے سے پمفلٹ میں ان مقاصد کو بالکل واضح طور پر بیان کیا گیا تھا۔ اس نظام کا مقصد نامزد لوگوں کا ایک ایسا گروہ پیدا کرنا تھا جسے سرکاری حکّام موقع محل کی مناسبت سے خوشامد ' رشوت ' نازبرداری ' دھونس ' دباؤ اور جبر کے ذریعے حکومت کے ہر اقدام کی حمایت پر آمادہ کر سکیں۔ لیکن اسے عالمی رائے عامہ کے سامنے عوام کے نمائندہ نظام کے طور پر پیش کیا جا سکے۔ مناسب وقت آنے پر جب مجلسِ قانون ساز کا فیصلہ ہوا تو یہ لوگ اسمبلی کے ارکان کا چناؤ کریں گے اور اگر صدر نے خود کو انتخابی آزمائش کیلئے پیش کرنا چاہا تو یہ لوگ صدر کے انتخاب کیلئے بھی رائے دہندگان کا کردار ادا کریں گے۔

تعلیم یافتہ طبقے کی توہین

بنیادی جمہوریتوں کے نظام کی ایک اضافی خوبی یہ تھی کہ اس نے ملک کے تمام تعلیم یافتہ طبقے کو مقننہ کیلئے رائے دہی کے حق سے محروم کر دیا۔ محولا بالا بیش قدر مقالے کے مطابق چونکہ ملک میں تعلیم (تعلیم کو یہاں خواندگی کے محدود معنوں میں نہیں بلکہ قومی نقطۂ نگاہ اور شعور کے وسیع تر معنوں میں لیا گیا ہے) کے نظام کو بار آور ہونے کیلئے ایک طویل عرصہ درکار ہو گا اور صدر کے خیال میں یہ عرصہ 20 سے 25 سال پر محیط ہو گا لہٰذا اس وقت تک بنیادی جمہوریتوں کا نظام ملک کے سیاسی نظام کی بنیاد کا کام دے گا۔ اس خیال کے مدِنظر اس نظام کو صدر کے نافذ کردہ 1962ء کے آئین کا بھی جزو لاینفک بنایا گیا۔

ملک کوایک بار پھر سے 1882ء کے حالات میں دھکیل دیا گیااور اس وقت سے اب تک ہونے والی سیاسی جدوجہد، منتخب اداروں کی تاریخ، عوام کو ملنے والی سیاسی تعلیم اور کامیابیوں کو دوشیزہ کی خطا کی طرح فراموش کر دیا گیا۔ اس منصوبے کا بنیادی فلسفہ یہ تھا کہ پاکستان کا عام دیہاتی اپنے گاؤں کا مفاد تو سمجھ سکتا ہے لیکن وہ یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ اس کے ملک کو بھی چوکس اور دیانت دار انتظامیہ کی ضرورت ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ قومی شعور سے بہرہ ور نہیں ہے۔ چنانچہ قومی سطح پر انتخابات کے انعقاد سے قبل اسے اپنے برے بھلے کی پہچان کروانے کیلئے تعلیم کی اشد ضرورت ہے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو اسے ایسے افراد کا انتخاب کرنا پڑے گا جن کی خوبیوں اور خامیوں کے بارے میں اس کا علم صفر ہو گا اور حریف امیدواروں کے درمیان ناجائز ہتھکنڈوں کا مقابلہ شروع ہو جائے گا۔ شاید کسی اور ملک کے حکمرانوں نے اپنے عوام کو اس قدر حقارت کا مستحق نہیں سمجھا ہو گا۔ بظاہر مارشل لاء کے سرغنوں نے اس حقیقت کو دانستہ نظرانداز کرنا قرینِ مصلحت سمجھا۔ یہ تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اس حقیقت سے بے خبر تھے کہ سیاسی جماعتوں کی بنیاد پر انتخابات عوام کی تعلیم و تربیت کا بہترین ذریعہ ہیں کیونکہ ان جماعتوں کو اپنے منشور اور اصولوں کی بناء پر اپنے وجود کا جواز پیش کرنا پڑتا ہے۔ اسی طرح امیدواروں کے انتخاب میں بڑی احتیاط سے کام لیا جاتا ہے کیونکہ غیر موزوں کردار کے حامل امیدواروں کو ٹکٹ دے کر کوئی جماعت اپنے ووٹ ضائع کرنے کا تصوّر بھی نہیں کر سکتی۔ درحقیقت سیاسی جماعتوں کی موجودگی میں انتخابات میں ناجائز ذرائع کے مقابلے کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا۔ 1962ء کے آئین کے تحت عام انتخابات کے انعقاد کے دوران یہ حقیقت بھرپور طریقے سے سامنے آئی تھی چنانچہ پاکستانی عوام کے شعور کی اس اہانت کا کوئی جواز نہیں تھا۔

مشرقی پاکستان کے عوام نے ہر انتخاب میں بہتر سیاسی شعور اور قوّتِ فیصلہ کا مظاہرہ کیا تھا جبکہ مغربی پاکستان میں جاگیردار اشرافیہ بے حد طاقتور تھی۔ مزید برآں برطانوی حکومت اس خطّے سے ہندوستانی فوج کے لئے بھرتی کی روایت کو برقرار رکھنا چاہتی تھی چنانچہ ان دونوں عوامل نے علاقے کے عوام میں سیاسی شعور کو پنپنے کا موقع نہ دیا[22] تاہم حریف سیاسی جماعتوں کی مساعی کے نتیجے میں عمومی جہالت میں مسلسل کمی واقع ہو رہی تھی۔ تقسیم کے بعد منعقد ہونے والے صوبائی انتخابات سے ثابت ہو گیا تھا کہ اگر حکومت ناجائز مداخلت سے کام نہ لیتی تو عوام حریف سیاسی جماعتوں اور مختلف امیدواروں کے درمیان مناسب چناؤ کی صلاحیتوں سے بہرہ ور تھے۔ آج جن لوگوں کے شعور کو گاؤں کی سطح تک محدود ہونے کا طعنہ دیا جا رہا تھا انہی لوگوں نے اپنے بیدار سیاسی شعور کی مدد سے پاکستان کی تخلیق میں حصہ لیا تھا۔

بنیادی جمہوریتوں کی تنسیخ کا عوامی مطالبہ

اس منصوبے کے تحت اقتدار عوام کے ہاتھوں میں منتقل کرنے کا دعویٰ کیا گیا تھا۔ یہ بھی کہا گیا کہ ان اداروں میں نامزد سرکاری افسران کو محض اس نظام کی مختلف سطحوں نیز بنیادی جمہوریتوں اور حکومت

کے درمیان رابطہ افسران کی حیثیت حاصل تھی۔ منصوبے کے مطابق یونین کونسلوں اور یونین کمیٹیوں کو درج ذیل شعبوں کا انتظام چلانا تھا۔ بلدیاتی انتظامیہ' عدلیہ 'پولیس 'ترقیات 'اور قومی تعمیرِ نو۔ آخر الذکر اصطلاح اس قدر غیر واضح تھی کہ اسے محض ایک کھوکھلا نعرہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ ابتدائی جوش و خروش کے ٹھنڈا ہونے کے بعد ان اداروں کو پسِ پشت ڈال دیا گیا حتیٰ کہ انہیں استعمال کرنے کا وقت آن پہنچا۔ خاصے للو پتو کرنے کے بعد ان اداروں کو یہ احساس دلایا گیا کہ وہی زمامِ حکومت کے اصل مالکان ہیں اور اس دعویٰ کو ثابت کرنے کیلئے بنیادی جمہوریتوں کو 29 شعبوں میں محصولات عائد کرنے کا اختیار دے دیا گیا۔ یونین کونسلوں اور کمیٹیوں کے سربراہان کو محصولات جمع کرنے اور دیگر انتظامی امور میں متعلقہ افسران کی اعانت کرنے کیلئے کہا گیا۔ انہیں بھاری بجٹ تیار کرنے 'مختلف طریقوں سے عوام پر محصولات عائد کرنے اور اس طرح حاصل ہونے والی آمدنی کو ترقیاتی کاموں پر صرف کرنے کا اختیار دے دیا گیا۔ تحصیل دار کو بجٹ منظور کرنے کا اختیار دے دیا گیا تھا اور وہ مناسب محصولات عائد نہ ہونے کی صورت میں بجٹ رد کرنے کا مجاز تھا۔

بے شک یونین کونسلوں کا کام پھولوں کی سیج نہیں تھا۔ دیہی عوام خاص طور پر مشرقی پاکستان کے باشندے مزید محصولات کا بوجھ برداشت کرنے کے قابل نہیں تھے۔ فی الحقیقت ان کی اقتصادی حالت اس قدر پتلی تھی کہ وہ نان شبینہ اور دو کپڑوں کا بھی مشکل سے بندوبست کر پاتے تھے۔ تعلیم یا صحت جیسے ثانوی امور پر توجہ دینا ان کی استطاعت سے باہر تھا چنانچہ محصولات عائد تو کر دیئے جاتے تھے لیکن وصول نہیں ہو پاتے تھے اور اگر وصول کر لئے جاتے تو بلدیاتی ادارے اس قدر غیظ کا نشانہ بنتے کہ عوام کھلم کھلا اس نظام کی تنسیخ کا مطالبہ کرنے لگتے جو محض صدر کے اقتدار کو طول دینے کا فریضہ انجام دے رہا تھا یا یونین کونسلوں کے چیئرمینوں کی جیب بھرنے کے کام آتا تھا۔ بنیادی جمہوریتوں کے ذریعے دیانتدار نمائندے منتخب ہو سکے اور نہ حکومت کا عوام سے رابطہ قائم ہو سکا۔

ترقیاتی فنڈ کا غبن

محصولات سے ہونے والی آمدنی یونین کونسل کے چیئرمین کے تصرّف میں ہوتی تھی اور مقامی سرکاری افسر کی طرف سے منظور کردہ ترقیاتی منصوبوں پر صرف ہوتی تھی۔ عام خیال یہ تھا کہ یہ آمدنی مختلف حیلوں بہانوں سے چیئرمین کی ذاتی جیب میں جاتی تھی وہ تمام ترقیاتی منصوبوں پر عمل در آمد کا ذمّہ دار تھا اسے آڈٹ وغیرہ کی رسمی کارروائی کے بغیر اخراجات کی تصدیق کرنے کا اختیار حاصل تھا یونین کونسلوں کے بیشتر سربراہوں کی مالی حالت حیرت انگیز طور پر بہتر ہونے لگی' اس بد عنوانی کا نتیجہ یہ تھا کہ یونین کونسلوں کے ارکان اور سربراہ مقامی حکاّم کی جوتیاں سیدھی کرتے تھے۔ مجلسِ قانون ساز کے ضمنی انتخابات میں سرکاری حکام نے بنیادی جمہوریتوں کے ارکان کو سرکاری امیدوار کے حق میں رائے دینے پر مجبور کیا اور

دھمکی دی کہ حکم عدولی کی صورت میں ان کے خلاف بد عنوانی کے الزامات کے تحت کارروائی کی جائے گی۔ ایسے دباؤ کی کچھ خاص ضرورت نہیں تھی کیونکہ بنیادی جمہوریتوں کے بہت کم ارکان سرکاری احکامات سے سرتابی کی جرأت رکھتے تھے۔ تاہم ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ بنیادی جمہوریتوں کے بعض ارکان نے جرأتِ رندانہ سے کام لیکر ملک کے بہتر جمہوری مستقبل کی امید روشن رکھی۔ بعض حلقوں میں فقید المثال مالی اعانت کو قابلِ تعریف طور پر تعمیراتی کاموں اور ترقیاتی منصوبوں پر صرف بھی کیا گیا۔ امریکی حکومت نے فوجی حکومت اور بعد ازاں شخصی آمریت کو جو اقتصادی امداد فراہم کی اس کے باعث حکومت کی طرف سے بلدیاتی اداروں کو اتنی مالی اعانت بہم پہنچانا ممکن ہو گیا جس کے بارے میں گزشتہ حکومتیں سوچ بھی نہیں سکتی تھیں۔

محصولات کے علاوہ یونین کونسلوں کے سربراہوں کو اور بھی کئی اختیارات سونپے گئے جن سے وہ اپنی دولت میں معتدبہ اضافہ کر سکتے تھے، عائلی قوانین کے صدارتی حکم کے تحت بنیادی جمہوریتوں کے ارکان کو شادی اور طلاق کی رجسٹریشن نیز عائلی تنازعوں کی صورت میں مصالحت کے اختیارات بخش دیئے گئے۔ قانونی کمیشن کی سفارشات کے علی الرغم ان مقامی اداروں کو محدود نوعیت کے مقدمات کی سماعت کا بھی اختیار دے دیا گیا انتقالِ جائیداد کی غرض سے شہریت کے تصدیق نامے بھی یہی بلدیاتی ادارے جاری کرتے تھے اور اس اختیار کو با آسانی ناجائز آمدنی کا ذریعہ بنایا جا سکتا تھا۔ امریکہ کے ادارہ برائے بین الاقوامی تعاون نے جان بیل کی سربراہی کے دوران دیہی ترقی کا ایک منصوبہ تیار کیا تھا جس سے دیہی علاقوں کو بے حد فائدہ پہنچا۔ حتیٰ کہ مشرقی پاکستان کے مختلف علاقوں سے سماجی کارکنوں نے مجھ سے رابطہ قائم کیا کہ میں اپنے روابط سے کام لیکر دیہی ترقی کے منصوبے کو ان کے علاقوں میں شروع کروا دوں۔ یہ لوگ دیانتداری سے ان منصوبوں پر عمل در آمد کی نیت رکھتے تھے۔ نامعلوم وجوہات کی بنا پر ادارہ برائے بین الاقوامی تعاون (بعد ازاں اس ادارے کو امریکی ادارہ برائے بین الاقوامی امداد کا نام دیا گیا) نے اس منصوبے کو ترک کر دیا۔ اس اقدام سے ادارے کا تشخص اور افادیت مجروح ہوئی، دیہی ترقی کے منصوبے کے تحت ضلع کونسلوں کو گراں قدر امداد دی گئی تھی تا کہ نچلی سطح پر ترقیاتی منصوبے شروع کئے جا سکیں۔

ناقابل تلافی انحطاط

بنیادی جمہوریتوں کے منتخب ارکان کو بے ضمیری اور بد عنوانی کے ثمرات سے پوری طرح آشنا کرنے کے بعد بنیادی جمہوریتوں کے ارکان سے استفسار کیا گیا کہ وہ صدر کی حمایت کرتے ہیں یا نہیں؟ انتخاب کے انعقاد کے موقع پر مارشل لاء کا سورج پوری قہر سامانیوں کے ساتھ ملکی افق پر جلوہ فگن تھا اور صدر کی ذات پر انگشت نمائی کی سزا چودہ سال قید بامشقت تھی۔ صدر واحد زندہ امیدوار تھے۔ صدر کے خلاف جانے والے ووٹوں کا سزاوار ایک سیاہ بکس کو ٹھہرایا گیا جسے تخیل کی پرواز کے سہارے حریف امیدوار قرار دیا جا سکتا تھا تعجب انگیز طور پر مشرقی اور مغربی پاکستان میں کچھ رائے دہندگان نے صدر کے خلاف رائے

دینے کی جسارت کر ڈالی تاہم مجموعی طور پر صدر نے ننانوے اعشاریہ آراء حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کرلی جس پر کسی تبصرے کی ضرورت نہیں۔ صدر کا کہنا تھا کہ ان کی کامیابی سے مندرجہ ذیل نتائج اخذ کیے جاسکیں گے۔

☆..... عوام نے ان پر اعتماد کا اظہار کیا ہے۔

☆..... انہیں ملک کے لئے اپنے حسبِ منشاء آئین تشکیل دینے کا اختیار مل جائے گا۔

☆..... صدر کسی مزید انتخاب کے بغیر اس مدت تک حکومت کر سکیں گے جس کا تعین وہ خود آئین کے نفاذ کے بعد کریں گے۔

آئینی کمیشن نے سفارش کی تھی کہ مجلسِ قانون ساز کے لئے بالغ حقِ رائے اور مخلوط طرزِ انتخاب کی بنیاد پر براہِ راست انتخابات کروائے جائیں تاہم توقعات کے عین مطابق صدر نے اپنی خداداد دانش کے ذریعے فیصلہ صادر کیا کہ مجلسِ قانون ساز کے لئے صرف بنیادی جمہوریتوں کے ارکان کو ووٹ کا حق حاصل ہو گا۔ چنانچہ 1962ء کے آئین کے نفاذ کے بعد بنیادی جمہوریتوں کے ارکان نے صوبائی اور مرکزی مجالسِ قانون ساز کے لئے ووٹ ڈالے، مرکزی مقننہ کی ہر نشست کے لئے رائے دہندگان کی اوسط تعداد 500 تھی اور صوبائی مجلسِ قانون ساز کی ہر نشست کے لئے تعداد محض 250 تھی۔ بعض حلقوں میں امیدواروں کی تعداد 30 تک جا پہنچی تھی۔ جنہیں امید تھی کہ وہ اپنے چند دوستوں کی مدد سے مجلسِ قانون ساز کے لئے منتخب ہونے میں کامیاب ہو جائیں گے، سرکاری اخبارات نے ان انتخابات کو جمہوریت کی زریں کامیابی قرار دیا۔ اب تک صدر کو سیاسی جماعتوں کا نام تک سننا پسند نہ تھا۔ تمام سیاسی جماعتوں پر پابندی عائد تھی۔ امیدواروں کو سیاسی وابستگی کی بنیاد پر انتخابی مہم چلانے کی اجازت نہیں تھی۔ بنیادی جمہوریتوں کے ارکان کو ہدایت کی تھی کہ صرف اسی امیدوار کو ووٹ دیں جسے وہ اپنا مناسب ترین نمائندہ تصور کرتے ہوں۔ کسی امیدوار کو اپنے طور پر سیاسی اجتماع منعقد کرنے کی اجازت نہیں تھی، حکام متعلقہ انتخابی حلقے کے تمام ارکانِ بنیادی جمہوریت کو ایک جگہ جمع کر لیتے تھے اور تمام امیدوار انہیں خطاب کرتے اور سوالات کے جواب دیتے۔ کچھ امیدوار تملق کی بھونڈی کوشش کرتے ہوئے بنیادی جمہوریتوں کے ارکان کو ملک کے لئے ریڑھ کی ہڈی قرار دیتے اور عوام کے حقیقی نمائندوں کے خطاب سے نوازتے۔ کچھ امیدوار وعدہ کرتے کہ وہ بنیادی جمہوریتوں کے نظام کے تسلسل کی تائید کریں گے، کچھ اسلام اور اسلامی آئین کا نعرہ بلند کرتے کچھ سرگشتۂ خمارِ رسوم وقیود ایسے بھی تھے جو منتخب ہونے کی صورت میں جمہوریت کے لئے جدوجہد کا اعلان کرتے تھے۔

بایں ہمہ انتخابات میں اصولوں کو کچھ ایسا دخل نہ تھا خاص طور پر ان علاقوں میں جہاں جاگیرداری کا زور تھا مغربی پاکستان کے شہری علاقوں میں انتہائی دولت مند صنعت کاروں اور پرمٹ ہولڈروں کا ایک نیا طبقہ پیدا ہو گیا تھا۔ بنیادی جمہوریتوں کے ارکان کے اخلاقی زوال کا کچھ ٹھکانا نہیں تھا۔ یہ صورتِ حال رائے دہندگان کی محدود تعداد کا منطقی نتیجہ تھی۔ کہ بنیادی جمہوریتوں کی اصلاح اور سدھار کی کوئی امید باقی

نہ رہی انتخابات کے دوران میں پبلک سیفٹی ایکٹ کے تحت نظر بند تھا۔

مشرقی پاکستان میں کالعدم عوامی لیگ کے کچھ دیرینہ کارکنوں نے میری نظر بندی کے خلاف احتجاجاً انتخاب کے انقطاع کی بجائے انتخاب میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا اور منتخب ہو کر مجلسِ قانون ساز تک پہنچ گئے۔ ان لوگوں نے مرکزی اسمبلی میں حزبِ اختلاف کی بنیاد رکھ کے ایسی صورتِ حال پیدا کر دی جس کے بارے میں صدر نے تصوّر بھی نہیں کیا تھا۔

مغربی پاکستان کے مقابلے میں مشرقی پاکستان میں بدعنوانی نہ ہونے کے برابر تھی؛ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ امیدواروں کے وسائل محدود تھے، مغربی پاکستان کے قبائلی علاقوں کے علاوہ سرکاری حکام نے عمومی طور پر کسی خاص امیدوار کی حمایت کرنے کی کوشش نہ کی۔ چنانچہ قومی اسمبلی میں حزبِ اختلاف کی تعداد بڑھنے لگی حتیٰ کہ حزبِ اقتدار اور حزبِ اختلاف میں برائے نام فرق رہ گیا۔ آئین نافذ کرتے وقت صدر کو ایسی صورتِ حال کا وہم و گمان بھی نہیں تھا۔

معاشی ترقی میں عدم مساوات

پہلے پانچ سالہ منصوبے کو 1960ء میں ختم ہونا تھا چنانچہ پلاننگ کمیشن نے دوسرے پانچ سالہ منصوبے پر کام کرنا شروع کر دیا۔ ہر صوبے کا اپنا پلاننگ کمیشن تھا جس نے اپنی تجاویز غور کرنے کے لئے مرکزی پلاننگ کمیشن کے حوالے کر دیں۔ اقوامِ متحدہ، ہاورڈ یونیورسٹی اور فورڈ فاؤنڈیشن کے ماہرین مشرقی پاکستان کے پلاننگ کمیشن کی اعانت کر رہے تھے اور ان صاحبان کا تعاون بے حد مفید ثابت ہوا تاہم منصوبے کو آخری شکل دینے کا اختیار مرکز کو حاصل تھا اور یہیں سے اصل مشکلات شروع ہوئیں۔ مشرقی پاکستان کی بدقسمتی یہ تھی کہ حکومت کے اہم شعبوں مثلاً خود پلاننگ کمیشن، وزارتِ خزانہ، وزارت صنعت و تجارت اور دیگر مالی اداروں مثلاً پاکستان صنعتی قرضہ جات و سرمایہ کاری کارپوریشن، پاکستان انڈسٹریل فنانس کارپوریشن ایگری کلچرل کریڈٹ کارپوریشنوں اور بینکوں وغیرہ میں مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے افسروں کو بالادستی حاصل تھی۔ حکومت کی فراخدلانہ اعانت اور ٹیکسوں میں چھوٹ کے باعث مغربی پاکستان نے صنعتی شعبے میں زبردست ترقی کی تھی۔ صنعتوں کے قیام کے لئے لائسنس بڑی فراوانی سے جاری کئے جاتے تھے۔ خاص طور پر ٹیکسٹائل ملوں میں منافع کی شرح خاصی بلند تھی؛ ایک اندازے کے مطابق کپڑے کے کارخانے ایک سال سے اٹھارہ مہینے کی مدت میں اصل سرمایہ کاری پوری کر دیتے تھے۔ بلاشبہ اس کا اصل بوجھ صارفین کو اٹھانا پڑتا تھا۔ لائسنسوں اور پرمٹوں کے لئے حکومت سرکاری شرحِ تبادلہ پر زرِ مبادلہ فراہم کرتی تھی جبکہ عالمی منڈی میں پاکستانی روپے کی قیمت خاصی کم تھی۔ ان خوش نصیب صنعت کاروں کو حکومت کی طرف سے 50 فیصد اعانت بھی ملتی تھی۔ اسی طرح بڑے بڑے صنعت کاروں کو اشیائے صرف، مشینری اور فالتو پرزے درآمد کرنے کے لئے لائسنس بھی

آنکھیں بند کر کے تقسیم کیئے جاتے تھے۔ اسی طرح مغربی پاکستان میں سرمایہ دارانہ ترقّی کی بنیادیں رکھ دی گئیں۔

بدقسمتی سے مشرقی پاکستان کے صنعت کاروں اور درآمد کنندگان کو اس عمدہ سلوک کا مستحق نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اور معمولی وجوہات کی بناء پر لائسنس جاری کرنے سے انکار کر دیا جاتا تھا۔ غالباً حکومت اس نقطۂ نگاہ کی حامل تھی کہ اگرچہ پاکستان کے دو حصے ہیں لیکن معیشت صرف ایک ہی ہے، زرِ مبادلہ کے ذخائر موجود تھے لیکن مغربی پاکستان میں قائم ہونے والی صنعتوں کو مشرقی پاکستان کو محض پٹ سن کے کارخانوں پر اکتفا کرنا پڑتا تھا جو کہ بوجوہ مغربی پاکستان میں قائم نہیں کیئے جاسکتے تھے۔ اس کے علاوہ کاغذ کے دو کارخانے تھے تاکہ مقامی بانس اور نرم لکڑی کو بروئے کار لایا جاسکے کھانڈ اور کھاد کا ایک ایک کارخانہ تھا اور آگے آیت۔ چنانچہ مشرقی پاکستان کو درآمدی قیمتوں سے بھی زیادہ نرخ پر مغربی پاکستان سے تیار شدہ مصنوعات خریدنا پڑتی تھیں۔ ایک معیشت ’متوازی صنعتوں کی عدم موجودگی اور لائسنسوں کے اجراء میں تنگ دلی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مشرقی پاکستان میں سرمایہ کاری اور صنعتوں کے فروغ کو موثر طور پر بانجھ کر دیا گیا۔

میں نے اپنے ایک سالہ دورِ اقتدار میں اس امتیازی سلوک کو ختم کرنے کی پوری کوشش کی۔ اگرچہ نوکر شاہی حسبِ عادت اس کوشش میں روڑے اٹکاتی رہی ہم نے زرِ مبادلہ کا 15 فیصد کراچی کے لئے رکھ کے باقی 85 فیصد کو ملک کے دونوں حصوں میں مساوی طور پر تقسیم کر دیا۔ اور صنعتوں کے لئے لائسنس جاری کرنے کا اختیار صوبوں کے حوالے کر دیا گیا۔ ہم نے اس مقبول عام خیال کو غلط ثابت کر دیا کہ سرمایہ کار مشرقی پاکستان میں سرمایہ کاری کرنے سے خائف ہیں کیونکہ محولہ بالا اقدامات کے نتیجے میں مشرقی پاکستان میں صنعتوں کے قیام کے لئے دھڑا دھڑ درخواستیں موصول ہونے لگیں۔ سرمایہ داروں نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور مشرقی پاکستان میں صنعتیں قائم ہونے لگیں۔ میرے مستعفی ہونے کے بعد صورتِ حال پھر سے پرانی ڈگر پر آگئی اور کئی سال تک معدودے چند خوش نصیبوں کے علاوہ کسی کو مشرقی پاکستان میں صنعت کاری کے لئے اجازت نہ مل سکی۔

مشرقی پاکستان کو ایک اور مشکل بھی درپیش تھی مخصوص موسمی حالات کے باعث ترقیاتی فنڈ مالیاتی سال کے اندر اندر استعمال نہ ہوسکنے کی بناء پر ضائع ہو جاتے تھے مشرقی پاکستان نے بار بار مرکزی حکومت کی توجہ اس جانب مبذول کروائی کہ ترقیاتی فنڈ مالیاتی سال کے آخری حصے یعنی مارچ میں جاری کیئے جاتے ہیں جبکہ مشرقی پاکستان میں موسم برسات بہت قریب ہوتا ہے چنانچہ مشرقی پاکستان کو ترقیاتی فنڈ استعمال کرنے کے لئے زیادہ وقت ملنا چاہیئے۔ مشرقی پاکستان نے درخواست کی کہ اس کے لئے مالیاتی سال کو 30 جون تک بڑھا دیا جائے لیکن شنوائی نہ ہو سکی الٹا مرکزی حکومت نے یہ پرچار شروع کر دیا کہ مشرقی پاکستان ترقیاتی فنڈ استعمال کرنے سے عاری ہے نتیجہ یہ ہے کہ اصولِ مساوات جسے آئینی طور پر تمام سرکاری امور پر منطبق کیا جانا تھا عملی طور پر بے کار ہو کر رہ گیا۔

مغربی پاکستان کے لئے اضافی رقوم

دوسرے پانچ سالہ منصوبے کے ابتدائی مسوّدے میں مرکزی پلاننگ کمیشن نے مشرقی پاکستان کے لئے 4 ارب اور مغربی پاکستان کے لئے 9 ارب روپے مختص کئے۔مشرقی پاکستان کے اقتصادی ماہرین نے اس پر شدید احتجاج کیا کیونکہ انہوں نے 9 ارب روپے سے زائد مالیت کے ترقیاتی منصوبے تیار کر رکھے تھے۔ اقوامِ متحدّہ کے ماہرین نے بھی مرکزی پلاننگ کو اپنے اختلافِ رائے سے آگاہ کیا اور خیال ظاہر کیا کہ ملک کے دونوں حصوں کی اقتصادی اعانت میں اتنا وسیع بعد سیاسی طور پر غیر دانشمندانہ فیصلہ ہو گا۔انہوں نے مرکزی پلاننگ کمیشن کو مشورہ دیا کہ وہ جرأت سے کام لیکر دوسرے پانچ سالہ منصوبے کو وسیع تر بنیادوں پر تشکیل دے اور مزید امداد کا مطالبہ کرے۔ اس احتجاج اور مشورے کے نتیجے میں پلاننگ کمیشن نے مشرقی پاکستان کے لئے آٹھ ارب ساٹھ کروڑ روپے اور مغربی پاکستان کے لئے تقریباً دس ارب روپے مختص کئے تاہم کمیشن نے توقع ظاہر کی کہ مطلوبہ قوت انجذاب کی عدم موجودگی میں مشرقی پاکستان اس رقم کو پوری طرح سے استعمال نہ کر سکے گا۔ بہرحال مشرقی پاکستان کو ترقیاتی منصوبوں کے لئے خاصی اقتصادی امداد میسر آئی بایں ہمہ دوسرے پانچ سالہ منصوبے میں ظاہر ہونے والی اس نسبتاً مساوی تقسیم کو مغربی پاکستان کے لئے منصوبے کے علاوہ اضافی امداد تفویض کر کے درہم برہم کر دیا گیا۔ کچھ ممالک نے صنعتوں کے قیام کے لئے پاکستان کو قرضے مہیا کرنے پر آمادگی ظاہر کی تھی۔ اس معاونت کا زیادہ تر فائدہ مغربی پاکستان کو پہنچایا گیا۔ علاوہ ازیں سندھ طاس کا منصوبہ بھی دوسرے پانچ سالہ منصوبے میں شامل نہیں تھا۔ اس منصوبے پر ایک ارب اسی کروڑ امریکی ڈالر کی لاگت کا تخمینہ لگایا گیا تھا مزید بر آں مغربی پاکستان میں سیم و تھور سے متاثرہ اراضی کی اصلاح کے لئے ایک ارب ڈالر خرچ کئے گئے۔ یہ اخراجات بھی دوسرے پانچ سالہ منصوبے میں شامل نہیں تھے۔

بلاشبہ سندھ طاس کا منصوبہ اور اصلاحِ اراضی کا مسئلہ مغربی پاکستان کی معیشت کے لئے بنیادی اہمیت کے حامل تھے اور ان اخراجات پر انگشت نمائی نہیں کی جا سکتی تاہم یہ حقیقت بھی اپنی جگہ موجود ہے کہ مشرقی پاکستان کو بھی ایسے ہی متعدد مسائل کا سامنا تھا لیکن ان کے لئے نہ کوئی منصوبہ تیار کیا گیا اور نہ کوئی رقم مختص کی گئی۔ مشرقی پاکستان کے سیلاب ہر سال پہلے کی نسبت زیادہ تباہ کن نوعیت اختیار کرتے جا رہے تھے۔ مشرقی پاکستان کے عوام کا خیال تھا کہ مرکزی حکومت کو سیلاب کی روک تھام کے لئے کوشش کرنی چاہئے۔ مرکزی حکومت نے سندھ طاس نیز سیم و تھور کے لئے دوست ممالک سے معاونت طلب کی تھی اسی طرح سیلاب کی روک تھام کے لئے منصوبہ بندی اور اس پر عمل درآمد کی غرض سے دوست ممالک مفید امداد فراہم کر سکتے تھے لیکن مشرقی پاکستان کے عوام براہِ راست تو دوست ممالک سے رابطہ نہیں کر سکتے تھے۔ یہ کام مرکزی حکومت کا تھا اور بعض اطلاعات کے مطابق چودھری محمد علی نے

مغربی پاکستان کے بنیادی مسائل کے حل تک مشرقی پاکستان میں ناگہانی آفات مثلاً سیلاب وغیرہ کے لئے امداد طلب کرنے سے گریز کا مشورہ دیا تھا تاکہ مسائل کی بھرمار کے نتیجے میں مغربی پاکستان کے لئے بھی اقتصادی امداد کے امکانات تاریک نہ ہو جائیں۔

میں نے بطور وزیرِ اعظم اپنے عہد میں امریکی حکومت سے سیلاب کی روک تھام کے لئے تجاویز تیار کرنے کی غرض سے ماہرین کا ایک وفد پاکستان بھیجنے کی درخواست کی تھی۔ چنانچہ جنرل کرگ کی سربراہی میں ایک وفد نے پاکستان کا دورہ کر کے سیلاب کی روک تھام کے لئے چند گراں قدر سفارشات پیش کیں جو میرے اقتدار سے محروم ہونے کے بعد طاقِ نسیان کی نذر کر دی گئیں۔ بعد ازاں مشرقی پاکستان میں واپڈا نے بھی سیلاب کی تباہ کاریوں سے بچاؤ کے لئے کچھ منصوبے تیار کئے تھے جن پر میری اطلاعات کے مطابق چند بین الاقوامی ماہرین نے نظرِ ثانی کی تھی تاہم ان منصوبوں کو اخراجات کے حوالے سے ناقابلِ عمل قرار دے دیا گیا مشرقی پاکستان واپڈا کے لئے 40 کروڑ روپے مختص کئے گئے تھے اور اس سے قبل اس ادارے کو کبھی اس قدر اقتصادی آسودہ حالی کا منہ دیکھنا نصیب نہیں ہوا تھا۔ لیکن سیلاب کی روک تھام کے لئے اس قدر کم رقم رکھی گئی کہ عملی طور پر اس مسئلے کی شدّت میں کوئی کمی واقع نہ ہو سکی۔

مشرقی پاکستان کا روز افزوں زوال

اکتوبر 1961ء میں صدر نے ریزمان ایوارڈ پر نظرِ ثانی کرنے کے لئے ایک مالیاتی کمیشن مقرّر کیا ریزمان ایوارڈ کے مطابق کپاس اور پٹ سن پر بر آمدی محصولات، سیلز ٹیکس اور فروخت سے مرکز کو ہونے والی آمدنی کا ایک حصہ متعلقہ صوبوں کے لئے مختص کیا جاتا تھا۔ اس کمیشن میں مرکزی حکومت مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے نمائندہ اقتصادی ماہرین شامل تھے، مالیاتی کمیشن میں شامل مشرقی پاکستان کے اقتصادی ماہرین نے اعداد و شمار سے ثابت کیا کہ قیامِ پاکستان کے بعد سے مشرقی پاکستان کی اقتصادی حالت مسلسل خراب سے خراب تر ہو رہی ہے ایک زمانے میں مشرقی پاکستان کی فی کس آمدنی مغربی پاکستان کی فی کس آمدنی سے زیادہ تھی۔ لیکن اب مشرقی پاکستان میں فی کس آمدنی کم ہو چکی ہے اس پر مستزاد یہ کہ اخراجاتِ زندگی میں اضافہ ہو گیا ہے، مشرقی پاکستان کو زرِ مبادلہ میں اس کے جائز حصے سے محروم رکھا جا رہا ہے انہوں نے تجویز کیا کہ مشرقی پاکستان کو اپنے مخصوص حالات کے مطابق اقتصادی پالیسی اپنانے کی اجازت دی جائے اس طرح مشرقی پاکستان کو اپنی بر آمدات سے حاصل ہونے والے زرِ مبادلہ پر بھی اختیار دیا جائے۔

پاکستانی حکومت نے مختلف ذرائع سے قرضہ جات حاصل کر کے مغربی پاکستان میں صرف کر رکھے تھے ان قرضوں کی واپسی اور بے باقی کا وقت قریب آ رہا تھا مغربی پاکستان کی اپنی بر آمدات سے مطلوبہ مقدار میں زرِ مبادلہ کے حصول کی توقع نہیں تھی لہٰذا حکومت نے مشرقی پاکستان کی بر آمدات سے ملنے والے زرِ مبادلہ کے ذریعے یہ قرضے چکانے کا ارادہ کر رکھا تھا۔ اس موضوع پر مشرقی پاکستان کے ماہرین

معاشیات کی معروضات مطالعے کی مستحق ہیں لیکن ان کی اشاعت کی اجازت نہیں دی گئی۔

مشرقی پاکستان کی شکایات

غالباً اس موقع پر مشرقی پاکستان کی شکایات کا ایک مختصر خاکہ پیش کرنا غیر مناسب نہیں ہو گا۔ ان شکایات کے شدید تر ہونے پر مشرقی پاکستان نے نتیجہ اخذ کیا کہ ملک کے دونوں بازوؤں کے باہمی اختلافات کو محض ترقیاتی فنڈ کی مقدار بڑھا کر طے نہیں کیا جا سکتا۔

دفاعی امور اور فوج پر اٹھنے والے اخراجات مرکزی حکومت کے زمرے میں آتے تھے لیکن ان اخراجات کو ملک کے دونوں حصّوں سے وصول کیا جاتا تھا۔ ایک تخمینے کے مطابق ان اخراجات کا 98 فیصد حصہ مغربی پاکستان میں یا مغربی پاکستان کی نفری پر صرف کیا جاتا تھا چنانچہ کسی واپسی کی توقع کے بغیر مشرقی پاکستان کا سرمایہ ضائع ہو رہا تھا اور یہ حصہ غریب سے غریب تر ہوتا جا رہا تھا۔ اس عدم مساوات کے جواز میں یہ نظریہ پیش کیا جاتا تھا کہ مشرقی پاکستان کا دفاع مغربی پاکستان کے ذریعے کیا جائے گا۔ اگر ہندوستان نے کبھی مشرقی پاکستان پر حملے کی کوشش کی تو مغربی پاکستان جواب میں ہندوستان پر حملہ کر دے گا۔ یہ تصوّر بعید از حقیقت ہے کیونکہ بظاہر اس امر کا کوئی امکان نظر نہیں آتا کہ پاکستان کبھی بھی بھارت پر جارحانہ حملہ کرنے کے قابل ہو سکے گا۔

جنرل ہیڈ کوارٹرز کی طرف سے کئی بار مشرقی بنگال سے زیادہ فوجی بھرتی کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ دونوں عالمی جنگوں کے دوران بنگال سے اچھے خاصے فوجی بھرتی کئے گئے تھے اور جنگ کے بعد فارغ کر دیئے گئے تاہم مغربی پاکستان کے افسران کے خیال میں مشرقی پاکستان کے لوگ فوج کے مطلوبہ معیار پر پورے نہیں اترتے۔ حتیٰ کہ میں وزیر اعظم اور وزیر دفاع ہونے کے باوجود فوج کے سربراہ ایوب خان کو اس امر پر آمادہ نہ کر سکا کہ بنگالی فوجیوں کی مزید بٹالین کھڑی کی جائیں نیز انصار فورس کو مناسب عسکری تربیت دی جائے وقتی طور پر کچھ نمائشی اقدامات کیے جاتے لیکن بالآخر کوئی مثبت نتیجہ بر آمد نہ ہوتا اور صورتِ حال دوبارہ پہلے والی جگہ پر آ جاتی۔ 1961ء میں بنگال رجمنٹ کی صد سالہ تقریبات منائی گئیں۔ یہ رجمنٹ صرف 2000 فوجیوں پر مشتمل تھی۔ اب بنگالیوں کے دل جیتنے کے لئے اس میں ایک یا دو بٹالینوں کا اضافہ کرنے کا معرکہ آراء فیصلہ کیا گیا اور اس فیصلے پر بھی 1965ء تک عمل در آمد نہ ہو سکا۔

1958ء میں فوج کی طرف سے جاری کردہ درج ذیل اعداد و شمار سے اصل صورت حال پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔

....	مشرقی پاکستان	مغربی پاکستان
لیفٹننٹ جنرل	0	3
میجر جنرل	0	20

بریگیڈیر	1	34
کرنل	1	49
لیفٹیننٹ کرنل	2	198
میجر	10	590
ایئر فورس آفیسر	60	640
نیول آفیسر	7	598
کل	81	2132

مغربی پاکستان کے عوام کے لئے آمدنی اور ملازمت کے بہتر مواقع کے علاوہ فوج کی موجودگی سے مصنوعات کی تیاری، اشیائے صرف کی فروخت اور عمومی معاشی حالات پر خوشگوار اثرات مرتب ہوتے تھے۔

اسی طرح مرکزی بجٹ کے غیر فوجی حصے پر نظر ڈالنے سے علم ہو گا کہ اس شعبے میں بھی مشرقی پاکستان کے وسائل مغربی پاکستان پر صرف ہو رہے تھے۔ وفاقی دارالحکومت، قبائلی علاقوں، مہاجرین اور آباد کاری جیسے اخراجات صرف مغربی پاکستان سے متعلق تھے۔ علاوہ ازیں مرکز کی طرف سے تعلیم، صحت، طبی اداروں اور شاہراہوں کے لئے مختص وسائل کا بیشتر حصہ بھی مغربی پاکستان کے حصے میں آتا تھا۔
مصارف اصلی کے ضمن میں مشرقی پاکستان پر خرچ ہونے والی رقم مغربی پاکستان کے حصے سے تقریباً نصف تھی۔ دفتر خارجہ میں مشرقی پاکستانیوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ مثال کے طور پر لندن میں پاکستان ہائی کمیشن کے 30 افسران میں مشرقی پاکستان سے تعلق رکھنے والے افسران کی تعداد صرف 3 تھی جبکہ نچلے عملے کے 450 ارکان میں صرف 20 ملک کے مشرقی بازو سے تعلق رکھتے تھے۔

مشرقی پاکستان کو یہ گلہ بھی تھا کہ مشرقی پاکستان کا زرِ مبادلہ مغربی پاکستان کی معاشی بنیادیں مضبوط کرنے کے کام آتا ہے اور اس رجحان میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا مشرقی پاکستان کے لئے علیحدہ معیشت کے مطالبے کی تہہ میں اس گلے کو خاصا دخل تھا۔

54-1953ء تک ملک کے دونوں حصوں کی بر آمدات کی مقدار قریب قریب یکساں تھی۔ لیکن بعدازاں زرِ مبادلہ کی صورت میں مشرقی پاکستان کی آمدنی بڑھنے لگی۔ در آمدات میں مشرقی پاکستان کا اوسط حصہ ایک تہائی تھا۔ جبکہ مارشل لاء کے پہلے سال 1960ء - 1959ء کے دوران کل در آمدات کا محض ایک چوتھائی حصہ مشرقی پاکستان کو ملا ایک تخمینے کے مطابق 1947ء سے 1961ء مشرقی پاکستان نے چار ارب تہتر کروڑ روپے مغربی پاکستان کو منتقل کئے اگر اس حقیقت کو بھی مدِ نظر رکھا جائے کہ مشرقی پاکستان کے زرمبادلہ کا اندازہ سرکاری شرح تبادلہ کے مطابق کیا جاتا تھا جبکہ اشیائے صرف یا مشینوں کے در آمد کنندگان کو کھلی منڈی کا فائدہ ملتا تھا۔ تو مغربی پاکستان کے در آمد کنندگان کے لئے مزید دو ارب ترسیٹھ کروڑ روپے کا فائدہ سامنے آتا ہے۔

میں پہلے ذکر کر چکا ہوں کہ متذبذب سرمایہ کار متوازی صنعتوں کی عدم موجودگی اور کمزور قوت انجذاب جیسے جواز تراش کر مغربی پاکستان کے مقابلے مشرقی پاکستان کے لئے کم مالیت کے فنڈ مختص کیے جاتے تھے۔ مشرقی پاکستان کو کپڑے اور سیمنٹ جیسی بنیادی ضروریات مغربی پاکستان سے منگوانا پڑتی تھیں حتیٰ کہ مشرقی پاکستان کو سائیکل اور موٹر وغیرہ کے ٹائروں کے لئے ربڑ انڈسٹری قائم کرنے کی بھی اجازت نہیں تھی۔ حالانکہ اس کے لئے درکار در آمدی خام مال مغربی پاکستان کی نسبت مشرقی پاکستان کو سستا پڑتا تھا۔ بعدازاں مشرقی پاکستان میں مرکزی حکومت کی اس اجتماعی نا انصافی کے خلاف شعور بیدار ہونے پر ملک کے مشرقی بازو میں صنعتوں کے قیام کے لئے خصوصی رقوم مختص کی گئیں۔ مرکزی حکومت میں مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والی نوکر شاہی کو بالادستی حاصل تھی اور یہی لوگ پاکستان کے اصلی حکمران تھے۔ بدقسمتی سے مشرقی پاکستان میں صنعتوں کے قیام کے لئے بہت تاخیر سے اقدامات کئے گئے۔ بنگال کے ممکنہ سرمایہ کاروں کے وسائل اور ہمّت مرکزی سرکار کی دریوزہ گری میں جواب دے چکی تھی اور صنعتوں کے قیام کے لئے مطلوبہ سرمایہ دارانہ ڈھانچہ موجود نہیں تھا۔ مثال کے طور پر 24 ٹیکسٹائل ملوں کے قیام کے لئے لائسنس جاری کئے گئے۔ ان میں سے ہر کارخانہ 12500 تکلوں اور 250، 200 یا 180 کرگھوں پر مشتمل تھا۔ حالانکہ 25000 تکلوں اور 500 کرگھوں کو ایک معاشی یونٹ قرار دیا جاتا ہے۔ فی الحقیقت 24 میں سے 22 لائسنس یافتگان نے اپنے لائسنس مغربی پاکستان کے صنعت کاروں کے حوالے کر کے دام کھرے کر لئے ہشرقی پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن نے بعدازاں چینی اور پٹ سن کے کارخانے قائم کئے گویا مشرقی پاکستان کو صرف سرکاری شعبے میں صنعت کاری کی راہ پر ڈالا جا سکتا تھا۔

صدر ایوب کی حکومت کا خیال تھا کہ مشرقی پاکستان کو اس کے حصے کا زر مبادلہ لوٹانے سے مسئلہ حل نہیں ہو گا۔ بلکہ اسے مغربی پاکستان کے سرمائے سے صنعتی ترقی بخشی جائے اُس فلسفے سے ملک کے دونوں بازوؤں میں پہلے سے موجود معاشی تفاوت مزید بڑھ گیا، صنعتیں مشرقی پاکستان کے کمائے ہوئے زرمبادلہ سے لگ رہی تھیں لیکن منافع کا رخ کراچی کی طرف تھا۔ تنخواہ دار ملازمین بھی مغربی پاکستان سے تعلق رکھتے تھے۔ ترقیاتی مصارف کا بڑا حصہ مشرقی پاکستان کے لئے مختص کرنے کے باوجود صورتِ حال میں کوئی خاص سدھار پیدا نہ ہو سکا۔

سرکاری ملازمتوں خاص طور پر اعلیٰ سطحی ملازمتوں میں مشرقی پاکستانیوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر تھی۔ مرکز میں کام کرنے والے مشرقی پاکستانی افسران کی بڑی تعداد کو ملازمتوں سے فارغ کر دیا گیا۔ اور قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر ملازمتوں کے حوالے سے ملک کے دونوں حصوں میں توازن پیدا ہوا بھی تو اس کے لئے کئی عشرے درکار ہوں گے۔ ذیل کے جدول سے اس نقطۂ نگاہ کی تصدیق ہوتی ہے۔

عہدہ	مشرقی پاکستان	مغربی پاکستان
سیکرٹری	0	19
جائنٹ سیکرٹری	7	39
ڈپٹی سیکرٹری	24	102
انڈر سیکرٹری	88	675
پریذیڈنٹ سیکرٹری	3	69
کل	122	904

مشرقی پاکستان میں مرکزی حکومت کی طرف سے چلائے جانے والے تمام شعبوں اور اداروں میں مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے ملازمین کی بھرمار تھی۔ صوبائی محاصل میں مرکزی حکومت کی طرف سے مشرقی پاکستان کو 1947ء سے 1959ء تک 21 کروڑ 30 لاکھ روپے کی سرکاری امداد دی گئی جبکہ اس عرصے میں کراچی اور مغربی پاکستان کو اس مد میں 46 کروڑ 70 لاکھ روپے دیئے گئے۔

مشرقی پاکستان میں تعلیمی سہولتوں کا انتہائی فقدان تھا۔ نجی سکولوں کے عملے کی اکثریت ہندوؤں پر مشتمل تھی۔ یہ لوگ تقسیم کے بعد بھارت چلے گئے۔ اس خلاء کو پورا کرنے کی کوئی خاص کوشش نہ کی گئی۔ درج ذیل شواہد سے اس بیان کی تائید ہوتی ہے۔ مغربی پاکستان میں 62 کے لگ بھگ کالج تھے۔ اور یہ سب سرکاری انتظام میں تھے۔ یا انہیں سرکاری اعانت بہم پہنچائی جاتی تھی۔ مشرقی پاکستان میں بھی کالجوں کی تعداد کم و بیش یہی تھی لیکن ان میں صرف 6 کو سرکاری سرپرستی حاصل تھی اور باقی اداروں کو

محدود نجی وسائل کے بل بوتے پر چلایا جا رہا تھا ان حالات میں مشرقی پاکستان کے طلباء کس طرح مغربی پاکستانی طالب علموں کا مقابلہ کرنے کی توقع رکھ سکتے تھے۔ یہ بھی ذہن میں رہے کہ مشرقی پاکستان میں بڑے بڑے جاگیر دار موجود نہیں تھے اور عام طور پر طلباء کا تعلق غریب گھرانوں سے ہوتا تھا۔ فی الاصل امتحان پاس کرنے یا اچھی ڈویژن حاصل کرنے کے لئے مشرقی پاکستان کے طلباء کو مغربی پاکستان میں اپنے حریف طلباء سے بہتر اوسط حاصل کرنا پڑتی تھی۔ چنانچہ مشرقی پاکستان کے طلباء مغربی پاکستان کے طالب علموں کے برابر اہلیت رکھنے کے باوجود کمتر درجے میں امتحان پاس کرتے تھے اور ناکام طلباء کا تناسب بھی مشرقی پاکستان میں زیادہ تھا۔

صنعتوں کی عدم موجودگی اور درآمدات و برآمدات پر مغربی پاکستان کے تجارتی سیٹھوں کی بالادستی مشرقی پاکستان میں سرمائے کی نشوونما عمل میں نہ آسکی چنانچہ مغربی پاکستان کی نسبت مشرقی پاکستان کو سرکاری اعانت کی زیادہ ضرورت تھی۔ بلکہ مشرقی پاکستان میں یہ نقطۂ نظر پایا جاتا تھا کہ پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن کو صنعتی منصوبے نجی اداروں کے حوالے کرنے کی بجائے خود پہل کاری کر کے صنعتیں قائم کرنی چاہئیں یا پھر نجی منصوبوں میں زیادہ بھرپور کردار ادا کرنا چاہئے۔

مشرقی پاکستان میں ریلوے کا شعبہ کئی برسوں سے بے توجہی کا شکار تھا۔ یہ ایک طویل قصّہ ہے لیکن مختصر یہ کہ تقسیم کے وقت ورثے میں ملنے والی ورکشاپوں کی دیکھ بھال نہ کی گئی۔ پٹڑیاں خطرناک حد تک ٹوٹ پھوٹ چکی تھیں۔ گاڑیوں کے ڈبّے خستہ ہو چکے تھے اور بری طرح ہچکولے کھانے کے باعث بے حد غیر محفوظ تھے۔ مال گاڑیوں اور مسافر گاڑیوں کی تعداد بے حد قلیل تھی۔ اطلاعات کے مطابق مشرقی پاکستان کو حکومت کی طرف سے خرید کردہ اثاثوں میں سے وصول شدہ حصے کی بجائے آبادی کے تناسب سے رقم ادا کرنا پڑتی تھی۔ ادھر مغربی پاکستان میں ریلوے کی دنیا ہی دوسری تھی۔ ریلوے کے نام سے حاصل کئے گئے قرضے ضروریات کی بجائے دونوں حصوں میں موجود ریلوے لائنوں کی لمبائی کے تناسب سے تقسیم کئے جاتے تھے اس تقسیم کے باوجود مشرقی پاکستان ریلوے کے دن پھرنے کی کوئی توقع نہیں تھی۔ کیونکہ اس کے لئے خصوصی مساعی کی ضرورت تھی لیکن حقیقت یہ تھی کہ تقسیم کے بعد مشرقی پاکستان میں شاذ و نادر ہی کہیں نئی پٹڑیاں بچھائی گئیں۔ چٹاگانگ تک ریلوے لائن کو دوہرا کرنے کی بھی کوشش نہ کی گئی۔

اسی طرح سڑکوں کی حالت بہتر بنانے پر بھی کوئی توجّہ نہ دی گئی۔ ابتداء میں سڑکوں کی تعمیر کا ارادہ ظاہر کیا گیا تھا لیکن پھر یکایک مرکزی حکومت پر انکشاف ہوا کہ مشرقی پاکستان میں بڑے بڑے دریا موجود ہیں چنانچہ آبی مواصلات کو ترقّی دینے کا زور شور سے اعلان ہوا آخر میں نہ سڑکوں کی حالت بہتر ہو سکی اور نہ آبی مواصلات کو ترقّی دی گئی۔ عوام کی طرف سے سڑکوں کی تعمیر نو کا پر زور مطالبہ جاری رہا خاص طور پر شمالی بنگال میں یہ مسئلہ سنگین نوعیت اختیار کر چکا تھا۔ آبی راستوں کی حالت بھی بدتر ہوتی چلی گئی۔ کئی اہم آبی راستے مٹی اور کیچڑ سے اٹ گئے اور متعلقہ علاقوں کا اردگرد سے رابطہ منقطع ہو گیا۔ آبی راستے صاف کرنے والی کشتیوں کے ایک اضافی بیڑے کی ضرورت تھی۔ ——— تقسیم سے کچھ پہلے پاکستان کے حصے میں آنے والے علاقوں میں سڑکوں کی کل لمبائی 16425 میل تھی۔ جن میں 5706 میل

لمبی سڑکوں کو اعلیٰ معیار کی حامل سڑکوں میں شمار کیا جاتا تھا۔ 1960ء میں ہر قسم کی ٹریفک کے لئے موزوں بڑھیا معیار کی سڑکوں کی لمبائی 9672 میل تھی جن میں سے 8772 میل پر محیط سڑکیں مغربی پاکستان کی سرزمین پر موجود تھیں۔ جبکہ مشرقی پاکستان میں ایسی سڑکوں کی لمبائی صرف 900 میل تھی۔

وقتاً فوقتاً متعدد منصوبوں پر سرگرم غور و فکر کے باوجود وسائل توانائی میں اضافے کی کوئی عملی کوشش نہ کی گئی۔ کُشتیا میں بھیراامار کے مقام پر ایک پن بجلی گھر کے علاوہ پورے شمالی بنگال میں کہیں پر بجلی پیدا کرنے کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ گورنر فاروق نے یہ تجویز بھی پیش کی کہ اس علاقے میں ایک ایٹمی بجلی گھر تعمیر کیا جائے۔ سلہٹ کے علاقے میں اعلیٰ معیار کی گیس کے لامحدود ذخائر دریافت ہوئے تھے لیکن ایک کھاد فیکٹری میں استعمال کے علاوہ اس گیس کو بروئے کار نہ لایا گیا۔ ان وسائل کے بہتر استعمال کے لئے تحقیق کی اشد ضرورت ہے۔ ایک تجویز یہ بھی تھی کہ فولاد کے کارخانے کے لئے اس گیس کو پائپ کے ذریعے چٹا گانگ لے جایا جائے۔ غالباً یہ منصوبہ سرمائے کے زیاں کا باعث ہوگا۔ اس کے علاوہ بجلی گھر اور گھریلو استعمال کی غرض سے اس گیس کو ڈھاکہ تک لائے جانے کی بھی تجویز سننے میں آئی تھی۔ جرمنی کے کیمیائی انجینئروں کا کہنا تھا کہ اس گیس کا معیار اس قدر خالص اور اعلیٰ ہے کہ اسے پیٹرو کیمیکل صنعت کے قیام کے لئے بروئے کار لایا جا سکتا ہے اور مغربی پاکستان میں سوئی کے مقام پر دریافت ہونے والی نسبتاً خام گیس کے مقابلے میں مشرقی پاکستان میں ایسا منصوبہ زیادہ قابلِ عمل اور عالمی منڈی میں زیادہ منافع بخش ثابت ہوگا لیکن اس منصوبے کو بھی تعویق میں ڈال دیا گیا۔

امریکی اعانت سے قبل کرنافلی کے بجلی گھر کا منصوبہ بھی کھٹائی میں تھا تاہم دریا کے بالائی حصے میں سیلابی پانی کو بھارتی علاقے میں داخل ہونے سے روکنے کے لئے ڈیم کی اونچائی مجوزہ منصوبے سے کم رکھی گئی۔ لہٰذا مطلوبہ مقدار یعنی 120000 کلوواٹ بجلی پیدا ہونے کی امید بار آور ثابت نہ ہو سکی۔ پانی کی نیچی سطح کے باعث 40000 ہزار کلوواٹ سے زیادہ بجلی پیدا کرنا ممکن نہ رہا۔ 1962ء تک تین میں سے صرف دو جنریٹر نصب کئے جا سکے۔ دونوں کسی ٹیکنیکی خرابی کے باعث کام نہیں کر رہے تھے اور یوں بھی ڈیم کے موجودہ حجم کے باعث برسات کے علاوہ دنوں میں صرف ایک جنریٹر کام کر سکے گا۔ مزید بر آں مشرقی پاکستان میں بجلی کے نرخ مقابلتاً کہیں زیادہ تھے۔ اور مشرقی پاکستان کے صنعت کار کو اس حوالے سے بھی خسارے کا سامنا تھا۔ چنانچہ فولاد تیار کرنے کے لئے قریب ہی موجود بجلی استعمال کرنے کی بجائے ایسی بھٹیوں کے استعمال پر غور کیا گیا جو سلہٹ سے لائی جانے والی مجوزہ گیس یا صاف شدہ تیل استعمال کر سکیں۔

پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن نے کھلی بھٹی کی ٹیکنیک پر مبنی فولاد کا ایک پلانٹ نصب کیا ہے جو پرانی طرز کا حامل ہونے کے علاوہ نسبتاً مہنگا بھی ہے جاپان نے قرض کی بے باقی کے لئے ایک پرانا پلانٹ بیچ ڈالا۔ ایسے پلانٹ کو کھلی منڈی میں مول تول کر کے کوڑیوں کے بھاؤ خریدا جا سکتا تھا۔ مشرقی پاکستان کی ضروریات کے مطابق ریلوے لائن نیز سادہ یا شکن دار چادریں تیار کرنے کی بجائے یہ پلانٹ صرف تعمیراتی فولاد تیار کر سکتا تھا حکومت کی طرف سے لائسنس حاصل کرنے والے صنعت کار سٹیل رولنگ ملوں کے ذریعے پہلے ہی تعمیراتی فولاد کی ضروریات پوری کر رہے تھے ادھر پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن سے

داموں فولادی سلاخیں در آمد کر کے مشرقی پاکستان کے صنعت کاروں کو مقابلے میں بارہ پتھر باہر کر دے گی۔ بلاشبہ اسے ایسی مصنوعات تیار کرنا چاہئے تھیں جو نجی صنعت کار تیار نہ کر رہے ہوں۔ ایسا کرنے میں زرِ مبادلہ کی بچت بھی یقینی تھی۔

گنگا کوباڈک منصوبہ گرتے پڑتے تکمیل کو پہنچ رہا تھا۔ مشرقی پاکستان کے باشندے پانی خریدنے کی روایت سے نا آشنا تھے' اطلاعات کے مطابق پانی کا نرخ اتنا بلند رکھا گیا تھا کہ زمیندار اسے خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے۔ مشرقی پاکستان واپڈا نے پانی کی قیمت میں تخفیف کی تجویز پیش کی تاہم منصوبے کی اصل لاگت تو بہر حال پوری کی جانا تھی۔

مشرقی پاکستان کی ایک اور شکایت یہ تھی کہ غیر ملکی امداد کا زیادہ حصہ مغربی پاکستان پر صرف کیا جاتا ہے۔ ایک موقع پر اندازہ لگایا گیا کہ امریکی امداد کا 88 فیصد حصہ مغربی پاکستان اور صرف 12 فیصد حصہ مشرقی پاکستان پر صرف کیا گیا۔ تمام ذرائع سے ملنے والی مجموعی بیرونی امداد کا 95 فیصد حصہ مغربی پاکستان کے عارض کو گل گوں کرتا رہا۔ جبکہ پانچ فیصد سے مشرقی پاکستان کی اشک شوئی کی گئی۔

دارالحکومت کی کراچی منتقلی پر بھی غم و غصے کا اظہار کیا گیا۔ کراچی کو مرکزی حکومت کے صدر مقام کے طور پر کام کرنے کے قابل بنانے میں مشرقی پاکستان نے بھی برابر کے اخراجات ادا کئے تھے۔ سرکاری عمارات اور دیگر ترقیاتی کاموں پر جو مرکزی فنڈ استعمال ہوئے تھے ان میں مشرقی پاکستان بھی برابر کا شریک تھا۔ مشرقی پاکستان کے عوام کو بجا طور پر شکوہ تھا کہ دارالحکومت کی تبدیلی کا فیصلہ انہیں اعتماد میں لئے بغیر کیا گیا تھا۔ انہیں اس کا کوئی جواز نظر نہیں آتا تھا کہ دارالحکومت کے نام پر جو اخراجات کئے گئے ان کے ثمرات مغربی پاکستان کے حصہ میں آئے اور اب نئے دارالحکومت پر اٹھنے والے مصارف سے بھی مشرقی پاکستان کے باشندے تمتع کریں گے۔ مشرقی پاکستان کو اس پر بھی اعتراض تھا کہ نیا صدر مقام فوجی ہیڈ کوارٹرز سے بہت قریب واقع تھا۔ مزید براں نئے صدر مقام کی آب و ہوا' سرما اور گرما میں اس قدر شدید تھی کہ مشرقی پاکستان سے تعلق رکھنے والے ملازمین اسے ناقابلِ برداشت پا کر تبادلے کی درخواست کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ مشرقی پاکستان نے ان اقدامات کو اطمینان بخش سمجھنے سے انکار کر دیا جو حکومت نے تالیفِ قلب کے طور پر کئے تھے۔ ان اقدامات میں ڈھاکہ کو دارالحکومتِ ثانی قرار دینا شامل تھا نیز ایوب خان کے آئین میں ڈھاکہ کو مرکزِ قانون سازی قرار دیا گیا تھا اور مرکزی مجلسِ قانون ساز کے تمام اجلاس ڈھاکہ میں طلب کئے جاتے تھے۔ ان اقدامات کو ایک ڈھونگ سے زیادہ حیثیت حاصل نہیں تھی۔ قابلِ ذکر امر یہ ہے کہ دارالحکومت ثانی کے لئے محض تین سو ایکڑ رقبہ مختص کیا گیا تھا اُس پر ہنسنے کی بھی اجازت نہیں تھی۔ شہری منصوبہ بندی کے ماہرین نے اصرار کیا کہ وہ ایک ہزار ایکڑ سے کم رقبے میں مطلوبہ سہولتوں کی گنجائش نہیں رکھ سکتے۔ یہ کچھ ایسا لمبا چوڑا مطالبہ نہیں تھا لیکن ان سے کہا گیا کہ فی الحال 300 ایکڑ پر اکتفا کریں آئندہ اس میں وسعت کی صورت نکالی جائے گی۔ عوام کی کوتاہ بین فہم سے ماوراء وجوہات کی بنا پر اسلام آباد میں پارلیمنٹ کی عمارت بھی استوار کی جا رہی تھی۔ اس پر ردِ عمل کا اظہار کرتے

ہوئے مشرقی پاکستان نے مطالبہ کیا کہ پاکستان کا انتظامی دارالحکومت ڈھاکہ میں منتقل کیا جائے۔
چٹاگانگ بندر گاہ میں نئی مال انداز گودیاں تعمیر کی گئیں لیکن گھاٹوں، سائبانوں، دوہری پٹریوں وغیرہ کی توسیع و مرمت پر کوئی توجّہ نہ دی گئی اور نہ چٹاگانگ تک ذرائعِ آمدورفت کو بہتر بنایا گیا۔ مشرقی پاکستان کے شمالی اور مشرقی حصوں کو سمندر سے ملانے والی اس اہم بندر گاہ تک ریل کی صرف ایک لائن جاتی تھی۔ اول تو مال گاڑیوں کی قلّت تھی اور اگر مال گاڑی پر سامان رکھ بھی دیا جاتا تو اسباب کی نقل و حرکت اکہری ریلوے لائن کے باعث بے حد سست ہوتی تھی۔ بندر گاہ پر اس قدر افراتفری ہوتی کہ اسباب چھڑوانے کے لئے ہفتوں انتظار کرنا پڑتا۔ کبھی کبھار تو ایسا ہوتا کہ سامان سے لدے ہوئے 28 کے قریب جہاز اپنی باری کے انتظار میں بندر گاہ پر کھڑے ہوتے۔ جہاز سے سامان اتروانے میں تاخیر ہو تو جہاز ران کمپنیاں بھاری ہرجانہ وصول کرتی ہیں۔ چنانچہ اس پر کوئی تعجّب نہیں ہونا چاہئے کہ مشرقی پاکستان کے عوام کو درآمدی اشیاء کی غیر معمولی قیمت ادا کرنا پڑتی تھی۔ بندر گاہ پر بڑے جہازوں کے لنگر انداز ہونے کی گنجائش نہیں تھی۔ چنانچہ جہازوں کو کھلے سمندر میں روک کر چھوٹی کشتیوں پر سامان اتارا جاتا اور پھر بندر گاہ پر پہنچایا جاتا۔ چنانچہ درآمدی اشیاء کی قیمت میں چھوٹی کشتیوں کے اخراجات اور دو مرتبہ سامان اتروانے کے اخراجات بھی شامل ہو جاتے۔ ایک مرتبہ امریکہ نے سامان اتارنے کی مشکلات اور جہاز خالی ہونے میں تاخیر پر 40 فیصد زائد کرایہ طلب کر لیا۔ اگرچہ بعد میں یہ اضافی خرچ واپس لے لیا گیا لیکن یہ رعایت صرف محدود مدت کے لئے مل سکی۔ حکومت نے سیمنٹ کی اتنی بڑی مقدار درآمد کرنے کا فیصلہ کر لیا کہ چٹاگانگ اور کھلنا کی بندر گاہوں کے لئے سامان کی نکاسی مشکل ہو گئی۔ کھلنا کے گھاٹ کو توسیع دی جا سکتی تھی۔ اس کے لئے متبادل اور بہتر جگہیں بھی موجود تھیں لیکن انہیں استعمال کرنے کی غرض سے کوئی قدم نہ اٹھایا گیا۔
جنگلات نیز سمندر، دریاؤں اور جوہڑوں میں ماہی گیری کے فروغ کے بے شمار امکانات تھے۔ اگر صرف ان دو شعبوں پر ہی خصوصی توجّہ دے دی جاتی تو مشرقی پاکستان ایک خوشحال خطّے میں بدل سکتا تھا۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ان شعبوں کو بھی نظر انداز کیا گیا۔ ملکی معیشت میں ریڑھ کی ہڈی کا کردار ادا کرنے والے شعبے یعنی زراعت کو بھی بری طرح نظر انداز کیا گیا۔ زیادہ پیداوار سے مجموعی خوشحالی میں اضافہ ہوتا، داخلی وسائل مستحکم ہوتے اور متوازن ترقّی کی راہیں کھل سکتی تھیں۔ اس کے لئے مسلسل اور وسیع ترسطح پر تحقیق کی ضرورت تھی۔ پٹ سن کی قیمت کو سرکاری اعانت کی حاجت تھی۔ لیکن حکومت کی تمام یقین دہانیاں خالی خولی دعوے ثابت ہوئیں۔
میں نے یہ تمام تفاصیل یہ ظاہر کرنے کے لئے بیان کی ہیں کہ حکومت کی اس دلیل میں کوئی وزن نہیں تھا کہ مشرقی پاکستان ترقیاتی امور کے لئے مختص رقوم صرف کرنے کی صلاحیت سے عاری ہے اور اس میں قوتِ انجذاب نہیں ہے۔ صدر ایوب نے دونوں حصوں کے لئے مختص رقوم میں تفاوت کا جواز پیش کرتے ہوئے بھی یہ استدلال پیش کیا تھا حالانکہ وہ اٹھتے بیٹھتے آئین میں تجویز کردہ اصولِ نیابت کی مالا

جیتے رہے تھے۔ اگر صدر کے یہی خیالات تھے تو ان سے یہ توقع عبث تھی کہ وہ ملکی ترقی کی صورتِ حال میں توازن پیدا کرنے کے لئے کوئی بامعنی قدم اٹھائیں گے۔ مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے اقتصادی ماہرین نے اس رپورٹ کی مخالفت کی جو کہ جو مالیاتی کمیشن کے مشرقی پاکستان سے تعلق رکھنے والے ارکان نے پیش کی تھی' مرکز نے اختلافی نقطہ ہائے نگاہ کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اپنی رپورٹ تیار کی' مرکزی محصولات میں سے صوبوں کو ملنے والے تناسب میں اس حد تک تبدیلی کی گئی کہ مشرقی پاکستان کے لئے 11 کروڑ روپے اور مغربی پاکستان کے لئے 4 کروڑ روپے مختص کئے گئے اور یہ معاملہ طے پا گیا۔ مالیاتی کمیشن کی رپورٹوں کو گہرے اخفاء میں رکھا گیا۔

مغربی پاکستان کی حوصلہ مند حزب اختلاف

میری گرفتاری کے بعد پورے مشرقی پاکستان میں متعدد مقامی رہنماؤں کو گرفتار کیا گیا۔ مجیب الرحمن اور مانک میاں کو چند روز کے اندر گرفتار کر لیا گیا۔ ان گرفتاریوں سے مشرقی پاکستان میں اندر ہی اندر کھولنے والا بے اطمینانی اور مارشل لاء کی مخالفت کا لاوا پھوٹ نکلا۔ ادھر مغربی پاکستان میں بھی حزبِ اختلاف نے جرأتِ کردار اور استقامت کی اچھی مثالیں پیش کیں۔ شمال مغربی سرحدی صوبے میں علیل اور ضعیف خاں عبدالغفار خان کی مسلسل نظر بندی پر گہرے غم و غصے کا اظہار کیا گیا۔ ہر تاریخ سماعت پر پٹھانوں کے جتھے مجسٹریٹ کی عدالت سے باہر جمع ہو کر مارشل لاء حکومت کے خلاف احتجاج کرتے اور انہیں بڑی باقاعدگی سے گرفتار کیا جاتا تھا' لیکن جب یہ سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا تو حکومت نے گرفتاریوں سے گریز شروع کر دیا اور اس کی بجائے ممتاز پٹھان رہنماؤں کو ہراساں کرنے کی پالیسی اپنا لی گئی۔ انہیں بغیر مقدمہ چلائے نظر بند رکھا گیا۔ ان کی جائیدادیں ضبط کی گئیں اور بعض صورتوں میں تو انہیں کوڑے بھی لگائے گئے۔ حکومت کے ان اقدامات سے پھیلنے والی نفرت ون یونٹ کی تنسیخ کے مطالبے پر منتج ہوئی جمہوریت کی بحالی اور جمہوری آئین کے نفاذ کا مطالبہ زور پکڑنے لگا حکومت نے پٹھان رہنماؤں کی ضبط شدہ جائیداد کا کچھ حصہ واپس کر کے حالات پر قابو پانے کی کوشش کی مگر اسے کوئی خاص کامیابی نہ مل سکی۔

بلوچستان میں صورتِ حال خاصی مخدوش ہو گئی۔ خان قلات کی گرفتاری' نظر بندی اور جلاوطنی سے قبائلی سردار مشتعل ہو گئے اور بغاوت کی سی صورتِ حال پیدا ہو گئی۔ بلوچستان کو پسماندہ علاقہ سمجھا جاتا تھا اور حکومت قبائلی سرداروں کے ذریعے اپنے اقتدار کو قائم رکھتی تھی۔ سردار قبائلی روایات اور قبائلی جرگوں کے ذریعے علاقے کا انتظام چلاتے تھے۔ سیاسی شعور کی بیداری سے عوام میں سرداروں کے خلاف نفرت پیدا ہونے لگی۔ عوام کا مطالبہ تھا کہ جرگہ سسٹم اور فرنٹیئر کرائمز ریگولیشنز کو ختم کر کے جمہوری ادارے قائم کئے جائیں اور بلوچستان کو پاکستان کے ترقی یافتہ علاقوں کے برابر لایا جائے' بایں ہمہ خان قلات کی گرفتاری کے باعث سردار اور عوام حکومت کے خلاف جدوجہد میں حلیف بن گئے' انتہاپسند

بلوچیوں کے کچھ جتھوں نے پہاڑوں کی راہ لی اور حکومت کے خلاف گوریلا لڑائی شروع کر دی۔

اس معاملے کی تفاصیل تو اس جدوجہد میں شامل سرگرم افراد کو ہی معلوم ہیں البتہ میں قومی اسمبلی میں بلوچ رہنماؤں کے بیانات نیز کراچی اور کوئٹہ میں عوامی اجتماعات سے ان کی تقاریر کے حوالے سے سامنے آنے والے واقعات درج کئے دیتا ہوں۔ بتایا گیا ہے کہ بلوچستان میں پاکستانی فوج کے انچارج میجر جنرل نے گوریلہ لڑائی کے سالار بلوچی سردار، سردار نوروز خان، سے ملاقات کی اور انہیں قرآن پر حلف دیا کہ اگر وہ ہتھیار ڈال دیں تو ان کے خلاف قانونی کارروائی نہیں کی جائے گی۔ سردار نوروز خان نے اپنی پہاڑی پناہ گاہ سے نکل کر پاکستانی فوج کے کمانڈر سے ملاقات کی اور قرآن پر ہر دو فریقین کے حلف کے بعد سردار نوروز خان نے اپنے پیروکاروں کو ہتھیار ڈالنے کا حکم دے دیا تاہم ہتھیار ڈالنے کے بعد انہیں گرفتار کر لیا گیا اور کچھ پر مقدمہ بھی چلایا گیا۔ سات کو پھانسی دی گئی اور سات افراد کو عمر قید کی سزا سنائی گئی' سردار نوروز خان کے بیٹے نے تختۂ دار پر اپنے گلے میں قرآن لٹکا رکھا تھا۔ انہوں نے یہ کہہ کر قرآن اتارنے سے انکار کر دیا کہ یہ مجھے نہیں بلکہ خود قرآن کو پھانسی دی جا رہی ہے۔ یہ الزام بھی لگایا گیا کہ بہت سے بلوچ قیدیوں کو ایک اذیت گاہ میں رکھا گیا اور ان پر تشدّد اور اذیت کے ایسے ایسے پہاڑ توڑے گئے کہ انہیں دہرانے سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ بلوچستان میں نفرت کی چنگاریاں سلگنے لگیں۔ حکومت نے بلوچستان کے بعض سرداروں کو جلاوطن کر دیا اور قومی اسمبلی کے ایک رکن پر مقدمہ بھی چلایا گیا۔ بعدازاں بلوچی عوام کے غم و غصے کو ٹھنڈا کرنے کی غرض سے خان قلات کو رہا کر دیا گیا' بایں ہمہ ان واقعات کے بعد اگرچہ بزرگ سردار بدستور شاہی جرگے اور دیگر چھوٹے چھوٹے جرگوں کے رکن رہے لیکن قبائلی نوجوانوں کا حکومت پر سے اعتماد اٹھ چکا تھا۔

پاکستان کا مستقبل خطرے میں

پاکستان کے مستقبل کو خطرے میں دیکھتے ہوئے افسوس سے کہنا پڑتا تھا کہ پاکستان کی کسی سابقہ حکومت کے خلاف عوام میں اس قدر بے چینی پیدا نہیں ہوئی تھی اور نہ کبھی علیحدگی پسند رجحانات کا اس طرح کھلے بندوں اظہار ہوا تھا۔ انقلابی حکومت نے قومی اتحاد اور قومی یک جہتی کو اپنے مقاصد قرار دیا تھا۔ یوں گویا بالواسطہ طور پر قومی زندگی میں ان عناصر کی عدم موجودگی یا کم از کم فقدان کا اعتراف کیا جا رہا تھا۔ لیکن ان وعدوں کے برعکس اس حکومت نے علاقائی اور صوبائی منافرت کی چنگاریوں کو ہوا دیکر ایک دہکتے ہوئے الاؤ میں بدل دیا۔ غلط یا صحیح' مشرقی پاکستان میں یہ تاثر پایا جاتا تھا کہ ملک کا مغربی بازو مشرقی بازو کا استحصال کر رہا ہے۔ ادھر مغربی پاکستان میں شمال مغربی سرحدی صوبہ سندھ' بلوچستان حتیٰ کہ بہاولپور کے بعض حصے صوبائی خودمختاری اور ون یونٹ کی تنسیخ کا مطالبہ کر رہے تھے۔ پنجاب کے ارکان بھی محسوس کرنے لگے کہ ان مخاصم ہمسایہ قومیتوں کی موجودگی میں وہ امن و سکون سے زندہ رہنے کی توقع نہیں کر سکتے تھے۔ اس صورتِ حال کا حل کیا تھا؟ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ یہ بحران صرف اس صورت میں دور ہو سکتا ہے

کہ تمام علاقوں کے حقیقی رہنما...... حقیقی رہنماؤں سے مراد وہ لوگ نہیں تھے جنہیں انتخابی عمل میں ہیرا پھیری کر کے اقتدار تک لایا گیا ہو۔ .... قومی یک جہتی کے جذبے کے ساتھ مل بیٹھیں (ان رہنماؤں کے دل صدر کی طرف سے دشنام طرازیوں کے باوجود قومی یک جہتی کی تال پر دھڑکتے تھے) اور خیر سگالی کی فضا میں پاکستان کے تمام علاقوں اور تمام قومیتوں کے لئے قابلِ قبول حل تلاش کریں۔ مختصر یہ کہ ہمیں جمہوری آئین اور حقیقی جمہوریت کے قیام کی ضرورت تھی۔ اور یہی اس بحران کا پائیدار حل تھا۔

یہ بتایا جا چکا ہے کہ انقلابی حکومت نے برسرِ اقتدار آتے ہی تمام سیاسی جماعتوں کو غیر قانونی قرار دیدیا تھا اور ان کے اثاثے ضبط کر کے ہر طرح کی سیاسی سرگرمیوں پر پابندی عائد کر دی تھی۔ پورے ملک کی فضا کو سابقہ سیاسی حکومتوں کے قائدین اور بطور ایک فلسفۂ حیات سیاست کے خلاف لعن و طعن اور غلیظ گالیوں سے متعفن کر دیا گیا تھا۔ ان قائدین کو جو کسی نہ کسی وقت میں ملکی انتظام کے ذمہ دار رہے تھے کٹہرے میں کھڑا کر کے ان پر بد انتظامی کے کردہ یا ناکردہ الزامات عائد کئے گئے۔ ایبڈو کے تحت ان کے خلاف مقدمات چلا کر انہیں دسمبر 1966ء تک کسی انتخابی ادارے کے انتخاب میں حصہ لینے کے لئے نا اہل قرار دے دیا گیا۔ یہ اکابرین خود بخود حق رائے دہی سے بھی محروم قرار پا گئے بایں ہمہ پاکستان کے احمق عوام کی عقل کا ماتم کرنا چاہئے کہ یہ قومی شعور اور سیاسی تعلیم سے بے بہرہ لوگ کس آسانی سے کایاں سیاستدانوں کے دامِ تزویر کا شکار ہو جاتے ہیں' انقلابی حکومت کی اس آفاقی اور سادہ تعلیم کا نتیجہ تو یہ ہونا چاہئے تھا کہ عوام سیاستدانوں پر لعنت بھیجتے لیکن سیاستدانوں کی تکریم میں بدستور اضافہ ہوتا رہا۔ انقلابی حکومت سیاستدانوں کے خلاف جتنا پرچار کرتی وہ اتنے ہی مضبوط ہوتے چلے جاتے' سیاسی جماعتیں کالعدم اور ہر چند کہیں کہ ہیں نہیں ہیں ہو گئیں لیکن سیاسی کارکنوں نے اپنی وفاداریاں تبدیل کرنے کی زحمت گوارہ نہ کی۔ البتہ موقع پرستوں کی بات الگ ہے۔ بے پیندے کے یہ لوٹے ہر نئی حکومت کے گلے کا ہار بن سکتے ہیں اور حکومت کے ہر غلط یا صحیح اقدام پر داد و تحسین سے آسمان سر پر اٹھا لیتے ہیں۔

ایک طرف تو سیاسی جماعتوں پر پابندی عائد تھی اور ان کا نام لینا بھی گناہِ کبیرہ سے کم نہیں تھا۔ دوسری طرف صدر صاحب دوسروں کی کوکھ بانجھ کر کے اپنی سیاسی جماعت کی بنیاد رکھ رہے تھے۔ سب سے پہلے خصوصی ریلیوں اور جلسوں کی مدد سے عوام سے مخاطب ہوئے' ابتداء میں عوام نے اپنے نئے رہنما کو دیکھنے کے لئے خاصی بڑی تعداد میں ان جلسوں اور اجتماعات میں شرکت کی لیکن پھر وضو ٹھنڈے ہوتے گئے اور سرکاری جلسوں میں عوام کی تعداد کم سے کم تر ہونے لگی۔ لیکن ادھر صدر کے ملفوظات میں تلخی کلام کی مقدار بڑھنے لگی حتیٰ کہ محکمۂ اطلاعات کو صدر کے بعض جملوں کی تردید کرنا پڑی حالانکہ یہ تقاریر ٹیپ ہو کر اخبارات کی زینت بن چکی تھیں۔ بعد ازاں ان تقاریر کے ریکارڈوں میں بھی مناسب قطع و برید کر دی گئی۔ یہ واقعہ ریکارڈ پر ہے کہ ڈھاکہ سٹیڈیم میں جلسۂ عام سے جیسے ہی صدر نے خطاب شروع کیا لوگوں نے جلسہ گاہ سے نکلنا شروع کر دیا۔ لیکن جلسہ گاہ سے باہر نکلنے والے راستوں کو بند کر کے عوام کو

صدر کا خطاب سننے پر مجبور کیا گیا۔ بنیادی جمہوریتوں کے ارکان کو اس وقت منتخب کیا گیا جب مارشل لاء پوری قوت سے نافذ تھا اور لوگ اس صدمے سے سنبھل نہیں پائے تھے۔ بنیادی جمہوریتوں کا یہ کھڑاگ صدر نے اسی غرض سے کھڑا کیا تھا کہ ان لوگوں کو اپنے اقتدار کو استحکام بخشنے کے لئے استعمال کیا جا سکے گا۔ اور پھر بنیادی جمہوریت کے ان رکھوالوں کو صدر کے ذاتی مفادات کی حفاظت کے لئے استعمال کیا گیا۔

سہروردی کی گرفتاری

آئین کمیشن کی سفارشات موصول ہونے کے بعد آئین کے نفاذ کو زیادہ دیر تک معرضِ التواء میں نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ تاہم آئین میں صدر لامحدود اختیارات اپنے ہاتھ میں رکھنے کے خواہشمند تھے۔ قانون ساز اسمبلیوں کے نام پر وہ بے اختیار چنڈو خانے قائم کرنا چاہتے تھے۔ اور وزراء کی بجائے انہیں ایسے ڈھنڈورچی درکار تھے۔ جو بات بے بات صدر کے نام کا تاشہ بجاتے رہیں۔

وزراء کو اپنے محکمے کی پالیسی یا انتظام کے بارے میں کسی اختیار کے بغیر ادھر ادھر مارے مارے پھرتے دیکھ کر رحم آتا تھا۔ صدر کی ذاتی خوشامد ان کا واحد فرضِ منصبی تھا۔ اس کے ذریعے وہ اپنے انتخاب کا جواز پیش کرتے تھے اور یہی خوشامد ان کی وزارت کے تسلسل کی ضامن تھی۔ بایں ہمہ آئین کے نفاذ سے قبل عوام کے ردِّ عمل کی ٹوہ لگانے کی کوشش کی گئی۔ مارشل لاء کے ضوابط کے مطابق حکومت پر تنقید کی سزا چودہ سال قیدِ بامشقت تھی۔ سیاسی اجتماعات پر پابندی عائد تھی۔ سیاستدان گنگ تھے۔ صدر مغربی پاکستان کی طرف سے نچنت تھے۔ ملک کے اس حصے میں عوام کو ڈرا دھمکا کر سیدھا کیا جا سکتا تھا۔ تاہم انہیں مشرقی پاکستان کے بارے میں ایسا اطمینان نہیں تھا۔ اسے میری بدقسمتی کہیئے کہ صدر کے گماشتوں نے عوام کے جس طبقے سے بھی رابطہ کیا انہیں ایک ہی جواب ملا اور وہ یہ کہ عوام کو میرے (یعنی سہروردی کے) ردِ عمل کا انتظار تھا۔ اگر صدر کو مشرقی پاکستان کی سیاست کے بارے میں کچھ شد بد ہوتی تو یہ صورتِ حال انہیں ایسی سنگین معلوم نہ ہوتی۔ مشرقی پاکستان میں کچھ عرصہ جنرل آفیسر کمانڈنگ کے طور پر قیام کے باوجود انہیں صوبے کی سیاست کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا۔ میں نے کئی عشروں تک بنگال میں سیاسی جدوجہد کی تھی اور عوام کو مجھ پر اعتماد تھا۔ وزیرِ اعظم کے طور پر میری معیاد کے دوران اس اعتماد میں کمی واقع ہونے کی بجائے اضافہ ہوا تھا۔ میں نے 1936ء کے بعد صوبے میں مسلم لیگ کو منظّم کیا تھا اور 1949ء کے بعد سے عوامی لیگ کو اپنا خون پسینہ دیا تھا۔ صدر کو تاثر دیا گیا کہ میں نے آئین کی مخالفت کے لئے صوبے بھر میں خفیہ مراکز قائم کئے ہیں اور یہ کہ میں آئین کے نفاذ کا اعلان ہوتے ہی طوفان برپا کر دوں گا۔

حقیقت یہ تھی کہ میں نے صرف اپنی پیشہ وارانہ مصروفیات کے ضمن میں ڈھاکہ اور چٹا گانگ کا دورہ کیا تھا۔ علاوہ ازیں آئین میں رکاوٹ ڈالنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ انٹیلی جنس برانچ کا ڈائریکٹر داخلی امور کے بارے میں صدر کا قریبی معتمد تھا اُس نے میرے ایک امریکی دوست کے ذریعے آئین کے بارے

ہیں میرا ردِّعمل جاننے کی کوشش کی۔ بدقسمتی سے میں نے اپنے خیالات کے اخفاء رابطے کا نتیجہ ہے۔ البتہ بلکہ خیال ظاہر کیا کہ صدر کو 1956ء کا آئین بحال کر دینا چاہئے کیونکہ ان کا اپنا ...ر آں حالیکہ متنازعہ ہو گا۔ صدر نے اس ردّعمل سے یہ اندازہ لگایا کہ میں آئین کے نفاذ میں کھنڈت ڈالنے و ستوں کے کروں گا۔ میں ایک مقدمے کے سلسلے میں کراچی گیا ہوا تھا۔ جہاں 30 جنوری 1962ء کو مجھے گرفتا... کرلیا گیا۔ صدر کو بتایا گیا کہ میری مقبولیت محض ایک واہمہ ہے۔ خاص طور پر اگر میری گرفتاری کے ساتھ ہی یہ اعلان بھی کر دیا گیا کہ حکومت دوسرے پانچ سالہ منصوبے کے تحت مشرقی پاکستان کے لئے اس قدر مالی وسائل مختص کر رہی ہے کہ سابقہ حکومتیں ان کے بارے میں تصوّر بھی نہیں کر سکتی تھیں، تو میرے مقبولیت کے غبارے سے بالکل ہوا نکل جائے گی۔ صدر کا خیال تھا کہ ان مالی ترغیبات سے عوام کو مشرقی پاکستان کے بارے میں صدر کے خلوص کا یقین آ جائے گا۔ اور میری گرفتاری کے خلاف کسی ممکنہ ردِّعمل کی پیش بندی بھی ہو جائے گی۔

میری گرفتاری کا جواز پیش کرنے کے لئے ایک اعلامیہ جاری کیا گیا جس میں مجھ پر ملک دشمن سرگرمیوں کا الزام لگایا گیا۔ علاوہ ازیں صدر نے ایک پریس کانفرنس منعقد کی اور مجھ پر پاکستان سے غدّاری کا الزام عائد کرتے ہوئے خیال ظاہر کیا کہ میں پاکستان کی علیحدگی اور مغربی پاکستان کی شکست و ریخت کے منصوبے بنا رہا تھا۔ روایت یہ ہے کہ اگر کسی شخص کو بغیر مقدمہ چلائے محض حفظِ ماتقدم کے طور پر نظر بند کر دیا جائے تو حکومت اس کے خلاف براہِ راست الزامات لگانے سے احتراز کرتی ہے۔ نظر بند کو عدالت سے رجوع کرنے کا موقع دیا جاتا ہے جہاں حکومت کی طرف سے فراہم کردہ نظر بندی کی

وجوہات کو پرکھا جاتا ہے اگر صدر یا حکومت عدالتی کارروائی سے پہلے ہی الزامات کو ثابت شدہ اور نظر بند کو مجرم قرار دینا شروع کر دے تو اس سے عدالت کی توہین لازم آتی ہے میرے بعض دوستوں نے مجھ سے مشورہ کئے بغیر ہائی کورٹ میں میری نظر بندی کے خلاف حبسِ بے جا کی درخواست دائر کر دی۔ اگرچہ ایک صدارتی حکم کے ذریعے ایسی درخواستوں کو عدالت کے دائرۂ سماعت سے خارج قرار دیدیا تھا لیکن ہائی کورٹ نے یہ درخواست سماعت کے لئے منظور کر لی کیونکہ صدارتی حکم میں کچھ خلاء باقی رہ گیا تھا۔ بایں ہمہ عدالت کے اس درخواست پر حتمی سماعت کرنے سے قبل ہی صدر نے ایک اور صدارتی حکم کے ذریعے اس خلاء کو پر کر دیا اور عدالتوں کو ہر قسم کی حفاظتی نظر بندی کے خلاف درخواستوں کی سماعت کے اختیارات سے محروم کر دیا گیا میرے خلاف الزامات واضح طور پر بے بنیاد تھے اور مجھے جاننے والوں کو علم تھا کہ ان الزامات میں کوئی صداقت نہیں، سب سے پہلے تو یہ کہ میں نے خود کو داخلی سیاست میں ملوث کرنے سے مکمل اجتناب کیا تھا۔ اگر میرے دوستوں نے کسی سیاسی معاملے پر میری رائے یا مشورہ طلب کیا تو میں نے انہیں تجویز دی کہ وہ اپنی صوابدید کے مطابق عمل کریں، بے شک مارشل لاء کے باعث مشرقی پاکستان میں سیاسی بے چینی بڑھ رہی تھی۔ مشرقی پاکستان کے عوام اپنے بہتر سیاسی شعور کی بناء پر مارشل لاء سے

نفرت کرتے تھے اور جلد از جلد بحالئ جمہوریت کے متمنی تھے مزید برآں مشرقی پاکستان میں یہ احساس فروغ پذیر تھا کہ اقتصادی معاملات میں اس سے نا انصافی ہو رہی ہے۔ نیز یہ کہ مغربی پاکستان کی خوشحالی کی خاطر مشرقی پاکستان کی ترقی کو نظر انداز کیا جا رہا ہے بنگالی دانشوروں میں یہ تاثر عام تھا کہ جب تک سول اور فوجی انتظامیہ میں مغربی پاکستان کی بالادستی قائم ہے مشرقی پاکستان کی سیاسی یا اقتصادی شکایات کا ازالہ ممکن نہیں۔ مشرقی پاکستان کے لئے سوائے معاشی خود مختاری اور جمہوریت کے نجات کا کوئی راستہ نہیں۔

ابتداء میں مشرقی پاکستان میں رائے عامہ وفاقی طرزِ حکومت قبول کرنے پر تیار تھی بشرطیکہ بیشتر محکموں کا انتظام صوبوں کو منتقل کر دیا جائے بعد ازاں اسے ناکافی سمجھتے ہوئے مطالبہ کیا گیا کہ مکمل صوبائی خود مختاری کے بغیر مسئلہ حل نہیں ہو سکے گا تاکہ سوائے دفاع اور کرنسی جیسے انتہائی اہم شعبوں کے دیگر امور میں مرکز کی مداخلت کا اندیشہ باقی نہ رہے۔ لیکن اس تجویز میں بھی یہ دقت تھی کہ دفاع اور کرنسی کے شعبوں کو اس قدر پھیلایا جا سکتا ہے کہ حکومت کے دیگر شعبے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ پھر علیحدگی سے بچنے کے لئے نیم وفاق کو واحد نسخہ سمجھا گیا۔ طلباء اور نوجوانوں سمیت مندرجہ بالا خطوط پر سوچنے والوں نے مجھ سے رابطہ قائم کیا لیکن میں نے ایسی ہر تجویز کی مخالفت کی جس سے ملک کے دونوں بازوؤں کا تعلق کمزور پڑنے کا خدشہ تھا میری رائے میں ملک کی فلاح اسی میں تھی کہ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان مل کر کام کریں۔ اس ضمن میں عملی اعتبار سے بہترین راستہ یہ تھا کہ ملک کے دونوں حصوں سے تعلق رکھنے والے دیانت دار اور محبِ وطن اور نیک نیت اصحاب مل کر ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کریں اور کوئی ایسا حل تلاش کریں جس سے پاکستان کے تمام علاقوں کو انصاف میسّر آسکے۔

ڈھاکہ یونیورسٹی کے طلباء جانتے تھے کہ میرے خلاف بے بنیاد الزام عائد کئے گئے ہیں میری گرفتاری کے فوراً بعد صدر نے مشرقی پاکستان کا دورہ کیا کچھ اہم ممالک کے سفیر بھی صدر کی دانش اور مقبولیت کا عملی مظاہرہ دیکھنے کے لئے ان کے ہمراہ تھے۔ صدر کو زبردست مخالفانہ مظاہروں کا سامنا کرنا پڑا ایوب گیٹ کے نام سے تعمیر کردہ ایک مستقل دروازہ نذرِ آتش کر دیا مظاہرین نے دیواروں پر چسپاں صدر کی تصاویر نوچ کر قدموں تلے روند ڈالیں وزیرِ خارجہ منظور قادر جن کا فرضِ منصبی بیرونی دنیا میں صدر کے اقدامات کی وضاحت کرنا تھا ڈھاکہ یونیورسٹی میں مشتعل طلباء میں گھر گئے وائس چانسلر نے مداخلت کر کے انہیں شدید زخمی ہونے سے بچایا[23]۔ مجھے یہ جان کر اطمینان ہوا کہ عوام کی اکثریت صدر کے عائد کردہ الزامات کی حقیقت سے آشنا ہے۔ اور یوں مجھے بیٹھے بٹھائے ہیرو اور شہید کا درجہ مل گیا۔

فردِ واحد کا آئین

صدر نے 2 فروری 1962ء کو اپنے آئین کا اعلان کیا انہوں نے زور دے کر اعلان کیا کہ وہ کسی صورت میں سیاسی جماعتوں کو کام کرنے کی اجازت نہیں دیں گے انہوں نے یہ دعویٰ بھی کیا کہ یہ آئین

مکمل طور پر ان کی بصیرت، وسیع تجربے، غور و فکر اور پاکستانی عوام سے ان کے رابطے کا نتیجہ ہے۔ البتہ انہوں نے آئین کمیشن اور آئین پر نظرِ ثانی کرنے والی کابینہ کی ذیلی کمیٹی کا شکریہ ادا کیا در آں حالیکہ انہوں نے کمیشن کی نیم جمہوری تجاویز کو بھی شرفِ قبولیت بخشنے سے انکار کر دیا تھا۔ بنیادی جمہوریتوں کے ارکان نے مرکزی مجلسِ قانون ساز کے انتخاب کے لئے رائے دینا تھی، قومی اسمبلی کے کل ارکان کی تعداد 156 تھی۔ ان میں سے 6 نشستیں خواتین کے لئے مخصوص تھیں۔ ہر صوبے سے تین خواتین کو قومی اسمبلی کے لئے منتخب ہونا تھا ہر صوبائی اسمبلی 155 نشستوں پر مشتمل تھی جن میں سے 5 نشستیں خواتین کے لئے مختص تھیں، صدر کے عہدے کے لئے مزید انتخاب کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ ۔ 1956ء کے آئین کی بیشتر انتظامی دفعات بنیادی تغیرات کے بعد نئے آئین میں شامل کر لی گئیں۔ مملکت کا نام "اسلامی جمہوریہ پاکستان" کی بجائے "جمہوریہ پاکستان" رکھ دیا گیا۔ قانون اور سنت کے تمام حوالے قلم زد کر دیئے گئے۔ اسلامی نظریاتی کونسل برقرار رکھی گئی۔ (دفعات 199۔ 206) تاہم اس کے دائرہ اختیار میں خاصی تخفیف کر دی گئی۔ اب اس کونسل کو محض یہ مشورہ دینا تھا کہ کوئی مجوزہ قانون فقۂ اسلامی سے مغائرت تو نہیں رکھتا یا اصولِ قانون کے منافی تو نہیں ہے۔ (دفعہ 6) 1956ء کے آئین میں بنیادی حقوق کو اصولِ قانون سازی کا نام دیا گیا تھا اور ان حقوق کی باقاعدہ تعریف کا تعین کر کے انہیں قانون کے دائرے میں لایا گیا۔ اور قانون سازی کے رہنما اصول قرار دیا گیا تھا۔ اب نئے آئین کے تحت بنیادی حقوق کو عدالتوں کے دائرۂ سماعت سے خارج قرار دے دیا گیا۔ دفعہ 6(2) یہ امر دلچسپ ہے کہ وزیرِ خارجہ منظور قادر نے بھی اس مسئلے پر صدر کی ہاں میں ہاں ملائی۔ صدر نے یہ کہہ کر اس انحراف کا جواز پیش کیا تھا کہ برطانیہ کے آئین میں بھی بنیادی حقوق عدالتوں کے دائرۂ اختیار سے باہر رکھے گئے ہیں۔ انہوں نے یہ حقیقت نظر انداز کر دی کہ برطانیہ کا آئین غیر تحریر شدہ ہے اور غیر منضبط ہے۔

کابینہ کے نظام کو بھی منسوخ کر دیا گیا۔ صدر کو اپنی مرضی کے مطابق وزراء نامزد کرنے کا اختیار دے دیا گیا۔ ان وزراء کے لئے مرکزی مقنّنہ کی رکنیت لازمی نہیں تھی (دفعہ 33) کابینہ میں شامل ہونے والے ارکانِ اسمبلی خود بخود اپنی نشست سے محروم ہو جاتے تھے۔ دفعہ 25(2) صدر مرکزی اسمبلی کے ارکان کو پارلیمانی سیکرٹری بھی مقرّر کرنے کا اختیار رکھتے تھے۔ دفعہ 35 ایسی صورت میں ان کی رکنیت برقرار رہتی تھی۔ (دفعہ 120) صدر کو زیادہ سے زیادہ 30 جون تک بجٹ کی منظوری دینا ہوتی تھی۔ (مالی سال کا اختتام 31 مارچ کی بجائے 30 جون کر دیا گیا تھا) صدر کے منظور کردہ بجٹ پر اعتراضات کی گنجائش نہیں تھی (دفعہ 235) 10 فیصد اضافے کے ساتھ بجٹ مستقل طور پر مقنّنہ کی منظوری کے بغیر برقرار رکھا جا سکتا تھا (دفعہ 40) البتہ مرکزی اسمبلی کو نئے ٹیکسوں پر رائے دینے کا اختیار تھا۔ راولپنڈی کے قریب کم از کم 200 مربع میل کا ایک وسیع قطعہ اراضی ملک کا انتظامی صدر مقام اور حکومت کا مرکز قرار دے دیا گیا (دفعہ 211) کراچی کو دوبارہ صوبائی حیثیت بخش دی گئی۔

ذاتی ترنگ اور آمرانہ اختیار کے بل بوتے پر کی جانے والی اس شاہ خرچی کی ناگزیر مخالفت کے پیشِ نظر مشرقی پاکستان کے صدر مقام ڈھاکہ کو دارالحکومت ثانی قرار دے دیا گیا۔ نیز اسے قومی اسمبلی کا مرکز قرار دے کر طے کیا گیا کہ یہاں پر قومی اسمبلی کے تمام اجلاس منعقد ہوں گے۔ دفعہ 211 (3) اور (5) فی الحال اسلام آباد کا رقبہ 300 ایکڑ رکھا گیا۔ صدر کے تعاون کے بغیر آئین میں ترمیم کو عملی طور پر ناممکن بنا دیا گیا۔ آئینی ترمیم کے لئے دو تہائی ارکان اسمبلی (104) کی تائید ضروری تھی۔ دفعہ 209 (1) صدر کے عدم اتفاق کی صورت میں آئینی ترمیم کو قومی اسمبلی میں تین چوتھائی (117) ارکان کی تائید حاصل کرنا ہوتی تھی۔ دفعہ 291 (4) اس کے باوجود صدر بنیادی جمہوریتوں کے ارکان کی رائے طلب کرنے کا مجاز ہوتا تھا کہ آیا مجوزہ قانون کو منظور کیا جائے یا نہیں۔ اگر پھر بھی نتیجہ صدر کی خواہش کے مطابق نہ ہو تو صدر اسمبلی برطرف کر کے صدر سمیت نئے سرے سے اسمبلی کے انتخاب کا اعلان کرنے کا اختیار رکھتا تھا۔

آئین میں صدر کے محاسبے کی گنجائش رکھی گئی لیکن اس کے بارے میں ایسی شرائط عائد کی گئیں کہ یہ گنجائش کالعدم ہو کر رہ گئی، صدر کے خلاف تحریک کے حق میں کم از کم تین چوتھائی ارکان کی رائے ضروری تھی۔ دفعہ 31 (6) علاوہ ازیں اگر صدر کے خلاف تحریک کل ارکان کی نصف تعداد کی رائے حاصل کرنے میں ناکام رہتی تو سب ارکان کی رکنیت منسوخ قرار پاتی .... دفعہ 13 (1) اور (7)) مرکز اور صوبوں کے درمیان شعبوں کی تقسیم میں جودتِ طبع کا ایک نمونہ پیش کیا گیا، گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935ء بڑے غور و فکر نیز وسیع انتظامی اور سیاسی تجربے کے نتیجے میں تیار کیا گیا تھا۔ اس ایکٹ میں محکموں اور حکومتی شعبوں کی تین فہرستیں تیار کی گئیں۔ ایک فہرست صرف مرکز کے دائرۂ اختیار میں تھی۔ دوسری فہرست صوبوں اور مرکز کے درمیان مشترک تھی تاہم اس میں مرکز کو بالادستی حاصل تھی۔ تیسری فہرست کے محکموں کا کلی نگران صوبوں کو قرار دیا گیا تھا۔ 1962ء کے آئین میں مرکز کے لئے محکموں کی صرف ایک فہرست رکھی گئی۔ اور دیگر تمام شعبوں اور محکموں کو صوبوں کی اقلیم قرار دے دیا گیا۔ درحقیقت یہ ایک دامِ تزویر تھا۔ مقصود یہ ظاہر کرنا تھا کہ صوبے اپنے داخلی امور میں خود مختار ہیں نیز نئے آئین نے اختیارات کے ارتکاز کو ختم کر دیا ہے۔ فی الاصل اس ضمن میں 1935ء کے آئین کی سب سے اہم شق یہ تھی اور اس شق کو 1956ء کے آئین میں برقرار رکھا گیا تھا کہ مرکز صوبائی فہرست سے شامل امور میں دخل دینے کا کوئی اختیار نہیں رکھتا تھا۔ 1962ء کے آئین میں یہ شق حذف کر دی گئی۔ مزید برآں، مرکز کو منصوبہ بندی، ہم آہنگی، پاکستان کی سلامتی (اس میں معاشی و اقتصادی استحکام بھی شامل تھا) اور حصولِ توافق کے نام پر صوبائی فہرست میں دخل اندازی کے اختیارات دے دیئے گئے۔

آئین کا ایک نادر پہلو یہ تھا کہ برسرِ اقتدار صدر کے علاوہ تین سے زیادہ افراد کو ایک ہی انتخاب میں

صدارتی امیدوار بننے کی اجازت نہیں تھی۔ تین سے زیادہ امیدواروں کی صورت میں قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے مشترکہ اجلاس کو تین امیدواروں کا انتخاب کرنا تھا۔ ہر رکن اسمبلی کو تین امیدواروں کے لئے رائے دینا تھا۔ چنانچہ اسمبلی میں صدر کی اکثریت اور بنیادی جمہوریت دانوں' سابقہ والیانِ ریاست' قبائلی ارکانِ اسمبلی اور پارلیمانی سیکرٹریوں کی موجودگی میں صدر کے لئے کچھ مشکل نہ تھا کہ اپنے دوستوں اور حواریوں میں سے تین افراد کو امیدوار منتخب کروالے اور بعدازاں انہیں مقابلے سے دستبردار کرواکے خود بلامقابلہ صدر منتخب ہوجائے۔

آئین کے بارے میں ملاجلا ردِّعمل ظاہر کیا گیا۔ مشرقی پاکستان میں سوائے ایک سیاستدان کے کسی ممتاز یا غیر ممتاز سیاسی قائد نے آئین کا خیر مقدم نہ کیا۔ البتہ کچھ ضلع کونسلوں نے آئین کے حق میں ردِعمل ظاہر کیا۔ مغربی پاکستان میں کچھ لوگ صدر کو مبارکباد دینے دوڑے اور اس مقصد کے لئے باقاعدہ وفود ترتیب دیئے گئے۔ ایک معروف مولانا صاحب ہدیۂ تبریک پیش کرنے والوں میں سب سے پہلے پہنچے اور اس نیازمندی پر اسلامی مشاورتی کونسل کے رکن مقرّر کر دیئے گئے۔ انہوں نے آئین کو صحیح معنوں میں اسلامی دستور اور اسلامی تعلیمات کے مطابق ہونے کی سند عطا فرمائی۔ آئین میں مملکت کے نام کی تبدیلی' قرآن و سنت کے حوالوں کا قلم زد کیا جانا اور سب سے بڑھ کر قوانین کو قرآن و سنت کے ڈھانچے میں ڈھالنے والی شق کا حذف کیا جانا' مولانا نے ان تمام درازدستیوں کو اپنے عمامے کی سلوٹوں میں چھپالیا۔ مولانا نے کہا "صدر نے اسلامی مشاورتی کونسل قائم کی (یہ کونسل تو 1956ء کے آئین میں بھی کہیں زیادہ اختیارات کے ساتھ قائم کی گئی تھی۔ مگر اسے چھوڑیئے) صدر نے سود حرام قرار دیا (1956ء کے آئین میں یہ شق بھی موجود تھی) صدر نے شراب کے استعمال میں اعتدال کی تلقین کی (1956ء کے حرماں نصیب آئین میں شراب پر مکمل پابندی کی تجویز دی گئی تھی) اور پھر اسلام میں بھی تو جمہوریت کی بجائے اطاعتِ امیر کا اصول پایا جاتا ہے۔ چنانچہ صدر صاحب کا آئین اسلامی اور مسلمان عوام کی نفسیات و روایات سے مطابقت رکھتا ہے۔ سینکڑوں لوگوں پر یکایک عوام کی حقیقی نفسیات کا انکشاف ہوا۔ کیونکہ آئین نے گویا معجزاتی طور پر سب اسرار فاش کر دیئے تھے۔ بنیادی جمہورتیوں کی کونسلیں پھولے نہیں سما رہی تھیں۔

مولانا مودودی نے آئین پر تنقید کی جسارت کی اور بعض اخبارات نے بے خیالی میں ان کا نقطۂ نظر شائع کر دیا۔ وزیر خارجہ منظور قادر نے مولانا کو سخت تنبیہ کی اور مودودی سمیت ہر خاص وعام کو خبردار کیا کہ مارشل لاء پوری توانائی کے ساتھ موجود ہے اور اگر کسی نے آئین پر تنقید کرنے کی کوشش کی تو اسے چودہ سال قید کے لئے تیاّر رہنا چاہیئے اخبارات کے بھی کان اینٹھے گئے۔ منظور قادر نے ملک بھر میں بار ایسوسی ایشنوں کا دورہ کر کے دانشوروں سے خطاب کیا۔ ہر جگہ انہیں معاندانہ تنقید اور کاٹ دار جملوں کی بوچھاڑ کا سامنا کرنا پڑا' تاہم ان واقعات کی عوام کو خبر نہ مل سکی۔

صدر کا اپنے محبوب نظریات سے انحراف

یک رنگی تشہیر کے اس سیلِ بے اماں کو جانتے ہوئے کسی کو تعجب نہیں ہونا چاہئے کہ صدر کو یہ خوش فہمی لاحق ہونے لگی کہ آتے ہیں" غیب سے یہ مضامین خیال میں" اور یہ کہ انہیں اس تیرہ نصیب قوم کا نجات دہندہ بنا کر بھیجا گیا ہے۔ صدر نے جہل کا نچوڑ اور گمراہ عوام کو ہمیشہ تحقیر' بد اعتمادی اور نفرت کی نگاہ سے دیکھا تھا۔ صدر کے آبگینۂ پندار کو خاصی ٹھیس پہنچی ہوگی جب انہیں بالآخر انہی لوگوں کی حمایت حاصل کرنے کے لئے اپنے محبوب نظریات سے انحراف کرنا پڑا۔ انقلابی حکومت کے تمام ستونوں کو خود ہی منہدم کرنا پڑا۔ ان کے مقاصد ایک ایک کر کے بخیر گزشت ہوتے گئے۔ البتہ ایک مقصد کو انہوں نے حرزِ جان بنائے رکھا وہ کسی قیمت پر اپنے اقتدار کی آہنی گرفت کو ڈھیلا کرنے پر تیار نہیں تھے۔ اسی اقتدار کے بل بوتے پر انہوں نے اپنی ذات اور اپنے خاندان کے لئے وسیع دولت اکٹھی کی تھی اور اپنے تمام ممکنہ حریفوں کو نیست و نابود کر دیا تھا۔

میری گرفتاری کے باعث میری جماعت کے اکثر ارکان نے انتخاب کا مقاطعہ کرنے کو ترجیح دی۔ جیسا کہ میں نے پہلے بیان کیا۔ کچھ ارکان نے انتخاب میں حصہ لیا اور منتخب ہو گئے۔ انتخاب میں حصہ لینے والے امیدواروں کی اکثریت کا تعلق کالعدم مسلم لیگ سے تھا۔ مغربی پاکستان میں جماعت اسلامی نے بھی انتخابات میں حصہ لیا تاہم کسی امیدوار کو کھلے بندوں اپنی جماعتی وابستگی کا اعلان کرنے کی اجازت نہیں تھی۔

مرکزی اسمبلی کا اجلاس 8 جون 1962ء کو طلب کیا گیا۔ اسی روز مارشل لاء اٹھایا جا رہا تھا صدر کو جن ابتدائی مشکلات کا سامنا تھا۔ ان میں سے ایک ارکانِ اسمبلی میں سے وزراء کا انتخاب تھا۔ وزارت قبول کرنے والوں کو اسمبلی کی رکنیت سے ہاتھ دھونا تھے۔ ارکانِ اسمبلی کو مطمئن کرنے کے لئے صدر نے ایک حکم کے ذریعے آئین کی متعلقہ شق میں ترمیم کر ڈالی اور اپنے سابقہ نقطۂ نگاہ سے منحرف ہو گئے۔ آئین کی دفعہ 224 (3) کے تحت صدر کو اختیار تھا کہ آئین یا آئین کی کسی شق پر عمل در آمد میں حائل مشکلات دور کرنے کے لئے صدارتی حکم کے ذریعے آئین میں ترمیم کر سکتے تھے۔ میرے خیال میں صدر نے وزراء کی رکنیت کے بارے میں جو صدارتی حکم جاری کیا وہ اس شق پر پورا نہیں اترتا تھا۔ اور عدالت سے رجوع کر کے اسے غیر قانونی قرار دلوایا جا سکتا تھا۔ مشرقی پاکستان ہائی کورٹ نے ایسی ہی ایک درخواست پر صدارتی حکم کو غیر قانونی قرار دے دیا۔ اس درخواست میں دو وزراء کو فریق بنایا گیا تھا۔ اگرچہ یہ ایک عمومی حکم تھا۔ لیکن قومی اسمبلی کے سپیکر تمیز الدین خاں نے مذکورہ بالا دو وزراء کے علاوہ باقی کابینہ کو ارکانِ اسمبلی کے طور پر ووٹ دینے کی اجازت دے دی۔ سپریم کورٹ نے مشرقی پاکستان ہائی کورٹ کے فیصلے کو برقرار رکھا اور وزارت قبول کرنے والے تمام ارکانِ اسمبلی کی رکنیت منسوخ قرار پا گئی۔

قومی اسمبلی میں افتتاحی تقریر کرتے ہوئے بھی صدر سیاسی جماعتوں کے خلاف خوب گرجے برسے

تھے۔ لیکن جلد ہی سیاسی جماعتوں کے قیام کے لئے قانون کا مطالبہ ہونے لگا۔ صدر نے سیاسی جماعتوں کی تعداد کو دو یا تین تک محدود کرنے کی بھرپور کوشش کی لیکن ناکام رہے اور سیاسی جماعتوں کا قانون منظور ہو گیا۔ البتہ سیاسی جماعتوں پر ایک بندش عائد کر دی گئی۔ اسلامی نظریۂ حیات کے منافی تصورات کے پرچار (جی ہاں۔ یہی الفاظ تھے) کے لئے قائم ہونے والی جماعتوں پر پابندی عائد کی جا سکتی تھی۔ اور اس امر کا فیصلہ سپریم کورٹ کے اختیار میں تھا۔ پبلک سیفٹی ایکٹ کے تحت نظر بند رہنے کے باعث خود بخود ایبڈو قرار پا جانے والے افراد کو سیاسی جماعتوں کی رکنیت اختیار کرنے کی اجازت مل گئی۔ البتہ جن لوگوں نے بدانتظامی کے الزامات کے خلاف صفائی پیش کرنے سے انکار کر کے سزا قبول کی تھی۔ یا جو اپنا دفاع کر کے مقدمہ ہار گئے تھے ان پر یہ پابندی بدستور قائم رہی۔

قانون کی بالادستی کی روایت میں پروان چڑھنے والوں کی نظر میں یہ امر بنیادی انسانی حقوق اور اصول قوانین سازی کی سراسر خلاف ورزی ہے۔ اور انسانی ضمیر کے لئے ناقابلِ قبول ہے کہ کسی شخص کو ایسے افعال پر مجرم ٹھہرا کر سزا دی جائے جو ارتکابِ فعل کے وقت جرم تصوّر نہیں کئے جاتے تھے۔ امرواقعہ یہ ہے کہ ایبڈو ایک بعد وقوع واقعہ نافذ ہونے والا قانون تھا۔ اور ان اشخاص کو جن افعال پر سزاوار قرار دیا گیا وہ ارتکابِ فعل کے وقت جرم نہیں سمجھے جاتے تھے۔ اس قانون میں ان افعال کے لئے سزا کی حد کا بھی تعین کر دیا گیا۔ تاہم سیاسی جماعتوں کے قانون کے تحت ان سزا یافتگان کو اپنے سیاسی خیالات کے اظہار کی اجازت مل گئی۔ البتہ یہ لوگ کسی سیاسی جماعت کی باقاعدہ رکنیت اختیار نہیں کر سکتے تھے۔ 1963ء کے صدارتی حکم نمبر 1 کے تحت ایبڈو زدہ افراد کے لئے کسی قسم کی سیاسی سرگرمی میں حصہ لینا قابلِ سزا جرم قرار دے دیا گیا۔

اس حقیقت کے مدِنظر کہ ملک بھر میں بنیادی جمہوریت کے ارکان کے انتخاب اور ان کے ذریعے مقنّنہ کے ارکان کے انتخاب پر بے چینی پائی جاتی تھی۔ نیز یہ کہ بنیادی جمہوریتوں کے باعث ملک کا پڑھا لکھا طبقہ عملی طور پر حقِ رائے دہی سے محروم ہو کر رہ گیا تھا۔ صدر نے اختر حسین کی سربراہی میں حقِ رائے دہی کمیشن قائم کیا۔ اختر حسین ماضی میں مغربی پاکستان کے گورنر، مرکزی وزیر اور چیف الیکشن کمشنر رہ چکے تھے۔ اس کمیشن نے متفقہ رپورٹ پیش کی کہ قانون ساز اداروں کے لئے حقِ بالغ رائے دہی کی بنیاد پر اور مخلوط طرزِ انتخاب کے تحت انتخابات منعقد کروائے جائیں، کمیشن کے سربراہ ایک رکن نے اقلیتی رپورٹ میں تجویز پیش کی کہ صدر کے لئے بنیادی جمہوریتوں کے ارکان کو حلقۂ انتخاب قرار دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ صدر کے لئے کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔ بنیادی جمہوریتوں کا تصوّر صدر کی طرف سے فلسفۂ سیاست کو خاص دین تھا اور صدر کسی صورت اس کارنامے سے جدا ہونے کو تیّار نہیں تھے۔

بایں ہمہ صدر پر بالکل واضح ہو چکا تھا کہ وہ وقت تیزی سے قریب آ رہا ہے۔ جب انہیں اپنے خود ساختہ اور محبوب نظریات کو خیرباد کہہ کے کھلے بندوں سیاسی اکھاڑے میں اترنا پڑے گا۔ انہیں بخوبی علم تھا کہ انہیں اس وقت اپنی سیاسی جماعت کی ضرورت پیش آئے گی۔

سہروردی کی رہائی کا مطالبہ

مارشل لاء اٹھائے جانے کے بعد پاکستان بھر میں جلسے منعقد ہوئے جن میں میری رہائی کا مطالبہ کیا گیا کراچی میں تمام سیاسی جماعتوں نے اس سلسلے میں ایک مشترکہ جلسہ منعقد کیا جس میں ایک اندازے کے مطابق دو لاکھ افراد نے شرکت کی۔ خان عبدالقیوم خاں نے اس جلسے میں بڑی دھواں دھار تقریر کی۔ چوہدری خلیق الزماں سمیت مسلم لیگ کے نمائندوں، نیشنل عوامی لیگ اور جماعتِ اسلامی نے بھی خاں عبدالقیوم خاں کی تائید کرتے ہوئے میری رہائی کا مطالبہ کیا۔ مارشل لاء کے دنوں میں صدر کے خلاف توہین آمیز بیان جاری کرنے پر فوجی عدالت نے خاں عبدالقیوم خاں پر مقدمہ چلا کر انہیں سزا دی تھی۔ میں ان دنوں نمونیے کے حملے کے بعد ابھی مکمل طور پر صحت یاب نہیں ہوا تھا۔ تاہم میں نے فوجی عدالت میں پیش ہو کر خاں عبدالقیوم خاں کا دفاع کیا۔ اس کے بعد خاں عبدالقیوم خاں نے ہمیشہ بڑی عالی ظرفی سے اعتراف کیا کہ وہ میری حریف جماعت سے تعلق رکھتے تھے اور ماضی میں انہوں نے مجھے شمال مغربی سرحدی صوبے میں داخل ہونے سے بھی روکا تھا۔ لیکن میں نے خود کو خطرے میں ڈال کر ان کی مدد کی۔

بدقسمتی سے خاں صاحب قید و بند کی صعوبتیں برداشت نہ کر سکے اور صدر کے نام ایک معافی نامہ داخل کر کے رہا ہو گئے۔ تاہم مارشل لاء اٹھائے جانے کے بعد انہوں نے میری حمایت میں کئی تقاریر کیں۔ لاہور کے ایک جلسے سے خطاب کرنے کے بعد انہیں پھر گرفتار کر لیا گیا۔ صدر نے گورنر مغربی پاکستان کو ہدایت کی تھی کہ خاں عبدالقیوم خاں کو گرفتار کر لیا جائے۔ گورنر مغربی پاکستان، خان عبدالقیوم خاں کے بارے میں نرم گوشہ رکھتے تھے۔ انہوں نے خاں صاحب کو گرفتار کرنے کی بجائے ان سے ضمانت لے لی کہ وہ لاہور کے جلسۂ عام سے خطاب نہیں کریں گے۔ تاہم ان کے پیروکاروں نے ان پر اس قدر دباؤ ڈالا کہ جلسے میں شریک ہونے پر مجبور ہو گئے۔ انہوں نے مبیّنہ طور پر اپنی تقریر میں کہا کہ فوج کے کچھ افراد نے ایک موقع پر انہیں مداخلت پر اکسایا تھا۔ جلسے کے بعد انہیں گرفتار کر لیا گیا بعد ازاں نظربندی کی کوفت سے اکتا کر انہوں نے اعلان کیا کہ ایبڈو زدہ ہونے کے باوجود سیاسی تقریر کر کے انہوں نے غلطی کی تھی۔ تاہم انہیں اپنی مرضی کے خلاف تقریر کرنے پر مجبور کیا گیا تھا انہوں نے اپنے بیانات پر افسوس کا اظہار کیا۔ اور آئندہ عوامی اجتماعات سے خطاب یا کسی قسم کی سیاسی سرگرمیوں میں شرکت سے گریز کی یقین دہانی کرواتے ہوئے معافی کے خواستگار ہوئے۔ چنانچہ انہیں رہا کر دیا گیا۔ لیکن یہ امر ہمیشہ کے لئے مشکوک ہو گیا کہ کیا وہ مستقبل میں اپنی جماعت یا عوام کا اعتماد حاصل کر سکیں گے۔

مشرقی پاکستان میں ڈھاکہ کے پلٹن میدان میں جسے بعد ازاں بیرونی سٹیڈیم کا نام دیا گیا اور جو عوامی اجتماعات کی تاریخی روایات کا امین ہے، ایک بہت بڑا جلسۂ عام منعقد ہوا جس میں میری فوری رہائی کا مطالبہ کیا گیا۔

میری گرفتاری کے بعد سے صدر صاحب مشرقی پاکستان کے باشندوں پر اپنی دریا دلی کا سکّہ جمانے کی کوشش کر رہے تھے۔ انہوں نے دوسرے پانچ سالہ منصوبے میں مشرقی پاکستان کے لئے خطیر رقوم کی تخصیص کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے دعوے کو مدلّل کرنے کی کوشش کی۔ بہت کم لوگوں کو علم تھا کہ اصل منصوبے میں مشرقی پاکستان کے لئے قلیل رقوم مختص کی گئی تھیں۔ یہ اضافہ دراصل اقوامِ متحدّہ کے ماہرین کی مداخلت پر کیا گیا تھا۔ اور اس میں صدر کے حسنِ نیّت کو بہت کم دخل تھا۔ علاوہ ازیں امریکہ کی طرف سے نہایت فیاضانہ اور بے مثال اقتصادی امداد کے کارن دوسرا منصوبہ یوں بھی بہت توسیع پا گیا تھا۔ اور منطقی طور پر مشرقی پاکستان کے لئے زیادہ رقوم کی تخصیص ہرگز تعجّب انگیز نہ تھی۔ دوسرے پانچ سالہ منصوبے پر اصولِ مساوات سے انحراف کے الزام پر صدر نے جواز پیش کیا کہ مشرقی پاکستان زیادہ اقتصادی معاونت کی کھپت سے قاصر ہے۔ نیز یہ کہ سندھ طاس منصوبے اور سیم و تھور کی روک تھام پر اٹھنے والے اخراجات کو مغربی پاکستان کے حصے میں شامل نہ کیا جائے کیونکہ یہ مصارف دوسرے پانچ سالہ منصوبے کا حصہ نہیں ہیں۔ تاہم صدر اس اعتراض کا کوئی جواب نہ دے سکے کہ مشرقی پاکستان میں سیلاب وغیرہ کی روک تھام کے لئے کوئی منصوبہ کیوں تیاّر نہیں کیا گیا۔

صدر نے فوجی انقلاب کے فوراً بعد مشرقی پاکستان کے بارے میں توہین آمیز کلمات ادا کئے تھے۔ اور کہا تھا کہ یہ بھوکے ننگے لوگ قومی وسائل کو لوٹ رہے ہیں۔ اور جب انہیں قرضے واپس کرنے کے لئے کہا جائے تو قدرتی آفات کا واویلا کرنے لگتے ہیں۔ صدر کے ان زہر آلود فقروں کی چبھن عوام کے حافظے میں ابھی تازہ تھی۔ صدر نے مشرقی پاکستان سے قرضے اور واجبات کی واپسی کے لئے سرٹیفیکیٹ کا طریقۂ کار اختیار کیا جس میں مطالبہ پر مقروض کو لازمی طور پر ادائیگی کرنا پڑتی ہے۔ عدم ادائیگی کی صورت میں مویشی، ہل اور گھریلو برتنوں جیسی منقولہ اشیاء ضبط کر کے نیلام کی جا سکتی ہیں۔ عوام کو یاد تھا کہ صدر ایوب کے سخت گیر رویّے کے باعث وہ اپنی زمینیں اور چھوٹی موٹی اشیاء بیچ ڈالنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ یوں کسمپرسی اور مفلوک الحالی کی حالت کو پہنچنے والے صدر کی اس ذہنی کایا کلپ پر اعتبار کرنے کو تیاّر نہیں تھے۔ جس کا صدر کو دعویٰ تھا۔ عوام دیکھ رہے تھے کہ امداد کی منظوری کے باوجود رقومات کی ادائیگی نہیں ہو رہی تھی۔ اور پانچ سالہ منصوبے کے تیسرے سال میں بھی ترقیاتی منصوبے تعویق و التواء کے طاق پر رکھے تھے۔ اب اچانک مشرقی پاکستان میں عوامی جذبات کو ٹھنڈا کرنے کی ضرورت آن پڑی اور ترقیاتی منصوبے دھڑا دھڑ مکمل ہونے لگے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ مشرقی پاکستان میں صنعتوں کے قیام کے لئے لائسنس حاصل کرنا مغربی پاکستان سے بھی آسان ہو گیا۔ اگرچہ آخری تجزیے میں اس کا فائدہ مغربی پاکستان کے صنعت کاروں کو ہی پہنچا۔ صدر بار بار تقابل کرتے رہے کہ انہوں نے سابقہ حکومتوں کی نسبت مشرقی پاکستان کو زیادہ فائدہ پہنچایا۔ لیکن مشرقی پاکستان کے عوام نے جھانسے میں آنے سے انکار کر دیا اور بدستور میری رہائی کا مطالبہ کرتے رہے۔

خبر نکلی کہ صدر مجھے رہا کرنے کو تیاّر ہیں۔ صدر کے خصوصی مشیر جنرل برکی نے جیل میں مجھ سے

ملاقات کی۔ میں نے انہیں صاف صاف بتا دیا کہ مجھے اپنی ذات کے لیے کچھ درکار نہیں، میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ ملک کو جمہوری آئین دیا جائے۔ صدر کی طرف سے نامزد کردہ مشرقی پاکستان کے وزراء نے پر زور طریقے سے میری رہائی کی مخالفت کی کیونکہ ایسی صورت میں وہ کہیں منہ دکھانے کے قابل نہ رہتے۔ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ وزیر خارجہ بوگرا محمد علی کے علاوہ مشرقی پاکستان سے تعلق رکھنے والے تمام وزراء فوجداری مقدمات میں ملوث رہ چکے تھے۔ فضل القادر چوہدری کو مسروقہ مال کی وصولی کے مقدمے میں سزا ہوئی تھی۔ اور میں نے تکنیکی بنیاد پر اسے سپریم کورٹ سے بری کروایا۔ اب اسی فضل القادر چوہدری نے صدر کے پاس جا کر مشرقی پاکستان میں اپنے اثر و رسوخ کے بلند بانگ دعوے کئے اور کہا کہ وہ صدر کے حق میں پانسہ پلٹ دے گا۔ اسمبلی کا اجلاس ختم ہونے سے قبل وہ ڈھاکہ پہنچ گیا اور ہوائی اڈے پر شیخی بگھاری کہ وہ ثابت کر دے گا کہ سہروردی کے علاوہ دوسرے بھی پلٹن میدان اور دیگر مقامات پر جلسے منعقد کر سکتے ہیں[24]۔ لیکن ٹرین کے ذریعے چٹا گانگ پہنچنے پر نوجوانوں اور طلباء کے ایک مشتعل ہجوم نے اس کا استقبال کیا۔ پولیس نے ہجوم پر بری طرح تشدد کیا۔ چٹا گانگ کے جلسۂ عام میں بھی ہنگامہ ہوا اور فضل القادر چوہدری کو معلوم ہو گیا کہ پلٹن میدان تو ایک طرف وہ مشرقی پاکستان میں کسی بھی جگہ جلسہ منعقد کرنے کی حیثیت نہیں رکھتے۔ اس کے بعد انہوں نے کئی بار اپنے دورے کا اعلان کیا اور ہر بار انہیں یہ ارادہ مؤخر کرنا پڑا۔

پھر صدر صاحب کے ایک اور وزیر خان عبد الصبور خاں نے صدر کی طرف سے اس مہم کا بیڑہ اٹھایا۔ ان حضرات کو ایک فوجی عدالت نے ایک سال قید بامشقت اور بھاری جرمانے کی سزا سنائی تھی۔ بعد ازاں قید کی معیاد کم کر کے چار ماہ کر دی گئی اور انہوں نے یہ قید کاٹی۔ میرے خلاف مہم میں خان عبد الصبور خاں بھی کچھ ایسے کامیاب نہ رہے۔ ایک اور وزیر وحید الزماں کا انجام بھی مختلف نہ ہوا۔ وحید الزماں پر تقسیم کے وقت مقدمہ چل رہا تھا۔ لیکن تقسیم کے باعث وہ بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ اب بھی مشرقی پاکستان کی عدالتوں میں ان کے خلاف غبن کے کئی مقدمات زیر سماعت تھے۔ اب محمد علی بوگرا کو حکم ہوا کہ مشرقی پاکستان کا رخ کریں۔ بوگرہ محمد علی سمجھدار نکلے۔ انہوں نے صدر کو مشورہ دیا کہ مجھے رہا کر دیا جائے۔ انہوں نے اپنی شہرت اور نیک نامی محفوظ رکھنے کے لئے میری رہائی تک مشرقی پاکستان جانے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے میری نظر بندی کے دوران مجھ سے ملاقات بھی کی اور کچھ غیر اہم سی تجاویز پیش کی۔ میں نے کسی قسم کی شرائط قبول کرنے یا کوئی یقین دہانی کروانے سے انکار کر دیا۔ انہیں کئی بار مشرقی پاکستان کے لئے ہوائی جہاز میں اپنی نشست منسوخ کروانا پڑی۔ میری رہائی کے بعد 19 اگست 1962ء کو وہ مشرقی پاکستان گئے۔ ڈھاکہ میں ایک اجتماع سے بھی انہوں نے خطاب کیا اور عوام نے ان کی بات سن لی۔[25]

نو دستخط کنندگان

مشرقی پاکستان میں تمام کالعدم سیاسی جماعتوں نے مل کر ایک منشور تیار کیا اور موقع پر موجود تمام

رہنماؤں نے اس منشور پر دستخط کیئے [26] "نور ہنماؤں کے بیان" کے نام سے مشہور ہونے والی اس دستاویز کو خاصی اہمیت حاصل ہو گئی۔ اس بیان کا لُبِّ لباب یہ تھا کہ کسی فردِ واحد کو آئین مدون کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ صرف اس مقصد کے لئے منتخب ہونے والے عوامی نمائندے ہی آئین تشکیل دینے کے مجاز ہیں۔ چنانچہ حقِ بالغ رائے دہی کی بنیاد پر انتخابات کروا کے ایک دستور ساز اسمبلی تشکیل دی جائے جو پاکستان کا آئین تیار کرے۔ سیاسی جماعتوں کے بارے میں ان رہنماؤں کا نقطہ نظر یہ تھا کہ 1962ء کے آئین میں سیاسی سرگرمیوں کے لئے جگہ نہیں ہے۔ جو صرف آزادانہ ماحول میں ہی جنم لے سکتی ہیں۔ لہٰذا نئی سیاسی جماعتوں کی تشکیل یا کالعدم جماعتوں کے احیاء سے گریز کرنا چاہئے۔ قانون ساز ادارے قطعی طور بے اختیار ہیں اور صدر نے تمام اختیارات اپنے ہاتھوں میں مرتکز کر رکھے ہیں۔ سیاسی جماعتوں پر بے شمار بندشیں عائد ہیں اور عوام کے حقیقی قائدین کو سیاسی جماعتوں میں شمولیت سے روک دیا گیا ہے۔ بیان کے دستخط کنندگان نے طرزِ حکومت کے صدارتی یا پارلیمانی ہونے کے بارے میں کوئی واضح رائے دینے سے احتراز کیا۔ تاہم یہ لوگ صدارتی طرزِ حکومت کو ملک کے لئے غیر موزوں سمجھتے تھے۔ کیونکہ صدارتی طرزِ حکومت کو جمہوری رنگ بخشنے والے ادارے اور روایات ملک میں مفقود تھیں۔ اس بیان کی تائید میں پورے مشرقی پاکستان میں جلسے منعقد ہوئے۔ مغربی پاکستان میں بھی اس اعلامیے کی بازگشت سنی گئی۔

غالباً یہاں پر اس بیان کے نو دستخط کنندگان اور مسودے کی تشکیل میں شریک مشاورت چند دوسرے رہنماؤں کے بارے میں کچھ تفصیل بیان کرنا نامناسب نہ ہو گا۔ نورالامین 1948ء سے لیکر 1954ء تک قریب چھ برس مشرقی پاکستان کے وزیرِ اعلیٰ اور مشرقی پاکستان مسلم لیگ کے سربراہ رہے تھے۔ ایبڈو زدہ یا پابندِ سلاسل مرکزی قائدین کی عدم موجودگی نیز نامساعد سیاسی فضا کے باعث مشرقی پاکستان میں باشعور سیاسی کارکنوں نے سیاسی جماعتوں کے احیاء کے خلاف رائے دی اور اس مطالبے پر اس شدت سے اصرار کیا کہ نورالامین اپنے سیاسی مستقبل کو خطرے میں دیکھ کر اس نقطۂ نگاہ سے اتفاق پر آمادہ ہو گئے۔ انہیں مشرقی پاکستان کا گورنر بننے کی پیش کش ہوئی مگر انہوں نے انکار کر دیا۔ آئین کے مطابق صدر کو دو خصوصی مشیر رکھنے کا اختیار حاصل تھا۔ مغربی پاکستان سے جنرل برکی صدر کے مشیر مقرر ہوئے۔ صدر نے نورالامین کو مشرقی پاکستان سے خصوصی مشیر بننے کی پیش کش کی لیکن نورالامین نے اسے بھی مسترد کر دیا۔

فضل الحق کی موت کے بعد کرشک سرامک پارٹی کی قیادت سنبھالنے والے ابو حسین سرکار نے اپنی جماعت کی نمائندگی کی۔ اگرچہ یہ جماعت عملی طور پر ایک مردہ گھوڑے میں تبدیل ہو چکی تھی۔ فضل الحق کی قیادت کے باعث اس جماعت کو تھوڑا بہت سیاسی مقام حاصل تھا۔ وہ بھی ختم ہو چکا تھا۔ کرشک سرامک پارٹی کے ایک اور نمائندے حمید الحق چوہدری نے بھی اس اعلامیے پر دستخط کیے۔ حمید الحق مشرقی پاکستان اور مرکز میں وزیر رہ چکے تھے۔ ایک زمانے میں پروڈا کے تحت ان کے خلاف مقدمہ چلایا گیا تھا اور انہیں نا اہل قرار دیا گیا تھا' حمید الحق چوہدری کو یہ بات ناگوار گزری کہ مجھے مشرقی

پاکستان کا نمائندہ تسلیم کیا جا رہا تھا۔ انہوں نے اجتماعی قیادت وغیرہ کی بات چلانے کی کوشش کی لیکن ان کی دال نہ گل سکی۔ کرشک سرامک پارٹی کی طرف سے فضل الحق کے بھتیجے سید عزیز الحق اور پارٹی کے سیکرٹری ایس محمد سلیمان نے بھی اس بیان پر دستخط ثبت کیے۔ عوامی لیگ کی طرف سے عطا الرحمٰن خاں اور شیخ مجیب الرحمن دستخط کنندہ تھے۔ مشرقی پاکستان مسلم لیگ کے سیکرٹری شاہ عزیز الرحمٰن بھی دستخط کنندگان میں شامل تھے۔ پیر محسن الدین نے نظامِ اسلام پارٹی کی طرف سے بیان پر دستخط کیے اگرچہ ان کی جماعت نے سیاسی جماعتوں کا احیاء نہ کرنے کے فیصلے سے اتفاق نہ کیا اور اپنی سیاسی اہمیت کھو بیٹھی۔ مشرقی پاکستان نیپ کے سیکرٹری محمود علی نے اپنی جماعت کی طرف سے دستخط کیے۔ انقلاب سے قبل مشرقی پاکستان عوامی لیگ کے صدر مولانا عبدالرشید ترکباغش اور کرشک سرامک پارٹی کے یوسف علی چوہدری عرف موہن میاں نے بھی بحث و تمحیص میں حصہ لیا۔

آئین کا جمہوری سنگھار

میں نے قومی جمہوری محاذ کی طرف سے مشرقی پاکستان کے تمام ضلعی مقامات اور کچھ قصبات میں بڑے بڑے عوامی اجتماعات سے خطاب کیا۔ سیاسی جماعتوں کے قانون (1962ء) کی رو سے میں کسی سیاسی جماعت کا رکن نہیں بن سکتا تھا۔ تاہم میں سمجھتا تھا کہ ایبڈو زدہ سیاستدانوں پر سیاسی نقطۂ نظر رکھنے یا اس کا اظہار کرنے کے ضمن میں کوئی پابندی نہیں تھی۔[27] خان عبدالقیوم خاں نے اپنی گرفتاری کے بعد سے اس معاملے میں اپنی رائے تبدیل کر لی تھی اور سیاسی سرگرمیوں سے محترز تھے۔ میاں ممتاز خان دولتانہ کا نقطہ نگاہ بھی جناب شیخ کا نقش قدم تھا یعنی غیر واضح تھا۔ ایک زمانے میں دولتانہ صدر سے قریبی ربط ضبط رکھتے تھے میں ان جلسوں میں رائے عامہ کے ٹھوس مظاہرے سے صدر پر واضح کرنا چاہتا تھا کہ مشرقی پاکستان بحالی جمہوریت کی تحریک اور مطالبے کی حمایت میں یک زبان ہے۔

آئین کے مطابق صدر کی منظوری کے بغیر آئین کی ایک بھی شق میں ترمیم بعید از امکان تھی۔ میری خواہش تھی کہ صدر کی توجّہ مشرقی پاکستان کے جذبات و احساسات کی طرف دلائی جائے تاکہ وہ مناسب ترامیم کے ذریعے آئین کو جمہوری رنگ و روپ دینے پر آمادہ ہو سکیں۔

صدر نے ردّ عمل کا اظہار کرتے ہوئے اعلان کیا کہ انہوں نے ملک کو ایک جمہوری آئین دیا ہے اور یہ کہ وہ جمہوریت کے بہت بڑے علمبردار ہیں۔ مشرقی پاکستان کے عوام کے بارے میں گوہر افشانی کرتے ہوئے انہوں نے کہا اور پر زور طریقے سے کئی بار اس کا اعادہ کیا۔ کہ انہوں نے مشرقی پاکستان کے لئے سابقہ حکمرانوں سے کہیں بڑھ کر کام کیا ہے اور مشرقی پاکستان کی ترّقی کے لئے کثیر رقوم مختص کی ہیں لہٰذا مشرقی پاکستان کے عوام کو چاہئے کہ ہر معاملے میں ان کی ہاں میں ہاں ملائیں۔ مشرقی پاکستان کے باشعور عوام کو مشرقی پاکستان' وہاں کے عوام اور رہنماؤں کے بارے میں صدر کی سابقہ بد کلامیاں یاد تھیں اور

اس دامِ تزویر میں آنے والے نہیں تھے۔ انہوں نے مشرقی پاکستان کی اقتصادی امداد کو وقت کا تقاضا اور دوسرے پانچ سالہ منصوبے کا منطقی نتیجہ قرار دیا' انہیں دوسرے پانچ سالہ منصوبے کی تیاری کے دوران ہونے والے جوڑ توڑ کا علم تھا۔ چنانچہ مشرقی پاکستان کے عوام نے مشرقی پاکستان کی اعانت کو صدر کی فراخدلی اور فیاضی کا اظہار سمجھنے سے انکار کر دیا۔ صدر یا ان کے وزراء میں سے کسی کو یہ جرأت نہیں تھی کہ مشرقی پاکستان میں کسی عوامی اجتماع سے خطاب کریں۔ عوام ان کی بات سننے کے لئے تیار نہیں تھے۔

مغربی پاکستان میں بحالیٔ جمہوریت کے روز افزوں مطالبے کے جواب میں صدر کا ذہن بگڑتا چلا گیا اور وہ عوامی تقاریر میں ٹھیٹھ فوجی بیرکوں والی مغلظات استعمال کرنے لگے' ان کے حواریوں نے دھمکی دی کہ اگر بحالیٔ جمہوریت کی تحریک کو لگام نہ دی گئی تو مارشل لاء دوبارہ نافذ کر دیا جائے گا۔ تاہم جلد ہی صدر کو احساس ہو گیا کہ انہیں بہر صورت عوام کو کچھ نہ کچھ مراعات دینا پڑیں گی۔ کچھ وعدے کرنا ہوں گے۔ اور کچھ زنجیروں کی گرفت کو ڈھیلا کرنا ہو گا۔ اپنے اختیارات اور مفادات کو برقرار رکھنے' نیز مزید ایک معیاد کے لئے صدارت کی ضمانت کے لئے ضروری تھا کہ صدر اخبارات کی آواز کو بدستور دبائے رکھیں اور مؤثر سیاسی مخالفت پر قادر ہر ممتاز رہنما کو سیاست میں سرگرم نہ ہونے دیں۔ صدر اپنے بلند بانگ دعووں کو اپنی اعلیٰ حوصلگی اور جمہوریت نوازی کے جواز کے طور پر پیش کرتے تھے۔ وعدوں کے ایفا کی تکلیف دہ صورتِ حال سے بچنے کے لئے ضروری تھا کہ مرکزی اسمبلی کو ہاتھ میں رکھا جائے۔ صدر نے ہاتھ کی چھڑی اور جیب کی گھڑی مقننہ تشکیل دینے میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کیا تھا۔ لیکن قومی اسمبلی میں حزبِ اختلاف کے ارکان کی قریب قریب حزب اقتدار کے برابر تعداد دیکھ کر ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ حزبِ اختلاف کی قیادت ان کے اپنے بھائی سردار بہادر خاں کر رہے تھے۔

حزبِ اقتدار کے ارکان کی اکثریت وزراء پارلیمانی سیکرٹریوں' عہدے داروں' ڈپٹی کمشنروں کے نامزد ارکان اور پولیٹیکل ایجنٹوں یا ایسے ارکان پر مشتمل تھی جو پولیس کے دباؤ میں آسکتے تھے۔ اس کے علاوہ بعض ارکان کو وزارت یا پارلیمانی سیکرٹری شپ کی ہڈی دکھا کر حکومت کے ساتھ نتھی کیا گیا تھا۔ ان ترغیبات کے سامنے سپر ڈالنے سے انکار کرنے والوں کے لئے دیگر حربے استعمال کئے جاتے تھے۔ مثال کے طور پر مغربی پاکستان کے ایک رکن اسمبلی کی زرعی اراضی کو سرکاری پانی کی فراہمی روک دی گئی اور اس وقت بحال کی گئی جب اس نے مغربی پاکستان کے گورنر کو حکومت کی حمایت کی یقین دہانی کروادی۔ ایک رکن نے امدادِ باہمی کے بینک سے قرضہ لے رکھا تھا۔ واجبات کی وصولی میں اس قدر سختی سے کام لیا گیا کہ اس رکن کی مزاحمت جواب دے گئی۔ ایک خاتون رکن اسمبلی کے بھائی کے خلاف ایک کارخانے کے سلسلے میں تحقیقات شروع کی گئیں۔ خاتون رکن کے حکومت کی طرف چلے آنے کے بعد خوش نصیب بھائی کو مشینری کی تنصیب کے لئے مالی اعانت بھی بہم پہنچائی گئی۔ کچھ ایسے سرپھرے ارکانِ اسمبلی بھی تھے جو ان حربوں کے باوجود حکومت کے دام میں نہ آسکے۔ ایک رکن اسمبلی نے لائل پور کے قریب 1500 ایکڑ رقبے پر محیط انتہائی زرخیز اور بیش قیمت زرعی اراضی قربان کرنا گوارا کر لیا مگر حکومت کے سامنے سر نہ

پاکستان کا نمائندہ تسلیم کیا جارہا تھا۔ انہوں نے اجتماعی قیادت وغیرہ کی بات چلانے کی کوشش کی لیکن ان کی دال نہ گل سکی۔ کرشک سرامک پارٹی کی طرف سے فضل الحق کے بھتیجے سید عزیز الحق اور پارٹی کے سیکرٹری ایس محمد سلیمان نے بھی اس بیان پر دستخط ثبت کئے۔ عوامی لیگ کی طرف سے عطا الرحمٰن خاں اور شیخ مجیب الرحمن دستخط کنندہ تھے۔ مشرقی پاکستان مسلم لیگ کے سیکرٹری شاہ عزیز الرحمٰن بھی دستخط کنند گان میں شامل تھے۔ پیر محسن الدین نے نظامِ اسلام پارٹی کی طرف سے بیان پر دستخط کئے اگرچہ ان کی جماعت نے سیاسی جماعتوں کا احیاء نہ کرنے کے فیصلے سے اتفاق نہ کیا اور اپنی سیاسی اہمیت کھو بیٹھی۔ مشرقی پاکستان نیپ کے سیکرٹری محمود علی نے اپنی جماعت کی طرف سے دستخط کئے۔ انقلاب سے قبل مشرقی پاکستان عوامی لیگ کے صدر مولانا عبدالرشید ترکباغش اور کرشک سرامک پارٹی کے یوسف علی چوہدری عرف موہن میاں نے بھی بحث وتمحیص میں حصہ لیا۔

آئین کا جمہوری سنگھار

میں نے قومی جمہوری محاذ کی طرف سے مشرقی پاکستان کے تمام ضلعی مقامات اور کچھ قصبات میں بڑے بڑے عوامی اجتماعات سے خطاب کیا۔ سیاسی جماعتوں کے قانون (1962ء) کی رو سے میں کسی سیاسی جماعت کا رکن نہیں بن سکتا تھا۔ تاہم میں سمجھتا تھا کہ ایبڈو زدہ سیاستدانوں پر سیاسی نقطۂ نظر رکھنے یا اس کا اظہار کرنے کے ضمن میں کوئی پابندی نہیں تھی۔[27] خان عبدالقیوم خاں نے اپنی گرفتاری کے بعد سے اس معاملے میں اپنی رائے تبدیل کر لی تھی اور سیاسی سرگرمیوں سے محترز تھے۔ میاں ممتاز خان دولتانہ کا نقطہ نگاہ بھی جناب شیخ کا نقش قدم تھا یعنی غیر واضح تھا۔ ایک زمانے میں دولتانہ صدر سے قریبی ربط ضبط رکھتے تھے میں ان جلسوں میں رائے عامہ کے ٹھوس مظاہرے سے صدر پر واضح کرنا چاہتا تھا کہ مشرقی پاکستان بحالی جمہوریت کی تحریک اور مطالبے کی حمایت میں یک زبان ہے۔

آئین کے مطابق صدر کی منظوری کے بغیر آئین کی ایک بھی شق میں ترمیم بعید از امکان تھی۔ میری خواہش تھی کہ صدر کی توجہ مشرقی پاکستان کے جذبات واحساسات کی طرف ولائی جائے تاکہ وہ مناسب ترامیم کے ذریعے آئین کو جمہوری رنگ وروپ دینے پر آمادہ ہوسکیں۔

صدر نے ردِّ عمل کا اظہار کرتے ہوئے اعلان کیا کہ انہوں نے ملک کو ایک جمہوری آئین دیا ہے اور یہ کہ وہ جمہوریت کے بہت بڑے علمبردار ہیں۔ مشرقی پاکستان کے عوام کے بارے میں گوہر افشانی کرتے ہوئے انہوں نے کہا اور پر زور طریقے سے کئی بار اس کا اعادہ کیا۔ کہ انہوں نے مشرقی پاکستان کے لئے سابقہ حکمرانوں سے کہیں بڑھ کر کام کیا ہے اور مشرقی پاکستان کی ترقی کے لئے کثیر رقوم مختص کی ہیں لہٰذا مشرقی پاکستان کے عوام کو چاہئے کہ ہر معاملے میں ان کی ہاں میں ہاں ملائیں۔ مشرقی پاکستان کے باشعور عوام کو مشرقی پاکستان، وہاں کے عوام اور رہنماؤں کے بارے میں صدر کی سابقہ بد کلامیاں یاد تھیں اور

اس دامِ تزویر میں آنے والے نہیں تھے۔ انہوں نے مشرقی پاکستان کی اقتصادی امداد کو وقت کا تقاضا اور دوسرے پانچ سالہ منصوبے کا منطقی نتیجہ قرار دیا' انہیں دوسرے پانچ سالہ منصوبے کی تیاّری کے دوران ہونے والے جوڑ توڑ کا علم تھا۔ چنانچہ مشرقی پاکستان کے عوام نے مشرقی پاکستان کی اعانت کو صدر کی فراخدلی اور فیاضی کا اظہار سمجھنے سے انکار کر دیا۔ صدر یا ان کے وزراء میں سے کسی کو یہ جرأت نہیں تھی کہ مشرقی پاکستان میں کسی عوامی اجتماع سے خطاب کریں۔ عوام ان کی بات سننے کے لئے تیاّر نہیں تھے۔

مغربی پاکستان میں بحالیٔ جمہوریت کے روز افزوں مطالبے کے جواب میں صدر کا ذہن بگڑتا چلا گیا اور وہ عوامی تقاریر میں ٹھیٹھ فوجی بیرکوں والی مغلظات استعمال کرنے لگے' ان کے حواریوں نے دھمکی دی کہ اگر بحالیٔ جمہوریت کی تحریک کو لگام نہ دی گئی تو مارشل لاء دوبارہ نافذ کر دیا جائے گا۔ تاہم جلد ہی صدر کو احساس ہو گیا کہ انہیں بہر صورت عوام کو کچھ نہ کچھ مراعات دینا پڑیں گی۔ کچھ وعدے کرنا ہوں گے۔ اور کچھ زنجیروں کی گرفت کو ڈھیلا کرنا ہو گا۔ اپنے اختیارات اور مفادات کو برقرار رکھنے' نیز مزید ایک معیاد کے لئے صدارت کی ضمانت کے لئے ضروری تھا کہ صدر اخبارات کی آواز کو بدستور دبائے رکھیں اور مؤثر سیاسی مخالفت پر قادر ہر ممتاز رہنما کو سیاست میں سرگرم نہ ہونے دیں۔ صدر اپنے بلند بانگ دعووٗں کو اپنی اعلیٰ حوصلگی اور جمہوریت نوازی کے جواز کے طور پر پیش کرتے تھے۔ وعدوں کے ایفا کی تکلیف دہ صورتِ حال سے بچنے کے لئے ضروری تھا کہ مرکزی اسمبلی کو ہاتھ میں رکھا جائے۔ صدر نے ہاتھ کی چھڑی اور جیب کی گھڑی مقننہ تشکیل دینے میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کیا تھا۔ لیکن قومی اسمبلی میں حزبِ اختلاف کے ارکان کی قریب قریب حزب اقتدار کے برابر تعداد دیکھ کر ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ حزبِ اختلاف کی قیادت ان کے اپنے بھائی سردار بہادر خاں کر رہے تھے۔

حزبِ اقتدار کے ارکان کی اکثریت وزراء پارلیمانی سیکرٹریوں' عہدے داروں' ڈپٹی کمشنروں کے نامزد ارکان اور پولیٹیکل ایجنٹوں یا ایسے ارکان پر مشتمل تھی جو پولیس کے دباؤ میں آ سکتے تھے۔ اس کے علاوہ بعض ارکان کو وزارت یا پارلیمانی سیکرٹری شپ کی ہڈّی دکھا کر حکومت کے ساتھ نتھی کیا گیا تھا۔ ان ترغیبات کے سامنے سپر ڈالنے سے انکار کرنے والوں کے لئے دیگر حربے استعمال کئے جاتے تھے۔ مثال کے طور پر مغربی پاکستان کے ایک رکن اسمبلی کی زرعی اراضی کو سرکاری پانی کی فراہمی روک دی گئی اور اس وقت بحال کی گئی جب اس نے مغربی پاکستان کے گورنر کو حکومت کی حمایت کی یقین دہانی کروا دی۔ ایک رکن نے امدادِ باہمی کے بینک سے قرضہ لے رکھا تھا۔ واجبات کی وصولی میں اس قدر سختی سے کام لیا گیا کہ اس رکن کی مزاحمت جواب دے گئی۔ ایک خاتون رکن اسمبلی کے بھائی کے خلاف ایک کارخانے کے سلسلے میں تحقیقات شروع کی گئیں۔ خاتون رکن کے حکومت کی طرف چلے آنے کے بعد خوش نصیب بھائی کو مشینری کی تنصیب کے لئے مالی اعانت بھی بہم پہنچائی گئی۔ کچھ ایسے سرپھرے ارکانِ اسمبلی بھی تھے' جو ان حربوں کے باوجود حکومت کے دام میں نہ آ سکے۔ ایک رکن اسمبلی نے لائل پور کے قریب 1500 ایکڑ رقبے پر محیط انتہائی زرخیز اور بیش قیمت زرعی اراضی قربان کرنا گوارا کر لیا مگر حکومت کے سامنے سر نہ

جھکایا۔ یہ اراضی گھوڑوں کی افزائش کے لئے استعمال کی جاتی تھی چنانچہ زرعی اصلاحات کے باوجود اس کی ملکیت برقرار رکھی جا سکتی تھی۔ رشوت 'ناجائز مراعات' خوشامد 'جبر' دھونس ' دھاندلی اور دھمکیوں کے ذریعے ارکانِ اسمبلی کی بچی کھچی عزتِ نفس اور آزادیٔ عمل بھی غارت کر ڈالی گئی۔ المیہ یہ تھا کہ صدر خود اس کھیل کا مرکزی کردار تھے۔

صدر ایوب کو جمہوریت کا علمبردار ہونے پر بڑا اصرار تھا۔ اور اس دعوے کی تائید میں اپنے کئی اقدامات کا ذکر کرتے تھے (یقیناً ان کے نقطۂ نگاہ میں خاصی تبدیلی آ گئی تھی ورنہ بنیادی جمہوریتوں کے پمفلٹ میں پاکستانی عوام کی ذہانت اور دیانت داری کی ہجو بھی تو صدر ہی کے ایماء پر لکھی گئی تھی۔) صدر کے ان اقدامات کا ایک ایک کر کے جائزہ لینا چاہئے تاکہ ان کے دعوے کی حقیقت سامنے آ سکے۔

ایوب کے اقدامات کا تجزیہ

صدر ایوب کے بقول ان کے درج ذیل اقدامات ان کی جمہوریت پسندی پر دال تھے۔

(1) انہوں نے ملک کو جمہوری آئین دیا حالانکہ وہ مطلق العنان مارشل لاء جاری رکھ سکتے تھے۔

(2) انہوں نے بنیادی جمہوریت کا نظام متعارف کروایا جس میں عوامی نمائندوں کو حق بالغ رائے دہی کی بنیاد پر منتخب کیا جاتا ہے۔

(3) انہوں نے جمہوری روایات کے عین مطابق قوم سے اپنی صدارت کے بارے میں رائے طلب کی۔ اس استصواب میں بنیادی جمہوریتوں کے ارکان نے ووٹ دیئے۔ صدر کے مطابق اس استصواب میں کامیابی کے نتیجے میں۔

(i) انہیں اعتماد کا ووٹ مل گیا۔

(ii) انہیں ملک کے لئے اپنے حسبِ منشا نیا آئین تشکیل دینے کا اختیار مل گیا۔

(iii) آئین کے تحت پہلا صدر ہونے کے ناطے وہ آئین کے نفاذ کے بعد مزید کسی انتخاب کے بغیر بھی صدر رہ سکتے تھے۔ اور انہیں خود ہی اپنی مدّت اقتدار کا تعین کرنا تھا۔

(4) آئندہ آئین کے بارے میں تجاویز کے لئے صدر نے سپریم کورٹ کے ریٹائرڈ جج کی سربراہی میں آئین کمیشن قائم کیا۔

(5) 8 جون 1962ء کو آئین کے نفاذ کے بعد انہوں نے صدر کے عہدے کی میعاد صرف تین سال اور دو ماہ تک محدود رکھی حالانکہ آئین کی رو سے وہ مزید کسی انتخاب کے بغیر بآسانی 5 یا 10 برس یا کسی بھی مدت کے لئے صدر کے عہدے پر فائز رہ سکتے تھے۔

(6) انہوں نے صرف تین سال اور دو ماہ بعد صدارتی انتخابات منعقد کروانے کا وعدہ کیا۔ (اور وہ خود بھی اس عہدے کے لئے امیدوار تھے)

(7) صدر نے 1965ء ختم ہونے سے قبل قانون ساز اسمبلی کے انتخابات منعقد کروائے۔قانون ساز اسمبلی کی میعاد پہلے اجلاس کے دن سے شروع ہو کر تین سال تک تھی۔ قانون ساز اسمبلی کا پہلا اجلاس 8جون 1962ء کو شروع ہوا تھا۔

(8) صدر اور ارکانِ مقنّنہ کے انتخاب کے لئے رائے دہندگان کا تعین کرنے کے لئے صدر نے رائے دہی کمیشن مقرر کیا۔

(9) آئین میں صدر کے مواخذے کی گنجائش رکھی گئی۔

(10) سیاسی جماعتوں کو کام کرنے کی اجازت دی گئی۔

(11) صدر بنیادی حقوق کو تسلیم کرنے اور عدالتوں کے دائرۂ سماعت میں لانے کے لئے تیّار تھے۔

آیئے صدر کے ان دعاوی کا جائزہ لیں۔

آئین

8جون 1962ء کو نافذ ہونے والا آئین سرے سے دستور کہلانے کا اہل ہی نہیں تھا۔ صدر ہنگامی حالت کا اعلان کر کے آئین کو پسِ پشت ڈالنے کا اختیار رکھتے تھے۔ غالباً اسے جمہوریت نہیں کہا جا سکتا بلکہ صدر کے مطلق اعنان اور آمرانہ اختیارات پر نقاب ڈال دیا گیا تھا۔ قانون ساز ادارے صدر کے ہاتھوں میں بے اختیار کٹھ پتلیوں کی حیثیت رکھتے تھے۔ وزراء قانون ساز اسمبلیوں کے سامنے جوابدہ نہیں تھے۔ مزید بر آں مقنّنہ کو مالیاتی امور پر کوئی اختیار حاصل نہیں تھا۔ آئین محض صدر کے اختیارات اور اقتدار کو طول بخشنے کے لئے وضع کیا گیا تھا۔ عالمی سطح پر روسیاہی کمائے بغیر مارشل لاء کو مزید جاری رکھنا اور بیرونی امداد سمیٹتے جانا ناممکن ہو رہا تھا۔ عالمی حلقوں کے سامنے کم از کم اخلاقی سطح پر صدر کو جواز پیش کرنا تھا کہ چار سال کے بے روک ٹوک اقتدار اور اس قدر بے معنی نتائج کے بعد آخر مارشل لاء کو کس لئے برقرار رکھا جائے اور یہ جواز پیدا کرنا آسان نہیں تھا۔

مزید براں چار سال قبل آئین منسوخ کر کے مارشل لاء نافذ کرتے وقت جنرل ایوب انقلاب کے دوسرے خالق سکندر مرزا کے اس وعدے میں شریک تھے کہ ملک میں جلد از جلد جمہوریت بحال کر دی جائے گی۔ جمہوری قوتوں کی تنقید کا توڑ کرنے کا اس سے بہتر طریقہ اور کیا ہو سکتا تھا کہ ملک میں آئین نما دستاویز نافذ کر دی جائے۔ اس وعدے کی تکمیل کی طرف پہلے قدم کے طور پر ایک آئینی کمیشن قائم کیا گیا اور پھر اس کی نیم جمہوری سفارشات بھی ردّی کی ٹوکری میں پھینک دی گئیں۔ کمیشن کی رپورٹ کا جائزہ لینے میں خاصا وقت گزار اگیا۔ تاہم اب مزید التوا ممکن نہیں تھا اور آئین کی اشاعت کو غیر محدود مدّت کے لئے ٹالا نہیں جا سکتا تھا۔

بنیادی جمہوریت کے ارکان

بادی النظر میں یہ امر تعجب انگیز معلوم ہوتا ہے کہ پوری طرح سے اقتدار پر قابض فوجی آمریت ایک ایسا نظام متعارف کروائے جو بظاہر جمہوری نظر آتا ہو۔ لیکن در حقیقت اختیارات میں کسی قسم کا عدم ارتکاز پیدا نہیں ہوا تھا' سیاسی جماعتوں اور سیاسی مقاصد کی عدم موجودگی میں اس نظام کو جمہوریت کا نام دینا ہی ایک مذاق کے مترادف تھا۔ ان اداروں کو کسی قسم کے اختیارات نہیں دیئے گئے تھے۔ اختیارات کا اصل سرچشمہ نوکر شاہی تھی۔ جسے اس نظام کی مختلف سطحوں پر نگرانی کے فرائض و اختیارات سونپے گئے تھے۔ بنیادی جمہوریت کے نظام کا واحد مقصد عوام کے نام پر صدر کے ہاتھ مضبوط کرنا تھا۔ جن حالات میں یہ نظام منصۂ شہود پر آیا' اس میں عوام پر بداعتمادی اور عوام کے شعور و اہلیت کے بارے میں تحقیر کے جراثیم پوشیدہ تھے' ان پر پچھلے صفحات میں تفصیل سے روشنی ڈالی جا چکی ہے۔

انتخابات کے انعقاد کے وقت مارشل لاء اپنی قوت و جبروت کے نصف النہار پر تھا اور عوام اس بالائے ناگہانی کے صدمے سے سنبھل نہیں پائے تھے۔ مارشل لاء کے ضوابط اور احکامات کا سلسلہ ختم ہونے میں نہیں آتا تھا۔ ہر روز نت نئے جرائم تخلیق کئے جا رہے تھے اور مبیّنہ جرائم کے لئے شدید سزائیں رکھی جاتی تھی۔ عوام کو حکومت پر تنقید کی صورت میں چودہ سال قید بامشقت کی سزا سے دہشت زدہ کیا جا رہا تھا۔ ڈپٹی کمشنروں اور انتخابی عملے کو نامناسب سیاسی وابستگی کے شبہے پر یا دیگر اسباب کی بنا پر کسی رائے دہندہ کا نام انتخابی فہرست سے حذف کرنے یا کسی امیدوار کے کاغذاتِ نامزدگی مسترد کرنے کا اختیار حاصل تھا۔ بلکہ کسی کامیاب امیدوار کی رکنیت ختم کی جا سکتی تھی۔ چنانچہ چند افراد کے علاوہ عزّتِ نفس رکھنے والے افراد نے عمومی طور پر انتخابات میں حصہ لینے سے اجتناب کیا۔ بہت سے انتخابی حلقوں میں کسی شخص نے کاغذاتِ نامزدگی داخل نہ کئے۔ چنانچہ سرکاری حکّام نے بہلا پھسلا کر بلکہ دھونس کے ذریعے لوگوں کو انتخابات میں امیدوار بنایا۔ بہت سے حلقوں میں ووٹ ڈالنے والوں کی تعداد بے حد کم رہی۔ کہا جاتا ہے کہ بہت سے ارکان صرف اپنے واحد ووٹ کی بناء پر ہی کامیاب ہو گئے تھے۔ خاندان' قبیلے' مذہب یا فرقے کی بنیادوں پر ووٹ ڈالے گئے۔ کچھ امیدواروں کے حق میں نمبرداروں کا اثر و رسوخ کام آیا۔ چھوٹے چھوٹے زمیندار' گاؤں کے ٹاؤٹ' پولیس کے مخبر' مشکوک کردار کے حامل غنڈے اور نمبری بدمعاش انتخابات میں کرتا دھرتا بنے ہوئے تھے۔

اس نظام کے ان اجزائے ترکیبی کی موجودگی میں بددیانتی اور بدعنوانی کا فروغ نوشتۂ دیوار تھا۔ بنیادی جمہوریتوں کو یونین کونسلوں کے چیئرمین منتخب کرنا تھا۔ نیز صوبائی اور قومی مجالسِ قانون ساز کے نمائندوں کے انتخاب میں ووٹ دینا تھے۔ ان دونوں مواقع پر زیادہ بولی دینے والوں کو ووٹ دیئے گئے۔ بنیادی جمہوریت کے ارکان کا سیاسی جماعتوں سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ نہ انہیں حب الوطنی وغیرہ جیسے تصوّرات سے کچھ غرض تھی۔ پاکستان میں کبھی کسی انتخاب کے دوران دھاندلی اور اخلاقی انحطاط کا اس

سے بدتر مظاہرہ دیکھنے میں ہیں آیا تھا۔ جیسا ایوب کی فوجی حکومت اور غیر فوجی عہدِ اقتدار کے دوران پاکستان کے حصے میں آیا۔ صدر ایوب نے بنیادی جمہوریت کا نظام سیاسی جماعتوں کے بغیر اور بعد ازاں کنونشن مسلم لیگ کے جزوِلازم کے طور پر وفاداروں کا ایک جتھا تخلیق کرنے کے لئے وضع کیا تھا۔ ان نمائندوں سے صدر کے لئے اعتماد کا ووٹ طلب کرنے سے قبل انہیں مراعات سے لاد دیا۔ انہیں اشیاء کی طویل فہرست پر محصولات عائد کرنے کا اختیار دے دیا گیا۔ ان محصولات میں سے چیئرمین یونین کونسل کو چار سو روپے ماہانہ مشاہرہ ملتا تھا۔ اور وہ تنخواہ دار سیکرٹری رکھنے کا مجاز تھا۔ متفرق اخراجات کے لئے رقوم مختص کرنے کے بعد ان محصولات کی باقی ماندہ آمدنی کے لئے چیئرمین یونین کونسل تحصیل کے حکام کے ساتھ صلاح مشورے سے مقامی ترقیاتی منصوبے تیار کرنا تھا۔ ان منصوبوں کے لئے حکومت کی طرف سے تیس کروڑ روپے کی فیاضانہ اعانت رکھی گئی تھی ان منصوبوں کے لئے کوئی آڈٹ تھا اور نہ کسی کی نگرانی ضروری سمجھی گئی تھی۔ انہیں محدود سطح پر فوجداری اور دیوانی سطح کے مقدمات کی سماعت کے اختیارات بھی دیئے گئے۔

قبل ازیں انگریزوں نے طویل عرصے تک یہ تجربہ کیا تھا اور ناکام رہے تھے کیونکہ یونین بورڈ اور یونین کورٹ میں مقامی اثر و رسوخ اپنا کام دکھاتا تھا۔ بدعنوانی اور جانبداری کے امکانات بڑھ جاتے تھے۔ حالانکہ ان اداروں کے ارکان کا معیار اور نمائندہ حیثیت بنیادی جمہوریت کے ارکان سے کہیں بہتر سمجھی جا سکتی تھی۔ بنیادی جمہوریت کے ارکان کو جائیداد کی خرید و فروخت میں پاکستانی شہریت کے تصدیق نامے جاری کرنے کا اختیار بھی بخش دیا گیا اور یونین کونسلوں کے سربراہوں پر دھن کا ایک اور دروزاہ کھل گیا۔ پیدائش و اموات نیز شادی و طلاق وغیرہ کی رجسٹریشن بھی یہی ارکان کرتے تھے انہیں عائلی تنازعوں میں تصفیے کے فرائض سونپے گئے۔ اور تصفیہ نہ ہو سکنے کی صورت میں انہیں طلاق کی توثیق کرنا ہوتی تھی۔ انہیں دیگر کئی منافع بخش اختیارات سے بھی نوازا گیا۔ عوام کے ووٹوں سے معرضِ وجود میں آنے کے باوجود یہ نظام جمہوری تو کجا عوام کا نمائندہ بھی نہیں تھا۔ اسے صدر کے ہاتھ مضبوط کرنے کے لئے تخلیق کیا گیا تھا۔ موقع پڑنے پر ضلعی حکّام کے احکامات کی روشنی میں یہ ادارے بند کمروں میں اجلاس منعقد کر کے حکومت کی تائید میں قرار دادیں منظور کرتے۔ صدر اور صدر کے وزراء کسی تنقید یا ناخوشگوار ردِّعمل کے اندیشے سے بے نیاز ہو کر ان ارکان کے سامنے اپنے خیالات کا اظہار کر سکتے تھے۔ حتیٰ کہ رائے دہی کمیشن نے بھی یہ بات تسلیم کی کہ اس نظام نے بدعنوانی کو فروغ بخشا ہے۔

نمائندہ حیثیت

مذکورہ بالا حقائق کی روشنی میں بنیادی جمہوریت کے ارکان کی رائے کو کسی بھی لحاظ سے قوم کی نمائندہ آواز قرار نہیں دیا جا سکتا تھا۔ اس تولیت کی شرائط بھی صدر نے اپنے مفاد کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے خود ہی متعین کی تھیں۔ ان شرائط کی تعداد تین تھی اور قوم کو صدر کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ ان کی تعداد تین سے

زائد نہیں تھی۔ حالانکہ شرائط کی تعداد سے قطعِ نظر صدر کسی بھی صورتِ حال میں کامیابی حاصل کر سکتے تھے۔ رائے دہندگان کے سامنے کوئی اور متبادل نہیں تھا۔ تولیت کی ان شرائط کے خلاف احتجاج کا مطلب 14 سال قیدِ بامشقت کو دعوت دینا تھا۔ صدر کے انتخاب کے لئے پولنگ مارشل لاء کی چھتری تلے منعقد ہوئی۔ رائے دہندگان کو سرکاری گاڑیوں میں پولنگ سٹیشنوں تک لے جایا گیا۔ صدر کے خلاف ووٹوں کی ایک خاصی تعداد صدر کے خلاف ڈالی گئی اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کچھ رائے دہندگان اس حد تک صدر اور فوجی حکومت کے مخالف تھے کہ انہوں نے صدر کے عواقب کی بھی پرواہ نہ کی۔ صدارت کے لئے ایسا نظام وضع کیا گیا تھا کہ اگر صدر ذرا بھی مقبول ہوتے تو انہیں صدفی صد ووٹ مل گئے ہوتے۔ تاہم انہوں نے گونگے بہرے سیاہ بکس کے مقابلے میں خاصی اکثریت سے کامیابی حاصل کر لی۔ ان کی شکست کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

آئین کمیشن

انتخابات میں کامیابی کے بعد ایک آئین کمیشن قائم کیا گیا۔ اس کی بنیادی سفارشات رد کر دی گئیں البتہ کمیشن کی مشقّت کے صلے میں اس کا موزوں و مناسب شکریہ ادا کیا گیا۔ کمیشن کی سفارشات کا پہلے کابینہ نے جائزہ لیا اور پھر صدر نے ان پر نظرِ ثانی کی۔ بالآخر صدر اپنی عمیق فراست اور بے پایاں تجربے کی بناء پر ایسا آئین وضع کرنے میں کامیاب ہو گئے جسکی تمام تر ذمّہ داری خود ان پر عائد ہوتی تھی اور وہ یہ ذمّہ داری اپنے مضبوط کندھوں پر اٹھانے کو تیار تھے۔ جن دنوں آئین کمیشن اپنی سفارشات تیّار کرنے میں مصروف تھا۔ صدر نے کئی مواقع پر آئین کے بارے میں اپنے نظریات بیان کئے۔ بالآخر منصّۂ شہود پر آنے والا آئین صدر کے بیان کردہ ذاتی تصورات سے مزّین تھا۔ ایسی صورت میں آئین کمیشن کے قیام کا تکلّف فرمانے کا کیا جواز تھا۔

صدارت کی میعاد

صدر نے دعوٰی کیا کہ بنیادی جمہوریت کے ارکان کے توسط سے قوم کا اعتماد حاصل کرنے کے بعد انہیں اختیار مل گیا تھا کہ وہ آئین کے تحت حلف اٹھانے والے پہلے صدر کی حیثیت سے اپنی میعادِ صدارت 3 سال اور 2 ماہ کی بجائے کہیں زیادہ طویل کرنے کے مجاز تھے تاہم انہوں نے جمہوری جذبے سے کام لیکر نئے صدارتی انتخابات کا اعلان کر دیا۔ تاہم اس اعتدال پسندی اور جمہوریت نوازی کی اصل وجہ یہ تھی کہ وہ ایبڈو زدہ سیاست دانوں کی نا اہلی کی میعاد ختم ہونے سے قبل دوسرے صدارتی انتخابات منعقد کروانا چاہتے تھے۔ سیاستدانوں پر ایبڈو کی پابندیاں یکم دسمبر 1966ء کو ختم ہونا تھیں اور اس تاریخ سے قبل صدر، قانون ساز اسمبلیوں اور بنیادی جمہوریتوں کے لئے انتخابات کروانا قرینِ مصلحت تھا۔ ایبڈو زدہ

سیاست دان اس بری طرح سے صدر کے اعصاب پر سوار تھے کہ دسمبر 1966ء تک ان پر کسی منتخب ادارے کے لئے امیدوار ہونے پر پابندی عائد کر کے بھی صدر کو اطمینان نہ ہوا چنانچہ سیاسی جماعتوں کے قانون 1962ء اور صدارتی آرڈیننس 1963ء (1) (بعدازں اس آرڈی نینس کو قومی اسمبلی سے منظور کروایا گیا) کے ذریعے ان سیاست دانوں کو ہر قسم کی سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے سے روک دیا گیا۔ صدر نے اپنی غیر نمائندہ اور غیر منتخب صدارت کی میعاد جمہوریت نوازی کے جذبے سے تین سال اور دو ماہ تک محدود نہیں کی تھی۔ بلکہ اس اقدام کے پیچھے یہ خدشہ کار فرما تھا کہ دسمبر 1966ء کے بعد ان کے لئے اپنے حریف سیاستدانوں کو شکست دینا یا بلا مقابلہ منتخب ہونا مشکل ہو جائے گا۔

صدارتی انتخابات

اب اس دلیل کو لیجئے کہ صدر نے صدارت کے لئے انتخابات کے انعقاد اور خود کو انتخابی عمل کے لئے پیش کر کے سچا جمہوریت پسند ہونے کا ثبوت دیا۔ اصل حقائق اس دعوے پر پورے نہیں اترتے۔

صدر نے کمال چابکدستی سے ایبڈو کا سہارا لیکر تمام ممکنہ حریفوں اور موثر سیاستدانوں کو انتخابی عمل سے بے دخل کر دیا۔ یہ لوگ کسی انتخاب میں نہ تو حصہ لے سکتے تھے اور نہ سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لیکر انتخابی عمل پر اثرانداز ہو سکتے تھے۔ سیاسی جماعتوں کی روح قبض کر لی گئی تھی۔ حکومت پر تنقید کرنے والے اخبارات کو قانونی کارروائی کی دھمکیاں دی جاتی تھیں۔ اس طرح ملک بھر میں ہر مخالف آواز کو خاموش کر دیا گیا۔

اس کے علاوہ آئین میں ایک خاص شق رکھی گئی تھی جس کے مطابق صدر کے عہدے کے لئے تین سے زیادہ امیدوار انتخاب میں حصہ نہیں لے سکتے تھے۔ صدر کے علاوہ تین سے زیادہ امیدواروں کی صورت میں مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے مشترکہ اجلاس میں تین امیدواروں کا انتخاب کیا جاتا تھا۔ ان حالات میں صدر کے لئے کم از کم تین برائے نام امیدواروں کے کاغذاتِ نامزدگی داخل کروانا کچھ مشکل نہ تھا۔ چنانچہ مقننہ کا مشترکہ اجلاس لازم ٹھہرتا۔ اسمبلیوں میں صدر کو ارکان کی اکثریت کی حمایت حاصل تھی۔ چنانچہ صدر آسانی سے اپنے تین امیدوار نامزد کروا سکتا تھا۔ بعدازاں یہ تینوں نام نہاد امیدوار بعنوانِ شائستہ انتخاب سے دستبردار ہو جاتے اور صدر انتخابات میں بلا مقابلہ کامیاب ہو جاتے۔ اگر ان احتیاطی تدابیر کے باوجود بات نہ بنے اور نوبت مقابلے تک جا پہنچے تو آئین کی دفعہ 165 کے تحت صدارتی انتخاب کے لئے ووٹ دینے کا حق بنیادی جمہوریتوں کے خود کاشتہ 'چہیتے اور بدعنوان ارکان کے نام معنون تھا۔ صدر نے انتخاب کے لئے حقِ بالغ رائے دہی کا اصول مسترد کرنے میں خاصی دقتِ نظر سے کام لیا تھا۔ اس مقصد کے لئے آئین میں ترمیم بھی کی گئی ملک کے ہر بازو میں بنیادی جمہوریت کے ارکان کی تعداد 40،000 سے زائد تھی۔ (دفعہ 155) صدارتی حکم کے ذریعے اس تعداد میں کمی

بیشی کی جا سکتی تھی۔ صدر نے تجویز پیش کی کہ انتخابی یونٹوں کی کل تعداد 80٬000 سے بڑھا کر 120٬000 کر دی جائے۔ رائے دہی کمیشن نے یہ تجویز قبول کر لی۔ اس سے ہر انتخابی حلقے میں رائے دہندگان کی تعداد مزید کم ہونے کے باعث غیر موزوں افراد کی کامیابی کے امکانات مزید بڑھ جاتے۔ یعنی ایسے افراد جو رشوت یا دباؤ کے ذریعے اطاعت پر مجبور کئے جا سکتے ہوں۔ علاوہ ازیں اس سے سرکاری خزانے پر اضافی بوجھ پڑتا اور پاکستان کے غریب عوام پر مقامی محصولات کے بوجھ میں اضافہ ہو جاتا۔

قانون ساز اسمبلیوں کے انتخابات

صدر نے آئین وضع کرتے وقت یہ احتیاط ملحوظِ خاطر رکھی تھی کہ ایبڈو کی پابندیاں ختم ہونے سے قبل یعنی دسمبر 1966ء سے پہلے بنیادی جمہوریتوں اور مجالس قانون ساز کے انتخابات مکمل ہو جائیں چنانچہ بنیادی جمہوریتوں کی معیاد اکتوبر 1964ء قانون ساز اسمبلیوں کی میعاد جون 1965ء اور صدر کی میعاد 6 اگست 1965ء کو ختم ہو گئی۔

رائے دہی کمیشن

صدر اور قانون ساز اسمبلیوں کے انتخابات کے لئے طریق رائے دہی پر تجاویز پیش کرنے کے لئے صدر نے ایک رائے دہی کمیشن مقرر کیا۔ یہ بات عام طور پر عوام کے علم میں ہے کہ صدر نے کمیشن کو بتا دیا تھا کہ ان کے لئے قانون ساز اسمبلیوں کے انتخاب کی حد تک بالغ رائے دہی کے مطالبے کی مزاحمت کرنا مشکل ہو گا۔ لیکن صدارتی انتخاب خاص طور پر ایوب خاں کے اپنے معاملے میں صرف بنیادی جمہوریت کے ارکان تک محدود ہونا چاہئے کیونکہ صدر کے لئے کروڑوں رائے دہندگان کو قائم کرنا مشکل تھا۔ کمیشن کے سربراہ، اختر حسین اور محمد علی بوگرہ مرحوم کے ماموں حسن علی چوہدری، صوبائی وزیر نے ان خطوط پر سفارشات پیش کر دیں۔ تب غالباً صدر نے حقِ بالغ رائے دہی پر پھر سے غور کیا اور فیصلہ کیا کہ قانون ساز اسمبلیوں کے لئے انتخابات بھی بنیادی جمہوریت کے ارکان کے ذریعے پایۂ تکمیل کو پہنچیں۔ بایں ہمہ بالغ رائے دہی کا طریقہ اپنایا جاتا یا بنیادی جمہوریت کے ارکان تک رائے دہی کا حق مخصوص کیا جاتا۔ رائے دہندگان ایبڈو زدہ سیاستدانوں کو تو ووٹ دینے سے رہے۔ سیاسی جماعتوں کی قوت نچوڑی جا چکی تھی۔ لہٰذا سیاسی افق پر خاصی ابتری اور افراتفری نظر آ رہی تھی۔ علاوہ ازیں رائے دہی کمیشن نے صدارتی انتخاب کے لئے جو تجاویز پیش کیں وہ بھی صدر کو زیادہ مرغوب تھیں اور انہیں تسلیم کرنے سے انتخابی عمل صدر کے لئے خاصی آزمائش بن سکتا تھا۔ لہٰذا رائے دہی کمیشن کی رپورٹ مسترد کر دی گئی۔

اس اثناء میں ایک اور خطرہ سیاسی افق پر منڈلا رہا تھا جو ہنگامہ خیز امکانات سے بھرپور تھا۔ عین ممکن تھا کہ اس افراتفری میں صدر کو انتخابات ملتوی کر کے ایک اور انقلاب برپا کرنے کا جواز ہاتھ آ جائے۔ صدر

نے اب تک مخلوط طرزِ انتخاب کو طے شدہ حقیقت کے طور پر لیا تھا۔ یوں بھی وہ ذاتی طور پر ہمیشہ سے مخلوط طرزِ انتخاب کے حق میں رہے تھے۔ بنیادی جمہوریتوں کے ارکان مخلوط طریقِ انتخاب پر منتخب ہوئے تھے۔ خود صدر نے اسی طریقِ انتخاب کے ذریعے اعتماد کا ووٹ حاصل کیا تھا۔ قانون ساز اسمبلیوں کے انتخابات کے لئے بھی یہی طرزِ انتخاب اختیار کیا گیا تھا۔ ملک میں کچھ سیاسی عناصر جو کامیابی کے لئے مذہبی اور فرقہ وارانہ جذبات کا سہارا لیتے ہیں۔ ہمیشہ سے مصر رہے ہیں کہ جدا گانہ طرزِ انتخاب ایک مسلم اسلامی تصور ہے۔ اور محض سیاسی حکمتِ عملی نہیں۔ علاوہ ازیں مخلوط طرزِ انتخاب اسلامی نظریے کے منافی ہے۔ صدر نے ان سیاسی عناصر اور انتہاء پسند مسلمانوں کی حمایت حاصل کرنے کے لئے اپنے وزیر قانون کے ذریعے یہ باور کروانا شروع کیا کہ حکومت از سر نو جدا گانہ طرزِ انتخاب رائج کرنے پر غور کر سکتی ہے۔ صدر کو توقع تھی کہ اس طرح وہ حزبِ اختلاف میں پھوٹ ڈلوا دیں گے۔ نیز مشرقی پاکستان ہندو اور مسلمان سیاسی طور پر جدا جدا ہو جائیں گے اور مشرقی پاکستان سے مسلمان نمائندوں کی تعداد میں کمی واقع ہو جائے گی' بلاشبہ مشرقی پاکستان میں اس تجویز کے خلاف سخت ردِّ عمل کی توقع تھی مزید بر آں ممکن تھا کہ اس الجھن کو سلجھانے میں اس قدر وقت لگ جائے کہ صدر کے آئین میں دیئے گئے وقت پر صدارتی انتخابات منعقد نہ ہو سکیں۔ چنانچہ آئین کے تقاضے پورے نہ ہونے پر ایک اور انقلاب لازم قرار پاتا۔ اسی صورت میں رائے دہی کمیشن کی سفارشات بھی بالائے طاق رکھی جا سکتی تھیں۔ جو کہ صدر کو سخت ناگوار تھیں۔ کونسل مسلم لیگ کے کچھ ایسے رہنماؤں نے بھی مخلوط طرزِ انتخاب کی تائید کر دی۔ جو ماضی میں جدا گانہ طریقِ انتخاب کو اسلامی عقائد کا جزو قرار دے چکے تھے تاہم اس وقت ایسے نقطہ نگاہ کے اظہار سے انتخابات میں فرقہ وارانہ رجحانات کا استحصال مقصود ہوتا تھا۔ کونسل مسلم لیگ کے رہنماؤں کے رویے سے امید پیدا ہو گئی کہ صدر جدا گانہ طرزِ انتخاب کی طرف رجعت کی فتنہ انگیز حرکت سے گریز کریں گے۔

قرائن سے معلوم ہوتا تھا کہ قومی اسمبلی میں حزبِ اختلاف رائے دہی کمیشن کی تجاویز قبول کرنے پر آمادہ ہو جائے گی۔ چنانچہ حکومت نے 1963ء کے موسمِ بہار کے اجلاس کے اختتام سے صرف پندرہ منٹ قبل رائے دہی کمیشن کی رپورٹ اسمبلی میں پیش کی چنانچہ اس پر بحث کے ذریعے ارکان کی رائے کا تعین اس قلیل وقت میں ممکن نہ تھا۔ اور حکومت رپورٹ پر بحث کے بغیر ہی اسے سلیکٹ کمیٹی کے حوالے کروانے میں کامیاب ہو گئی۔ کمیٹی میں حزبِ اقتدار کے ارکان کی اکثریت تھی۔ چنانچہ حکومت رائے دہی کمیشن کی رپورٹ کو بالائے طاق رکھ کے انتخابات کی نوعیت کے بارے میں اپنی من مانی کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ بظاہر حکومت کا فرض تھا کہ رائے دہی کے بارے میں مسوّدۂ قانون اسمبلی کے سامنے رکھے تاکہ ارکانِ اسمبلی کی رائے معلوم ہو سکے۔ حزبِ اختلاف نے بجا طور پر ان ناجائز' غیر پارلیمانی اور غیر جمہوری ہتھکنڈوں پر سخت اعتراض کیا اور ایوان میں خاصی ہنگامہ آرائی کی۔

ذیل میں رائے دہی کمیشن کی چند ایسی تجاویز کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ جو صدر کو اس بناء پر ناگوار تھیں کہ ان سے صدر کی کامیابی کے امکانات پر ضرب پڑتی تھیں۔ ان تمام سفارشات کی بنیاد مخلوط طرزِ انتخاب پر

تھی۔

--اولاً، رائے دہی کمیشن نے بالواسطہ انتخابات کے بارے میں صدر کے استدلال کا پول کھول دیا۔ کمیشن کے ارکان کا کہنا تھا کہ اوسط رائے دہندہ ناخواندہ ہونے کے باوجود قومی مفادات کا شعور رکھتا ہے۔ اور وہ کسی امیدوار کی دیانت داری اور فراست کے حوالے سے پرکھ کرنے کے لئے ضروری احساسِ ذمہ داری اور فہم سے بہرہ ور ہے۔ مراعات یافتہ طبقات اور تعلیم یافتہ افراد کا ایک حصہ اس نقطۂ نگاہ سے اتفاق نہیں رکھتا۔ لیکن رائے دہی کمیشن نے سائمن کمیشن اور بھارتی رائے دہی کمیشن سے اتفاق کیا کہ خواندگی کو دانش، کردار اور سیاسی اہلیت کا معیار قرار نہیں دیا جاسکتا۔ ناخواندگی کا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ ناخواندہ فرد آزادانہ طور پر اپنا ووٹ ڈالنے کا اہل نہیں ہے۔ کمیشن نے یہ نشاندہی بھی کی کہ بنیادی جمہوریت کے ارکان کے ذریعے انتخابات کو رشوت اور دھاندلی سے محفوظ رکھنا ممکن ہو گا جبکہ حق بالغ رائے دہی سے سیاسی تعلیم کو فروغ حاصل ہو گا اور مستحکم سیاسی نظریات پر مبنی جماعتیں نمو پائیں گی۔ رائے عامہ کی تشکیل اور اسے متحرک کرنے میں سیاسی جماعتوں کے کردار پر مزید روشنی ڈالنے کے بعد کمیشن نے سفارش کی کہ مجالسِ قانون ساز کے لئے انتخابات حقِ رائے دہی کی بنیاد پر منعقد کروائے جائیں۔ اسی تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لئے آئین میں ترمیم کی ضرورت تھی۔ جس کے لئے صدر کا تعاون درکار تھا۔ تاہم کمیشن نے خبردار کیا کہ سیاسی پرچار کو نفرت، تاویل آرائی اور جذبات بھڑکانے کی مہم میں تبدیل ہونے کی اجازت دینا خطرناک ہو گا اور ایسے رجحانات کی حوصلہ افزائی کرنے والے امیدواروں کو نااہل قرار دے دیا جائے۔

کمیشن کی دوسری سفارش یہ تھی کہ اصولی طور پر صدر کا انتخاب بھی حقِ بالغ رائے دہی کی بنیاد پر منعقد ہونا چاہئے تاہم خصوصی حالات کے پیشِ نظر اس انتخاب کو بنیادی جمہوریت کے ارکان کی رائے تک محدود کرنا قرینِ مصلحت ہو گا۔ بشرطیکہ بنیادی جمہوریت کے ارکان کی تعداد 80،000 سے بڑھا کر 12،000 کر دی جائے نیز ضرورت پڑنے پر ایک حلقے سے ایک سے زیادہ نمائندوں کے انتخاب کی اجازت دے دی جائے۔ کمیشن نے حقِ بالغ رائے دہی اور مخلوط طرزِ انتخاب کی بنیاد پر صدر کے انتخاب کی سفارش مسترد ہونے کی صورت میں درج ذیل تجاویز پیش کیں۔

○ ...... آئین کی دفعہ 167 منسوخ کر دی جائے، جس کے تحت قانون ساز مجالس کا مشترکہ اجلاس صدارتی انتخاب کے لئے تین سے زائد امیدواروں کی صورت میں تین امیدواروں کا انتخاب کرتا تھا۔

○ ... اگر یہ تجویز بھی مسترد کر دی جاتی ہے تو پھر اس انتخاب سے قبل حقِ بالغ رائے دہی کی بنیاد پر مجالسِ قانون ساز کے لئے نئے انتخابات کروائے جائیں، نیز ہر رکن کو تین کی بجائے صرف ایک ووٹ ڈالنے کی اجازت ہو۔

○ ..... بنیادی جمہوریتوں کے لئے انتخابات کا مرحلہ قومی اسمبلی کی طرف سے صدارتی امیدواروں کے چناؤ کے بعد رکھا جائے تاکہ جمہوریتوں کے ارکان منتخب کرنے والے رائے دہندگان کو صدارتی

امیدواروں کا علم ہو۔

○ ...... ان سفارشات پر عمل در آمد کے لئے موجودہ صدر کے عہدے کی معیاد میں دو ماہ کی توسیع کر دی جائے۔

یہ امر بالکل واضح تھا کہ رائے دہی کمیشن کی سفارشات قبول کرنے کی صورت میں صدر کے تمام منصوبے خاک میں مل جاتے۔ صدر صاحب ارکانِ مقننہ کے ذریعے من مانے امیدواروں کی نامزدگی اور بعد ازاں ان امیدواروں کو انتخاب سے دستبردار کروا کے بلامقابلہ منتخب ہونے کے خواب دیکھ رہے تھے۔ تاہم صدر کو اصل خطرہ کمیشن کی اس تجویز سے تھا کہ قانون ساز اسمبلیوں کے لئے حقِ بالغ رائے دہی کی بنیاد پر انتخاب منعقد کروائے جائیں۔ اس اقدام کے بڑے دوررس نتائج بر آمد ہو سکتے تھے۔ عین ممکن تھا کہ حقِ بالغ رائے دہی کی بنا پر منتخب ہونے والے ارکانِ اسمبلی آئین میں موزوں ترامیم کے ذریعے اسے جمہوری رنگ وروپ بخش دیں۔ اور اس صورتِ حال کا تصور بھی صدر کے لئے سوہانِ روح تھا۔ مزید بر آں ایسی مجلسِ قانون ساز جس میں صدر کو اکثریت کا اعتماد حاصل نہ ہو، صدر کی سیاسی تجاویز پر آمنا و صدقنا کہنے سے انکار بھی کر سکتی تھی۔ ان حالات میں ان سوالات کا جواب مشکل نہیں رہتا کہ صدر نے قانون رائے دہی مقننہ کے سامنے پیش کرنے سے اجتناب کیوں کیا؟ قانونِ رائے دہی کے بارے میں اپنے خیالات کو پردۂ اخفا میں کیوں رکھا؟ نیز اجلاس کے آخری لمحات میں قانونِ رائے دہی ایوان میں پیش کرنے کا مقصد بھی واضح ہو جاتا ہے۔ بایں ہمہ جب تک صدر کے انتخاب کے لئے بنیادی جمہوریت کے ارکان کو حقِ رائے دہی پر اجارہ داری حاصل تھی، صدر کے دوبارہ منتخب ہونے میں کسی کو شبہ نہیں تھا۔

صدر کا مواخذہ

صدر کے مواخذے کے لئے متعین کردہ شرائط کی موجودگی میں آئین ایک مضحکہ خیز تماشا بن کر رہ گیا۔ صدر کے خلاف کسی کامیاب تحریک کے لئے اسمبلی کے تین چوتھائی ارکان کی تائید درکار تھی۔ ایوان میں پارلیمانی سیکرٹریوں کی بھرمار تھی۔ قبائلی علاقوں کے نمائندے تھے جنہیں عام طور پر ڈپٹی کمشنر نامزد کرتا تھا۔ سوات، دیر اور چترال کے نمائندے تھے۔ روایتی حکمران خاندان تھے اور جاگیرداروں کی گنتی ختم ہونے میں نہیں آتی تھی۔ یہ لوگ حکومت کے اشارۂ ابرو کے غلام تھے۔ اس کے علاوہ عہدے اور وزارت کو پرمٹ اور لائسنس کے حصول کے لئے اسمِ اعظم کا درجہ مل چکا تھا۔ ان نوازشات سے فیض یاب ہونے والے صدر کی مخالفت کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ صدر کو اپنی حکمتِ عملی ترتیب دینے اور اپنی صفیں درست کرنے کے لئے 14 سے 30 روز تک کا وقت ملتا تھا۔ اس کے بعد اگر تحریک کے محرکین (جن کے لئے ایوان کی کل تعداد کا ایک تہائی ہونا ضروری تھا) نصف ارکان کی حمایت حاصل کرنے میں ناکام رہتے تو ان سب کی رکنیت خود بخود ختم ہو جاتی۔ ایسے حالات میں خطرہ مول لینے کی جراَتِ رندانہ کون کرتا؟ کہنا چاہئے کہ آئین میں صدر کے مواخذے کی شق محض نمائشی چیز

تھی۔

۔ صدر نے سیاسی جماعتوں کو کام کرنے کی اجازت دی

جی ہاں! صدر نے سیاسی جماعتوں کو کام کرنے کی اجازت دی مگر ایسی پابندیوں کے ساتھ کہ مس فاطمہ جناح کے الفاظ میں صدر کی اپنی جماعت کے علاوہ دیگر جماعتیں مخنث ہو کر رہ گئیں۔ سیاسی جماعتوں کا وجود صدر کی طبع نازک پر سخت گراں تھا۔ اور وہ انہیں ملک کے تمام مسائل کا ذمّہ دار سمجھتے تھے۔ بعدازاں وہ نہ صرف ایک سیاسی جماعت میں شریک ہوئے بلکہ اسے طاقتور بنانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ یہ جماعت ان کی اپنی تخلیق تھی اور انہوں نے اس کا پرچار کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ گورنروں' وزراء' پارلیمانی سیکرٹریوں اور سرکاری ملازمین کو بھی اس جماعت کی حمایت کرنے کی ترغیب دی۔ ڈپٹی کمشنروں کی وساطت سے پرمٹوں' لائسینسوں' ٹھیکوں اور ترقیاتی رقوم کی شکل میں اس جماعت کو بھرپور سرکاری سرپرستی مہیا کی گئی۔ صدر نے اس قلابازی کی وجہ بیان کرتے ہوئے کہا کہ ان کے رفقائے کار' وزراء پارلیمانی سیکرٹریوں اور غیر سیاسی ارکان بنیادی جمہوریت کے توسط سے غیر سیاسی بنیادوں پر منتخب ہونے والے ارکانِ اسمبلی نے ان کے عقل مندانہ مشورے اور نصیحت پر کان دھرنے سے انکار کر دیا تھا۔ چنانچہ انہیں 15 جولائی 1962ء کو سیاسی جماعتوں کا قانون منظور کرنے پر آمادہ ہونا پڑا۔

صدر نے پرزور طریقے سے مشورہ دیا تھا کہ دو یا تین سے زائد سیاسی جماعتوں کو کام کرنے کی اجازت نہ دی جائے۔ لیکن ان کے مشیر اس معمولی نکتے پر بھی ان سے اتفاق نہ کر سکے' بایں ہمہ عوامی اعتماد کا امکان رکھنے والی جماعتوں کو مؤثر طور پر بے اثر کر دیا گیا تھا۔ کوئی ایبڈو زدہ سیاستدان سیاسی جماعتوں کا رکن نہیں بن سکتا تھا۔ کسی سیاسی جماعتوں کو اسلامی نظریے یا ملکی سلامتی کے منافی سرگرمیوں (بعینہٖ یہی الفاظ تھے) کی اجازت نہیں تھی۔ ان دونوں تصورات کے تعین میں واضح ابہام سے کام لیا گیا تھا تاکہ حکومت ناپسندیدہ سیاسی جماعتوں کو ہراساں کر سکے' نیز اگر مرکزی حکومت سمجھے کہ کوئی سیاسی جماعت زیادہ تنگ کر رہی ہے تو معاملہ حتمی فیصلے کے لئے سپریم کورٹ کے حوالے کیا جا سکے۔

سیاسی جماعت کی تعریف یہ کی گئی تھی۔ ''افراد کا ایسا مجموعہ یا اشخاص کی ایسی تنظیم جو سیاسی نظریات کے فروغ یا دیگر سیاسی سرگرمیوں کی غرض سے سیاسی ڈھانچہ قائم کرے' چندہ جمع کرے یا اثاثے حاصل کرے۔''

6 جنوری 1963ء کو ایک صدارتی حکم (بعدازاں اس صدارتی حکم کو قومی اسمبلی نے باقاعدہ قانون کی شکل میں منظور کر لیا) کے ذریعے سیاسی جماعتوں کی تعریف کا دائرہ بڑھا دیا گیا' اس اقدام کا مقصد این ڈی ایف (قومی جمہوری محاذ) کو سیاسی جماعت قرار دینا تھا تاکہ ایبڈو زدہ سیاستدان این ڈی ایف کی

سرگرمیوں میں بھی شریک نہ ہو سکیں۔ این ڈی ایف بنیادی طور پر ایک تحریک تھی؛ چنانچہ اس کا تنظیمی ڈھانچہ تشکیل نہیں دیا گیا تھا۔ یہ تحریک نہ چندہ جمع کرتی تھی اور نہ کسی نوع کے اثاثوں کی مالک تھی۔ یہ تحریک افراد کا ادارہ یا اشخاص کی تنظیم بھی نہیں تھی۔ سیاسی جماعت کی نئی تعریف میں افراد کے ایسے اجتماع یا گروہ کو بھی شامل کر لیا گیا جو سیاسی نقطۂ نگاہ کے پرچار کی کوشش کر رہا ہو یا کسی دوسری سیاسی سرگرمی میں حصہ لے رہا ہو۔ یہ امر اب بھی متنازعہ فیہ تھا کہ این ڈی ایف کو افراد کا مجموعہ یا گروہ قرار دیا جا سکتا تھا یا نہیں۔

فی الحقیقت یہ تحریک ان عوامی اجتماعات کی شکل میں آگے بڑھ رہی تھی جو مقامی کارکن ملک کے مختلف حصوں میں منعقد کرتے تھے اور مختلف کالعدم اور سرگرم سیاسی جماعتوں کے رہنما اپنی سہولت کے مطابق ان اجتماعات سے خطاب کر کے ملک کے لئے ایک جمہوری آئین کا مطالبہ کرتے تھے۔ چنانچہ این ڈی ایف افراد کا ایک منظم گروہ یا مجموعہ ہونے کی بجائے جمہوریت پر یقین رکھنے والے لاکھوں افراد کے ڈھیلے ڈھالے اجتماعات کی ایک تحریک تھی۔ نئے صدارتی حکم کی ایک شق کے مطابق ایبڈو کے تحت نا اہل قرار دیئے گئے کسی شخص کو کسی سیاسی جماعت (توسیع شدہ تعریف) کی سرگرمیوں میں ملوث ہونے یا کسی دوسرے ایبڈو زدہ سیاستدان کی ایسی ہی سرگرمیوں سے تعلق رکھنے سے بھی روک دیا گیا تھا۔ اس قانون کی خلاف ورزی پر دو سال قید یا جرمانہ یا بیک وقت دونوں سزائیں دی جا سکتی تھیں۔ مزید برآں اگر حکومت سمجھتی کہ کوئی ایبڈو زدہ سیاستدان سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لے رہا ہے یا حصہ لینے کا ارادہ رکھتا ہے تو اس پر چھ ماہ کے لئے کسی عوامی اجتماع سے خطاب کرنے پریس کانفرنس منعقد کرنے یا اخبارات کے لئے سیاسی نوعیت کا بیان جاری کرنے پر پابندی عائد کی جا سکتی تھی۔ اس مدت کے اختتام پر اس پابندی کو مزید چھ ماہ کے لئے توسیع دی جا سکتی تھی۔ خلاف ورزی کی صورت میں دو سال قید یا جرمانہ یا بیک وقت دونوں سزائیں دی جا سکتی تھیں۔

بنیادی حقوق

صدر ایوب کا کہنا تھا کہ وہ جمہوریت کے مفاد میں بنیادی حقوق کو تسلیم کرنے اور انہیں عدالتوں کے دائرۂ سماعت میں شامل کرنے کے لئے تیار ہیں۔ انہوں نے اپنے آئین میں 1956ء کے آئین میں متعین کردہ بنیادی حقوق کم و بیش شامل کر دیئے تھے تاہم انہیں بنیادی حقوق قرار نہیں دیا گیا تھا اور نہ ہی عدالتوں میں ان حقوق کی خلاف ورزی پر قانونی چارہ جوئی کی جا سکتی تھی۔ ان حقوق کو محض قانون ساز اداروں کے لئے رہنما اصولوں کا درجہ حاصل تھا۔ چنانچہ قانون ساز اداروں کو بالادستی حاصل تھی۔ اگر قانون ساز ادارے بنیادی حقوق کے منافی قوانین منظور کر دیتے تو ان قوانین کو عدالتوں میں چیلنج کرنا ناممکن تھا۔ صدر نے اس صورتِ حال کا جواز پیش کرتے ہوئے کہا کہ برطانوی آئین میں بھی پارلیمینٹ کو بالادستی حاصل ہے اور اس قانون سازی کو آئین کے منافی ہونے کی بنا پر عدالت میں چیلنج نہیں کیا جا سکتا

تاہم صدر نے اس حقیقت کو نظرانداز کر دیا کہ برطانوی آئین غیر تحریر شدہ ہے۔ صدر نے 1956ء کے آئین میں بیان کردہ قوانین سازی کے اصولوں کو بنیادی حقوق تسلیم کرنے اور انہیں عدالتوں کے دائرۂ سماعت میں داخل کرنے پر آمادگی کا اظہار کیا بشرطیکہ اس اقدام سے موجودہ قوانین اور صدارتی احکامات پر کوئی اثر نہ پڑے۔ اس شرط سے یہ سارا معاملہ بے معنی ہو کر رہ گیا کیونکہ موجودہ قوانین اور صدارتی احکامات بنیادی حقوق کا منہ چڑانے کے مترادف تھے۔ قومی اسمبلی میں حزبِ اختلاف نے آئین میں محولہ بالا ترامیم پر اعتراض کیا۔ حکومت کو اپنی ترامیم منظور کروانے کے لئے دو تہائی اکثریت کی ضرورت تھی۔ چنانچہ حزبِ اختلاف سے وعدہ کیا گیا کہ حکومت حزبِ اختلاف کی تائید کے عوض بالادست بنیادی حقوق کے نام ہر چند غیر اہم قوانین کو آئین سے خارج کرنے میں حزبِ اختلاف کو ضروری حمایت بہم پہنچائے گی۔ یقین کیا جاتا ہے کہ یہ مراعات محض ایک دام تزویر ہیں اور حزبِ اختلاف اس وقت تک حکومت کی تائید نہیں کرے گی۔ جب تک بنیادی حقوق کے منافی قوانین کو آئین سے خارج نہیں کیا جاتا۔

عوامی اجتماعات پر پابندی

مشرقی پاکستان میں فاتحانہ طور پر بڑے بڑے عوامی جلسوں کے بعد میں نے مغربی پاکستان میں لاہور کا دورہ کیا جہاں بڑے جوش و خروش سے میرا استقبال کیا گیا۔ میرے لئے استقبالیہ ہجوم کے جوش و جذبے کے باعث ہوائی اڈّے سے باہر آنا مشکل ہو گیا۔ میں نے دوڑ کر سامنے آنے والی پہلی کار میں پناہ لے لی۔ میری بڑھتی ہوئی مقبولیت سے خائف ہو کر حکومت نے رکاوٹوں، دھونس اور جبر کی راہ اختیار کر لی۔ اے ایم قریشی نامی ایک شخص حکومت کے خاص آدمیوں میں شمار ہوتا تھا۔ مشکوک افراد اور تاریک ماضی کے حامل اس شخص کو جرائم پیشہ افراد سے اپنے تعلق پر بڑا فخر تھا۔[28] اس نے کچھ سڑکوں میں لاٹھی بردار غنڈے بھر لئے، ہر ٹرک پر ایک چھوٹا سا سیاہ پرچم لہرا رہا تھا، یوں سیاہ جھنڈوں سے میرے استقبال کی تیاری کر لی گئی۔ تاہم خیر مقدم کے لئے آنے والے ہجوم کی تعداد دیکھ کر ان غنڈوں کو اپنے ٹرکوں سے نیچے اترنے کی ہمت نہ ہو سکی۔ پولیس نے ایک خاص مقام تک استقبالیہ ہجوم کے جلوس کو روکنے کی کوئی کوشش نہ کی۔ جب عوام منتشر ہو کر اپنے گھروں کی طرف جا رہے تھے تو اچانک پولیس لاٹھیوں سے ان پر پل پڑی اور انہیں بری طرح زدو کوب کیا گیا۔ اس حملے سے یہ واضح کرنا مقصود تھا کہ حکومت کو میرا استقبال پسند نہیں آیا اور یہ کہ وہ آئندہ بھی میری حمایت کے اظہار کو ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کرے گی۔ وسیع اشاعت کا حامل انگریزی روزنامہ "ڈان" حکومت نواز اور ایوب پرست رجحانات رکھتا تھا۔ اس اخبار کو فراخدلانہ نرخوں پر سرکاری اشتہارات کے ذریعے سرکاری سرپرستی سے نوازا جاتا تھا اور اسے عام طور پر حکومت کا ترجمان اخبار شمار کیا جاتا تھا۔ اس اخبار نے غالباً بے خیالی میں میرے استقبال کی تصاویر شائع کر دیں۔ سیاہ جھنڈیوں والے ٹرک اور لاٹھی چارج کرتے ہوئے پولیس والے بھی کیمرے کی زد میں

آ گئے تھے۔ اس واقعے کے بعد سیاہ جھنڈوں والے ٹرکوں نے فاتحانہ طور پر شہر کی سڑکوں پر گشت کیا تھا۔ ایسے لائسنس یافتہ اور رجسٹرڈ ٹرکوں کو پولیس کی پیشگی اجازت کے بغیر عوام کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے اور سڑکوں پر گشت کرنے کی اجازت نہیں ہوتی اسس امر میں کوئی شک نہیں تھا کہ مغربی پاکستان کی انتظامیہ اور مرکزی حکومت تصادم کی راہ پر گامزن تھیں۔

اس کے بعد مجھے مغربی پاکستان میں سکون کا سانس نہ لینے دیا گیا۔ سیاسی مصلحت کا تقاضہ تھا کہ میں کراچی میں رہائی کے فوراً بعد ایک جلسۂ عام منعقد کرتا اور یقیناً میں نے کراچی میں طوفان برپا کر دیا ہوتا لیکن میں نے اسے مشرقی پاکستان کے عوام سے ناانصافی پر قیاس کیا، جنہوں نے میری رہائی کے لئے بڑی طاقتور تحریک چلائی تھی؛ میں نے سوچا کہ مشرقی پاکستان کے عوام سے ملے بغیر مغربی پاکستان میں جلسۂ عام منعقد کر کے اپنے خیالات کا اظہار کرنا مشرقی پاکستان کے عوام سے زیادتی ہو گا۔ مغربی پاکستان کی سیاسی سوچ واضح طور پر مشرقی پاکستان کے مقابلے میں مختلف ہے۔ مغربی پاکستان کا سیاسی شعور خاصا الجھا ہوا ہے اور لوگوں کی خاصی تعداد روایتی طور پر برسرِ اقتدار حکومت کی حمایت کر کے مفادات حاصل کرنے کو ترجیح دیتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں ان لوگوں میں موقع پرستانہ ذہنیت فروغ پا چکی ہے۔ میں نے ہمیشہ اس نقطۂ نگاہ کا اظہار کیا کہ ملک کے دونوں حصوں کو متحد رکھنے اور قومی یکجہتی واستحکام کے فروغ کے لئے صرف یہی امر کافی نہیں تھا کہ ملک کے دونوں حصوں میں مسلمانوں کی اکثریت آباد ہے جسے عام طور پر اسلام کا تعلق قرار دیا جاتا تھا۔ اس مقصد کے لئے معاشی انصاف اور ملک کے تمام حصوں اور تمام قومیتّوں کی اقتصادی ترقّی بھی ضروری تھی۔ اس سے بھی ضروری امر یہ تھا کہ ملک کے دونوں حصوں میں سیاسی سوچ کو قریب تر لایا جائے اور ممکنہ حد تک ہم آہنگی پیدا کی جائے۔ دونوں صوبوں کے تاریخی پس منظر میں اختلافات کے باعث اس مقصد کا حصول آسان نہیں تھا تاہم اس سمت میں کوشش کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ورنہ سیاسی اتحاد اور یک جہتی ناممکن ہو جاتی اور ملک پارہ پارہ ہو جاتا۔ میرے خیال میں اس یک جہتی کو صرف جمہوری عمل کے ذریعے ہی حاصل کیا جاسکتا تھا۔

مغربی پاکستان میں درج ذیل سیاسی جماعتوں کی حیثیت خاصی مستحکم تھی۔ مسلم لیگ، عوامی لیگ، جماعتِ اسلامی، نیپ، چوہدری محمد علی بھی نظامِ اسلامی پارٹی کو منظم کر کے قومی سطح کی سیاسی جماعت میں ڈھالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ 1956ء میں وزارتِ عظمٰی سے علیحدگی کے بعد انہوں نے تحریک اسلامی پارٹی بنانے کی کوشش کی لیکن انہیں کچھ خاص کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ کچھ عرصے کے لئے وہ جماعتِ اسلامی میں شامل ہوئے اور پھر نظامِ اسلام پارٹی کی بنیاد ڈالی۔ قومی اسمبلی کے رکن میاں عبدالباری کی شکل میں انہیں ایک قد آور معتمد کی خدمات حاصل تھیں تاہم ان کی جماعت کا اصل انحصار چوہدری محمد علی کی اپنی شخصیت پر تھا۔ ملک بھر میں کہیں پر بھی اس جماعت کو تنظیم یا ارکان کے لحاظ سے اثر ورسوخ حاصل نہیں تھا۔ عوامی لیگ اور نیشنل عوامی پارٹی نے فیصلہ کیا کہ جمہوریت کی مکمل بحالی تک اپنے تنظیمی احیاء سے گریز کیا جائے۔ البتہ جماعتِ اسلامی نے خاصی تیزی دکھائی اور دوبارہ اپنی تنظیم قائم

کرلی۔

لیگ کے کنونشن کا آغاز بد

مسلم لیگ اپنے احیاء کے لئے بے چین تھی۔ صدر بھی اس کے عزائم پر مہمیز لگا رہے تھے۔ انہیں مسلم لیگ کی ہوسِ اقتدار پر مبنی روایت کا بخوبی علم تھا اور وہ جانتے تھے کہ بالآخر انہیں اسی جماعت کی حمایت حاصل ہوگی۔ کالعدم مسلم لیگ کے ارکان نے بنیادی جمہوریتوں اور مجالسِ قانون ساز کے لئے انتخابات میں حصہ لیا تھا۔ مسلم لیگ کے کئی ممتاز رہنماؤں نے مارشل لاء کا خیر مقدم کیا تھا اور آئین کے نفاذ پر صدر ایوب کو مبارکباد دیئے گئے تھے۔ مسلم لیگ بھی دیگر جماعتوں کی طرح کالعدم قرار پائی تھی۔ لیکن صدر اس جماعت کی اطاعت گزاری سے پُرمطمئن تھے۔ تاہم 8 جون 1962ء کو آئین کے نفاذ کے بعد اس حمایت میں کچھ رخنہ آیا تھا جب مسلم لیگ کے ارکان نے اپنے سربراہ خان عبدالقیوم خاں کی قیادت میں دیگر سیاسی جماعتوں کے ساتھ مل کر میری حفاظتی نظربندی سے رہائی کا مطالبہ شروع کردیا۔ مسلم لیگ کے نائب صدر مولانا محمد اکرم خاں کو ترغیب دیکر ڈھاکہ میں مسلم لیگ کونسل کا اجلاس بلایا گیا۔

قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ صدر کے قریبی سیاسی مشیروں کو قدرے تاخیر سے خیال آیا کہ یہ تنظیم مکمل طور پر ان کے ہاتھ میں نہیں ہوگی۔ لہٰذا عین ممکن ہے کہ یہ اپنا تخلیق کردہ جن بوتل سے باہر نکل کر جمہوریت کا مطالبہ شروع کردے۔ آئین پر تنقید کرنے لگے اور یوں صدر صاحب کو لینے کے دینے پڑ جائیں۔ اس کے علاوہ اس قسم کے اجلاس کے لئے مشرقی پاکستان کی سرزمین کو موزوں انتخاب قرار نہیں دیا جاسکتا تھا۔ اچانک مولانا محمد اکرم نے بغیر کوئی وجہ بیان کئے اس اجلاس کو منسوخ کردیا۔ انہوں نے اپنے اس متلون رویے کی وضاحت کرنے سے بھی انکار کردیا بعدازاں مرکزی وزراء اور پارلیمانی سیکرٹریوں کا ایک اجلاس حکومت کے صدر مقام راولپنڈی میں منعقد ہوا اور فیصلہ کیا گیا کہ مسلم لیگ کا کنونشن کراچی میں منعقد کیا جائے۔ کنونشن میں 700 مندوبین (ہر صوبے سے 350 مندوبین) شریک ہونا تھے۔ اور صدارت کے لئے قرعۂ فال چوہدری خلیق الزماں کے نام نکلا۔ اگرچہ کراچی میں ایک استقبالیہ کمیٹی کی تشکیل کا تکلف بھی کیا گیا لیکن دعوت نامے راولپنڈی سے جاری کئے گئے۔ مندوبین کے لئے مکمل طور پر سرکاری اعتماد کا حامل ہونا ضروری قرار دیا گیا۔ مشرقی پاکستان سے آنے والے مندوبین کے لئے مفت سفر کا اہتمام کیا گیا۔ (صرف ایک رکن نے اپنے بیان کے مطابق اپنا کرایہ خود ادا کیا) سفر کے یہ اخراجات محکمۂ دفاع کی طرف سے ادا کئے گئے جو براہِ راست صدر کی تحویل میں تھا۔ آئین کے مطابق وزیر دفاع کے لئے کم از کم لیفٹیننٹ جنرل ہونا ضروری تھا۔ چنانچہ فیلڈ مارشل صدر سے بہتر اور قابلِ اعتماد وزیر دفاع کون ہوسکتا تھا؟ مشرقی پاکستان سے مندوبین کی تعداد پوری کرنے کے لئے راولپنڈی میں مشرقی پاکستان سے تعلق رکھنے والے سرکاری ملازمین کو رخصت دیکر کراچی روانہ کیا گیا۔ ملک کے دونوں حصوں سے تعلق

رکھنے والے مندوبین کے قیام و طعام کے تمام اخراجات استقبالیہ کمیٹی کے سپرد تھے۔ چنانچہ مشرقی پاکستان کے مندوبین نے مغربی پاکستان میں خاصا خوشگوار وقت گذارا۔ کنونشن کا اجلاس کراچی کے ماہی خانے میں منعقد ہوا غالباً اس عمارت اور ایوانِ صدر میں براہِ راست ٹیلی فون کا رابطہ موجود تھا۔ اور صدر صاحب کو تمام کارروائی سے آگاہ رکھا جارہا تھا۔ مشرقی پاکستان سے تعلق رکھنے والے ایک مندوب نے کچھ غیر محتاط تقریر کی' صدر صاحب نے حکم دیا کہ اس گستاخ مندوب کو گرفتار کر کے ان کے حضور پیش کیا جائے تاہم اس حکم پر عمل در آمد سے قبل ہی اسے جہاز پر سوار کر کے مشرقی پاکستان روانہ کیا جاچکا تھا۔ مندوبین کے انتخاب میں تمام تر احتیاط کے باوجود کنونشن کا ماحول آغاز ہی سے ہنگامہ پرور تھا۔ مشرقی پاکستان کے مندوبین چلا چلا کر خان عبدالقیوم خان کی رہائی کا مطالبہ کرتے رہے۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ کنونشن کی اصل کارروائی کے آغاز سے قبل خاں عبدالقیوم خان کی رہائی کے لئے قرارداد منظور کی جائے۔ تمام وزراء پردے کے پیچھے سے کنونشن کی تاریں ہلا رہے تھے۔ مرکزی وزیر خاں حبیب اللہ خاں نے سرحد سے ایک بڑا وفد کنونشن میں بھیجا تھا۔ اور یہ لوگ قیوم خاں کی مذمت میں بڑے بلند آہنگ تھے۔ میاں ممتاز خاں دولتانہ نے بھی اپنے کچھ دوستوں اور حامیوں کو کنونشن میں بھیجا تھا۔ ان لوگوں میں چٹھہ اور کرمانی نمایاں تھے۔ قیوم خان کی رہائی کا مطالبہ کرنے پر حکومت کے حامیوں نے کرمانی سے بدتمیزی کی اور دھول دھپہ کر کے انہیں بیٹھنے پر مجبور کر دیا گیا۔ اعتراض کیا گیا کہ یہ مسلم لیگ کا کنونشن نہیں ہے۔ چنانچہ اس اجتماع کو مسلم لیگیوں کے کنونشن کا نام دے دیا گیا۔ کنونشن نے تسلیم کیا کہ صدارتی طرزِ حکومت پاکستانی عوام کے مزاج سے قریب تر نظام ہے۔ نیز یہ کہ ایوب کے نافذ کردہ آئین سے بہتر دستور کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ وفاداری کے ان عہد ناموں پر سرِ تسلیم خم کرنے کے بعد فیصلہ کیا گیا کہ مسلم لیگ کو نچلی سطح سے از سر نو منظم کیا جائے۔ مرکز نیز مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے لئے چیف آرگنائزر مقرر کئے گئے۔

کنونشن کی دوسری نشست کے لئے ایک جلسۂ عام کا پروگرام تھا۔ جسے صدارتی محل کے پچھواڑے میں واقع پولو گراؤنڈ پر منعقد کیا گیا۔ کراچی مسلم پناہ گزینوں اور ہندوستان سے آنے والے نئے گھروں کا گڑھ بن چکا تھا۔ تقسیم ہند سے قبل ہندوؤں اور مسلمانوں سمیت اس شہر کی کل آبادی 350000 تھی۔ جواب مسلمان پناہ گزینوں کے باعث 20 لاکھ سے بڑھ چکی تھی۔ یہ لوگ ہندوستان میں مسلم لیگ کے زبردست حامی رہے تھے اور بہت سوں کو تو مسلم لیگ کی حمایت پر ہندوستان سے نکلنا پڑا تھا۔ چنانچہ توقع تھی کہ کنونشن کا جلسہ بہت کامیاب رہے گا۔ خاص طور پر یہ توقع اس لئے بڑھ گئی تھی کہ ابھی چند روز قبل قیوم خاں نے میری رہائی کا مطالبہ کرنے کے لئے جو جلسہ کیا تھا اس میں 2 لاکھ کے لگ بھگ افراد شریک ہوئے تھے۔ جلسۂ عام کے لئے بڑے پیمانے پر انتظامات کئے گئے۔ جلسہ گاہ کو شامیانوں' قالینوں اور گملوں سے آراستہ کیا گیا۔ جگمگاتی ہوئی روشنیوں سے پورے میدان کو بقعہ نور بنا دیا گیا۔ سامعین کی بہت بڑی تعداد کی توقع پر پنڈال میں دور دور تک لاؤڈ سپیکر اور مائیکروفون نصب کئے گئے۔ بدقسمتی سے

مندوبین سمیت حاضرین کی تعداد 4000 سے زیادہ نہ ہو سکی۔

جلسے کے آغاز میں طالبِ علموں کے ایک گروہ نے ہنگامہ کرنا شروع کر دیا۔ طلباء کا مطالبہ تھا کہ صدر کی طرف سے نامزد کردہ تعلیمی کنونشن کی سفارشات کے خلاف ان کی احتجاجی قرارداد منظور کی جائے۔ کنونشن کے منتظمین کے پس وپیش کرنے پر طلباء نے چبوترے پر چڑھ کر جلسے کی کارروائی اپنے ہاتھ میں لے لی۔ احتجاجی کارروائی منظور کی اور رخصت ہو گئے۔ طلباء کے جانے کے بعد پنڈال میں صرف 1500 افراد رہ گئے۔ اس کے باوجود جلسہ گاہ ——————

میں امن قائم نہ ہو سکا۔ جیسے ہی کوئی مقرر اجتماع کو مسلم لیگ کا جلسہ قرار دیتا۔ سامعین اعتراضات کی بوچھاڑ کر دیتے۔ ہنگامہ تھمنے میں نہ آیا۔ تو مغربی پاکستان کا ایک مولوی سٹیج پر چڑھ کر خدا سے دعا کرنے لگا کہ وہ سامعین کو ہدایت دے تاکہ کارروائی آگے بڑھ سکے۔ ہجوم کے ایک حصے نے مولوی کی بات مان لی۔ جبکہ دوسرا حصہ بدستور ہنگامہ کرتا رہا۔ مولوی نے پھر دعا کی کہ خدا دوسرے حصے کو بھی سکون سے بیٹھنے کی توفیق دے۔ بالآخر جانے پہچانے غنڈوں نے جن کی خدمات بطورِ خاص اس جلسے کے لئے حاصل کی گئی تھیں، مار پیٹ کر ہنگامہ کرنے والوں کو بھگا دیا اور 6 سو افراد پر محیط جلسے کی کارروائی اطمینان سے طے پانے لگی، جلسے کی مضحکہ خیزی کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب ہنگامہ ختم ہو گیا تو فضل القادر چوہدری مائیکروفون میں چنگھاڑے "مٹھی بھر افراد کس برتے پر 50'000 کے اس ٹھاٹھیں مارتے سمندر کو خراب کرنے کی جرأت کر سکتے ہیں؟" یہ الفاظ چند قدم پر واقع صدارتی محل میں بیٹھے صدر ایوب کی ضیافتِ طبع کے لئے ادا کئے گئے تھے۔ مسلم لیگ کنونشن کی بسم اللہ ہی غلط ہو چکی تھی۔

تاہم اس امر میں کوئی شک نہیں تھا کہ مسلم لیگ کنونشن کے انتظامات سے واضح ہو گیا تھا کہ حکومت کی طرف سے مالی معاونت اور دیگر ہر طرح کی سرپرستی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی جائے گی۔ سرکاری حکام، گورنر اور وزراء اپنے اثر و رسوخ نیز جبر و تشدد سے بھرپور کام لیں گے۔ ترقیاتی رقوم کے علاوہ صنعتکاروں سے ہتھیایا گیا چندہ بھی جماعت پر نچھاور کیا جائے گا۔ خوشامدی، چاپلوس اقتدار کے پجاری، نودولتان، سیاسی و سماجی بساط، لائسنسوں کے خواہشمند، پرمٹوں کے متمنی اور نو دولتیے صنعتکار بھی اپنے نذرانے لئے سرکار کی چوکھٹ پر جا پہنچیں گے۔ کم از کم کاغذی سطح پر آرگنائزروں، کمیٹیوں اور ارکان کی کوئی کمی نہیں رہے گی۔ البتہ یہ سوال اپنی جگہ برقرار تھا کہ یہ جماعت حق بالغ رائے دہی کی بنیاد پر منعقد ہونے والے انتخابات کی آزمائش میں پوری اتر سکے گی یا نہیں صدر خود سارے ملک میں جلسے منعقد کر کے اپنی جماعت کو منظم کر رہے تھے لیکن انہیں اس جماعت کی قوت اور مقبولیت پر اتنا اعتماد تھا کہ انہوں نے اگلے صدارتی انتخابات یا قانون ساز اسمبلیوں کے انتخابات حقِ بالغ رائے دہی کی بنیاد پر منعقد کروانے کا خطرہ مول نہیں لیا۔

انقلاب کے رہنما اصول

یہ کنونشن جولائی 1962ء میں سیاسی جماعتوں کے قانون کے نفاذ کے فوراً بعد صدر اور ان کے

وزراء کے ایماء پر بلایا گیا تھا۔ تاہم صدر نے کنونشن سے یک گونہ بے نیازی کا تاثر دیا تاہم بہت کم لوگوں کو شک تھا کہ صدر اس جماعت کو تخلیق کریں گے، اس کی سرپرستی کر کے اسے اپنے مقاصد کے لئے استعمال کریں گے اور پھر اس میں شامل ہو کر اس کی قیادت پر قبضہ کر لیں گے۔ وزراء جماعت کے عام کارکن ہونے کا دعوی کر رہے تھے اور صدر کا کہنا تھا کہ انہیں اس جماعت سے صرف نظری طور پر دلچسپی ہے یعنی یہ کہ ہر سیاسی جماعت کی طرح اسے بھی نچلی سطح سے استوار ہونا چاہئے۔ مسلم لیگ کے نئے چیف آرگنائزر چوہدری خلیق الزمان نے انہیں مسلم لیگ کی صدارت سنبھالنے کی پیشکش کی، جس کے جواب میں صدر نے بار بار اس ارادے کا اعادہ کیا کہ وہ کسی سیاسی جماعت میں شریک نہیں ہوں گے۔ مسلم لیگ میں شمولیت سے چند روز پہلے انہوں نے راجہ صاحب محمود آباد کو جو تقسیم سے قبل آل انڈیا مسلم لیگ کے چوٹی کے رہنما رہے تھے، پرزور یقین دہانی کروائی کہ وہ مسلم لیگ (کنونشن) میں شمولیت کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔ جب انہوں نے مغربی پاکستان میں عوامی اجتماعات منعقد کر کے عوام کو مسلم لیگ میں شمولیت کی تلقین کرنا شروع کی تو ان کے عزائم ڈھکے چھپے نہ رہے۔ انقلاب کا یہ رہنما اصول کہ سیاسی جماعتوں کے بغیر ملک کا انتظام بہترین طریقے سے چلایا جا سکتا ہے۔ وقت کی تیز ہوائیں سوکھے پتے کی طرح اڑ گیا۔

سرکاری سرپرستی میں تخلیق ہونے والی مسلم لیگ (جسے بہت مناسب طور پر جیبی مسلم لیگ کا نام بھی دیا گیا) کے پیشِ نظر میاں ممتاز خاں دولتانہ کو خیال آیا کہ مارشل لاء سے پہلے والی مسلم لیگ کے احیاء کا وقت آ گیا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر انہوں نے یہ قدم نہ اٹھایا تو کالعدم مسلم لیگ کے ارکان سرکاری جماعت پر نوازشات کی بارش دیکھ کر استقامت کا دامن چھوڑ دیں گے اور مسلم لیگ (کنونشن) کی آغوش میں پہنچ جائیں گے۔ میں نے انہیں بتایا کہ مسلم لیگ (کنونشن) عوام یا دانشوروں میں اپنی ساکھ قائم نہیں کر سکے گی اور صرف ایسے لوگ اس میں شامل ہوں گے جو صدر کے آئین اور آمریت کو قبول کر کے صدر کی چاپلوسی کرنے پر آمادہ ہوں گے۔ ممتاز دولتانہ نے مجھ سے اتفاق نہ کیا اور کہا کہ مغربی پاکستان کے ارکان گہرے سیاسی تجزیے کا شعور نہیں رکھتے اور انہیں ظاہری نمود و نمائش خاص طور پر موزوں ترغیبات سے باآسانی گمراہ کیا جا سکتا ہے۔ میں نے ایک اور تضاد کی طرف بھی ان کی توجہ دلائی۔ مشرقی پاکستان میں قومی جمہوری محاذ سیاسی جماعتوں کا احیاء نہ کرنے کی پالیسی پر عمل پیرا تھا۔ مشرقی پاکستان مسلم لیگ نے بھی اپنا احیا کرنے سے انکار کر کے این ڈی ایف میں شمولیت اختیار کر لی تھی۔ نورالامین نے اسی اصول پر کاربند رہتے ہوئے حکومت کی طرف سے بڑے بڑے مناصب کی پیشکشوں کو مسترد کر دیا تھا۔ چنانچہ میں ان کے اعتماد کو ٹھیس لگانے سے معذور تھا میں نے ممتاز دولتانہ کو بتا دیا کہ میں مشرقی پاکستان میں احیاء شدہ مسلم لیگ کو این ڈی ایف میں شامل نہیں کر سکوں گا۔ البتہ مغربی پاکستان کی حد تک ایسا کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہو گی۔ ممتاز خاں دولتانہ میرا نقطۂ نظر سمجھ گئے اور انہوں نے میرے تجویز کردہ حل سے اتفاق کیا۔

مسلم لیگ کے باقی ماندہ جائنٹ سیکرٹریوں میں سے ایک نے ڈھاکہ میں مسلم لیگ (کونسل) کا کنونشن

طلب کیا۔ میاں دولتانہ نے لاہور میں مغربی پاکستان مسلم لیگ(کونسل) کا ابتدائی اجلاس بلایا اور 85 افراد پر مشتمل بھاری وفد لیکر ڈھاکہ پہنچ گئے۔ جہاں تک میری یاداشت کام کرتی ہے اس کنونشن کی صدارت مولانا محمد اکرم نے کی۔ خواجہ ناظم الدین کو مسلم لیگ(کونسل) کا صدر منتخب کیا گیا۔ کونسل کے اجلاس میں مشرقی پاکستان مسلم لیگ کے بہت کم ارکان نے شرکت کی۔ کنونشن میں شریک ہونے والوں میں سے بھی بہت سے سیاسی جماعتوں کا احیاء نہ کرنے کی حکمتِ عملی کے حق میں تھے۔ ان افراد کی شرکت کا منشایہ تھا کہ مسلم لیگ کونسل کو ترغیب دی جائے کہ پانچ یا چھ نکات کی بنیاد پر این ڈی ایف سے تعاون کی پیشکش کی جائے۔ یہ شرائط خاصی قابلِ قبول تھیں کیونکہ ان میں جمہوری آئین کے بنیادی اصول بیان کیے گئے تھے۔ چنانچہ میں نے انہیں قبول کر لیا۔

خواجہ ناظم الدین نے پلٹن میدان ڈھاکہ میں ایک جلسہ عام سے خطاب کر کے اپنی مہم کا آغاز کیا جلسے میں عوام کی شرکت کچھ زیادہ حوصلہ افزا نہیں تھی۔ مشرقی پاکستان میں عمومی طور پر ان کے اجتماعات زیادہ کامیاب نہ رہے۔ تاہم مغربی پاکستان میں وہاں کے معیار سے ان کے جلسے خاصے بھرپور رہے اور ابتداء میں مغربی پاکستان نے بھی انہیں روکنے کی زحمت نہ کی۔ لاہور ریلوے سٹیشن پر ان کا پرجوش استقبال ایک بہت بڑی کامیابی تھا۔ انہوں نے مسلم لیگ (کونسل) کو نچلی سطح سے منظم کرنے کی بے حد کوشش کی۔ تاہم یہ افواہیں برقرار رہیں کہ وہ مسلم لیگ کنونشن سے تعاون یا ادغام کا راستہ اپنا لیں گے۔ غالباً مسلم لیگ (کونسل) کی صفوں میں ابتری پیدا کرنے کے لئے سرکاری حلقے وقفے وقفے سے یہ افواہیں اڑاتے رہے تھے۔ خواجہ ناظم الدین نے اپنی تقاریر میں سختی سے یہ نقطہ نظر اپنایا تھا کہ خالص جمہوریت کی بحالی تک کنونشن مسلم لیگ سے تعاون کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ان کے اس بے لچک رویے کے پیشِ نظر مسلم لیگ کے دونوں دھڑوں میں تعاون یا ادغام خاصا بعید از امکان تھا۔

عوامی اجتماعات کے انعقاد میں مکرر رکاوٹیں

مجھے مشورہ دیا گیا کہ میں مغربی پاکستان میں اپنی مہم کا آغاز لاہور سے کروں کیونکہ یہ شہر مغربی پاکستان کی سیاست کا اعصابی مرکز ہے۔ مجھے توقع تھی کہ نیپ کے جنرل سیکرٹری محمود علی قصوری جلسے کی صدارت کریں گے۔ ایک نامور وکیل ہونے کے علاوہ وہ بڑی قد آور شخصیت کے مالک تھے اور عدالتوں میں حکومتی جبر کا شکار ہونے والے افراد کا دفاع کرنے میں پیش پیش رہتے تھے۔ ان کا المیہ یہ تھا کہ بذاتِ خود کمیونسٹ نہ ہونے کے باوجود ان کے سبھی مشیر اور کارکن کٹر کمیونسٹ سمجھے جاتے تھے۔ ملک دشمنی کے الزام کے باعث نیپ کو پنجاب میں زیادہ پذیرائی حاصل نہیں تھی۔[29] لہذا محمود علی قصور کی صدارت پر اعتراض کیا گیا۔ اور مجھے بامر مجبوری جلسے کی صدارت کرنا پڑی۔ لاہور کے معیار کے مطابق جلسہ گاہ میں لوگوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ لیکن پنڈال کے دو کونوں سے کچھ نوجوان پولیس کی سرپرستی میں ہنگامہ کرنا چاہتے تھے۔ میں نے صورتِ حال پر قابو پا لیا اور 15 سے 25 نوجوانوں پر مشتمل ان

گروہوں کو قریبی پولیس سٹیشن میں پناہ لینا پڑی۔ میرا اگلا جلسہ لائلپور کے مقام پر رکھا گیا۔ وہاں حکومت نے کھلے بندوں ہنگامہ آرائی کی کوشش کی۔ غنڈوں کے دو گروہ سارا وقت شور و غل کرتے رہے۔ پولیس ان افراد کو جلسہ گاہ میں بھی نشہ آور اشیاء فراہم کرتی رہی بالآخر مجھے سننے کے لئے آنے والے ہجوم نے ان افراد کو مار بھگایا اور جلسہ پرامن طور پر ختم ہوا۔

اگلا جلسہ گوجرانوالہ کے مقام پر منعقد ہونا تھا۔ میں نے اس شہر میں ماضی میں بڑے کامیاب جلسے منعقد کئے تھے۔ اور یہاں پر میری جماعت کو خاصی مقبولیت حاصل تھی۔ ریلوے سٹیشن پر حسبِ معمول بڑے جوش و خروش سے میرا استقبال کیا گیا۔ لیکن جب میں کار کی طرف بڑھ رہا تھا تو کسی نے مجھ پر گولی چلادی جو میرے داہنے ہاتھ کھڑے شخص کی ران میں جالگی۔ کچھ طالبِ علم سیاہ جھنڈے اٹھائے کھڑے تھے۔ اور "میاں صاحب ' زندہ باد" کے نعرے لگا رہے تھے۔ تاہم ان لوگوں نے قریب آنے کی کوشش نہیں کی۔ ان طالبِ علموں کو پولیس یہاں لائی تھی۔ بعدازاں ایک پولیس انسپکٹر ان طالبِ علموں کی رہنمائی کر کے انہیں اس مکان کی طرف لے گیا جہاں میں قیام کر رہا تھا۔ ان طالبِ علموں کو پولیس نے خاصی ہدایات دے رکھی تھیں۔ لیکن منزل پر پہنچنے سے پہلے ہی انہیں مار بھگایا گیا۔

اسی شام میرے اعزاز میں گارڈن پارٹی دی گئی تھی۔ اچانک مشرقی پاکستان سے شیخ مجیب الرحمٰن سمیت لاہور سے بہت سے رہنما بڑی گھبراہٹ کے عالم میں اندر داخل ہوئے انہیں اطلاع ملی تھی کہ مجھ پر گولی چلائی گئی ہے یہ لوگ اصرار کر رہے تھے کہ میں جلسئہ عام میں شرکت نہ کروں لیکن میں مصر تھا کہ مجھے جلسے میں شریک ہونا چاہئے۔ بالآخر حتمی فیصلے کو ملتوی کر دیا گیا' رات کو میں اپنی قیام گاہ سے جلسہ گاہ کے قریب ایک مکان کی طرف روانہ ہوا جہاں سے مجھے جلسہ گاہ میں جانا تھا۔ راستے میں ہم نے پولیس کے متعدد ٹرک دیکھے جن پر قریبی دیہات سے تقریباً 400 غنڈے اور بدمعاش لائے جا رہے تھے۔ شام لگی لاٹھیوں سے مسلح یہ لوگ جلسہ گاہ کے قریب سڑک اور ریلوے لائن کے درمیان تاریکی میں چھپنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ بات بالکل واضح ہو چکی تھی کہ حکومت ہر قیمت پر مجھے جلسے سے خطاب کرنے سے روکنا چاہتی ہے خواہ اس کے لئے وسیع پیمانے پر تشدّد بھی کیوں نہ کرنا پڑے۔ محمود علی قصوری 'نوابزادہ نصراللہ خاں 'مجیب الرحمٰن 'خواجہ رفیق اور بہت سے رہنما جو لاہور سے آئے تھے۔ مجھ سے پہلے جلسہ گاہ میں چلے گئے' یہ گوجرانوالہ کی تاریخ میں سب سے بڑا اجتماع تھا۔ جب ان رہنماؤں نے عوام کے سامنے اعلان کیا کہ حکومت کی طرف سے ہنگامہ آرائی کی تیاریوں کے پیشِ نظر جلسہ منسوخ کیا جاتا ہے تو آگے بیٹھے ہوئے غنڈوں نے سوڈا واٹر کی بوتلیں پھینکنا شروع کر دیں۔ (پتھراؤ میں سوڈا واٹر کی بوتلیں خطرناک ہتھیار شمار ہوتی ہیں کیونکہ یہ نشانے پر لگ کر پھٹ جاتی ہیں) اب اس امر میں کوئی شک نہیں رہا تھا کہ حکومت مغربی پاکستان میں میرے دورے کو درہم برہم کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ دوستوں کے دباؤ کے پیشِ نظر میں نے صوبے کا دورہ اس وقت تک ملتوی کرنے کا فیصلہ کر لیا جب تک حکومت یہ ضمانت نہ دے کہ وہ میرے جلسوں میں ہنگامہ آرائی نہیں کروائے گی۔ حکومت نے اس قسم کی کوئی یقین دہانی کروانے سے انکار کر

دیا۔

۔۔ اس کے بعد میں نے مشرقی پاکستان میں پر ہجوم عوامی اجتماعات کا ایک اور سلسلہ مکمل کیا۔ اس دورے میں ایسے ضلعی صدر مقامات اور اہم تحصیلوں میں بھی جلسے کیئے گئے جو پچھلے دورے میں باقی رہ گئے تھے۔ بہت سی ایسی جماعتوں کے رہنما بھی ان جلسوں میں شریک ہوتے تھے۔ جنہوں نے سیاسی جماعت کا احیاء نہ کرنے کی حکمتِ عملی اختیار کی تھی۔ عوام نے ان رہنماؤں کی پر جوش پذیرائی کی۔ معلوم ہوتا تھا کہ عوام ایسی متحدہ سیاسی جدوجہد سے مانوس ہوتے جا رہے ہیں جس کے ذریعے اور جس کے دوران سیاسی جماعتوں کے باہمی اختلافات ختم ہو سکیں۔ یکے بعد دیگرے مختلف رہنماؤں نے مجھے عوام کا ترجمان اور تحریک کا رہنما قرار دیا اور مجھے اپنی تائید کا یقین دلایا۔

بھاشانی کی منافقت

یہ صورتِ حال نیپ کو زیادہ پسند نہ آئی۔ کیونکہ اس جماعت کا خیال تھا کہ اس کے نظر بند رہنما مولانا بھاشانی کو پسِ منظر میں دھکیلا جا رہا ہے۔ مولانا بھاشانی کو 1958ء میں 7 اکتوبر کے انقلاب کے فوراً بعد گرفتار کیا گیا تھا۔ کچھ عرصے کے لئے انہیں قیدِ تنہائی میں رکھا گیا اور انہوں نے خاصی تکلیف اٹھائی لیکن ان کی درخواست پر انہیں بہتر حالات فراہم کر دیئے گئے۔ صدر نے 6 اکتوبر 1959ء کو انہیں رہا کرنے کا فیصلہ کیا بشرطیکہ وہ خود کو مشرقی پاکستان کے ضلع تنگیل میں اپنے گاؤں کاگماری تک محدود رکھیں۔ اور کسی عوامی اجتماع سے خطاب نہ کریں۔ مولانا بھاشانی نے محسوس کیا کہ رہائی کے بعد لوگ ہر صورت میں ان سے ملنے آئیں گے اور ان کی جان ضیق میں آجائے گی۔ وہ ملاقات کے لئے آنے والوں سے جو بھی کہیں گے حکومت رہائی کی شرائط کی خلاف ورزی پر مولانا کا ٹینٹوا لے گی۔ چنانچہ ان کی اپنی تجویز پر انہیں ڈھاکہ کے ایک بنگلے میں نظر بند کر دیا گیا۔ نظر بندی کے دوران ان کے اہلِ خانہ بھی ان کے ساتھ قیام پذیر تھے۔ انہیں اپنے وکیل اور ڈاکٹر کے علاوہ کسی سے ملنے کی اجازت نہیں تھی۔ بنگلے کی مناسب حفاظت کی جاتی تھی۔ مادی نقطۂ نگاہ سے بھی انہیں عمدہ رہائش ملی تھی اور انہیں بھتہ بھی ملتا تھا۔ شنید ہے کہ انہوں نے صدر کے نام خوشامدانہ خطوط ارسال کئے تھے' بدقسمتی سے عوام نے ان کی رہائی کے لئے کسی خاص اضطراب کا مظاہرہ نہ کیا۔ مولانا بھاشانی' ان کی جماعت اور ان کے احباب نے اس امر کا برا منایا کہ مولانا بھاشانی سال بھر نظر بند رہے اور ان کی رہائی کے لئے کسی نے تحریک نہ چلائی جبکہ 30 جنوری 1962ء کو میری گرفتاری کے فوراً بعد ہنگامے شروع ہو گئے۔

مشرقی پاکستان میں این ڈی ایف کے شاندار جلسوں میں دوسرے رہنما منظرِ عام پر آ گئے تھے۔ خفیہ ہاتھ نے مولانا بھاشانی کو راہ دکھائی کہ وہ سیاسی اکھاڑے میں اپنی ساکھ بحال کرنے کے لئے بھوک ہڑتال کا اعلان کریں۔ مولانا اس بھوک ہڑتال کو "تامرگ" قرار دیتے تھے۔ مبیّنہ طور پر انہوں نے

خوراک اور پانی استعمال کرنے سے انکار کر دیا۔ بعدازاں انہیں ہسپتال منتقل کر دیا گیا جہاں وہ نو روز تک مقیم رہے۔ نیپ کے کارکنوں نے طلباء' نوجوانوں اور عوام میں مولانا بھاشانی کی رہائی کے لئے جذبات ابھارنے کی از بس کوشش کی لیکن ناکام رہے۔ تاہم ہم نے جلسے منعقد کر کے نہ صرف مولانا بھاشانی بلکہ خان عبدالقیوم خان سمیت دیگر نظر بندوں کی رہائی کا بھی مطالبہ کیا۔ ہم ہر روز ہسپتال میں ان کی عیادت کرنے جاتے۔ بظاہر ان کی حالت میں کوئی ابتری نظر نہیں آتی تھی۔ جسے ان کی غیر معمولی توانائی پر محمول کیا گیا۔ وہ دن رات اپنے محافظوں' معالجوں اور ملاقاتیوں سے ایسے بلند آہنگ لہجے میں گفتگو کرتے کہ لوگوں کو ان کی بھوک ہڑتال پر شک ہونے لگا۔ تاہم میرے سادہ اور خوش عقیدہ لیکن مضحمل ہوتے ذہن نے یہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کہ کوئی اتنی بڑی بد دیانتی بھی کر سکتا ہے۔ چنانچہ میں ان کی بھوک ہڑتال کو حقیقی سمجھتا رہا۔ بایں ہمہ جب ہسپتال میں داخل ہونے کے آٹھ روز بعد بھی ان کی گھن گرج مدہم ہوئی نہ ان کے بازوؤں کے سڈول پن میں کمی واقع ہوئی تو مجھے بھی شک گزرنے لگا کہ ان کی بھوک ہڑتال حقیقی نہیں ہے۔ معلوم ہوا کہ ان کے معالجوں میں سے ایک صاحب' جو کمیونسٹ تھے۔ انہیں خفیہ طور پر خوراک بہم پہنچاتے رہتے تھے۔ صدر کو بھی اس کی خبر پہنچ گئی اور انہوں نے فیصلہ کیا کہ مولانا کو اٹھارہ روز تک رہا نہ کیا جائے یوں ان کے دھوکے کو پوری طرح پاکستان عوام پر واضح کر کے ہمیشہ کیلئے ان کی سیاسی ساکھ تباہ کر دی جائے۔ لیکن صدر کے محرمانِ راز دروں خانہ مشیروں اور مشرقی پاکستان مسلم لیگ کنونشن کے رہنماؤں نے صدر کو مشورہ دیا کہ مولانا کو فوراً رہا کر دیا جائے اور ان کی مزید توہین نہ کی جائے کیونکہ وہ میرے اثر و نفوذ کا توڑ کرنے میں بہت ممد ثابت ہو سکتے ہیں۔ صدر کو بتایا گیا کہ مولانا بھاشانی این ڈی ایف کی پشت میں کانٹا بننے کی اہلیت سے مالا مال ہیں۔

9 مئی کو مولانا بھاشانی رہا کر دیئے گئے۔ مہاتما گاندھی کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے مولانا نے اصرار کیا کہ وہ بھوک ہڑتال کے بعد میرے ہاتھ سے مائع غذا کا پہلا (عوامی) گھونٹ لیں گے۔ بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے ان کے جانثار پیرو کاروں نے پر جوش طریقے سے اس تجویز کا خیر مقدم کیا۔ رہائی کے بعد انہوں نے ایک پریس کانفرنس سے خطاب کیا۔ ایک ایسے شخص کے لئے یہ واقعی غیر معمولی قوتِ برداشت کا مظاہرہ تھا جو بقول خود نو روز تک خوراک اور پانی سے محروم رہا ہو۔ بعدازاں وہ اپنے معمول کے مطابق ایک کشتی میں بیٹھ کر صحت یابی کے لئے دریا جمنا کی سیر پر نکل گئے۔ انہوں نے دریا کے کنارے کچھ اجتماعات سے بھی خطاب کیا۔ جن میں عوام نے زیادہ تعداد میں شرکت نہ کی۔ پلٹن میدان میں بھی ان کا جلسہ پھیکا رہا۔ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ان کی دیانتداری پر لگے داغوں کے صاف ہونے میں خاصا وقت لگا۔

چٹا گانگ کے جلسۂ عام میں جو ان کی مکمل صحت یابی کے بعد غالباً پہلا جلسہ تھا' انہوں نے صدر ایوب کی سی تندہی سے کام لیتے ہوئے سابقہ حکومتوں اور سیاسی رہنماؤں کی مذمّت کی اور ان لوگوں سے نجات دلانے پر صدر کی فراست کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ تاہم احتیاط کے طور پر انہوں نے اسی سانس میں

جمہوریت کی وکالت کر ڈالی۔ قرائن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے کارکنوں نے مذکورہ بالا نقطۂ نگاہ کے پرچلو سے نیپ کو پہنچنے والے نقصان کا اندازہ کر کے انہیں خبردار کیا کہ وہ ان خیالات کے اظہار سے گریز کریں چنانچہ اس کے بعد انہوں نے اپنے ہتھکنڈے تبدیل کر کے اعلان کیا کہ وہ جمہوریت کی خاطر میری اور این ڈی ایف کی تحریک کی حمایت کرنے کے لئے تیار ہیں تاہم چٹا گانگ میں ان کی تقریر سے ان کے اندرونی خیالات ذہنی رجحانات اور حکمتِ عملی کی جو تصویر سامنے آئی تھی اسے نظر انداز کرنا آسان نہیں تھا۔ اس طرح مولانا نے صدر سے ہونے والے وعدے وعید پورے کئے۔

مزید براں این ڈی ایف کی مبیّنہ حمایت کے باوجود وہ اپنے جلسوں میں تعاون کے لئے کبھی 16 نکات پر مبنی شرائط پیش کرتے تو کبھی سات نکاتی مطالبات پیش کرتے۔ کبھی ان نکات کی تعداد صرف پانچ رہ جاتی تاہم یہ سبھی نکات متنازعہ فیہ تھے۔ اس طرح مولانا بھاشانی نے تمام سیاسی جماعتوں کی مشترکہ جدوجہد کے خواب کو شرمندۂ تعبیر نہ ہونے دیا چونکہ رسمی طور پر نیپ کا احیاء نہیں ہوا تھا۔ لہٰذا وہ نیشنل عوامی پارٹی کے نام سے اجتماعات منعقد نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے اپنے نقطۂ نگاہ کے اظہار کے لئے کرشک سمیٹی کے نام سے جلسے منعقد کرنا شروع کر دیئے اس تنظیم کا کہیں وجود نہیں تھا۔ اگرچہ وہ این ڈی ایف میں حقیقی تفرقہ پیدا کرنے میں ناکام رہے تاہم انتشار کی سی کیفیت پیدا کر کے انہوں نے تحریکِ بحالئ جمہوریّت کو نقصان پہنچایا اور صدر کے مقاصد کو تقویت پہنچائی۔ مولانا بھاشانی نے اعلان کیا کہ صدر ایوب کی جماعت سمیت جو جماعت بھی درج ذیل 5 نکاتی پروگرام سے اتفاق کرے گی وہ اس سے تعاون کریں گے۔

(1) تمام سیاسی اسیروں کی رہائی

(2) آزادانہ اور غیر جانبدارانہ خارجہ پالیسی کا اجراء نیز سیٹو اور سنٹو سے علیحدگی۔

(3) صوبائی خود مختاری کی ضمانت

(4) مکمل جمہوریت کا قیام

(5) پارلیمنٹ کو تمام اختیارات کا سرچشمہ قرار دیا جائے یعنی پارلیمنٹ بجٹ پر اختیار رکھتی ہو۔ انتخابات حقِ بالغ رائے دہی کی بنیاد پر ہوں اور بنیادی حقوق کو عدالتوں کے اختیارِ سماعت میں لایا جائے۔

بایں ہمہ مولانا بھاشانی نے صدر ایوب کے آئین کے بارے میں کوئی واضح نقطۂ نظر اپنانے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے صدر ایوب کے ساتھ تین گھنٹوں پر محیط ملاقات کی جس میں سیاسی قیدیوں کی رہائی پر بات کی گئی۔ اس ملاقات سے چند ہی روز قبل مولانا بھاشانی نے بیان دیا تھا کہ وہ صدر سے اس وقت تک ملاقات نہیں کریں گے جب تک وہ تمام سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں کا مشترکہ اجلاس نہ طلب کریں۔ نیز یہ کہ وہ سیاسی قیدیوں کی رہائی کے لئے صرف مغربی پاکستان کے گورنر سے ملاقات کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ڈھاکہ میں نیپ کی اعلیٰ قیادت کا ایک اجلاس منعقد ہوا جس میں محوّلہ بالا نکات کی مزید وضاحت کی گئی۔ نیز ان میں وحدتِ مغربی پاکستان کی تنسیخ کا مطالبہ بھی شامل کر لیا گیا۔ مولانا بھاشانی نے اس امید کا اظہار کیا

کہ کم از کم نکات پر دوسری جماعتوں سے تعاون کا امکان پیدا ہو جائے گا۔ اجلاس کے فوراً بعد مولانا نے اعلان کیا کہ ان مطالبات پر زور دینے کے لئے 15 دسمبر کو مظاہرے کئے جائیں گے اور یہ کہ اگر دفعہ 144 نافذ کی گئی تو اس کی خلاف ورزی کی جائے گی۔ نیپ کی اعلیٰ قیادت کے اجلاس میں اس قسم کی کوئی تجویز زیر بحث نہیں لائی گئی تھی۔ بلکہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ ان مطالبات کے لئے جدوجہد کو آئین اور قانون کی حدود میں رکھا جائے گا۔ مولانا بھاشانی کے اعلان سے ان کے رفقاء دنگ رہ گئے۔ محمود الحق عثمانی نے کہا

کہ یہ معاملہ زیر بحث نہیں لایا گیا تھا۔ تاہم مولانا بھاشانی کے بیان کے مطابق مظاہرے کئے جائیں گے محمود علی کو مولانا بھاشانی کا یہ اقدام خاصا ناگوار گزرا' انہوں نے کہا کہ نیپ کی اعلیٰ قیادت میں اس فیصلے کی منظوری نہیں دی تھی۔ ——————— یہ اعلان پارٹی کی اس قرارداد کے منافی تھا جس میں قانون کے دائرے کے اندر رہتے ہوئے جدوجہد کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ بہ الفاظ دیگر مولانا بھاشانی نے جماعت کے فیصلے کی خلاف ورزی کی تھی' بعد ازاں اخبارات میں خبر آئی کہ مولانا بھاشانی حکومتِ پاکستان کی طرف سے چین جانیوالے ایک ثقافتی وفد کی قیادت کریں گے۔ بہت بعد میں مولانا بھاشانی نے اس خبر کی تردید کی کہ وہ حکومت پاکستان کی طرف سے چین بھیجے جا رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ چین کی حکومت نے انہیں اپنے یومِ آزادی کی تقریبات میں شرکت کی دعوت دی ہے اور وہ نیپ کے دیگر رہنماؤں کے ساتھ چین جائیں گے۔ تاہم وہ وفد کے دیگر ارکان کے ساتھ چین نہ جا سکے کیونکہ انہیں سردی لگ جانے کے باعث جناح ہسپتال میں داخل ہونا پڑا۔ چند روز بعد وہ روبصحت ہو گئے اور اپنے طبی اور قانونی مشیروں کے ہمراہ یکم اکتوبر کی تقریبات میں شرکت کیلئے چین پہنچ گئے۔ ان کی بیماری کے دوران بہت سے افراد ان کی عیادت کرنے پہنچے۔ جن میں حکومتِ پاکستان کے سیکرٹری خارجہ عزیز احمد سب سے نمایاں تھے۔

صدر کا بغض و انتقام

مولانا بھاشانی کی رہائی کے بعد میں نے مشرقی پاکستان میں مزید چند جلسے منعقد کئے اور دوبارہ مغربی پاکستان جانے کا فیصلہ کیا۔ مجھے امید تھی کہ گزشتہ موقع پر میرے جلسوں کو زبردستی خراب کرنے اور مجھے عوام سے مخاطب ہونے سے روکنے پر حکومت کے اپنے اخبارات نے بھی تنقید کی تھی۔ شاید اس سے حکومت کے رویئے میں کچھ تبدیلی واقع ہوئی ہو۔ کراچی کے پٹیل پارک میں ایک جلسے کا اعلان کیا گیا مگر تعزیراتِ پاکستان کی دفعہ 144 کے تحت جلسے جلوسوں پر پابندی عائد کر دی گئی۔ اس فیصلے کا جواز یہ پیش کیا گیا کہ امریکہ اور برطانیہ کی طرف سے بھارت کو ہتھیاروں کی فراہمی کے باعث خطرناک کشیدگی پیدا ہو گئی ہے۔ قانون کی خلاف ورزی کرنے کی بجائے میں نے جلسے کو پندرہ روز کے لئے ملتوی کر دیا اس عرصے میں دفعہ 144 واپس لے لی گئی۔ ہمیں تاثر یہ دیا گیا کہ حکومت کے رویئے میں نرمی آ گئی ہے اور ہمیں جلسہ کرنے کی اجازت مل جائے گی۔ کونسل مسلم لیگ کراچی کے صدر' زید ایچ لاری کو جلسے کا

صدر منتخب کیا گیا۔ سٹیج سیکرٹری کے فرائض نیپ کے محمود الحق عثمانی کو سونپے گئے۔ اطلاعات موصول ہونے لگیں کہ حکومت اس جلسے کو بھی خراب کرنے پر تلی ہوئی ہے اور پولیس اس مقصد کے لئے کیماڑی کے علاقے میں رہنے والے پٹھانوں کو استعمال کرنا چاہتی ہے۔ ان لوگوں کو پولیس حکام کی نگرانی میں جلسہ گاہ تک لایا گیا۔ مقامی مجسٹریٹ اور پولیس کو اطلاع دی گئی اور انہوں نے ہنگامہ آرائی کی روک تھام کرنے کی یقین دہانی کروائی۔ تاہم جلسہ شروع ہوتے ہی مجسٹریٹ صاحب غائب ہو گئے' عین اس وقت جب میں جلسہ گاہ جانے کے لئے گھر سے روانہ ہو رہا تھا' ایک شخص نے مجھے اطلاع دی کہ میں گھر پر ہی رہوں کیونکہ غنڈوں نے سٹیج پر بیٹھے رہنماؤں پر حملہ کر دیا ہے' قرائن سے معلوم ہوا کہ پولیس کی طرف سے لائے گئے پٹھانوں نے عثمانی کی تقریر میں مداخلت کی اور لاٹھیاں اور پستول لہراتے ہوئے سٹیج پر چڑھ دوڑے۔ سٹیج پر تشریف فرما قائدین پر چاقوؤں سے حملہ کیا گیا۔ شامیانے پھاڑ ڈالے گئے۔ مائیکروفون توڑ دیئے گئے۔ حملہ آور جاتے وقت مائیکروفون اور سٹیج پر رکھی ہوئی دوسری اشیا سمیت تین ٹیپ ریکارڈر بھی اٹھا کر چمپت ہو گئے۔ کناروں پر کھڑی پولیس نے مداخلت کی زحمت گوارہ نہ کی۔ یہ ہنگامہ اور افراتفری قریب 20 منٹ جاری رہی جب غنڈے ٹرکوں پر سوار ہو کر نعرے لگاتے' ناچتے کودتے اور فاتحانہ انداز میں مائیکروفون لہراتے کراچی کی سڑکوں پر پولیس کی سرپرستی میں چکر لگانے کے لئے روانہ ہو گئے تو قریبی تھانے سے مجسٹریٹ اور پولیس کی نفری بھی جلسہ گاہ میں پہنچ گئی۔

مغربی پاکستان کی حکومت نے تہیّہ کر رکھا تھا کہ مجھے جلسہ نہیں کرنے دے گی۔ خواہ اس کے لئے کچھ بھی کرنا پڑے۔ حکومت کو کسی دوسرے رہنما کے جلسوں پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ حتیٰ کہ کونسل مسلم لیگ کے بعد خواجہ ناظم الدین نے بھی جگہ جگہ جلسے منعقد کر کے آمریت کے خاتمے اور جمہوریت کی بحالی کا مطالبہ کیا لیکن ان سے تعرض نہ کیا گیا۔ بدقسمتی سے صدر نے مجھے اپنے بغض و انتقام کا واحد نشانہ سمجھ رکھا تھا اور مجھے ازراہِ التفات اپنا اہم ترین حریف سمجھتے تھے۔ درآں حالیکہ میں ایبڈو کی تیغ ستم کا شہید تھا اور صدر کی اوچھی چاند ماری کے ہاتھوں بری طرح گھائل ہو چکا تھا۔ لیکن ان کا کوئی تیر نشانے پر نہیں لگا تھا اور میری شہرت داغدار ہونے کی بجائے عوام کی نگاہوں میں میری قدر و منزلت پہلے سے بھی بڑھ چکی تھی۔ یہ صورتِ حال صدر کے لئے ناقابلِ برداشت تھی۔

تاہم صدر پر یہ واضح کرنا ضروری تھا کہ مغربی پاکستان بھی جمہوریت کا طلب گار تھا۔ میں نے سندھ میں جلسوں کا اعلان کیا مگر ہر جگہ دفعہ 144 نافذ کر کے اجتماعات پر پابندی عائد کر دی جاتی۔ میں نے اس کا مناسب متبادل یہ نکالا کہ کچھ ممتاز رہنما مل کر جمہوریت کی حمایت میں ایک قرارداد کا مسوّدہ تیار کریں۔ چنانچہ لاہور میں محمود علی قصوری کی رہائش گاہ پر ایک اجلاس منعقد ہوا اور مندرجہ بالا خطوط پر ایک قرارداد تیار کی گئی جس پر میرے علاوہ جماعتِ اسلامی (مولانا مودودی مولانا طفیل احمد) 'عوامی لیگ (نوابزادہ نصراللہ خاں اور دیگر زعماء) نیپ (محمود علی قصوری اور پنجاب 'بلوچستان اور شمال مغربی سرحدی صوبے کے دیگر قائدین) کے رہنماؤں سمیت کچھ آزاد سیاستدانوں مثلاً چوہدری فضل الٰہی 'یوسف خٹک اور کرنل

عابد حسین نے دستخط کئے۔ مشرقی پاکستان کی غیر احیا شدہ جماعتوں کے ایک نمائندہ وفد نے بھی بحث و مباحثے میں حصہ لے کر دستاویز پر دستخط کئے۔ میرے خیال میں یہ ایک اہم کامیابی تھی۔ مولانا مودودی نے عملی سیاست کی سوجھ بوجھ کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسلام کا استحصال کرنے سے گریز کیا اور سب رہنما اس نتیجے پر پہنچے کہ جمہوریت ملک کی بنیادی ضرورت تھی۔ مجھے مولانا مودودی کے اس دانشمندانہ رویّے پر تعجّب بھی ہوا اور مسرّت بھی، مختصر یہ کہ اس اجلاس میں موجود تمام زعماء یک نکاتی پروگرام پر متفق ہوگئے۔ طے پایا کہ کچھ عرصے بعد ایک کنونشن منعقد کر کے ان مقاصد کے حصول کے لئے حکمتِ عملی تشکیل دی جائے۔ اس وُقت کونسل مسلم لیگ تشکیل کے مراحل میں تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ دولتانہ میرے پروگرام سے متفق ہیں۔ چنانچہ مجھے مسلم لیگ اور مشرقی پاکستان سے تعلق رکھنے والے مسلم لیگی ارکان کی طرف سے اطمینان تھا لیکن بعد ازاں خان عبدالقیوم خاں نے دولتانہ کو نکال باہر کیا۔

پاکستان بچانے کے لئے تجاویز

"نور ہنماؤں" نے اپنے بیان میں تجویز دی تھی کہ نئے آئین کی تشکیل کے لئے دستور ساز اسمبلی کے انتخابات کروائے جائیں تاہم پاکستان کو جمہوری آئین فراہم کرنے کے لئے کئی متبادل راستے اختیار کئے جا سکتے تھے۔ مثلاً صدر 1962ء کے آئین کی بجائے 1956ء کا آئین بحال کر سکتے تھے یا 1962ء کے آئین کی ان دفعات میں ترمیم کی جا سکتی تھی۔ جو 1956ء کے آئین سے مختلف تھیں۔ 1956ء کے آئین میں موجود خامیوں سے قطعِ نظر، یہ آئین اس دستور ساز اسمبلی کے ارکان کی مشترکہ مساعی کا ثمر تھا۔ جو 1947ء میں پاکستان کی بنیاد بننے والے قانون آزادیٔ ہند میں طے کردہ طریقۂ کار کے مطابق معرضِ وجود میں آئی تھی۔ یعنی دستوریہ کے ارکان کو حقِ بالغ رائے دہی کی بنیاد پر منتخب ہونے والی صوبائی مجالسِ قانون ساز کے ارکان نے منتخب کیا تھا۔ صدر کو محولہ بالا ترامیم یا متبادل راستوں کے اختیار کرنے میں تذبذب نہیں ہونا چاہئے تھا کیونکہ انہوں نے اپنی مافوق الفطرت ذکاوت اور بے پایاں تجربے کی بنیاد پر جو نادر آئین مدوّن کیا تھا وہ خود ہی اس کے تمام رہنما اصولوں اور مفروضات کو ایک ایک کر کے تج چکے تھے۔

چند مثالوں سے اس بیان کی تصدیق کی جا سکتی ہے۔ صدر نے اپنے وزراء کے ذریعے آئین میں اس ترمیم کو بھرپور طریقے سے استعمال کیا جو انہوں نے آئین کی دفعہ 224 کے مطابق ایک صدارتی حکم کے ذریعے کی تھی (بعد ازاں سپریم کورٹ نے اس صدارتی حکم کو غیر آئینی قرار دیدیا) اس ترمیم کے مطابق کابینہ میں لئے جانے والے ارکان کی قومی اسمبلی کی رکنیت برقرار رکھنے کی اجازت دی گئی تھی۔ تا کہ صدر اپنی ذہنی ترنگ کے مطابق صدارتی اور پارلیمانی نظام کا ملغوبہ تیّار کر سکیں۔ صدر نے سیاسی جماعتوں کو مملکت کی تباہی کا بنیادی سبب قرار دیا تھا۔ لیکن بعد ازاں انہوں نے سیاسی جماعتوں کو کام کرنے کی

آزادی دی۔ صدر کو اصرار تھا کہ اگر سیاسی جماعتیں ناگزیر ہو جائیں تو ان کی تعداد کو دو یا تین سے نہیں بڑھنا چاہئے۔ بعدازاں انہیں یہ ضد بھی ترک کرنا پڑی۔ مزید برآں انہوں نے اپنے سیاسی مقاصد کے حصول کے لئے بنیادی جمہوریتوں کا نظام تخلیق کیا۔ یہ ادارہ ان کی اپنی سیاسی جماعت کا مرکزہ ثابت ہوا جو سیاسی جماعتوں کے قانون کے نفاذ کے فوراً بعد معرضِ وجود میں آ گئی۔ انہوں نے اسلام کو اس بے دردی سے استعمال کیا کہ ماضی کی تمام مثالیں پیچھے چھوڑ گئے۔ اس طرح وہ ان لوگوں کے دل جیتنا چاہتے تھے۔ جنہیں انہوں نے کبھی گاؤدی قرار دیا تھا اور جنہیں جاہل سمجھ کر وہ حقارت سے رد کیا کرتے تھے وہ قانون ساز اسمبلی کے لئے بنیادی جمہوریت کے ارکان کی بجائے عوام کو رائے دہی کا حق دینے پر بھی آمادہ ہو چکے تھے نیز مالی امور پر قانون ساز اسمبلی کو کچھ اختیارات عطا کرنا بھی انہیں اب کچھ ایسا ناگوارِ خاطر نہیں تھا۔ بشرطیکہ ان مالی امور میں ایوانِ صدر کے اخراجات کو شامل نہ کیا جائے۔ جو آئین کے نفاذ سے کچھ ہی عرصہ قبل کئی گنا بڑھا دیئے گئے تھے۔ (اس کے برعکس بھارتی صدر نے اپنے مشاہرے میں کمی کے علاوہ ایوانِ صدر کے اخراجات کو ناقابلِ تصور حد تک کم کیا تھا۔)

معاشرتی تہذیب کی طرف اس سفر میں صدر بنیادی حقوق کو عدالتوں کے اختیارِ سماعت میں شامل کرنے پر بھی تیار ہو چکے تھے۔ صدر کا خیال تھا کہ ایسا کرنے سے آئین میں انقلابی تبدیلی آ جائے گی اور جمہوریت کے بڑھتے ہوئے مطالبے کو بھی مطمئن کیا جا سکے گا۔ نیز اس سے ان کے جمہوریت نواز ہونے پر گویا ایک اور مہر ثبت ہو جائے گی حالانکہ ماضی میں خود صدر نے اور ان کے قانون دان وزیر خارجہ منظور قادر نے بار بار کہا تھا کہ وکلاء عدلیہ کے جج صاحبان کو گمراہ کر سکتے ہیں۔ لہٰذا عدلیہ کو یہ جائزہ لینے کا اختیار نہیں دیا جا سکتا کہ قانون ساز اداروں کے کسی اقدام سے بنیادی حقوق کی خلاف ورزی ہوئی ہے یا نہیں۔ فی الحقیقت جب اس قانون کا مسوّدہ شائع کیا گیا تو معلوم ہوا کہ بنیادی حقوق کو ایسے قوانین اور صدارتی احکامات کے تابع کر دیا گیا تھا جو بذاتِ خود بنیادی حقوق کے منافی تھے۔ اپوزیشن نے اس دامِ تزویر میں آنے سے انکار کر دیا۔ آئین میں ترمیم کے لئے دو تہائی اکثریت کی تائید ضروری تھی للٰذا یہ مسودہ قانون منظور نہ ہو سکا۔ حسبِ توقع صدر نے اس تعطل پر حزبِ اختلاف کو موردِ الزام ٹھہرایا۔ جب صدر کو احساس تھا کہ ان کے مضبوط دمدمے ایک ایک کر کے ہاتھ سے نکل رہے تھے تو کیا یہ مناسب تجویز نہ تھی کہ وہ غصب کردہ آمرانہ اختیارات عوام کو واپس لوٹا کر پارلیمانی نظام تشکیل دیں اور خود ملک کا آئینی سربراہ بننے کو ترجیح دیں؟ دوسرے لفظوں میں 1956ء کے آئین کی طرف مراجعت کریں؟ ملک کو درپیش حالات کا یہی منطقی حل تھا۔

ایک اور متبادل راستہ یہ تھا کہ جلد از جلد حقِ بالغ رائے دہی کی بنیاد پر قانون ساز اداروں کے لئے از سرِ نو انتخابات منعقد کروائے جائیں۔ اس طرح معرضِ وجود میں آنے والی مرکزی مقننہ کو آئین کو جمہوری تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کی ذمہ داری سونپی جا سکتی تھی۔ آئین میں ترمیم کر کے مقننہ کو اکثریتِ رائے سے آئین میں ترمیم کا اختیار دینے سے حالات میں سدھار پیدا ہو سکتا تھا۔ یہ امر خاصا قرین قیاس تھا کہ اگر

انتخابات آزادانہ اور منصفانہ نہ ہوئے اور صدر کی جماعت کے لئے حکومت کے تمام تر وسائل استعمال کئے گئے تو بھی آئین میں جمہوری ترامیم کے لئے ایوان میں مطلوبہ دو تہائی اکثریت حاصل ہو جائے گی۔ (صدر نے حکومت کے غیر فوجی اور فوجی وسائل کو جس طرح اپنے مقاصد کے لئے استعمال کیا تھا اس کے بعد کسی کو انتخابات کے منصفانہ اور آزادانہ ہونے کا یقین نہیں رہا تھا) چنانچہ صدر بنیادی جمہوریت کے ارکان کی بجائے حقِ بالغ رائے دہی کی بنا پر مجالسِ قانون ساز کے انتخابات منعقد کروانے سے خائف تھے۔

ایک اور امکان یہ تھا کہ گول میز کانفرنس کے ذریعے رائے عامہ کے رہنما کسی آئین پر متفق ہو جائیں۔ صدر کو اصرار تھا کہ صدارتی نظام کے تحت بھی جمہوریت قائم کی جا سکتی ہے۔ مشرقی پاکستان کے "نور رہنماؤں" نے پارلیمانی طرزِ حکومت کی طرف میلان ظاہر کیا۔ لیکن وہ متبادل تجاویز پر غور کرنے کے لئے تیار تھے۔ میرا ذاتی نقطۂ نظر یہ تھا کہ پارلیمانی نظام اور صدارتی نظام کے ملغوبے کی پیچیدگی عوام کی سمجھ سے بالا ہوگی۔ صدارتی نظام کے تحت جمہوریت کے قیام کے لئے کئی آئینی اداروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ جنہیں مخصوص اختیارات حاصل ہوتے ہیں اور پاکستانی عوام ان روایات سے نا آشنا تھے۔ مزید بر آں 1962ء کے آئین کو صدارتی طرزِ حکومت کا نام دینا اس اصطلاح سے زیادتی کے مترادف تھا۔ در حقیقت یہ آئین ایک مطلق العنان صدر کا تودۂ آمریت تھا۔ پاکستان کے عوام برطانوی طرز کے سادہ پارلیمانی نظام سے مانوس ہیں اور مارشل لاء کے نفاذ تک اس طرزِ حکومت کو غیر متنازعہ سمجھا جاتا تھا۔ تاہم اگر صدر کو مختلف طرز ہائے حکومت کے کسی امتزاج کے امکانات آزمانا مقصود تھے تو بھی اس کے لئے گول میز کانفرنس کے ذریعے رائے عامہ کے رہنماؤں کی مشاورت ضروری تھی۔

بایں ہمہ یہ تو ذرائع اور طریقوں کی بحث ہے۔ اصل مفروضہ یہ تھا کہ ملک کو ایک جمہوری آئین کی ضرورت ہے اور اس مقصد کے حصول کی خاطر مختلف جماعتوں کو مشترکہ طور پر جدوجہد کرنی چاہئے اگرچہ ان جماعتوں میں کچھ کا احیاء ہو چکا تھا اور کچھ نے اپنا احیاء نہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ ان جماعتوں کے کارکنوں کی وفاداری بھی متزلزل نہیں ہوئی تھی۔ ہر جماعت کا اپنا منشور تھا جو بنیادی تصورات' ترجیحات' مفروضات اور نظریے کے اعتبار سے دوسری جماعتوں سے مختلف ہو سکتا تھا لیکن یہ تمام جماعتیں ایک جمہوری آئین کے لئے مل کر جدوجہد کرنے پر آمادہ تھیں۔

اس حقیقت سے قطعِ نظر کہ تمام سیاسی جماعتوں کے تمام مطالبات کو پورا کرنا عملی طور پر ممکن نہیں تھا' سیاسی نظام کے نام پر آمریت کو قائم رکھنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ چنانچہ ہمارے مطالبات کو ایک نکتے میں سمویا جا سکتا تھا۔ یعنی جمہوریت کی بحالی آئین کو جمہوری شکل دینے کا مطالبہ بھی اسی نکتے کو ایک دوسرے انداز سے بیان کرنے کے مترادف تھا۔ آئین کو جمہوری رنگ و روپ بخشنے سے آئین کے وجود کا ایک حقیقت پسندانہ جواز مل سکتا تھا۔ نیز نظری طور پر ہی سہی اس میں ترامیم کی گنجائش نکل سکتی تھی۔

جماعتی مفادات کی بالادستی

مغربی پاکستان میں میری مشکلات کا آغاز ہو چکا تھا۔ میں نے سندھ، بلوچستان، شمال مغربی سرحدی صوبے کے رہنماؤں کے متعدد نمائندہ اجتماعات میں شرکت کی۔ وہاں پر مجھ سے مسلسل مطالبہ کیا گیا کہ میں اپنی تحریک میں وحدتِ مغربی پاکستان کی تنسیخ کا مطالبہ بھی شامل کروں۔ (میں نے تحریکِ بحالیٔ جمہوریت کو این ڈی ایف یا قومی جمہوری محاذ کا نام دیا تھا۔) بصورتِ دیگر ان رہنماؤں کا کہنا تھا کہ اگر پنجابی بالادستی کے خاتمے کی صورت نظر نہ آئے تو انہیں جمہوریت کے قیام سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ مجھے ان رہنماؤں کو اس مطالبے کو ترک کرنے پر آمادہ کرنے میں ازحد دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ بالآخر جب میں نے تحریک سے لاتعلق ہونے کی دھمکی دی تو مجھے کچھ کامیابی حاصل ہوئی۔ میرا کہنا تھا کہ سیاسی لحاظ سے وحدتِ مغربی پاکستان کی تنسیخ کا مطالبہ کرنا بےحد غیر دانشمندانہ اقدام ہوگا کیونکہ حکومت کو یہ کہنے کا موقع مل جائے گا کہ این ڈی ایف پاکستان کے حصے بخرے کرنے کے درپے ہے۔ اور ملک دشمن عناصر پر مشتمل ہے، اس الزام کا جواب دینے میں ہماری بہت سی توانائی ضائع ہوگی۔ علاوہ ازیں اس سے ہر جماعت کو تحریک ہوگی کہ اپنے جماعتی پروگرام کی قبولیت کو این ڈی ایف میں شمولیت کی پیشگی شرط ٹھہرائے۔ اس سے سیاسی افراتفری میں اضافہ ہوگا۔ مشرقی پاکستان کو بھی بہت سی شکایات ہیں لہٰذا وہاں کے عوام اصرار کریں گے کہ ان کی شکایات کے ازالے کو این ڈی ایف کے پروگرام کا حصہ بنایا جائے۔ چنانچہ جمہوریت کے لئے متحدہ محاذ تشکیل دینے کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکے گا۔ بنیادی طور پر ہمیں پاکستان کے تمام حصوں اور قومیتوں سے انصاف کے لئے پاکستان کے عوام اور ان کے نمائندوں کی مشترکہ فہم اور دیانتداری پر بھروسہ کرنا چاہیے۔ ہمارے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ ان مشکلات کے جمہوری حل کو ایک جمہوری نظام کے قیام تک مؤخر کر دیں۔

مشرقی پاکستان میں نیپ مشکلات پیدا کر رہی تھی۔ یہ جماعت اپنے ذاتی پرچار کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی تھی۔ اگرچہ نیپ نے دیگر جماعتوں کے ساتھ اپنا احیاء نہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا تاہم جماعت اپنے علیحدہ اجلاس منعقد کرتی رہی اور کارکنوں کو منظم کرنے کا کام جاری رہا۔ نیپ کے مختلف گروہوں میں سے ایک بڑے گروہ کی قیادت حاجی دنیش (دیناج پور) اور محی الدین (بریسال) کے ہاتھ میں تھی۔ اس گروہ میں کئی کمیونسٹ شامل تھے جن کے بارے میں یقین سے کہا جاتا تھا کہ وہ زیرزمین کمیونسٹوں سے رابطہ رکھتے ہیں۔ اس گروہ نے مجھے اپنے تعاون کے عوض ایک سولہ نکاتی پروگرام قبول کرنے کے لئے کہا۔ میں نے ان کے سامنے اپنا نقطہ نگاہ پیش کرنے کی ہر ممکن کوشش کی مگر ان کی تاریں تو کسی اور مقام سے ہلائی جا رہی تھیں۔ ان لوگوں کو اپنے نمائندے اور سیکرٹری محمود علی کی ٹانگ کھینچنے میں بھی عار نہیں تھا۔ محمود علی این ڈی ایف سے تعاون کر رہے تھے۔ بالآخر کوئی چارہ نہ پا کر یہ لوگ وقتی طور پر این ڈی ایف سے تعاون پر آمادہ ہو گئے۔ لیکن ذہنی طور پر اپنی جماعت کے انفرادی مفادات کو آگے بڑھانے کے لئے موقع کی تلاش میں رہے، ان کے اس رویے کے باعث اکثر عوامی لیگ کے کارکنوں سے ان کے تصادم کی نوبت آ جاتی۔ عوامی لیگ اپنے خرچ پر جلسوں کا اہتمام کرتے مگر عین موقع پر نیپ کے

کارکن جارحانہ طریقے سے مائیکروفون پر قبضہ کر کے نیپ کے جماعتی نعرے بلند کرنے لگتے۔ تاہم اس صورتِ حال سے مشرقی پاکستان کے عوام کے جوش وجذبے اور یک نکاتی پروگرام سے ان کی وابستگی پر کوئی اثر نہ پڑا۔ تاہم اس سے مستقبل میں این ڈی ایف کی صفوں میں انتشار کے امکانات پیدا ہو گئے۔ محمود علی کے لئے اپنی جماعت کے کارکنوں پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا۔

میں نے جمہوری آئین کے لئے اپنی جدوجہد کے لازمی جزو کے طور کہنا شروع کیا کہ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کو ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کر کے اس تحریک کو آگے بڑھانا چاہئے ورنہ آئنی طریقوں سے اس مقصد کا حصول مشکل ہو جائے گا۔ جمہوریت کے بغیر قومی اتحاد، قومی یک جہتی، مشترکہ مقاصد اور قومی شعور جیسے جذبات کا پیدا ہونا دشوار تھا بلکہ ملک کے ایک حصے کو دوسرے حصے کی مستقل افادیت کا احساس بھی پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ جمہوریت کے لئے جدوجہد دونوں حصوں میں یک جہتی اور ہم آہنگی کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ ملک کے دونوں حصوں میں عوام آمریت کے خاتمے کے خواہش مند ہیں۔

علیحدگی ناگزیر

میرے منظرِ عام پر آنے سے پہلے یہ تاثر زور پکڑ رہا تھا کہ ملک کے دونوں حصوں میں علیحدگی ناگزیر ہو چکی تھی، 2 ستمبر 1962ء کو صدر نے ڈھاکہ میں صحافیوں سے بات چیت کرتے ہوئے کہا کہ اگر مشرقی پاکستان علیحدگی چاہتا ہے تو اسے ایسا کرنے کا حق حاصل ہے تاہم وہ مشرقی پاکستان کو مشورہ دیں گے کہ وہ ایسا نہ کرے کیونکہ بھارت مشرقی پاکستان کو ہڑپ کر لے گا۔ میرے نقطۂ نگاہ اور کوششوں سے یہ تحریک ختم ہو گئی اور قومی یک جہتی کی فضا فروغ پانے لگی تاہم میری مہم کا ایک ضمنی نتیجہ یہ نکلا کہ مشرقی پاکستان پر صدر ایوب کی گرفت اور بھی مضبوط ہو گئی۔ مغربی پاکستان کے ہاتھوں مشرقی پاکستان کے استحصال، غفلت، امتیازی سلوک اور مغربی پاکستان کی فوجی بالادستی سمیت انگنت اسباب کی بنا پر مشرقی پاکستان میں نفرت اور تلخی کے جو جذبات پیدا ہو رہے تھے میں نے انہیں ختم کرنے میں یقیناً خاصی کامیابی حاصل کی۔ اس سے ان لوگوں کو خاصی مایوسی ہوئی جو سمجھتے تھے کہ ناگزیر علیحدگی کا وقت آ رہا ہے اور مشرقی پاکستان کی تمام مشکلات دور ہو جائیں گی۔ بایں ہمہ میرا خیال تھا کہ اس علیحدگی کی بنیاد نفرت اور دشمنی کی بنیاد پر رکھی جائے گی اور اس سے انجام کار تباہی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔

صدر ایوب کے نام معروضات

این ڈی ایف کی تحریک اور پرچار کو واضح شکل دینے اور اس کے تسلسل کو یقینی بنانے کا مسئلہ درپیش تھا۔ اس تحریک کو اس وقت تک تنظیم کا نام نہیں دیا جا سکتا تھا۔ مشرقی پاکستان میں جب میں نے صوبے کا دورہ کیا تو عام جماعتوں کے نمائندوں اور ترجمانوں نے ایک ہی پلیٹ فارم پر جمع ہو کر جمہوری آئین کا مطالبہ کیا۔ میں نے عوام کے تمام طبقات سے ملنے والے حوصلہ افزا ردِ عمل کو عوام کے دلوں میں روشن امید کی جوت پر محمول کیا اور خیال ظاہر کیا کہ مختلف جماعتوں اور رہنماؤں میں اتحاد و یگانگت کا جو جذبہ موجود

رہے۔ اس کی موجودگی میں مقاصد کا حصول دشوار نہیں ہو گا۔ عوام کو امید تھی کہ مشرقی پاکستان کی مشکلات ' اس کی غربت ' افلاس ' فاقہ کشی اور گرسنگی کا خاتمہ ہونے والا تھا۔ بوڑھوں اور نوجوانوں کو میلوں کا سفر پاپیادہ طے کر کے میری ایک جھلک دیکھنے کیلیے جمع ہوتے دیکھنا ایک دل گرفتہ ' جذباتی مگر حوصلہ افزا منظر ہوتا تھا۔ ان لوگوں کو امید تھی کہ میں امید اور آزادی کا کوئی پیغام دوں گا۔ شاید ملک کو درپیش مصائب کے حل کے لئے کوئی امرت دھارا میرے پاس ہو۔ میری تقاریر میں صدر ایوب کے نام اپیلوں ' درخواستوں ' گزارشات اور معروضات کی تعداد بڑھتی گئی۔ میں نے صدر سے التجائیں کیں کہ دھمکیاں دینے اور غیر آئینی اقدامات کا ہوّا کھڑا کرنے کی بجائے عوام کے مطالبات پر مثبت ردِ عمل کا اظہار کریں۔ آخر عوام بڑھتی ہوئی مایوسی کی تیرگی میں کب تک جی سکتے ہیں۔ جبکہ ان کے مطالبات بنیادی نوعیت کے حامل ہوں ' ان کے مصائب ٹھوس ہوں ' ان کے آلام جاں گداز ہوں اور ان کی معروضات بنجر صحراؤں میں گونج کر دم توڑ دیں ' ان کی گزارشات کے بیجوں کو تنگ دلی اور ہوسِ اقتدار کے بانجھ بادلوں سے رحم اور التفات کی بارش کے چند قطرے بھی میسّر نہ آئیں۔

آئینی تحریکوں کو بار آور ہونے کے لئے ایک طویل عرصہ درکار ہوتا ہے۔ مفاد پرست اور بے ضمیر حکمرانوں کے مقابلے میں تو بعض اوقات آئینی جدوجہد کی کونپلیں مرجھا کر رہ جاتی ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ طویل جمود اور مایوسی کے تسلسل کے باعث جمہوری تحریکیں ناکام ہو جاتی ہیں، غیر آئینی انقلابی تحریکیں یا تو ناکام ہو جاتی ہیں یا کامیابی سے ہمکنار ہوتی ہیں۔ ناامیدانہ زیست کرنے کا تصور ایسی تحریکوں میں نہیں پایا جاتا۔ مشرقی پاکستان یہ سوچ رہا تھا کہ میں نے انتہا پسندی کی طرف لیجانے والی تلخیوں اور نفرتوں کی آگ بجھا کے تحریک کو جو آئینی رنگ دیا تھا کیا اس سے جدوجہد غیر موثر ہو کر ناکامی کی طرف بڑھ رہی تھی؟

اتحاد برقرار رکھنے کی آخری کوشش

میں نے پاکستان میں قیام کے آخری دنوں میں مشرقی پاکستان کی سطح پر ایک کمیٹی قائم کی جس میں مسلم لیگ ' عوامی لیگ ' نیپ اور کرشک سرامک پارٹی میں سے ہر جماعت کے دو نمائندے اور نظامِ اسلام پارٹی کا ایک نمائندہ شامل کیا گیا۔ اس کمیٹی کے ذمے تمام اضلاع اور تحصیلوں میں این ڈی ایف کی شاخوں کے طور پر کمیٹیوں کی تشکیل اور بحالیٔ جمہوریت کے مطالبے کو زندہ رکھنے کا کام سونپا گیا۔ میں نے اس کمیٹی میں مسلم لیگ (کونسل) کا کوئی نمائندہ نامزد کرنے سے اجتناب کیا اور خود کو ان گروہوں تک محدود رکھا جنھوں نے اپنی جماعت کا احیاء کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اسی طرح جماعتِ اسلامی کا بھی کوئی نمائندہ اس کمیٹی میں شامل نہیں کیا گیا۔ مجھے اس کمیٹی کی کارکردگی کے بارے میں کوئی علم نہیں۔

نور الامین نے مسلم لیگیوں کو صبر سے کام لینے کی تلقین کرنے کی بجائے کونسل مسلم لیگ کی تنظیم کاری کی اجازت دے کر متحدہ محاذ کی تشکیل کے امکانات کو نقصان پہنچایا ہے۔ کیونکہ خواجہ ناظم الدین بظاہر جمہوریت کی بحالی کے لیے کیسے ہی اضطراب کا مظاہرہ کریں، ان کی اصل خواہش یہ ہے کہ کونسل

مسلم لیگ کے نام سے تشکیل کردہ پیکر خیالی عام انتخابات میں بھرپور اکثریت حاصل کرلے گی خواہ یہ انتخابات بنیادی جمہوریت کے ارکان کو حلقہ رائے دہندگان قرار دیکر ہی کیوں نہ منعقد کروائے جائیں۔ ارکانِ اسمبلی کے کابینہ میں لیے جانے سے خالی ہونے والی نشستوں پر ضمنی انتخابات کے بارے میں شیخی بگھارتے ہوئے خواجہ ناظم الدین نے بنیادی جمہوریت کے ارکان کی ہیئتِ ترکیبی اور ملک پر مسلّط آمر کے وسائل واختیارات کو بالکل فراموش کر دیا اور دعویٰ کیا کہ وہ ضمنی انتخاب میں تمام نشستیں جیت لیں گے۔ حالانکہ اگر تمام جماعتیں مل کر صدر کی جماعت کنونشن مسلم لیگ کے مقابلے میں موزوں ترین امیدوار نامزد کریں تو بھی ان کی کامیابی کے امکانات زیادہ روشن نہیں بلکہ کہنا چاہیے کہ حزبِ اختلاف کے اِمیدواروں کی کامیابی کا کوئی امکان نہیں۔ صدر اور حکومت کے وسائل کا تو خیر مقابلہ ہی نہیں کیا جاسکتا تاہم انتخابات کے لئے کچھ نہ کچھ مالی وسائل تو درکار ہوں گے۔ علاوہ ازیں نیپ اور عوامی لیگ کے باہمی اختلافات اپنی جگہ ہیں اور بھاشانی کی سرگرمیاں بھی ان اختلافات کو ہوا دیں گی۔

عوامی لیگ کی صفوں میں بے چینی بڑھ رہی ہے۔ عوامی لیگ کو کنونشن مسلم لیگ کے بارے میں زیادہ پریشانی نہیں لیکن اسے فکر ہے کہ کونسل مسلم لیگ نورالامین کے پیرو کاروں کو گمراہ کر رہی ہے۔ ادھر نیپ اپنے علیحدہ اجلاس منعقد کرتی رہتی ہے اور سیاسی جماعتوں کا احیاء نہ کرنے کی حکمتِ عملی پر کاربند ہونے کا ڈھونگ رچانے کے باوجود اندرونِ خانہ اپنی تنظیم کاری میں مصروف ہے۔ کرشک سرامک پارٹی کے سیاسی عزائم ختم ہو چکے ہیں۔ لیکن حمید الحق چوہدری اس جماعت کے نام کو اپنے ذاتی مفادات کے لئے استعمال کرنے کا موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیں گے۔ خطرہ ہے کہ طویل عرصے تک غیر متحرک رہنے اور میری مسلّط کردہ معتدل حکمتِ عملی کے باعث عوامی لیگ کی مقبولیت میں کمی واقع ہو جائے گی۔ خاص طور پر مجیب الرحمٰن بہت جز بز ہو رہے ہیں وہ پاکستان میں جمہوریت کی بحالی کو واحد مقصد کے طور پر قبول کرنے کے لئے تیاّر ہیں۔ انہیں یہ بھی احساس ہےکہ فی الحال میں ہی وہ واحد شخص ہوں جو مشرقی پاکستان میں عوام کو متحرک کرسکتا ہے اور انہیں قیادت فراہم کرسکتا ہے۔ لہٰذا میری قیادت میں سیاسی جدوجہد کرنا زیادہ قرینِ مصلحت ہو گا۔ لیکن انہیں اس ضمن میں خاصے شکوک و شبہات ہیں کہ قومی یک جہتی اور یگانگت کی مدد سے مشرقی پاکستان کے مسائل حل ہو سکیں گے۔ مجیب کو بیرونی سیاست میں زیادہ دلچسپی نہیں کیونکہ وہ کسی بیرونی قوت کو یہ اجازت دینے کے حق میں نہیں کہ وہ ہمارے داخلی معاملات میں زیادہ دلچسپی لے ان کا کہنا ہے کہ مشرقی پاکستان کو اپنی قسمت کا فیصلہ خود کرنا چاہیے۔ چنانچہ بیرونی ممالک کی سیاسی مداخلت کی راہ تکنا بے معنی ہو گا۔ تاہم انہیں اس ضمن میں خاصی فکر لاحق ہے کہ موقع پرست کونسل مسلم لیگ یا نیپ کے ہاتھوں عوامی لیگ کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ کونسل مسلم لیگ صرف اپنے جتھے کو قومی اسمبلی تک پہنچانے کی فکر میں ہے دوسری طرف نیپ نے بائیں بازو کی طرف میلان رکھنے کے علاوہ کمیونسٹوں سے روابط بھی قائم کر رکھے تھے۔ مزید برآں نیپ معاشرے کے متلون عناصر کی تائید پر انحصار کئے ہوئے تھی۔ میری عدم موجودگی کے باعث شیخ مجیب الرحمٰن کوئی قدم اٹھانے سے قاصر ہیں اور

جماعت کو مایوسی کے ہاتھوں ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہونے سے بچا کر متحد رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ شیخ مجیب چاہتے ہیں کہ عوامی لیگ کے احیاء کا اعلان کر کے اسے از سرِ نو منظم کیا جائے۔ تاکہ نوجوان نسل کو کمیونزم کی آغوش میں جانے سے بچایا جا سکے۔ دوسری جماعتیں بھی دورانِ خانہ یا کھلے بندوں یہی کر رہی ہیں۔ شیخ مجیب کا خیال ہے کہ ہم بیش قیمت وقت اور موقعہ ضائع کر رہے ہیں۔

عوامی لیگ اور کرشک سرامک پارٹی (حتیٰ کہ مسلم لیگ بھی اس صف میں شامل ہے) کے کچھ ارکان کا خیال ہے کہ نئے تقاضوں پر پورا اترنے کے لئے ایک نئی جمہوری جماعت قائم کی جانی چاہئے جس کا نام قومی جمہوری پارٹی ہو۔ ایسی جماعت کو منظم سیاسی جماعتوں کی طرح ایک باقاعدہ منشور کی ضرورت ہوگی اور اسے بحالیٔ جمہوریت نکاتی پروگرام کے تحت نہیں چلایا جا سکے گا۔ ــــــــــــ اس جماعت کا مقصد ایک ایسی فلاحی اور سیکولر مملکت کا قیام ہو جس میں مختلف علاقوں اور قومیتوں کو ثقافتی اور صوبائی خود مختاری کی ضمانت دی جا سکے۔ بایں ہمہ ایسی جماعت میں منشور اور قیادت پر اختلافات کا ظہور لازمی امر ہو گا۔ جس پر قابو پانے کے لئے طویل غور و فکر اور قربانیوں کی ضرورت ہوگی۔

مغربی پاکستان یا مشرقی پاکستان میں جماعتِ اسلامی، نظامِ اسلام پارٹی اور مسلم لیگ کے نئی جماعت میں شامل ہونے کا کوئی امکان نہیں ہو گا۔ اس کے بعد مشرقی پاکستان میں مسلم لیگ کا غیر متحرک دھڑا، کرشک سرامک پارٹی، نیپ اور عوامی لیگ باقی رہ جاتی ہیں۔ کسی خاص مقصد کے حصول کی غرض سے تعاون کے لئے متحدہ محاذ کو ایک کم از کم اشتراکِ فکر کی بنا پر چلایا جا سکتا ہے لیکن اس جماعت کے لئے ایسے وسیع منشور کی ضرورت ہوگی جو اس کے تمام اجزائے ترکیبی کو بیک وقت مطمئن کر سکے۔ اس کے علاوہ ایک قابلِ قبول قائد اور دیگر عہدے داروں کے انتخاب کا مرحلہ درپیش ہو گا۔ اگر عوامی لیگ نے فہم و فراست، تعاون اور ایثار کا مظاہرہ کیا تو نئی جماعت کے لئے مسلم لیگ کے غیر متحرک دھڑے اور کرشک سرامک پارٹی کا تعاون حاصل کرنا دشوار نہیں ہو گا۔ اولذکر گروہ اپنی سیاسی ساکھ خاصی حد تک گنوا چکا ہے اور فضل الحق کی موت کے بعد کرشک سرامک پارٹی کا بھی کچھ ٹھکانہ نہیں رہا (البتہ حمید الحق چوہدری کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا) بایں ہمہ نیپ کی خارجہ پالیسی قبول کئے بغیر اس جماعت سے تعاون کی امید رکھنا عبث ہو گا۔ اور فی الوقت ایسا کرنا پاکستان کے مفاد میں نہیں ہو گا۔

نیپ کی خارجہ پالیسی قبول کرنا ایوب کی دلی خواہش پوری کرنے کے مترادف ہو گا تاکہ وہ خم ٹھونک کر خود کو مغربی دنیا کے مفادات کا محافظ قرار دے سکیں اور اعلان کریں کہ احمق، گھامڑ اور جذباتی عوام پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ مغربی طاقتوں کو جمہوریت کی بحالی پر اصرار کرنے کی بجائے ملک کے مستحکم اور ہوش مند قائد ایوب کے اقتدار پر بھروسہ رکھنا چاہئے کیونکہ ملک کا کوئی رہنما تدبّر اور فراست میں ایوب کا متبادل نہیں بن سکتا۔ یہ بات تو سب کے علم میں ہے کہ ایوب اپنے سرکاری اور غیر سرکاری گماشتوں کے ذریعے عوام کو سیٹو اور سینٹو سے علیحدگی کا مطالبہ کرنے پر اکساتے تھے۔ (حالانکہ ایک پر معنی علامت کے سوا ملک کے دونوں حصوں میں اس مطالبے کی کوئی اہمیت نہیں) اور خود ساختہ مظاہروں کے بعد صدر

ایوان میں کھڑے ہو کر اس مطالبے کی مذمت کرتے تھے۔ تاریخِ عالم میں شاید کسی مقتدر شخص کی طرف سے اپنے ذاتی مفادات کی خاطر اپنے ہی عوام کو عالمی حلقوں میں ڈھٹائی سے رسوا کرنے کی اس سے بدترین سازش کی کوئی مثال نہ مل سکے۔

بھاشانی صدر ایوب کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہیں مجوزہ نئی جماعت کی قیادت پر بھاشانی صاحب کا بھی دعویٰ ہو گا کم از کم مجھے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ ماضی میں بھاشانی کے رویّے کے پیشِ نظر عوامی لیگ انہیں کس طرح قبول کر سکے گی۔ اسی طرح یہ سمجھنے سے بھی میری عقل قاصر ہے کہ مسلم لیگ کا غیر متحرک دھڑا کس طرح بھاشانی یا مجیب الرحمٰن کی قیادت تسلیم کر سکے گا یا پھر بھاشانی صاحب کس طور نور الامین، حمید الحق چوہدری یا مجیب الرحمٰن کی پیشوائی قبول کر سکیں گے۔

مغربی پاکستان میں ہمیں عوامی لیگ، نیپ، ری پبلکن پارٹی اور مسلم لیگ کے دونوں دھڑوں سے بیزار کچھ مسلم لیگی ارکان کی حمایت کی توقع ہو سکتی ہے۔ امکان ہے کہ مغربی پاکستان میں نیپ اور بائیں بازو کے عناصر اس جماعت پر چھا جائیں گے۔ اگر یہ لوگ پارٹی کی قیادت پر قبضہ کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے تو بھی انہیں قیادت پر خاصا اثر حاصل ہو گا۔ ہمیں یہ امر نظر انداز نہیں کرنا چاہئے کہ سندھ، بلوچستان، شمال مغربی سرحدی صوبے اور کراچی میں وحدتِ مغربی پاکستان کے خلاف شدید جذبات پائے جاتے ہیں۔ اس حقیقت سے نیپ کی قوت میں اضافہ ہوتا ہے اور مغربی پاکستان میں مجوزہ پارٹی کی قیادت نیپ کے ہاتھ آنے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ صرف پنجاب کے مرکزی علاقے میں ون یونٹ کے خلاف بات کرنا کفر کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔ تاہم محمود علی قصوری نے ہر موڑ پر حکومت کی مخالفت کرنے میں جس جرأت مندی سے کام لیا ہے اس سے یقیناً پنجاب میں نیپ کی مخالفت کم کرنے میں مدد ملی ہو گی۔ نیپ کی گنجائش پیدا کرنے کے لئے پارٹی کے منشور کو بائیں بازو کے رنگ میں ڈھالا جائے گا۔ اسی طرح خارجہ پالیسی کے بیان میں بھی تنوّع سے کام لیا جائے گا بھاشانی کے قیادت سنبھالنے کی صورت میں ری پبلکن پارٹی مجوّزہ جماعت میں شریک نہیں ہو گی اسی طرح کچھ ایسے مسلم لیگی اور آزاد ارکان بھی مجوّزہ جماعت میں شمولیت سے گریز کریں گے۔ ــــــــــــــ جو میری موجودگی میں یقیناً ہم سے تعاون کرتے اس بحث کا حاصل یہ ہے کہ این ڈی ایف کو کامیابی سے ہمکنار ہونے کے لئے نیپ کے بغیر ہی کام چلانا ہو گا۔ یہ فیصلہ افسوسناک سہی مگر بھاشانی کے دوہرے پن، صدر ایوب سے ان کے گٹھ جوڑ نیز زیر زمین عناصر سے ان کے ارتباط کے باعث کوئی اور چارہ باقی نہیں رہا۔

ذاتی طور پر میرا خیال ہے کہ ابھی کسی نئی جماعت کی تشکیل یا کسی نئی حکمتِ عملی کے اختیار کرنے کا وقت نہیں آیا اور اس کے لئے کوئی عجلت بھی نہیں ہے۔ اس امر میں اختلافِ رائے کی خاصی گنجائش ہے کہ کونسل مسلم لیگ یا نیپ کا احیاء راتوں رات سیاسی افق پر تبدیلیاں پیدا کر دے گا البتہ یہ ضرور ہوا کہ اس اقدام سے سیاسی اتحاد کی فضا متاثر ہوئی ہے۔ اور اس سے بھی زیادہ یہ امر تشویش ناک ہے کہ ایک ایسے

وقت میں گروہی اختلافات اور مختلف انواع مقاصد نے سر اٹھایا ہے جب اتحادِ عمل وقت کی سب سے بڑی ضرورت تھا۔ عین ممکن ہے کہ اگر عوامی لیگ اپنا احیاء نہ کرے اور آئندہ مفادات کا خیال کئے بغیر مستقل مزاجی سے موجودہ ڈگر پر چلتی رہے تو جمہوری جدوجہد کی کامیابی عوامی لیگ کی کامیابی تصور ہو گی تب سیاسی جماعتوں کا احیاء نہ کرنے کی حکمتِ عملی پر گامزن جماعتوں کے ادغام سے جو نئی جماعت معرضِ وجود میں آئے گی اس میں عوامی لیگ کے قائدین اور کارکنوں کو ہراول دستے کی حیثیت حاصل ہو گی اور اسی جماعت کو عوام کا اعتماد نصیب ہو گا۔

مغربی پاکستان میں 'بحالیٔ جمہوریت کے لئے مشترکہ اعلامیہ لاہور پر دستخط کرنے والے رہنما زور دے رہے تھے کہ کنونشن کے انعقاد کے لئے اقدامات کئے جائیں۔ فی الوقت مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کا مشترکہ کنونشن عملی طور پر ممکن نظر نہیں آتا تھا۔ مشاورت کے بعد طے پایا کہ مغربی پاکستان کی تمام سیاسی قوتوں کے چار چار نمائندوں پر مشتمل کانفرنس قائم کی جائے' مجھے اختیار دیا گیا کہ کانفرنس کو ہر ممکن حد تک نمائندہ حیثیت بخشنے کے لئے میں اپنی صوابدید کے مطابق مزید نمائندے نامزد کر سکوں گا۔ اس کانفرنس کو مغربی پاکستان میں کنونشن کی تفاصیل مرتب کرنے کا فرض سونپا گیا۔ چنانچہ میں نے عوامی لیگ' جماعتِ اسلامی' مسلم لیگ (کونسل) نیپ اور ری پبلکن پارٹی کو دعوت نامے جاری کر دیئے۔ ری پبلکن پارٹی کے ارکان نے اپنے اجلاس میں فی الوقت ری پبلکن پارٹی کا احیاء نہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ سندھ اور بلوچستان کے نمائندوں کے علاوہ ایک قدر آور' بے لوث اور جرأت مند رہنما مولانا عبدالستار خاں نیازی کو بھی مدعو کیا گیا۔ پہلے میں نے اس کانفرنس کے لئے لاہور کا انتخاب کیا بعد ازاں اکثریت کی سہولت کے پیشِ نظر کانفرنس کو کراچی منتقل کر دیا۔ کانفرنس کے لئے 26 اور 27 جنوری 1963ء کی تواریخ طے پائیں۔ سیاسی جماعتوں کو صرف ایسے نمائندے نامزد کرنا تھے جن پر ایبڈو کی پابندیاں عائد نہ کی گئی ہوں یعنی جو سیاسی جماعتوں کے رکن بننے کی اہلیت رکھتے ہوں۔ ایبڈو زدہ سیاستدانوں مثلاً پنجاب سے دولتانہ' سندھ سے ایوب کھوڑو اور قاضی فضل اللہ پر مشتمل ایک مشاورتی گروپ تشکیل دے دیا گیا جسے این ڈی ایف کو رہنمائی مہیا کرنا تھی۔ میں اپنی صوابدید کے مطابق اس مشاورتی گروپ کی توسیع کا مجاز تھا۔ دعوت ناموں کے اجراء کے بعد 3 جنوری 1963ء کو مجھ پر عارضہ قلب کا حملہ ہوا اور مجھے جناح ہسپتال منتقل کر دیا گیا۔ 11 جنوری کو یہ بیماری باقاعدہ عارضہ قلب کی شکل اختیار کر گئی۔ معالجین نے میرے بات چیت کرنے' اخبارات کا مطالعہ کرنے' لوگوں سے ملاقات کرنے یا بیرونی دنیا میں رونما ہونے والے واقعات میں دلچسپی لینے پر پابندی عائد کر دی۔

سیاستدانوں کے لئے ایک اور زنجیر

صدر نے 6 جنوری 1963ء کو دو صدارتی حکم جاری کئے' پہلے صدارتی حکم کے ذریعے سیاسی

جماعتوں کی تعریف میں توسیع کر کے غیر منظم تحریکوں مثلاً این ڈی ایف کو بھی سیاسی جماعتوں میں شامل کر دیا گیا۔ تاکہ ایبڈو زدہ سیاستدان کسی تحریک میں بھی اپنا کردار ادا نہ کر سکیں۔ یوں انہیں سیاست میں حصہ لینے اور باہمی رابطے سے روکنے کے لئے ان کے پیروں میں ایک اور زنجیر ڈال دی گئی۔ دوسرے صدارتی حکم کے ذریعے صدر کو اختیار دیدیا گیا کہ وہ کسی درخواست کے بغیر اپنی صوابدید کے مطابق کسی ایبڈو زدہ سیاستدان پر عائد نااہلی کو منسوخ کر سکیں گے یعنی اس کی سزا واپس لے سکیں گے میں نے عارضۂ قلب کے ہاتھوں بے بس ہونے سے قبل ایک مختصر بیان کے ذریعے اس کھلی دھاندلی اور دھونس کے خلاف احتجاج کیا۔ دوسرے سیاستدانوں اور اخبارات نے بھی میری پیروی کی۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ پہلا صدارتی حکم قومی اسمبلی کے سامنے پیش کیا گیا اور اسمبلی نے اسے منظور کر لیا۔ حالانکہ اس کے ذریعے ایبڈو زدہ سیاستدانوں کے ایسے فعل پر ایک تازہ تعزیر نافذ کی گئی تھی جو ارتکابِ وقوعہ کے وقت جرم تصور نہیں ہوتا تھا۔ دوسرا صدارتی حکم واپس لے لیا گیا اور مطلوبہ معیاد کے اندر قومی اسمبلی کی تائید حاصل نہ ہونے کے باعث خود بخود غیر مؤثر ہو گیا کیونکہ قومی اسمبلی بھی اس ننگی بدعنوانی کی تائید کرنے سے قاصر تھی۔ اس صدارتی حکم کا واپس لئے جانا واضح طور پر حکومت کی ہزیمت کے مترادف تھا لیکن اس کے لئے یہ جواز پیش کیا گیا کہ صدر کو پہلے ہی ہر طرح کی سزائیں معاف کرنے کا اختیار حاصل ہے لہٰذا یہ صدارتی حکم غیر ضروری تھا۔ ایک عرصے تک یہ امر موضوعِ بحث رہا کہ آیا خان عبدالقیوم خاں نے معافی کے لئے درخواست کی تھی یا نہیں۔ انہوں نے سزا کی منسوخی کے لئے درخواست میں یہ جواز پیش کیا تھا کہ ایبڈو کے تحت ان پر جن الزامات کے بارے میں مقدمہ چلایا گیا۔ قبل ازیں گورنر جنرل غلام محمد بھی پوڈو کے تحت ان کے خلاف انہیں الزامات کی بنا پر مقدمہ چلا چکے تھے اور انہیں بے گناہ قرار دیا گیا تھا۔ چنانچہ ایبڈو کے تحت ان کے خلاف کارروائی بلاجواز اور غیر قانونی تھی۔ یہ افواہ بھی خاصی گرم تھی کہ صدر خان عبدالقیوم خان کی سزا معاف کر کے انہیں مسلم لیگ (کنونشن) کا سربراہ بنانا چاہتے تھے، ایسی افواہوں سے خان عبدالقیوم خان کی رہی سہی ساکھ بھی تباہ ہو گئی۔ حکومت نے اعلان کیا کہ 21 افراد نے سزا کی معافی کے لئے درخواست دی ہے تاہم انکے نام صیغۂ راز میں رکھے گئے۔ اس صورتِ حال سے ایسا تعفن پیدا ہوا کہ حکومت صدارتی حکم کو توثیق کے لئے قومی اسمبلی کے سامنے پیش کرنے کی ہمت نہ کر سکی اور یہ حکم غیر موثر ہو گیا۔ صدر کسی سیاستدان کی سزا معاف کر کے اسے اپنے سایۂ عاطفت میں لینے کی جرأت نہ کر سکے۔

پہلے صدارتی حکم کے نتیجے میں وہ سیاستدان جنہیں 26 اور 27 جنوری 1963ء کو این ڈی ایف کی کانفرنس میں شریک ہو کر کنونشن کے انعقاد کے لئے اقدامات کی تفصیل طے کرنا تھی، اس اجلاس میں شرکت سے قاصر رہے۔ یہ اجلاس لکھم ہاؤس کراچی میں منعقد ہوا۔[32] اجلاس کے آغاز ہی میں اختلافات نے سر اٹھا لیا۔ میں نے دولتانہ کے ساتھ طے پانے والے انتظام کے مطابق مغربی پاکستان میں کونسل مسلم لیگ کو این ڈی ایف کانفرنس میں مدعو کیا تھا لیکن مشرقی پاکستان کمیٹی میں کونسل مسلم لیگ

کو شامل نہیں کیا گیا تھا کیونکہ وہاں پر این ڈی ایف کونسل مسلم لیگ کے ان ارکان سے تعاون کر رہی تھی جنھوں نے کونسل مسلم لیگ کا احیاء نہ کرنے کی تجویز پر صاد کیا تھا۔ اس پر خواجہ ناظم الدین نے اعتراض کرتے ہوئے اپنے جنرل سیکرٹری اور این ڈی ایف کانفرنس کے رکن سردار بہادر خاں کو ہدایات بھیجیں کہ کانفرنس میں شرکت نہ کی جائے۔ میاں دولتانہ این ڈی ایف سے تعاون کا عہد کر چکے تھے۔ انہوں نے اسے اپنے وقار کا مسئلہ سمجھتے ہوئے سردار بہادر خاں کو کانفرنس میں شرکت پر قائل کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ اس دوران میں انہیں کونسل مسلم لیگ سے علیحدگی کی دھمکی بھی دینا پڑی۔ بالآخر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے' خواجہ ناظم الدین کی حرکت کا نتیجہ یہ نکلا کہ کانفرنس عملی طور پر "مستقبل میں مشترکہ جدوجہد کے امکانات کا جائزہ لینے کے لئے دس افراد پر مشتمل کمیٹی کے تقرر" یا اسی قسم کے کسی نمائشی اقدام تک محدود ہو کر رہ گئی۔ کانفرنس کے آخر میں زیرِ بحث آنے والے عملی اقدامات کی روح بھی محولہ بالا خطوط پر قبض ہو کر رہ گئی۔ پہلے مارشل لاء حکومت' مارشل لاء کے غیر نفاذ' مارشل لاء کی ناکامیوں اور مارشل لاء کے بعد قائم ہونے والی آمریت کے اقدامات پر تنقید پیش کی گئی۔ اس مشق کو کانفرنس کے اصل مقاصد سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس سے صرف یہ فائدہ حاصل ہوا کہ انقلابِ اکتوبر کی مذمت پر اتفاقِ رائے پیدا ہوا۔ کافی بحث و تمحیص اور کئی ترامیم کے بعد یہ دستاویز منظور ہو گئی اور کانفرنس میں موجود 26 یا 27 ارکان نے اس پر دستخط ثبت کئے۔ کچھ مدعوئین کانفرنس میں شریک نہیں ہو سکے تھے لیکن انہوں نے تار کے ذریعے کانفرنس کے ساتھ اپنے تعاون کا اظہار کیا اور پیشگی طور پر کانفرنس کے نتائج کی پابندی کرنے سے اتفاق کیا۔ یہ الگ بات ہے کہ کانفرنس کے جو نتائج بر آمد ہوئے وہ اس قابل نہیں تھے کہ ان پر سنجیدگی سے غور کیا جائے۔

حکومت نے قرارداد کی عبارت پر اعتراض کرتے ہوئے دستخط کنندگان کے خلاف دفعات 124 اے اور 153 (قانونی حکومت کے خلاف بغاوت) کے تحت مقدمات درج کروا دیئے۔ تحقیقات شروع ہو گئیں۔ تفتیشی سوالات کا مقصد میاں ممتاز دولتانہ اور مجھے ملوّث کرنا تھا۔ بالآخر دس دستخط کنندگان کو مقدمہ چلانے کے لئے منتخب کر لیا گیا۔ اگرچہ ہر دستخط کنندہ آخری مسوّدے کی تیاری کے لئے برابر کا ذمہ دار تھا۔ لیکن اس انتخاب کی بنیاد قرارداد کی تیاری میں مذکورہ بالا افراد کی مبیّنہ سرگرم شرکت قرار پائی۔ یہ حقیقت بڑی معنی خیز چیز تھی کہ صدر کے بھائی سردار بہادر خاں کو ملزمان میں شامل نہیں کیا گیا تھا۔ حالانکہ وہ مسلم لیگ کے مرکزی نمائندے اور پارلیمینٹ میں قائدِ حزبِ اختلاف تھے۔

جماعتِ اسلامی کے مولانا طفیل احمد اور چوہدری غلام محمد' عوامی لیگ کے نوابزادہ نصر اللہ خاں اور خواجہ محمد رفیق' نیپ کے میاں محمود علی قصوری' محمود الحق عثمانی اور شیخ عبدالمجید سندھی' مسلم لیگ کے زیڈ ایچ لاری' مولانا عبدالستار خاں نیازی' اور بلوچستان کے سردار عطاءاللہ خاں مینگل پر مقدمہ چلایا گیا۔ ضمانت کے لئے درخواستیں دائر کی گئیں جن کی حکومت نے مخالفت کی۔ معاملہ لاہور میں مغربی پاکستان ہائی کورٹ

کے چیف جسٹس تک جا پہنچا۔ جسٹس منظور قادر نے اس شرط پر ضمانت منظور کر لی کہ ملزمان ضمانت پر رہائی کے دوران اسی نوعیت کے مزید بیانات جاری نہیں کریں گے۔ کراچی میں مغربی پاکستان ہائی کورٹ کے منصفین نے لاری کی درخواستِ ضمانت پر بھی ایسا ہی فیصلہ سنایا۔ مقدمے کے تمام ملزمان نے مشروط ضمانت دینے سے انکار کر دیا البتہ جسٹس لاری نے اپنے دفاع میں بیان دیا کہ وہ قرار داد کے آخری مسوّدے کی تیاری کے دوران کانفرنس میں موجود نہیں تھے۔ لہٰذا ان پر مقدمہ نہیں چلایا جا سکتا۔ سپریم کورٹ نے اس بنا پر جسٹس منظور قادر کا فیصلہ تبدیل کرتے ہوئے تمام ملزمان کو رہا کر دیا کہ مجموعہ ضابطہ فوجداری کے تحت ضمانت پر شرائط عائد کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ مقدمے کی سماعت کے لئے ایک خصوصی مجسٹریٹ کا تقرّر کیا گیا۔ ہائی کورٹ میں منصفی کے دوران جسٹس لاری نے قانون کی فہم اور آزاد عمل کی جو شہرت حاصل کی تھی اسے خاصا دھچکا پہنچا اور ان کے خلاف کئی مظاہرے کئے گئے۔

سیاست کا جمود

آج پاکستان میں عوام کی سطح پر سیاسی سرگرمیاں جمود کا شکار ہیں۔ کونسل مسلم لیگ اور جماعتِ اسلامی خود کو منظّم کرنے کی کوشش میں ہیں لیکن درحقیقت یہ جماعتیں بھی خلا میں معلق ہیں عوامی لیگ بھی گومگو کا شکار ہے اور میری واپسی کا انتظار کر رہی ہے۔ صدر نے حال ہی میں ایبڈو زدہ سیاستدانوں کو ایک صدارتی حکم کے ذریعے ہر قسم کی سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے اور سیاسی بیانات دینے سے روک دیا ہے۔ مقصود اس اقدام کا یہ تھا کہ ان سیاستدانوں کے پر قینچ کئے جائیں جو ابھی تک عوام میں اثر و نفوذ رکھتے ہیں، قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آخری حربہ کارگر رہا ہے۔ اور بحالئ جمہوریت کی تحریک مدہم پڑ گئی ہے۔ اب یہ سوال سنجیدہ غور و فکر کا متقاضی ہے کہ سیاستدانوں کے لئے کون سا راستہ باقی رہ گیا ہے۔ بھاشانی این ڈی ایف کی جڑیں کاٹنے میں مصروف ہیں۔ شنید ہے کہ مرکزی اسمبلی میں بجٹ پر بحث کے دوران صدر پر خاصی تنقید کی گئی۔ اس دوران میں کرسٹائن کیلر کے معاملے پر کھسر پھسر بھی سننے میں آئی۔ کرسٹائن کیلر نے صدر صاحب کے بارے میں انکشاف کیا تھا کہ وہ اور صدر ایوب تہانے کے تالاب میں چہلیں کرتے رہے۔ چوڑے چکلے اور تنومند صدر نے اسے ٹانگ سے کھینچ کر تالاب میں گرا دیا وغیرہ۔ لیکن اہم بات یہ ہے کہ صدر اب کھلے بندوں مسلم لیگ (کنونشن) میں شامل ہو چکے ہیں۔ اور ملک بھر میں جلسے منعقد کر کے عوام کو اپنی جماعت میں شمولیت کی ترغیب دے رہے ہیں اور ان کے لئے میدان بالکل صاف ہے۔

صدر نے ماضی کے سیاستدانوں کو گالی اور دشنام سے زیر کرنے کی کوشش کی - ایبڈو کی کارروائیوں کے ذریعے ان کی مشکیں کسنا چاہیں لیکن عوام کی نگاہوں میں ان رہنماؤں کی قدر و منزلت روز بروز بڑھتی رہی۔ چنانچہ صدر کو اپنی کامیابی ممکن بنانے کے لئے ان سیاست دانوں کے خلاف جبر و استبداد کا بھرپور استعمال کرنا پڑا۔ اب جبکہ وہ سیاسی اکھاڑے میں اتر چکے ہیں، اصولی طور پر حزبِ اختلاف انہیں

تنقید کا نشانہ بنانے کا جواز رکھتی ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے گا جبکہ بلی کے پنجے بھی خاصے خوفناک ہیں۔ صدر نے امریکہ مخالف جذبات سے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ بھارت کو اسلحے کی فراہمی سے پاکستان میں حقیقی طور پر خطرے کی لہر دوڑ گئی ہے اور صدر کو پاکستان کے محافظ کے طور پر سامنے آنے کا موقع مل گیا ہے۔ تاہم حزب اختلاف نے بھی اس کا توڑ معلوم کر لیا ہے۔ صدر کی بدمعاملگی اور خویش پروری کے خلاف عوامی نفرت کی پردہ پوشی مشکل ہوتی جارہی ہے۔ اگرچہ صدر کے کاسہ لیس ان کا دفاع کرنے کی پوری کوشش کر رہے ہیں۔ کھیل کے تمام اہم پتے صدر کے ہاتھ میں ہیں۔ وہ اب وسیع تعلقوں' باغات اور شہری جائیداد کے مالک شخص ہیں اور انہوں نے الغاروں دولت جمع کر لی ہے۔ ان کے بیٹے کبھی صدر کے اے ڈی سی تھے اور اب فوج سے مستعفی ہو کر لائسنسوں کے سہارے بڑے بڑے صنعتی اداروں کے مالک بن چکے ہیں۔ صدر کے بھائی اور حزب اختلاف کے قائد سردار بہادر خان سمیت ان کے تمام رشتے داروں نے اس لوٹ کھسوٹ میں اپنا حصہ وصول کیا ہے صدارت پر قبضے کے بعد صدر اور ان کے اہل خانہ پر برسنے والے ہن کے علاوہ تمام حکومتی وسائل صدر کے ہاتھ میں ہیں۔ اس کے علاوہ خفیہ مقاصد کے لئے مختص لامحدود رقوم کونوں کھدروں میں کھپائی گئی ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ صدر کے ممکنہ سیاسی حریفوں کو سیاسی میدان سے بے دخل کر دیا گیا ہے' سیاسی جماعتوں کی قوت نچوڑی جاچکی ہے اور موثر حزب اختلاف کی آواز دبائی جاچکی ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ صدر کی حیثیت بہتر ہونے کا امکان ہے۔ کیونکہ ان ناقابل تسخیر مشکلات کا مقابلہ کرنا حزب اختلاف کے لئے مشکل سے مشکل تر ہوتا جائے گا۔ وقتی طور پر شخصی اور سیاسی اختلافات کو پس پشت ڈالا جا سکتا ہے مگر یہ اختلاف یقینی طور پر سامنے آئیں گے۔ اور حزب اختلاف کو کمزور کریں گے۔

امر واقعہ یہ ہے کہ صدر کو خواہ کیسے ہی فوائد کیوں نہ حاصل ہوں' ان کی ذات اور ان کی حکومت کی غیر مقبولیت بہر طور ان کا اثر زائل کر دے گی۔ اگر صدارتی انتخابات حق بالغ رائے دہی کی بنیاد پر منعقد ہوا تو صدر کی کامیابی کا صرف ایک ہی طریقہ باقی رہ جائے گا اور وہ یہ کہ مجالس قانون ساز میں ساز باز کر کے اپنے تین جعلی امیدواروں کے علاوہ دیگر امیدواروں کو مقابلے سے خارج کر دیا جائے۔ بعدازاں یہ جعلی امیدوار مقابلے سے دست بردار ہو کر صدر کو بلا مقابلہ منتخب ہونے کا موقع فراہم کر دیں۔ اگر صدارتی انتخاب میں صرف بنیادی جمہوریت کے ارکان کو رائے دہی کا حق دیا گیا تو بھی صدر کی کامیابی مشکوک ہو جائے گی کیونکہ اکتوبر 1964ء میں بنیادی جمہوریتوں کے لئے انتخابات ہوں گے اور نو منتخب ارکان میں سے بہت سے افراد صدر کے ساتھ گٹھ جوڑ پر آمادہ نہیں ہوں گے۔ بایں ہمہ صدر کی اپنی غیر مقبولیت کے شک و شبہے سے بالاتر ہونے کے باوجود نتیجے کا انحصار بڑی حد تک حزب اختلاف کی طرف سے موزوں امیدوار کی نامزدگی پر ہو گا۔ ایبڈو زدہ سیاستدانوں کے مقابلے سے خارج ہونے کے باعث موزوں امیدواروں کی تعداد بہت کم رہ جائے گی۔ ممکنہ امیدواروں کے بارے میں قیاس آرائیوں کے باعث یہ افراد خطرے میں گھر جائیں گے۔ اخلاقی اور سیاسی لحاظ سے صدر کی حالت قابل رحم سہی مگر ان کی دولت

اور مالی استحکام کا مقابلہ کرنا آسان نہیں۔

اگر حزبِ اختلاف صدارتی انتخابات کے لئے کسی امیدوار پر متفق ہو گئی تو صدر کی کامیابی کے امکانات خطرے میں پڑ جائیں گے۔ ایسی صورت میں صدر کے پاس تین راستے ہوں گے۔

○ ..... پارلیمینٹ میں صدر کو اکثریت حاصل ہے لہٰذا وہاں ساز باز کر کے مخالف امیدواروں کو نامزد نہ ہونے دیا جائے۔

○ ..... انتخابی ادارے کے طور پر بنیادی جمہوریتوں کو برقرار رکھا جائے

○ ..... دھمکی، دھونس، رشوت اور دھاندلی کے لئے سرکاری افسروں کو استعمال کیا جائے۔

اگر صدر مجالسِ قانون ساز کے ذریعے مخالف امیدواروں کا کانٹا نکالنے میں کامیاب ہو گئے تو آخری حربے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ اور اگر انتخابات میں صرف بنیادی جمہوریت کے ارکان کا حق دیا گیا تو کسی مخالف امیدوار کے میدان میں ہونے کے باوجود ان حربوں کو معمولی پیمانے پر استعمال کرنا ہو گا۔ بایں ہمہ اگر انتخاب حقِ بالغ رائے دہی کی بنیاد پر منعقد ہوا تو ان تمام ہتھکنڈوں کے باوجود صدر کو خاصی کڑی آزمائش کا سامنا ہو گا دولت اور قوت کے تمام تر استعمال کے باوجود مشرقی پاکستان میں صدر کوئی تاثر قائم نہیں کر سکیں گے۔ مغربی پاکستان میں پنجاب کے کچھ حصوں اور قبائلی علاقوں کے علاوہ صدر کو سندھ کے چند بڑے جاگیرداروں کی حمایت حاصل ہو گی لیکن ان کی کامیابی کے لئے یہ حمایت اطمینان بخش نہیں ہو گی۔ یہ سب امکانات اپنی جگہ لیکن فوج کی صورت میں ایک اہم ہتھیار صدر کے قبضے میں ہو گا۔ اس کے علاوہ وہ لوگ بھی صدر کی بھرپور حمایت کریں گے جنہیں صدر نے قوم کی قیمت پر دولت میں نہال کیا ہے۔ اس صورتِ حال کے نتیجے کا کافی انحصار اس امر پر ہو گا کہ صدر کی دست آموز مقننہ کس حد تک رائے دہی کمیشن کی سفارشات کو درخورِ اعتنا سمجھتی ہے۔[33]

مشرقی پاکستان میں وسیع شورش کا اندیشہ

کسی بھی پہلو سے معاملات پر نظر ڈالئے، سیاسی فضا پر جمود طاری ہے اور یہ سوال منہ کھولے کھڑا ہے کہ اس جمود کو کیسے توڑا جائے؟ یہ ایک مسلمہ قاعدہ ہے کہ جب آئینی راستے بند کر دیئے جائیں تو بستی میں گریبانوں کے ڈھیر لگ جایا کرتے ہیں یعنی عوام غیر آئینی ہتھکنڈے استعمال کرنے لگتے ہیں۔ فی الوقت اس سوال کا حتمی جواب نہیں دیا جا سکتا کہ آیا مسلح افواج اور عوام کی قوت کے درمیان واضح تفاوت کی موجودگی میں اس قسم کا انقلاب کامیاب ہو سکے گا یا نہیں۔ ایک امکان یہ ہے کہ مشرقی پاکستان کے عوام مغربی پاکستان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے۔ اور فوج، مغربی پاکستان کے صنعت کاروں اور غیر بنگالی پناہ گزینوں سمیت کوئی بھی ان کے غیظ و غضب سے محفوظ نہیں رہے گا۔ ایسی صورت میں فسادات ہوں گے قتل و غارت گری ہو گی، جس کی بنیاد محض نفرت پر ہو گی۔ میں نے ابھی تک اس رجحان کے سامنے

بند باندھے رکھا ہے لیکن یہ دیکھنا باقی ہے کہ یہ آگ مکمل طور پر بجھ چکی ہے یا اس خاکستر میں کوئی چنگاری ابھی سلگ رہی ہے۔ اگر ایسا ہوا تو مایوسی جن شعلوں کو ہوا دے گی۔ عین ممکن ہے میں خود بھی ان کی زد میں آ کر حرفِ غلط کی طرح مٹ جاؤں

ضمیمہ۔ 1

سہروردی بنام صدر ایوب خاں

مسٹر پریزیڈنٹ'

مجھے 30 جنوری 1962ء کو گرفتار کیا گیا اور میں اس دن سے آج تک سنٹرل جیل کراچی میں سکیورٹی آف پاکستان ایکٹ 1952ء کے تحت نظر بند ہوں۔ 5 فروری 1962ء کو مجھے اپنی نظر بندی کی "وجوہات" موصول ہوئی تھیں۔ یہ وجوہات اس قدر مبہم اور غیر واضح ہیں کہ ان کی تردید میں کوئی معقول محضر تیار کرنے کی کوشش عبث ہوگی؛ میں صرف اتنا کر سکتا ہوں کہ ملک و قوم کے لئے اپنی سابقہ خدمات کا حوالہ دے کر ان الزامات کی عدم صحت کی طرف اشارہ کروں۔ بایں ہمہ ان الزامات کی لغویت کتنی ہی واضح کیوں نہ ہو' میرا خیال ہے کہ میں آپ سے مخاطب ہونے کا استحقاق رکھتا ہوں۔

جناب صدر' معاف کیجئے گا لیکن میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ مجھے اس قدر قریب سے جاننے کے باوجود آپ نے میری حب الوطنی کو مشکوک قرار دینے والے ان بیانات' کینہ آمیز اشاروں اور مبنی بر دروغ الزمات کو کیسے قابلِ اعتنا سمجھ لیا جو یقیناً آپ تک پہنچائے گئے ہوں گے۔ میرا اشارہ نظر بندی کی "سرکاری وجوہات" کی طرف نہیں ہے کیونکہ ان وجوہات میں دیئے گئے الزامات تو اس قدر لغو اور بچگانہ ہیں کہ وہ میری نظر بندی کی اصل بنیاد نہیں ہو سکتے۔ یقیناً آپ کے ذہن کو کچھ اور تہمتوں کی مدد سے زہر آلود کیا گیا ہے۔ میری گرفتاری سے اگلے ہی روز آپ نے صحافیوں سے بات چیت کے دوران میری نظر بندی کی جو وجوہات بیان کی تھیں ان میں سے ایک بھی اس فہرست میں شامل نہیں جو میرے حوالے کی

گئی ہے۔ چنانچہ یہ واضح ہے کہ میری گرفتاری کی اصل وجوہات، سرکاری طور پر مجھے مہیّا کی جانے والی وجوہات سے مختلف ہیں۔ میں ذیل میں ان "وجوہات" کا کھوکھلا پن واضح کرنا چاہتا ہوں۔ پہلی وجہ! "قیام پاکستان کے بعد سے اور خاص طور پر گزشتہ تین برسوں کے دوران آپ نے اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک پاکستان دشمن عناصر سے میل جول رکھا"۔

میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ آیا مجھے ملک کا وزیر قانون اور بعد ازاں وزیر اعظم بننے سے پہلے والے افعال کے لئے بھی جوابدہ ٹھہرایا جا رہا ہے یا نہیں۔ جن دنوں ہم کابینہ میں رفیقِ کار تھے میں نے کبھی آپ کے منہ سے کوئی ایسی بات نہیں سنی جس سے مجھے اندازہ ہوتا کہ آپ میری حب الوطنی کو قابلِ اعتراض سمجھتے ہیں۔ اگر آپ کو اصل حالات سے آگاہی ہوتی تو آپ کو احساس ہوتا کہ تقسیمِ ہند کے فوراً بعد ہندوستان میں ٹھہر کر میں نے بنگال کو اس طوفان سے بچالیا تھا۔ جس نے پنجاب کو آگ اور خون میں نہلا دیا تھا۔ آپ قتل و غارت گری کی اس داستان سے بخوبی واقف ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر بنگال میں بھی یہی کہانی دہرائی جاتی تو کسی مسلمان کے لئے ہندوستان میں ٹھہرنا ممکن نہ رہتا اور پناہ گزینوں کے اس سیلِ بے اماں کے سامنے پاکستان کے محدود وسائل خس و خاشاک کا بند ثابت ہوتے۔ جہاں تک گزشتہ تین برس کا تعلق ہے، میں اس کذب بیانی کی تردید کے علاوہ کیا کہہ سکتا ہوں پہلی بات تو یہ کہ میں نے سیاسی سطح پر کسی سے بیرون ملک رابطہ نہیں کیا بلکہ میں نے ہمیشہ بیرون ملک پاکستانی سیاست کو موضوعِ گفتگو بنانے سے انکار کیا ہے ———— اب اس "بیرونِ ملک" کی ترکیب کو ہی لے لیجئے۔ کسی وضاحت کے بغیر اس مبہم الزام کی شافی تردید نہیں کی جا سکتی۔ انقلاب کے بعد میں گزشتہ 13 جولائی سے لیکر 13 نومبر تک ایک ہی بار ملک سے باہر گیا ہوں۔ ملک سے روانہ ہوتے ہوئے میں نے ارادہ کیا تھا کہ کسی قسم کے سیاسی عناصر سے رابطہ نہیں کروں گا اور اگر ایسا ہوا تو پاکستان کی داخلی صورتِ حال پر تبصرے سے گریز کروں گا اور میں اس ارادے پر قائم رہا۔ اب مجھے خیال آتا ہے کہ شاید مجھے بیرونِ ملک جانے کی اجازت اسی لئے دی گئی تھی کہ بعد ازاں اس قسم کے الزامات عائد کئے جا سکیں۔ چونکہ میں بیرونِ ملک انسانوں سے تو ملا ہوں لہٰذا اس "بیرونِ ملک روابط" کی اب میں کیا تردید کروں؟ جملۂ معترضہ کے طور پر پوچھنا چاہتا ہوں کہ "پاکستان مخالف عناصر" سے آپ کی کیا مراد ہے۔ کہیں آپ کا اشارہ پاکستانی سفیر کی طرف تو نہیں۔ جن سے میں نے ملاقات کی تھی؟ میں پورے اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میں کسی ایک بھی ایسے شخص سے نہیں ملا جسے پاکستان مخالف عناصر میں سے ایک قرار دیا جا سکے۔ اور یوں بھی کسی ایسے شخص سے ملاقات میری گرفتاری کا مناسب قانونی جواز نہیں ہے کیونکہ اس سے پاکستان کے دفاع یا سلامتی کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوتا۔

اب "اندرونِ ملک پاکستان دشمن عناصر" سے گٹھ جوڑ کے الزام کو لیجئے۔ ایک بار پھر میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ "پاکستان دشمن عناصر" سے کون لوگ مراد ہیں۔ ان لوگوں کی نشاندہی کرنا مشکل

نہیں ہونا چاہئے۔ کیا یہ عناصر پاکستانی شہری ہیں؟ پاکستان میں رہنے والے پاکستان دشمن عناصر سے گٹھ جوڑ تو در کنار، مجھے ایسے کسی شخص سے بات کرنے کا بھی اتفاق نہیں ہوا۔ میرے جیسا شخص جو مسلمان ہے، جسے مسلمانوں سے محبت ہے، ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمانوں کی فلاح اور بہتری جس کی سوچ کا محور ہے، یہ کیسے سوچ سکتا ہے کہ مشرقی پاکستان کے معصوم مسلمانوں کو، جنہوں نے مجھے اپنے اعتماد اور محبت سے نوازا ہے، ہندو بھارت کی آغوش میں ڈال دیا جائے۔ کیا آپ کا اشارہ علیحدگی کی طرف ہے؟ میں نے بیرونِ ملک دورے سے واپسی سے قبل کبھی اس امکان کا ذکر تک نہیں سنا تھا۔ مسلمانوں کے لئے پاکستان ایک وحدت ہے اور ناقابلِ تقسیم ہے۔ ہم نے پاکستان کی منزل حاصل کرنے کیلئے اپنی جانیں خطرے میں ڈالی تھیں اور اسی کے استحکام اور سلامتی کے لئے جتن کرتے ہم بوڑھے ہوئے ہیں۔ ملک کے دونوں حصوں کی یکجہتی اور اتحاد ناگزیر ہے۔ اگر مشرقی پاکستان نے علیحدگی اختیار کی تو یہ بھارتی بالادستی، تباہی اور فوجی اقدام کے ذریعے ادغام کے خطرے کو کھلی دعوت ہوگی۔ علیحدگی کی کسی تجویز کے بارے میں میرا ردِ عمل یہی ہے۔ میں پھر سے اس خیال کا اعادہ کرتا ہوں کہ ہماری بہتری متحد رہنے اور مغربی پاکستان سے تعاون کرنے میں ہے۔

میں نے مشرقی پاکستان کے عوام کو اصولِ مساوات قبول کرنے پر آمادہ کیا تھا تاکہ اقلیت ہونے کے ناطے سے مغربی پاکستان کے عوام دل گرفتہ نہ ہوں۔ اگرچہ گزشتہ رپورٹوں میں اس پر کافی زور دیا گیا ہے لیکن میں یہ امر واقعہ دہرانا چاہتا ہوں کہ میرے علاوہ کوئی شخص مشرقی پاکستان کے عوام کو اس سیاسی حق کو ترک کرنے پر آمادہ نہیں کر سکتا تھا جسے تمام جمہوری معاشروں میں عزیز رکھا جاتا ہے۔ حقِ خود ارادیت کے اصول کی اہمیت اسی سیاسی حق کی مرہونِ منت ہے۔ میرا خیال تھا کہ پاکستان کی بقا اور ترقی کے لئے مغربی پاکستان سے تعاون از حد ضروری ہے اور یہ کہ اصولِ مساوات سے صوبائی کشمکش کا خاتمہ ہو جائے گا اور صوبائی سیاسی قوتوں کی بجائے ملک کے دونوں حصوں میں مشترکہ سیاسی جماعتیں فروغ پائیں گی۔ میں نے وزیرِ قانون کی حیثیت سے مشرقی پاکستان کا دورہ کیا اور ان گنت جلسوں سے خطاب کر کے عوام کو ترغیب دی کہ وہ اصولِ مساوات کو قبول کر لیں۔ اسی اصول کی بناء پر 1955ء میں پہلی بار دستور ساز اسمبلی کا انتخاب ہوا تھا (میں اس وقت وزیرِ قانون تھا)

مجھے مشرقی پاکستان سے غداری کا مرتکب ٹھہرایا گیا، مجھ پر الزام لگایا گیا کہ میں مشرقی پاکستان کو رہن رکھ رہا تھا لیکن میں اپنے نقطۂ نگاہ پر ڈٹا رہا اور متحدہ پاکستان کے نام پر کامیابی حاصل کی۔ کیا آپ اب بھی سمجھتے ہیں کہ میں علیحدگی کی کسی تحریک کا حامی ہوں۔ مسٹر پریذیڈنٹ! مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ایسے افسوسناک الزامات کے تحت مجھے نظر بند کر کے آپ نے میری افادیت غارت کر دی۔ میں نے کبھی کسی عہدے یا اقتدار کی خواہش نہیں کی اور نہ مجھے آج بھی اس کی ہوس ہے۔ لیکن اگر ضرورت پڑتی تو میں نے آگے بڑھ کر مشرقی پاکستان کے عوام کو متحدہ پاکستان کی افادیت اور اہمیت سے آگاہ کیا ہوتا اور مجھے یقین ہے کہ میری آواز مؤثر ثابت ہوتی۔

جناب صدر! کیا میں آپ کے احترام کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے یہ عرض کر سکتا ہوں کہ اگر آپ نے میرے دشنام طرازوں کی اس الزام تراشی کا اعادہ نہ کیا ہوتا تو یہ بہت بہتر ہوتا' جواب تک اتنی بار دہرائی جا چکی ہے کہ عام طور پر اسے امر واقعہ خیال کیا جانے لگا ہے۔ پاکستان' ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے ایک گھر کے طور پر تخلیق کیا گیا تھا اور ہم نے اسی جذبے کے ساتھ مطالبۂ پاکستان کی تائید کی تھی۔ بنگالی عوام اور خاص طور پر مغربی بنگال کے مسلمانوں نے ہندوؤں کے ہاتھوں بہت سختیاں برداشت کی تھیں۔ اور پھر ہم نے پاکستان حاصل کر لیا۔ پاکستان ہمارا وطن ہے، کوئی پناہ گاہ نہیں۔ ہمیں یہاں آنے کا حق حاصل تھا اور ہم یہاں چلے آئے۔ جی ہاں' ہم اپنے وطن میں آئے تھے جس کی تخلیق میں ہمارا خون پسینہ بھی شامل تھا' قانونِ شہریت کے نفاذ کے بعد اس امر کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا تھا کہ پاکستانی شہری ہوتے ہوئے ہندوستان میں رہائش اختیار کی جائے چنانچہ میں نے پاکستان آنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں بڑے ادب سے آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ فروری 1949ء تک میں پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کا رکن تھا۔ میرے لئے پاکستان میں پناہ حاصل کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ جب میں نے پاکستان میں رہائش اختیار کرنے اور 5 مارچ 1949ء کو مستقل طور پر پاکستان منتقل ہونے کا اعلان کیا تو مسلم لیگ وزارت کی انگیخت پر مسٹر تمیز الدین خاں نے 26 فروری 1949ء کو مجھے دستور ساز اسمبلی کی رکنیت سے محروم کر دیا۔ میرے خیال میں اگر قائدِ اعظمؒ حیات ہوتے تو انہوں نے ایسے اقدام کی اجازت نہ دی ہوتی۔ کیا آپ اب بھی یہ سمجھتے ہیں کہ میں نے پاکستان میں پناہ حاصل کی تھی؟ بے شک میں ایک مہاجر ہوں لیکن قائدِ اعظمؒ بھی تو مہاجر تھے۔ لیاقت علی خاں بھی تو مہاجر تھے اور اسی طرح وہ لاکھوں لوگ بھی تو مہاجر ہیں جو اپنے اس گھر میں چلے گئے تھے جس کی ضمانت قائدِ اعظمؒ نے دی تھی۔

جناب صدر! امید ہے کہ آپ برا نہیں منائیں گے اگر میں یہ کہوں کہ میرے متعلق آپ کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ میری نظر بندی کی اصل بنیاد یہ خدشہ ہے کہ اگر میں جیل سے باہر رہا تو مستقبل قریب میں نافذ ہونیوالے آئین پر عمل در آمد میں کھنڈت ڈالوں گا ورنہ اس بیان میں اس خدشے کے اظہار کی کوئی وجہ نہیں تھی جس میں آپ نے میری گرفتاری کی وجوہات بیان کی تھیں۔ بہتر ہوتا کہ ایسا قدم اٹھانے سے قبل آپ نے میرا ردِّ عمل معلوم کر لیا ہوتا۔ یہ تو مسلمہ امر ہے کہ میں ایسے آئین کا گرم جوشی سے خیر مقدم نہیں کر سکتا جو آپ نافذ کرنے والے ہیں۔ لیکن کسی شہری کی نظر بندی کے لئے یہ ایک جامع بنیاد نہیں ہے۔ اخبارات میں خواہ کچھ ہی شائع کیا جائے' پاکستان کے تقریباً ننانوے فیصد عوام اس آئین کے بارے میں میرے خیالات کی تائید کرتے ہیں۔

عام طور پر کمیونسٹوں اور ان کے حقیقی یا مصنوعی ہم خیالوں کو پاکستان مخالف سمجھا جاتا ہے۔ گزشتہ تین برسوں کے دوران ایسے کسی شخص سے میرا گٹھ جوڑ تو در کنار' میرا رابطہ تک نہیں ہوا۔ جہاں تک غیر ملکیوں کا تعلق ہے تو کیا یہ فہرست صرف سفارت کاروں تک محدود ہے یا اس میں غیر سفارت کار بھی شامل ہیں؟ دونوں صورتوں میں ایسے افراد کی نشاندہی کرنا زیادہ مشکل نہیں ہونا چاہئے۔ میں پورے اعتماد

سے کہہ سکتا ہوں کہ میری کسی ایسے غیر سفارت کار شخص سے آشنائی نہیں جو پاکستان مخالف ہو یا اس کا تعلق کسی ایسے ملک سے ہو جسے عام طور پر پاکستان مخالف سمجھا جاتا ہو۔ اگر ان عناصر سے مراد سفارت کاری سے متعلقہ حضرات ہیں تو بھی میں کسی پاکستان مخالف عنصر سے رابطے کا مرتکب نہیں ہوا۔ ممکن ہے کہ سماجی تقریبات میں دیگر پاکستانیوں کی طرح مجھے بھی ایسے افراد سے ملاقات کا موقع ملا ہو تو عام طور پر پاکستان مخالف سمجھے جانے والے ممالک سے تعلق رکھتے ہوں لیکن ایسے کسی رابطے کو اس گٹھ جوڑ کا نام نہیں دیا جا سکتا جس کا ذکر میری گرفتاری کے پہلے "سبب" میں کیا گیا ہے۔ میں دعویٰ کرتا ہوں کہ میری حب الوطنی شک و شبہے سے بالاتر ہے اور اس قسم کے کسی رابطے سے اس پر حرف نہیں آ سکتا۔

مجھے یہ جان کر انتہائی صدمہ ہوا کہ مبینہ طور پر آپ نے ڈھاکہ میں یہ بھی کہا (اگرچہ اسے میری گرفتاری کی رسمی "وجوہات" میں شامل نہیں کیا گیا) "اس سے (یعنی سہروردی سے) کچھ بعید نہیں کہ اس نے پاکستان کے دشمنوں سے مالی امداد بھی حاصل کی ہو" معاف کیجئے گا جناب صدر! کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ اس قدر سنجیدہ الزام عائد کرنے کے لئے آپ کے پاس کیا جواز تھا؟ یہ امر میری فہم سے بالاتر ہے کہ آپ کو ایسے بیان پر اکسانے کے لئے کس قسم کی غلیظ اور مبنی بر دروغ اطلاعات آپ کو پہنچائی گئی ہوں گی۔ کسی شخص کے کردار پر اس قدر گھٹیا حملہ نہیں کیا جا سکتا۔ میں اس الزام کی تردید میں سوائے اس کے کیا کہہ سکتا ہوں کہ آپ سے انصاف اور ایمانداری سے کام لینے کی درخواست کروں۔

جناب صدر! میں ایک غریب آدمی ضرور ہوں اور غریب آسانی سے بھٹک جایا کرتے ہیں لیکن میں نے کبھی ایسی غلیظ حرکتوں کی گراوٹ قبول نہیں کی۔ میری تالیف قلب کے لئے تو یہ یقین ہی کافی ہے کہ ملک کے اندر اور باہر کوئی بھی اس الزام پر یقین نہیں کرے گا سوائے ان لوگوں کے جو اسے درست سمجھنا چاہتے ہیں۔ صحافیوں کے ساتھ آپ کی گفتگو سے صاف ظاہر ہے کہ میری نظر بندی غیر حقیقی "اسباب" کی بنیاد پر عمل میں لائی گئی ہے۔ ایسے تمام واضح اور دو ٹوک الزامات جو آپ نے عائد کئے ہیں اور جنہیں ثابت یا رد کیا جا سکتا ہے، میری نظر بندی کے "اسباب" کی اس فہرست میں شامل نہیں کئے گئے جو مجھے مہیا کی گئی ہے۔

میں آپ کے عائد کردہ دیگر الزامات پر آگے چل کر مزید بات کروں گا بشرطیکہ نظر بندی کے اسباب پر معروضات کے دوران ان کا احاطہ نہ ہو سکا۔ درحقیقت، جناب صدر! آپ نے صحافیوں سے گفتگو کے دوران میری گرفتاری کی جو وجوہات بیان کی ہیں وہ ان "اسباب" سے قطعی طور پر مختلف ہیں جو مجھے سرکاری طور پر مہیا کئے گئے ہیں۔

پیراگراف نمبر 2...... میں نے کچھ دوست ممالک کو پاکستان سے برگشتہ کرنے کے لئے اپنا اثر و رسوخ اور ذاتی تعلقات استعمال کئے۔

مجھے یہ جان کر کچھ برخود غلط سی مسرت ہوئی ہے کہ میں کچھ ذاتی اثر و رسوخ رکھتا ہوں۔ دراں حالانکہ ذاتی اثر و رسوخ جیسی کسی شے کا وجود آپ کے عہد اقتدار میں عنقا ہے۔ میں ایک بار پھر سے سمجھنے

سے قاصر ہوں کہ "ذاتی تعلقات" سے آپ کا اشارہ کس طرف ہے۔ بظاہر آپ پاکستان کے دوست ممالک کے کچھ سفارت کاروں اور غیر سفارتی باشندوں کا ذکر کرنا چاہتے ہیں۔ جن کا نام نہیں لیا گیا۔ پہلی بات تو یہ کہ اپنے منصب سے علیحدگی کے بعد میں نے کسی سے باقاعدہ رابطہ نہیں رکھا تاہم غیر ملکی سفارت خانوں کے ساتھ کسی بھی شہری کے تعلقات ہو سکتے ہیں یا وہ حضرات اقتدار سے باہر کسی شخص کی طرف دوستانہ روّیہ رکھ سکتے ہیں۔ تاہم ان لوگوں کی پہلی ترجیح حکومت کے ساتھ خوشگوار تعلقات ہوتے ہیں اور امکان ہوتا ہے کہ وہ محرومِ اقتدار صاحبان کو شک و شبہے کی نظر سے دیکھیں گے۔ دوسری بات یہ کہ کیا ان سفارت خانوں میں سے کوئی شخص اتنا احمق ہو سکتا ہے کہ وہ یہ راز فاش کر دے کہ میں نے پاکستان کے مفادات کے خلاف کسی جذبات کا اظہار کیا ہے۔ یا یہ کہ میں پاکستان مخالف خیالات رکھتا ہوں سوائے اس کے کہ وہ آپ کی خوشامد کرنا چاہتا ہو۔ اور آپ کو یہ بتائے کہ میں نے دوست ممالک کو پاکستان سے برگشتہ کرنے کی کوشش کی ہے؛ جب بھی کبھی میں نے پاکستان کے بارے میں کسی سے بات کی ہے اور ایسے مواقع کم ہی آئے ہیں۔ میں نے ہمیشہ پاکستان کے لئے امداد کی ضرورت پر زور دیا ہے اور اس خواہش کا اظہار کیا ہے کہ اس قسم کی اعانت سے پاکستان کی خود مختاری پر حرف نہیں آنا چاہئے۔

جناب صدر! شاید آپ کو علم نہ ہو اس لئے میں آپ کو بتائے دیتا ہوں کہ پاکستان میری زندگی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میں نے اس ملک کی تخلیق میں اہم کردار ادا کیا تھا، مسلم اکثریتی صوبوں میں سے بنگال وہ واحد صوبہ تھا جس نے قائدِ اعظمؒ کو مسلم لیگ کی وزارت دی تھی۔ بنگال قائدِ اعظمؒ کے ہاتھ میں ترپ کا وہ پتا تھا جس کے باعث کانگریس کو تقسیمِ ہند قبول کرنا پڑی۔ مسلم لیگ کو بنگال میں قابلِ قبول بنانے کے لئے اور مطالبۂ پاکستان کی پزیرائی کے لئے مجھے اپنے معاش، صحت اور سلامتی کو خطرے میں ڈال کر دن رات کام کرنا پڑا۔

میں بنگال کی صوبائی مسلم لیگ کا سیکرٹری تھا اور اس کی ساری ذمہ داری میرے کندھوں پر تھی۔ مقامی رہنما اپنے متعلقہ حلقوں میں ہماری کچھ نہ کچھ مدد کرتے تھے لیکن پھر بھی مجھے دور افتادہ دیہات میں جا کر مسلمانوں سے مخاطب ہونا پڑا۔ میں نے دیہاتی ذرائعِ آمدورفت پر، ٹوٹی پھوٹی سڑکوں پر اور چھوٹی چھوٹی کشتیوں کے ذریعے دور دراز کے سفر کئے۔ جہاں چھت میسر آتی قیام کر لیتا، کھانے کو جو ملتا کھا لیتا، اور پاکستان کے پیغام کو گھر گھر پہنچاتا رہا۔ مجھے اس دوران پتھراؤ کا بھی سامنا کرنا پڑا اور میں مرتے مرتے بچا۔ مجھے مخالفین کے برچھوں کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ میں نے یہ سب کچھ پاکستان کے لئے کیا۔ اپنے گھروں میں بیٹھ رہنے والے میری بوئی ہوئی فصل کا پھل کاٹتے رہے اور آج تک کاٹ رہے ہیں۔ میں نے بنگال میں رائے عامہ کو مسلم لیگ کے نقطۂ نگاہ اور پاکستان کے حق میں ہموار کیا۔

جناب صدر! آپ کو برصغیر کے دوسرے کنارے پر رہتے ہوئے ان معاملات کا علم نہیں ہو سکتا اس کے لئے برسوں کی مشقت درکار تھی میری زندگی کے دس بہترین سال اس جدوجہد میں صرف ہوئے

اور تب ہمیں 1946ء کی فتح نصیب ہوئی تھی اور پھر مجھ پر یہ الزام لگانا کہ میں نے دوست ممالک کو پاکستان سے برگشتہ کرنے کی کوشش کی ہے' جناب صدر' مجھے کہنے دیجئے کہ یہ ایک قابلِ مذمت جھوٹ ہے میری تو یہ خواہش ہے کہ یہ تمام دوست ممالک ہمارے اور بھی قریب آ جائیں اور اگر کبھی ضرورت پیش آئے تو ہماری مدد کو پہنچیں۔

پیراگراف نمبر 3..... مجھ پر الزام لگایا گیا ہے کہ میں نے گزشتہ تین سالوں کے دوران بیرونِ ملک ایسے عناصر سے گٹھ جوڑ کئے رکھا ہے جو موجودہ حکومت کی نافذ کردہ اصلاحات کی کھلے بندوں مخالفت کر رہے ہیں۔

یہ الزام بھی بے حد غیر واضح ہے بلکہ اس الزام سے تو وہ سوال یاد آتا ہے "تم نے آخری بار اپنی بیوی کی پیٹائی کب کی تھی؟" یعنی اگر کھلم کھلا نہیں تو خفیہ ساز باز کو امر مسلمہ قرار دیا جا رہا ہے۔ اور میں اس قسم کی کسی گٹھ جوڑ کی سختی سے تردید کرتا ہوں۔ ایک دفعہ پھر یہ واضح نہیں ہے کہ ان عناصر سے کون لوگ مراد ہیں جو مختلف اصلاحات کی کھلے بندوں مخالفت کر رہے ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ یہ الزام اس قدر لایعنی ہے کہ میں یہ سوچنے پر مجبور ہوں کہ اس کا اشارہ خود انقلاب کی طرف تو نہیں ہے..... یعنی موجودہ حکومت کی اصلاحات کی بجائے خود موجودہ حکومت کو ایک اصلاح تو قرار نہیں دیا جا رہا۔ یقیناً اس الزام کا یہ مفہوم نہیں ہے مجھے یقین ہے کہ آپ تسلیم کریں گے کہ عوام کو انقلاب کے بارے میں مختلف نقطہ ہائے نگاہ رکھنے کا حق حاصل ہے، کچھ آئینی ماہرین کا خیال ہے کہ 1956ء کے آئین میں ایسے اختیارات موجود تھے جنہیں بروئے کار لا کر آئین کو معطل کئے بغیر وہ سب کچھ کیا جا سکتا تھا جو انقلابی حکومت نے اصلاحِ احوال کے لئے کیا ہے۔

میرا ہمیشہ سے یہ نقطۂ نظر رہا ہے کہ جواز یا عدم جواز سے قطعِ نظر' جب ایک بار فوجی حکومت قائم ہو جائے اور صاحبانِ فوج اقتدار سنبھال لیں تو پھر انہیں پورا موقع ملنا چاہئے کہ اپنی بہترین صلاحیتیں صرف کر کے ملک کی خدمت کریں تا آں کہ اللہ کی مہربانی سے ملک میں دوبارہ قیامِ جمہوریت کی سبیل نظر آ جائے۔ اس حقیقت کی تردید کرنا تو حماقت ہو گی کہ پورا ملک دوبارہ جمہوریت کی طرف لوٹنے کا خواہشمند ہے اور جناب صدر! خود آپ نے اس حقیقت کا ادراک کرتے ہوئے ملک کو اسی سمت گامزن کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ مجھے اس اعتراف میں کوئی باک نہیں کہ خود میری خواہش بھی یہی ہے اور یہ امر قطعی طور پر غیر اہم ہے کہ بحالیٔ جمہوریت کی صورت میں' میں اقتدار میں' ہوں یا اقتدار سے باہر۔ بایں ہمہ جمہوریت کے لئے میری رغبت کا مختلف عناصر سے گٹھ جوڑ وغیرہ کرنے سے کوئی تعلق نہیں۔ درحقیقت مجھے موجودہ حکومت کی نافذ کردہ بہت سی اصلاحات سے اتفاق نہیں ہے۔ موجودہ حکومت نے یہ اصلاحات اپنے وسیع صوابدیدی اختیارات کے بل بوتے پر نافذ کی ہیں ان اصلاحات کی نوعیت ایسی ہے کہ اگر کسی جمہوری حکومت کو بھی ایسے ہی وسیع صوابدیدی اختیارات مل جاتے تو بھی ان قوانین کو ایک طویل آئینی جدوجہد اور کشاکش کے بعد ہی نافذ کیا جا سکتا تھا۔

پیرا گراف چہارم...... مجھ پر الزام عائد کیا گیا ہے کہ میں نے مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے مختلف شہروں میں ایسے خفیہ مراکز قائم کئے ہیں جہاں پر موجودہ حکومت کے کارناموں کے خلاف پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے۔ اس الزام کے خالق کی قوت متخیلہ کی داد دینا پڑتی ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ قانونی اور آئینی روایات میں پروان چڑھنے اور قائدِ اعظمؒ کے آئینی طریقۂ کار کا پیرو کار ہونے کے ناطے میں کسی قسم کی خفیہ ' زیرِ زمین اور مبنی بر سازش سرگرمیوں میں حصہ لینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

اس قسم کی سرگرمیوں کے لئے جس قسم کے رجحانِ طبع 'اہلیت' وسائل 'علم اور تجربے کی ضرورت ہوتی ہے وہ مجھے میسّر نہیں ہیں۔ جب آپ نے سیاسی جماعتوں پر پابندی عائد کی تو دیگر تنظیموں کے ساتھ ہی میری سیاسی جماعت بھی ختم ہو گئی یہ ایک حقیقت ہے، جماعتوں پر پابندی عائد کرنے سے عوام کی سیاسی سوچ ختم نہیں ہو جایا کرتی اور یہ ایک کھلا راز ہوتا ہے کہ سیاسی کارکن اپنی سابقہ سیاسی جماعتوں سے ذہنی وابستگی برقرار رکھتے ہیں۔ لیکن جہاں تک ایک باقاعدہ سیاسی تنظیم کے طور پر کام کرنے کا تعلق ہے آپ کے حکم کے بعد میری جماعت کالعدم ہو کر رہ گئی اور تمام عہدیداران بھی اپنی حیثیت کھو بیٹھے۔ یہ انتہائی مضحکہ خیز بات ہے کہ میں نے ملک کے دونوں حصوں کے مختلف شہروں میں خفیہ دفاتر یا مراکز قائم کئے ہیں۔ اپنی پیشہ ورانہ قانونی مصروفیات کے ضمن میں ' میں نے اس عرصے میں صرف کراچی (جہاں میں مستقل طور پر رہتا ہوں) لاہور' چٹا گانگ اور ڈھاکہ کا دورہ کیا ہے۔ میرے دوستوں اور موکلین نے مجھے مختلف شہروں میں اپنی قیام گاہوں پر بطور مہمان مدعو کیا تھا۔ تاکہ سیاست سے فراغت کے باعث میں کچھ آرام کر سکوں لیکن میں نے ایسی دعوتیں قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس لئے نہیں کہ مجھے خدشہ تھا کہ اگر میں نے ان شہروں کا دورہ کیا تو مجھے خفیہ مراکز قائم کرنے کا مرتکب ٹھہرایا جائے گا۔ (میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس قسم کا عجوبۂ روزگار خیال بھی کسی ذہنِ رسا پر نازل ہو سکتا ہے) میں نے تو ان دعوتوں کو قبول کرنے سے محض اس لئے انکار کیا کہ مجھے اپنی پیشہ ورانہ مصروفیات سے وقت نہیں ملتا' میں سفر کی کوفت سے گھبراتا تھا اور یہ کہ میں دانستہً لوگوں سے میل ملاقات سے حتی الامکان احتراز کر رہا تھا۔ اگر میں مذکورہ بالا خفیہ مراکز کے قیام میں دلچسپی رکھتا تو یہ دعوتیں اس ضمن میں بے حد مفید ثابت ہو سکتی تھیں لیکن مشکل تو یہ ہے کہ میں اس فنِ لطیف سے بے بہرہ ہوں۔ میں سوال کرتا ہوں کہ میں نے کہاں خفیہ مراکز قائم کئے ہیں۔

پیرا گراف نمبر 5...... میں اس سبب کو دو حصوں میں تقسیم کرنا چاہوں گا حصہ اول...... مجھ پر الزام عائد کیا گیا ہے کہ میں "مسلسل" (براہ کرم مسلسل کے لفظ کو ذہن میں رکھئے) کالعدم عوامی لیگ کے رفقائے کار اور کارکنوں میں پاکستان کے خلاف نفرت اور تحقیر پھیلاتا رہا ہوں۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ مجھے ایسا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ "نفرت اور تحقیر" بڑے سخت الفاظ ہیں۔ نفرت اور تحقیر پھیلانے کے لئے سخت الفاظ کی ہی ضرورت ہوتی ہے۔ عدالت میں الزام عائد کرتے ہوئے متعلقہ دفعہ کا حوالہ دیا جاتا

ہے۔ بڑی احتیاط کے ساتھ معاملے کے سیاق وسباق کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ اور پھر کسی نتیجے پر پہنچا جاتا ہے۔ بیانات کے مختلف اقتباسات کو کافی شہادت، تسلیم نہیں کیا جاتا۔ کیا اس الزام کی تائید میں کوئی ثبوت پیش کیا جا سکتا ہے۔ بظاہر یہ الزام بھی مضحکہ خیز ہے۔ میں اس حقیقت سے انکار نہیں کرتا کہ کالعدم عوامی لیگ کے کچھ دوستوں اور میرے رفقاء نے اپنے مقدمات کے سلسلے میں مجھ سے رابطہ کیا ہے۔ لیکن ان کے درمیان ''نفرت اور تحقیر'' کے جذبات پھیلانے سے مجھے کیا فائدہ مل سکتا ہے؟ پاکستان کے خلاف نفرت پھیلانے کی آخر کیا تک بنتی ہے؟ کیا مجھے اس اضحوکہ روزگار الزام کو رد کرنے کی ضرورت ہے؟ کیا میرا ذہنی توازن بگڑ گیا ہے، جو میں اس قسم کی لغویات میں الجھتا پھروں۔ جو لوگ عدالت میں مجھ سے ملے ہیں ان میں سے تو کسی نے میرے خللِ دماغ کی نشاندہی نہیں کی۔

حصہ دوم!..... میں نے اصلاحات سے متاثر ہونے والے افراد سے وعدے وغیرہ کئے ہیں۔ خدا کے لئے یہ تو بتا دیجئے کہ کہاں؟ وہ کونسے مفادات ہیں جو اصلاحات سے مجروح ہوئے ہیں اور میں انکی تلافی کے وعدے کر رہا ہوں؟ میرے خیال میں واحد مراعات یافتہ طبقہ جس کے مفادات کو اصلاحات سے زک پہنچی ہے وہ مغربی پاکستان کا جاگیردار طبقہ ہے۔ جناب صدر! غالباً یہ حقیقت آپ کے علم میں نہیں ہے کہ اس سے کہیں زیادہ سخت زرعی اصلاحات عوامی لیگ کے پروگرام میں ترجیحی طور پر شامل تھیں۔ اور شاید آپ کو یہ بھی علم نہیں ہے کہ میں نے بنگال کے غریب مزارعین کو ان کے حقوق دلوانے کے لئے جاگیرداروں کے خلاف کس قدر مستقل مزاجی سے جدوجہد کی تھی۔ یہ الزام اس قدر عمومی ہے کہ میں نے اپنی فہم کے مطابق اس کا جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ کیا آپ کا کوئی معتمد یا دفاتر میں تشریف فرما صاحبان میں سے کوئی شخص مجھے یہ بتانے کی زحمت کرے گا کہ میں نے کہاں اور کون سے جاگیردار سے وعدے وعید کئے تھے اور کن حالات میں؟

پیراگراف 6!..... الزام عائد کیا گیا ہے کہ میں نے آج تک تصورِ پاکستان کو صمیمِ قلب سے قبول نہیں کیا۔ جناب صدر! آپ اس وقت میرے رفیقِ کار رہے ہیں جب میں وزیراعظم تھا۔ کیا آپ اس الزام کی صحت پر یقین رکھتے ہیں۔ تصوّرِ پاکستان کے لئے میں نے کیا کیا ہے اور کیا صعوبتیں اس راہ میں اٹھائی ہیں کچھ میں ہی جانتا ہوں۔ میں آپ کی توجہ اس تقریر کی طرف دلانا چاہتا ہوں جو میں نے دہلی میں مسلم لیگ کے آخری کنونشن میں کی تھی (اس تقریر کا عنوان تھا' پاکستان میری زندگی ہے) تاکہ آپ کو علم ہو سکے کہ یہ الزام آپ کی انتظامیہ میں موجود کسی سنڈاس کی متعفن دماغ کی اختراع ہے۔

پیراگراف 7..... ''خارجہ پالیسی پر جس کی تشکیل میں آپ نے بھی بنیادی کردار ادا کیا تھا، بلا جواز تنقید کر کے آپ موجودہ حکومت کے لئے مشکلات پیدا کر رہے ہیں'' میں ان حکّام کا شکر گزار ہوں جنہوں نے از راہ عنایت یہ تسلیم کیا کہ میں نے پاکستان کی خارجہ پالیسی کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ اب اس خارجہ پالیسی کی تشکیلِ نو، ترمیم اور اس کا اطلاق حکومتِ وقت کی ذمہ داری ہے۔

اور اب، جناب صدر، مجھے اجازت دیجئے کہ اپنی گرفتاری کے سرکاری "اسباب" پر اپنی معروضات کے بعد ایک بار پھر صحافیوں سے آپ کی اس گفتگو کا ذکر کروں جس میں آپ نے میری گرفتاری کے "اسبابِ دگر" پر روشنی ڈالی تھی۔ آپ کی بیان کردہ وجوہات ہی میری گرفتاری کی اصل بنیاد ہیں۔ غالباً مجھے مہیا کی جانے والی فہرست فائل کا گھر پورا کرنے کے لئے تیار کی گئی ہے۔

اپنے بیان کے پہلے حصے میں آپ نے کہا ہے کہ میں ابتدائی طور پر مشرقی پاکستان کی شکست و ریخت اور پھر پورے ملک کی تباہی کے درپے ہوں۔ "مشرقی پاکستان کی شکست و ریخت" سے آپ کی کیا مراد ہے؟ کیا میں اس کے حصے بخرے کرنے کی فکر میں ہوں؟ یا پھر آپ کے اسی بیان کے ایک دوسرے اقتباس کے مطابق مجھ سے یہ بھی بعید نہیں کہ میں نے پاکستان کے مخالفین سے مالی اعانت قبول کی ہو نیز یہ کہ ایسے عناصر موجود ہیں جو مشرقی پاکستان کی شکست و ریخت کے مقصدِ واحد کے لئے میرا آلہ کار بننے کو تیار ہیں۔ غالباً آپ کا مطلب یہ ہے کہ میں مشرقی پاکستان کو ہندوستان میں مدغم کرنے کے لئے بھارت سے مالی امداد وصول کر رہا ہوں۔ جناب صدر! اسے ایک بار پھر دل پر ہاتھ رکھ کر کہئے اور اللہ ہمارے درمیان خود ہی انصاف کر لے گا۔ اسی دنیا میں یا اگلے جہاں میں۔ کیونکہ اگر آپ کے یہی جذبات ہیں تو پھر مجھے زندہ نہیں رہنا چاہئے۔ کاش کہ آپ کو علم ہوتا کہ ہندو بھارت میں میرے لئے کوئی جگہ نہیں اور بنگال کے ہندوؤں کے لئے میری موت سے بڑھ کر کوئی خوشی نہیں ہو سکتی۔ ان کیلئے اس سے بڑی مسرت کوئی نہیں ہو سکتی کہ مجھے گاڈسے کے کلہاڑے پر بھینٹ کر دیا جائے۔

ہندو بھارت یا ہندو بنگال کے ساتھ ادغام کا خیال بھی صرف پاکستان کے ساتھ ہی نہیں بلکہ پورے عالمِ اسلام سے غدّاری کے مترادف ہے۔ یہ عمل بنگالی مسلمانوں کو ہندو تعصب کی قربان گاہ پر بھینٹ کرنے کے مترادف ہو گا۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ مجھے اس کا احساس نہیں ہے۔ میں بہت سوں سے کہیں زیادہ واضح طور پر دیکھ رہا ہوں کہ ہندوستان میں انتہاپسند ہندوازم کی لہر اونچی ہو رہی ہے اور ہندوستان میں بسنے والے مسلمانوں کا وجود خطرے میں پڑ گیا ہے۔

ضمیمہ - 2

بنگلہ دیش کی عبوری حکومت کے نام راشد سہروردی کا مکتوب جس میں بیگم اختر سلیمان کے بیان میں یہ مکتوب بیگم اختر سلیمان کے اس بیان کے ردِ عمل میں لکھا گیا تھا جو کہ جون 1971ء میں دیا گیا تھا۔ اس بیان میں مشرقی پاکستان میں فوجی اقدام اور عوام کے قتلِ عام کی حمایت کر کے شہید سہروردی کی شبیہ کو غبار آلود کرنے کی کوشش کی گئی تھی کے ردعمل میں تحریکِ آزادی کی حمایت کی گئی تھی۔

لندن

7 اکتوبر 1971ء

جب سے مجھے مغربی پاکستان کی افواج کے ہاتھوں قتلِ عام اور غارتگری کی اطلاع ملی ہے میری ہمدردیاں اور بھرپور حمایت بنگلہ دیش کے عوام کی تحریکِ آزادی کے ساتھ ہیں۔ سیاست سے براہِ راست تعلق نہ رکھنے کے باعث میں نے ذاتی طور پر اظہارِ رائے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی لیکن چونکہ میرے خاندان کی ایک رکن نے اپنے حالیہ بیانات کے ذریعے میرے والدِ محترم کی شخصیت اور عکس کو مسخ کرنے کی کوشش کی ہے لہٰذا میرے لئے مزید خاموش رہنا قرینِ مصلحت نہیں رہا۔

میں دوٹوک الفاظ میں کہنا چاہتا ہوں کہ میں دل و جان سے بنگلہ دیش کی تحریکِ آزادی کے لئے کامیابی کا خواہاں ہوں۔ گزشتہ 24 برسوں کے دوران مغربی پاکستان نے مشرقی پاکستان کا معاشی استحصال کیا ہے اور ان پر سیاسی بالادستی قائم کیئے رکھی ہے۔ آخر انہوں نے عوام کے بہیمانہ قتلِ عام اور دوسرے بھیانک جرائم سے تنگ آکر ہتھیار اٹھالئے ہیں جو مغربی پاکستان کی فوج نے کیئے ہیں اور اب بھی کر رہی ہے۔

میرے ذہن میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ آزادی کے بہادر مجاہدین بالاخر مکمل آزادی حاصل کرنے میں کامیاب ہوں گے اور غاصب افواج کو اپنی سرزمین سے نکال باہر کریں گے۔ میں بے چینی سے اس دن کی راہ دیکھ رہا ہوں جب میں ایک آزاد اور مختار مملکت بنگلہ دیش میں ہر عقیدے اور ہر سیاسی نقطۂ نظر کے حامل شہریوں کو امن اور ہم آہنگی کے ساتھ زندگی بسر کرتے دیکھ سکوں گا۔

میں بنگلہ دیش کی حکومت کو بھی ہدیۂ تہنیت پیش کرنا چاہتا ہوں جس کے تمام ارکان میرے والد کے رفقائے کار تھے اور ان کی محبتوں کا مرکز تھے۔

ضمیمہ ۔ 3

وزیرِاعظم بنگال حسین شہید سہروردی نے 9 اپریل کو مسلم لیگی قانون سازوں کے دہلی کنونشن میں درج ذیل قرارداد پیش کی۔

"ہر گاہ کہ برصغیر ہندوستان کی وسعتوں میں بسنے والے دس کروڑ مسلمان ایک ایسے عقیدے کے پیروکار ہیں جو کہ محض روحانی عقائد اور رسومات کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ ان کی معاشرتی زندگی کے تعلیمی، سماجی، معاشی اور سیاسی غرضیکہ تمام پہلوؤں میں مکمل رہنمائی کرتا ہے۔ یہ عقیدہ ہندو دھرم اور فلسفے سے قطعی طور پر متضاد ہے جس نے ہزاروں برس سے ذات پات کا ایسا بے لچک نظام قائم کر رکھا ہے کہ اس کے نتیجے میں چھ کروڑ انسان اچھوت بن کر رہ گئے ہیں۔ یہ مذہب انسانوں کے مابین غیر فطری رکاوٹیں کھڑی کرتا ہے، اس نے ملک کے ایک بڑے حصے پر سماجی اور معاشی ناہمواری مسلط کر رکھی ہے اور یہ خطرہ پیدا ہو گیا ہے کہ مسلمان، عیسائی اور دیگر اقلیتیں سماجی اور معاشی سطح پر ناقابلِ تلافی تنزل کا شکار ہو کر رہ جائیں گی؛

ہر گاہ کہ ہندو ذات پات کا نظام قوم پرستی، مساوات اور جمہوریت کے ان اعلیٰ اصولوں کی مکمل نفی کرتا ہے جو اسلام نے پیش کیے ہیں:

ہر گاہ کہ مختلف تاریخی پس منظر، روایات، ثقافت نیز سماجی و معاشی نظام کے اختلافات نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے لئے مل کر متحدہ ہندوستانی قومیت کی تشکیل کرنے کا خواب پریشان کر دیا ہے، ایک ایسی متحدہ قوم کا ظہور ناممکن ہو گیا ہے جس کی اقدار اور مقاصد مشترک ہوں۔

ہر گاہ کہ صدیوں تک اکٹھے رہنے کے باوجود ہندو اور مسلمان دو مختلف قوموں کی حیثیت سے زندہ رہے ہیں۔

ہر گاہ کہ مغربی جمہوریتوں کی طرز پر ہندوستان میں سیاسی ادارے قائم کرنے کی پالیسی کے فوراً بعد یہ واضح ہو گیا تھا کہ قوم یا معاشرے کی اکثریت، اقلیت کی مخالفت کے باوجود ملک پر اپنی مرضی مسلّط کر سکے گی۔ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935ء کے تحت ہندو اکثریتی صوبوں میں کانگریس حکومت کے اڑھائی برسوں میں یہ حقیقت بہت کھل کر سامنے آ گئی تھی جب مسلمانوں کو ناقابلِ بیان جبر و تعدی کا سامنا کرنا پڑا اور انہیں معلوم ہو گیا کہ آئین میں دیئے گئے نام نہاد تحفظات اور گورنروں کے لئے تشکیل کردہ ضابطہ ہائے اخلاق ان کے مفادات کا تحفّظ نہیں کر سکیں گے۔ مسلمان اس ناگزیر نتیجے پر پہنچے کہ متحدہ ہندوستان فیڈریشن وجود میں آئی تو مرکز میں ہندو بالادستی کے باعث مسلم اکثریتی صوبوں میں بھی ان کے مفادات کا تسلی بخش تحفّظ نہیں ہو سکے گا:

ہر گاہ کہ ہمیں کامل یقین ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی بالادستی سے بچانے اور اپنے اجتماعی شعور اور قومی امنگوں کے مطابق ترقی کا موقع فراہم کرنے کا واحد راستہ یہ ہے کہ شمالی مشرقی خطے میں بنگال اور آسام اور شمال مغربی خطّے میں پنجاب، سندھ، بلوچستان اور شمالی مغربی سرحدی صوبے پر مشتمل آزاد اور خود مختار ریاست تشکیل دی جائے:

ہندوستان کے مرکزی اور صوبائی قانون ساز اداروں کے مسلم لیگی ارکان کا یہ کنونشن، پورے غور و خوض کے بعد اعلان کرتا ہے کہ مسلمان متحدہ ہندوستان کے کسی دستور کو کبھی قبول نہیں کریں گے۔ اس مقصد کے لئے قائم ہونے والے کسی دستوری ڈھانچے میں شریک نہیں ہوں گے نیز یہ کہ اگر برطانوی حکومت نے ملک کے داخلی امن اور ہم آہنگی کو یقینی بنانے کے لئے وضع کردہ حسب ذیل منصفانہ اصولوں کو مدِ نظر رکھے بغیر کوئی منصوبہ طے کرنے کی کوشش کی تو ہندوستان کا مسئلہ حل نہیں ہو سکے۔

○ یہ کہ شمال مشرقی خطّے میں آسام اور بنگال اور شمال مغربی خطّے میں پنجاب، شمال مغربی سرحدی صوبے، سندھ اور بلوچستان کے صوبوں پر (جہاں مسلمانوں کی اکثریت موجود ہے) مشتمل خود مختار اور آزاد مملکت قائم کی جائے اور پاکستان کے بلا تاخیر قیام کی واضح اور غیر مبہم ضمانت دی جائے۔

○ پاکستان اور ہندوستان کے علیحدہ علیحدہ دستور بنانے کے لئے دو جداگانہ دستور ساز اسمبلیاں

معرضِ وجود میں لائی جائیں۔

○ 23 مارچ 1940ء کو لاہور میں آل انڈیا مسلم لیگ نے جو قرارداد منظور کی تھی اس کے مطابق ہندوستان اور پاکستان میں اقلیتوں کو تحفظات فراہم کیے جائیں۔

○ مرکز میں عبوری حکومت کی تشکیل میں مسلم لیگ کے تعاون اور شمولیت کی شرطِ اوّلین مطالبۂ پاکستان کی منظوری اور اس پر بلاتاخیر عمل درآمد ہو۔

○ ○ یہ کنونشن اپنے اس عزم کا مکرر اعلان کرتا ہے کہ اگر متحدہ ہندوستان کی بنیاد پر کوئی دستور مسلّط کرنے کی یا مرکز میں مسلم لیگ کے مطالبے کے خلاف جبراً عبوری حکومت قائم کرنے کی کوئی کوشش کی گئی تو مسلمانوں کے لئے اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں رہے گا کہ وہ اپنی بقاء اور قومی تحفظ کے لئے تمام ممکنہ طریقوں سے اس کی مخالفت کریں۔"

حصہ اول کے حواشی

1...... راغب احسن ، "زندگی نہیں ، تاریخ" روزنامہ "اتفاق" سہروردی ایڈیشن ، مدیر تفضّل حسین (مانک میاں) مارچ 1964ء صفحہ نمبر17

2...... شیخ ابو نجیب سہروردی (...... 1167ء) کو سلسلۂ سہروردیہ کا بانی بھی کہا جاتا ہے۔ دیکھئے عبید اللہ العبیدی ، مطبوعات پاکستان ، اکتوبر 1970ء ، کراچی صفحہ نمبر1

3...... راغب احسن ، حوالہ بالا ، صفحہ نمبر17

4...... ایضاً

5 برصغیر میں اشاعتِ اسلام کے حوالے سے جن چار سلاسلِ تصوّف نے اہم کردار ادا کیا۔ سلسلۂ سہروردیہ ان میں سے ایک ہے۔ باقی تین سلسلوں کے نام حسبِ ذیل ہیں۔ قادریہ ، چشتیہ ، نقشبندیہ ، مجددیہ۔

6...... راغب احسن ، حوالہ بالا صفحہ نمبر17

7...... ایضاً

8...... ایضاً

9...... ایضاً

10...... ایضاً

11...... ایضاً

12.......... گوراور پانڈو کی یادداشتیں۔ بحوالہ راغب احسن، حوالہ بالا صفحہ نمبر 17

13..... راغب احسن، حوالہ بالا۔ صفحہ نمبر 17

14..... ایضاً

15..... مولانا عبید اللہ العبیدی سہروردی، حوالہ بالا صفحات 5 تا 11

16..... ایضاً

17..... اس مضمون کی ایک نقل ایشیاٹک سوسائٹی لائبریری، ڈھاکہ میں موجود ہے۔

18..... کے کے عزیز، "سید امیر علی، حیات اور کارنامے" پبلشرز یونائٹڈ لمیٹڈ، لاہور 1968ء صفحہ نمبر 543

19..... ماخذ العلوم، ڈھاکہ یونیورسٹی لائبریری میں اس کتاب کا ایک نسخہ محفوظ ہے۔

20..... مولانا عبید اللہ العبیدی سہروردی، حوالہ بالا صفحہ نمبر 5

21..... ایضاً صفحہ نمبر 3

22..... انعام الحق (مدیر) "نواب بہادر عبداللطیف۔ تحریریں اور متعلقہ دستاویزات" سمودر پروکشانی، ڈھاکہ 1968ء صفحات 215 تا 216

23..... مولانا عبید اللہ العبیدی سہروردی حوالہ بالا صفحہ نمبر 4

24..... ایضاً

25..... محمڈن اینگلو عربیک کالج نے آگے چل کر مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کا روپ اختیار کیا۔

26..... مولانا عبید اللہ العبیدی سہروردی، حوالہ بالا، صفحہ نمبر 5

27..... نواب عبداللطیف، مطبوعاتِ پاکستان، فروری 1970ء کراچی۔ صفحات 11 تا 14 انعام الحق حوالہ بالا صفحہ نمبر 79

28..... سید امیر علی، مطبوعاتِ پاکستان، کراچی فروری 1970ء صفحات 3 تا 8..... کے کے عزیز، حوالہ بالا صفحہ 567

29..... ایم اے قیوم، "ڈھاکہ محمڈن فرینڈز ایسوسی ایشن" ماہ نو (بنگالی ماہنامہ) مطبوعاتِ پاکستان، ڈھاکہ اپریل 1967ء صفحہ نمبر 17۔ ایس ایم علی۔ "مولانا عبید اللہ العبیدی، ماہِ نو (بنگالی ماہنامہ) مطبوعاتِ پاکستان۔ ڈھاکہ جولائی 1967ء صفحہ نمبر 7

30..... مولوی ہمت علی ایسوسی ایشن کے صدر اور مولوی عبدالمجید سیکرٹری مقرر ہوئے، حمایت الدین اور مولوی زاہد الرحمن ایسوسی ایشن کے جائنٹ سیکرٹری تھے۔ بحوالہ ایس ایم علی، حوالہ بالا صفحہ نمبر 6 تا 7

31..... ایم اے قیوم۔ حوالہ بالا صفحہ نمبر 31

32..... ایضاً صفحات 31 تا 34

33.....ایضاً

34.....ایضاً

35.....نورالدین احمد "حسین شہید سہروردی، ہماری تاریخ کا سپوت" روزنامہ "اتفاق" سہروردی ایڈیشن حوالہ بالا۔ صفحات 159 - 160

36.....ایضاً صفحہ 159

37.....راغب احسن، حوالہ بالا صفحہ 18

نورالدین احمد، حوالہ بالا صفحہ 159

38.....ایضاً

39.....ایضاً

40.....نورالدین احمد، حوالہ بالا صفحات 159 تا 160

41.....مجیدیہ ایک اعزاز تھا جو کارہائے نمایاں سرانجام دینے والے اشخاص کو سلطنتِ عثمانیہ کی طرف سے ملتا تھا اس اعزاز کا سلطان عبدالعزیز نے 1852ء میں سلطان عبدالمجید کے نام پر جاری کیا تھا۔

42.....راغب احسن، حوالہ بالا صفحہ 18

43.....نورالدین احمد، حوالہ بالا صفحہ 160

44.....راغب احسن، حوالہ بالا صفحہ 18

45.....ایضاً

46.....ایضاً

47.....ابوالفضل "سہروردی، تاریخ کے آئینے میں" روزنامہ "اتفاق" سہروردی ایڈیشن حوالہ بالا صفحہ 133

48.....راغب احسن حوالہ بالا صفحہ 19

49.....کے۔ احمد "بنگال کی قومی نشاۃِ ثانیہ اور سہروردی" روزنامہ "اتفاق" سہروردی ایڈیشن حوالہ بالا صفحہ نمبر 147

50.....ایضاً

51.....راغب احسن حوالا بالا صفحہ نمبر 19

52.....ایضاً

53.....1924ء میں انڈین نیشنل کانگریس میں اس سوال پر اختلافات پیدا ہو گئے کہ کونسل کے انتخابات کا بائیکاٹ کیا جائے یا قانون ساز اداروں میں پہنچ کر آزادی کی جدوجہد کو جاری رکھا جائے۔ چنانچہ سوراج پارٹی کا قیام عمل میں آیا دوسروں کے علاوہ ڈاکٹر راجندر پرساد اور راج گوپال اچاریہ نے بھی سی آر داس کی مخالفت کی۔ اور یوں کانگریس میں ترقی پسند اور رجعت پسند دھڑے وجود میں آگئے۔ موخر

الذکر گروہ گاندھی کے راست اقدام کے لائحہ عمل کا حامی تھا۔ سی آر داس نے حکیم اجمل خان اور پنڈت نہرو کے ساتھ ملکر 1923ء میں سوراج پارٹی کی بنیاد رکھی۔ دیکھئے ''انڈیا ونز فریڈم'' مصنّف مولانا ابوالکلام آزاد اورینٹ لانگ مینز، کلکتہ 1960ء صفحات 20۔ 21

54..... ابوالفضل، حوالا بالا صفحہ 133

55..... راغب احسن، حوالہ بالا صفحہ 19

56..... شیخ مجیب الرحمٰن ''میرا قائد، جیسے میں نے دیکھا'' روزنامہ ''اتفاق'' سہروردی ایڈیشن، حوالہ بالا صفحہ 146 شیخ مجیب الرحمٰن، شہید سہروردی کے قریب ترین سیاسی معتمدین میں سے ایک تھے۔ وہ حسین شہید سہروردی کی وفات کے بعد عوامی لیگ کے صدر بنے۔ جب سیاسی جماعتوں کا احیاء ہوا تو عوامی لیگ نے شیخ مجیب کے دیئے ہوئے چھ نکات کی بناء پر 1970ء کے انتخابات میں حصہ لیا اور شاندار فتح حاصل کی۔ مرکز کی طرف سے انتقالِ اقتدار میں تعویق کی بناء پر شیخ مجیب نے پر امن احتجاجی تحریک شروع کر دی انہیں گرفتار کر لیا گیا اس کے بعد شروع ہونے والی خانہ جنگی کے نتیجے میں مشرقی پاکستان آزاد ہو گیا اور شیخ مجیب اس کے صدر (اور وزیر اعظم) بنے۔ انہیں 15 اگست 1975ء کو بغاوت کے دوران قتل کیا گیا۔

57..... یاداشتیں صفحہ نمبر 102

58..... راجپال نے اس کتاب میں پیغمبرِ اسلامؐ کی خانگی زندگی سے مثالیں اخذ کر کے تعدادِ ازدواج کے نقائص گنوانے کی کوشش کی تھی۔ اس کتاب کی اشاعت سے مسلمانوں کے مذہبی جذبات بری طرح مجروح ہوئے مصنف پر لاہور ہائی کورٹ میں مقدمہ چلایا گیا مگر جسٹس کنور دلیپ سنگھ نے اسے بری کر کے پورے برصغیر میں ہنگامہ آرائی اور تشدّد کا دروازہ کھول دیا۔ گائے کے ذبیحہ یا مسجدوں کے سامنے ڈھول بجانے پر بھی کبھی اس پیمانے کے فسادات نہیں ہوئے تھے۔ تفصیلات کے لئے دیکھئے محمد نعمان، ''مسلم انڈیا'' کتابستان (پہلا ایڈیشن) 1942ء الہ آباد صفحات 221، 217، 225

59..... سہروردی نے بیرسٹر لانگ فورڈ جیمز سے رابطہ کیا اور ہائی کورٹ میں اپیل دائر کروا دی مگر ہائی کورٹ نے اپیل مسترد کر دی۔ حتیٰ کے پریوی کونسل نے بھی موت کی سزا برقرار رکھی پھر بیرسٹر جیمز نے گورنر بنگال سے رحم کی اپیل کی اور یوں غریب آدمی کی جان بچ سکی۔ دیکھئے ''حسین سہروردی'' مارننگ نیوز ''سہروردی ضمیمہ'' 5 دسمبر 1969ء

عزیز الرحمٰن، ''وہ ہمارے دلوں میں بستا ہے'' روزنامہ ''اتفاق'' سہروردی ایڈیشن حوالہ بالا صفحہ 169

60..... راغب احسن حوالہ بالا صفحہ 19

61..... سہروردی ''ذاتی یادداشتیں'' یہ دستاویز حسین شہید سہروردی کی بیٹی بیگم اختر سلیمان کی تحویل میں ہے۔ (اس کی ایک نقل راقم الحروف کے پاس موجود ہے) صفحہ نمبر 9

62..... یادداشتیں صفحہ 103

63..... راغب احسن حوالا صفحہ 19

64..... ایضاً

65..... ایضاً

66..... ان رہنماؤں میں مولانا ابوالکلام آزاد' چودھری خلیق الزماں 'مولانا محمد اکرم خان' رفیع احمد قدوائی' ڈاکٹر ایم اے انصاری' مولانا ظفر علی خان' ٹی اے شیروانی اور سر علی امام شامل تھے۔

67..... سہروردی "ذاتی یادداشتیں" حوالہ بالا صفحہ 10

68..... مجیب الرحمٰن' حوالا بالا صفحہ 146

69..... راغب احسن' حوالہ بالا صفحہ 19

70..... ایضاً

71..... ایضاً

72..... یادداشتیں صفحہ 114' راغب احسن' حوالہ بالا صفحہ 19

73..... راغب احسن' حوالہ بالا صفحہ 19

74..... ایضاً صفحہ 20

75..... ایضاً

76..... ابوالفضل حوالہ بالا صفحہ 138

77..... رنگالال سین' "بنگلادیش کی سیاسی اشرافیہ" یونیورسٹی پریس لمیٹڈ' ڈھاکہ 1986ء صفحہ 40

یادداشتیں صفحہ 103

رنگالال سین اور راغب احسن نے اس جماعت کو "بنگال مسلم یونائیٹڈ پارٹی" کے نام سے موسوم کیا ہے۔

78..... بنگال کے مسلم رہنما مزارعین کے حقوق میں زیادہ دلچسپی رکھتے تھے بنگال کے قانون دخیل کاری 1928ء کے اجراء کے بعد (اس قانون میں مالکانِ اراضی کو زیادہ اختیارات سے نوازا گیا تھا) ان لوگوں نے 1929ء میں نکھیل بانگو پرجا سمتی کے نام سے ایک جماعت قائم کی۔ سر عبدالرحیم اس جماعت کے صدر بنے۔ مولانا محمد اکرم خان کو سیکرٹری منتخب کیا گیا۔ 1935ء میں دوبارہ انتخابات کے نتیجے میں اے کے فضل الحق اس جماعت کے سربراہ بن گئے۔ اگلے برس کسانوں میں زیادہ مقبولیت کے حصول کی خواہش کے مدِ نظر اس جماعت کا نام بدل کر کرشک پرجا پارٹی رکھ دیا گیا۔

79..... راغب احسن' حوالہ بالا صفحہ نمبر 20

80..... ایضاً

رنگلال سین حوالہ بالا صفحہ 39-40
81۔۔۔ یادداشتیں صفحہ 103
82۔۔۔ رنگلال سین حوالہ بالا صفحہ 40
83۔۔۔ سہروردی "ذاتی یادداشتیں" حوالہ بالا صفحہ 13
84۔۔۔ رنگلال سین حوالہ بالا صفحات 40، 42
85۔۔۔ کے احمد "بنگال کی سیاسی و سماجی تاریخ اور بنگلہ دیش کا قیام" پائنیر پرنٹنگ پریس (چوتھا ایڈیشن) ڈھاکہ 1975ء صفحہ 34
86۔۔۔ رنگلال سین، حوالہ بالا صفحہ 42
87۔۔۔ ایضاً صفحات 42 تا 43
88۔۔۔ کے احمد حوالہ بالا صفحہ 48
89۔۔۔ بحوالہ رنگلال سین حوالہ بالا صفحہ 48
90۔۔۔ کے احمد حوالہ بالا صفحہ 36
91۔۔۔ حسین شہید سہروردی، مطبوعاتِ پاکستان، کراچی، اپریل 1970ء صفحہ 10
92۔۔۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران جاپانی خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے وائسرائے ہند نے جو وار کونسل تشکیل دی تھی فضل الحق اس میں شامل ہو گئے۔ ان کے اس اقدام سے پیدا ہونے والے تنازعے کے نتیجے میں فضل الحق نے مسلم لیگ سے استعفیٰ دیدیا۔ فضل الحق سر سکندر حیات خان، بیگم شاہنواز اور چند دوسرے مسلم زعماء نے وائسرائے کے مدعو کرنے پر مسلم لیگ سے رائے لئے بغیر نیشنل ڈیفنس کونسل میں شمولیت اختیار کر لی تھی، جناح نے ان سب سے استعفیٰ دینے کے لئے کہا اور انہوں نے تعمیل کی۔ فضل الحق نے یہ کہتے ہوئے استعفیٰ دیا کہ ان کے خیال میں موجودہ حالات میں وار کونسل میں ان کی موجودگی سے کوئی مقصد حاصل نہیں ہو رہا تھا۔ انہوں نے یہ بھی دعویٰ کیا کہ وہ یہ سوچ کر نیشنل ڈیفنس کونسل میں شامل ہوئے تھے کہ دورانِ جنگ ایسی سول حکومت بے دست و پا ہو کر رہ جائے گی جس کا سربراہ وار کونسل میں نمائندگی سے محروم ہو گا چنانچہ انہیں فیصلہ کرنا تھا کہ وہ مسلم لیگ سے عہدِ وفا نبھائیں گے یا بنگالی عوام سے وفاداری کا پاس کریں گے۔

یہ امر قابلِ غور ہے کہ فضل الحق نے تاریخی قراردادِ لاہور پیش کی تھی، اس کے ایک ہی برس کے اندر انہیں مسلم لیگ سے کیوں نکالا گیا یا ان کے اپنے دعویٰ کے مطابق ان کے استعفیٰ کی نوبت کیوں آئی۔ مسلم لیگ کے لاہور اجلاس کی ابتداء میں جناح نے خاصی توہین محسوس کی تھی کہ جب وہ صدر اجلاس کی حیثیت سے افتتاحیہ خطبہ پیش کر رہے تھے تو فضل الحق پنڈال میں داخل ہوئے۔ اہلِ لاہور نے "شیر بنگال۔ زندہ باد" کے فلک شگاف نعروں سے آسمان سر پر اٹھا لیا اور مطالبہ کیا کہ پہلے فضل الحق خطاب کریں۔ عوام کو پہلے صدر اجلاس کی تقریر سننے پر آمادہ کرنے میں فضل الحق کو تقریباً آٹھ منٹ لگے۔

جناح نے اس پر جملہ کسا "جب شیر میدان میں آجائے تو میمنے کو پیچھے ہٹ جانا چاہئے" غالباً جناح نے اپنی انا پر اس چوٹ کو فراموش نہیں کیا اور پہلا موقع ملتے ہی فضل الحق کو مسلم لیگ سے نکال باہر کیا۔ یہ واضح طور پر شخصیات کا تصادم تھا۔ فضل الحق کئی بار یہ کہتے پائے گئے تھے کہ وہ کئی ہزار جناح اپنی جیب میں ڈال سکتے ہیں۔

سہروردی، جناح کا بے حد احترام کرتے تھے مگر انہیں ہمیشہ جناح سے یہ گلا رہا کہ وہ انہیں مسلم لیگ کی مرکزی مجلسِ عاملہ کا رکن نامزد نہیں کرتے تھے۔ لیاقت علی خان اور حسن اصفہانی بڑی مستقل مزاجی سے مسلم لیگ کی مجلسِ عاملہ میں سہروردی کی رکنیت کی مخالفت کرتے تھے۔ حتیٰ کے جب سہروردی پورے برصغیر میں مسلم لیگ کے واحد وزیر اعظم تھے، انہیں اس وقت بھی مسلم لیگ کی مرکزی مجلسِ عاملہ کا رکن نامزد نہیں کیا گیا۔ خواجہ ناظم الدین اور حسن اصفہانی (خواہ یہ حضرات اقتدار میں شامل ہوں یا نہ ہوں) ہمیشہ بنگال کی نمائندگی کے لئے منتخب کئے جاتے رہے۔ جناح سے سہروردی کے اختلافات کی تفصیل کے لئے دیکھئے رنگالال سین، حوالہ بالا صفحات 53 تا 57۔

93..... کے احمد حوالہ بالا صفحہ 58

94..... فوڈ کانفرنس تمام صوبوں اور اہم ہندوستانی ریاستوں کے نمائندوں پر مشتمل تھی۔ ان صوبوں اور ریاستوں میں سے بعض خوراک کی کمی کا شکار تھیں اور بعض میں خوراک کے اضافی ذخائر موجود تھے کانفرنس کا مقصد یہ تھا کہ اناج کی قلت وافراط کا تخمینہ لگایا جائے اور اضافی اناج کو ضرورت مند علاقوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ اس ضمن میں مصدقہ اور قابلِ اعتماد اعداد وشمار دستیاب نہیں تھے۔ اضافی اناج رکھنے والے صوبے اپنے ذخائر کی مقدار کم سے کم بیان کرتے تھے اور قلت کا شکار صوبے اپنی احتیاج کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتے تھے۔

95..... سہروردی "ذاتی یادداشتیں" حوالہ بالا صفحہ 15

96..... شیخ مجیب الرحمن "میرا قائد..... امن کا پیامبر" مارننگ نیوز، سہروردی سپلیمنٹ، کراچی، 5 دسمبر 1969ء صفحہ نمبر 11

97..... ایضاً

98..... کے احمد، حوالہ بالا صفحہ 59

99..... سہروردی نے عدم تعاون کی یہ راہ صوبے سے چاول کی خریداری کے لئے حسن اصفہانی کی بطور سول ایجنٹ تقرری کے باعث بھی اختیار کی تھی۔ سہروردی نے اصفہانی سے رابطہ کر کے چند ہندوؤں کو بھی ایجنٹ مقرر کرنے کی اجازت چاہی، اس پر بنگال میں جناح کا معتمد ترین دوست حسن اصفہانی بھڑک اٹھا اور سہروردی کا مخالف بن گیا۔ اس نے سہروردی کی اس جسارت کو کبھی معاف نہیں کیا۔ اصفہانیوں کے بارسوخ خاندان نے 1946ء کے انتخابات کے بعد پارلیمانی قیادت کے چناؤ میں خواجہ ناظم الدین کا ساتھ دیا اور سہروردی کی شکست میں اہم کردار ادا کیا۔

100...... قحط تحقیقاتی کمیشن نے 15 لاکھ اموات کی تصدیق کی لیکن باخبر ذرائع کے مطابق مرنے والوں کی تعداد 50 لاکھ سے تجاوز کر گئی تھی۔ دیکھئے متین الدین احمد "1943ء کا قحطِ بنگال ' برطانوی ذمہ داری اور معاشرتی نتائج"

ڈھاکہ یونیورسٹی سٹڈیز حصہ اول ' جلد 28۔ جون 1978ء صفحہ 75

قحط کے دلدوز مناظر کے لئے ملاحظہ فرمایئے۔ پاکستان آرٹ فولیوز (زین العابدین) دی آرٹ فاؤنڈیشن ' مطبوعاتِ پاکستان ' کراچی 1968ء قحط زدہ انسانیت کی اذیت سے متاثر ہو کر زین العابدین نے قحط کی بے حد تیکھی عکاسی کی تھی۔

101...... بحوالہ رنگالال سین حوالہ بالا صفحات 62 تا 64

102...... حسین شہید سہروردی حوالہ بالا صفحہ 15

103...... تفضل حسین (مانک میاں) "بحرِ بیکراں" اتفاق (روزنامہ) سہروردی ایڈیشن حوالہ بالا صفحہ 36

104...... ابوالمنصور احمد "شہید سہروردی ' ایک مدبّر" پاکستان آبزرور ' سہروری سپلیمنٹ 5 دسمبر 1969ء

105...... ایس اسلام "حسین شہید سہروردی ' ایک خراجِ تحسین" پاکستان آبزرور سہروردی سپلیمنٹ ' 5 دسمبر 1969ء۔

106...... 2 جولائی 1945ء کو تحریر کیا جانے والا یہ اصل مکتوب شمس الحسن کے پاس محفوظ ہے جو اس وقت آل انڈیا مسلم لیگ کے آفس سیکرٹری تھے۔ مزید دیکھئے شریف الدین پیرزادہ "قرار داد لاہور" ڈان ' یوم پاکستان سپلیمنٹ ' 23 مارچ 1970ء

107...... سہروری خاندان سے ذاتی خط و کتابت مزید دیکھئے کے احمد ' حوالہ بالا صفحہ 68 اور رنگالال سین حوالہ بالا صفحات 65۔ 66

108...... کے۔ احمد۔ حوالہ بالا صفحہ 46

109...... مانسرغ اور لمبی (مدیران) "ہندوستان اور برطانیہ کے آئینی تعلقات انتقالِ اقتدار کی دستاویزات" جلد ششم (1947ء۔ 1942ء) لندن 1970ء صفحہ 196 بحوالہ رنگالال سین ' حوالہ بالا صفحہ 66

110...... لیاقت علی خان "آل انڈیا مسلم لیگ کی قرار داد (1946ء۔ 1945ء)" ادارہ قومی دستاویزات اسلام آباد ' پاکستان ' (فوٹو سٹیٹ نقل) صفحات 35 تا 47۔ مزید دیکھئے "اتفاق" سہروردی ایڈیشن حوالہ بالا صفحات 57۔ 58

111...... ایضاً

112...... آل انڈیا مسلم لیگ نے 29 جولائی 1946ء کو بمبئی میں منعقد ہونے والے اجلاس میں

کابینہ مشن منصوبہ قبول کر لیا لیکن اسی اجلاس میں راست اقدام کے لئے قرار داد بھی حسب ذیل الفاظ میں منظور کی "یہ اجلاس ہندوستانی مسلمانوں سے درخواست کرتا ہے کہ وہ جسدِ واحد کی طرح متحد ہو کر اپنی واحد نمائندہ تنظیم مسلم لیگ کی پشت پناہی کریں اور ہر نوع کی قربانیوں کے لئے تیار رہیں"۔

113 ...... ہندوستان میں برطانوی اقتدار کے آخری اٹھارہ مہینوں کے دوران ایسٹرن کمانڈ کے جنرل آفیسر کمانڈنگ، لیفٹننٹ جنرل سر فرانسس ٹکر لکھتے ہیں "اس منصوبے کے پیچھے ہندو مہاسبھا کا ہاتھ تھا لیکن ہندو پولیس نے خفیہ برانچ اور سی۔ آئی۔ ڈی میں اجارہ داری قائم کر رکھی تھی اور ان عناصر نے حکومت کو تاریکی میں رکھا۔" ان کی کتاب دیکھئے "جب تک حافظہ قائم ہے" کیسل اینڈ کمپنی لمیٹڈ، لندن 1950ء (بحوالہ کے۔ احمد، حوالہ بالا، صفحہ 158)

114 ...... تفضّل حسین، حوالہ بالا صفحات 137۔ 136۔ فرانسس ٹکر نے اس انکار کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے "بریگیڈیر سکس سمیتھ نے سہروردی کو حسبِ معمول جواب دیا کہ فوج کے لئے اپنے فرائض کو بہترین طریقے سے انجام دینے کا یہی لائحہ عمل ہے کہ آمد و رفت کے اہم راستوں کو صاف رکھا جائے اور وقت پڑنے پر ان راستوں کے لئے فوجی دستوں کو موثر کارروائی کے لئے استعمال کیا جا سکے۔" دیکھئے "جب تک حافظہ قائم ہے" حوالہ بالا صفحہ 158

115 ...... تفضّل حسین، حوالہ بالا صفحات 136۔ 137، 193

116 ...... ان ممتاز رہنماؤں میں ابو الہاشم، سرت چندر بوس، سریندر موہن بوس اور کرن شنکر رائے شامل تھے۔ دیکھئے ایضاً صفحہ 137

117 ...... ٹکر لکھتے ہیں "تلواروں، آہنی سلاخوں اور آتشیں ہتھیاروں سے مسلح ہندوؤں اور سکھوں سے لدی ہوئی بسیں اور ٹیکسیاں ہر طرف گھوم رہی تھیں" کشتگانِ ستم کی تعداد کے بارے میں ٹکر لکھتے ہیں "مجھے یا کسی کو بھی مرنے والوں کی صحیح تعداد کا علم نہیں۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہلاک شدگان کی تعداد ہزاروں سے متجاوز تھی" دیکھئے "جب تک حافظہ قائم ہے" حوالہ بالا صفحات 161۔ 163، 165

118 ...... تفضّل حسین، حوالہ بالا صفحات 136۔ 137

119 ...... ایضاً

120 ...... ایضاً

121 ...... ایضاً

122 ...... حسن اصفہانی "قائدِ اعظم، میری نظر میں" فارورڈ پبلی کیشنز ٹرسٹ، کراچی، پاکستان 1966ء صفحہ 193

123 ...... مجیب الرحمٰن، حوالہ بالا صفحات 171۔ 170

124 ...... ایم۔ این ہدی "سہروردی، میری نظر میں" روزنامہ "اتفاق" سہروردی ایڈیشن، حوالہ بالا

صفحہ 158

125۔.....کے۔ احمد حوالہ بالا صفحہ 149۔ 148

126.....ایضاً صفحہ 149

127.....ایضاً

128.....راغب احسن حوالہ بالا صفحات 20۔ 21

کے احمد ' حوالہ بالا صفحہ 149

کے احمد ' حوالہ بالا صفحہ 72

129.....عبوری وزارت میں سرجوگندر ناتھ منڈل کو بنگال کی نمائندگی کے لئے نامزد کیا گیا جو کہ اس وقت کی سیاسی صورتِ حال میں ایک مذاق کے مترادف تھا۔

اس سے دوسرے صوبوں کے مسلم لیگی رہنماؤں اور خاص طور پر جناح کی بے حسی اور بنگال دشمنی کے رجحانات کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ سہروردی نے اسے بنگال سے ناانصافی قرار دیا مگر جناح صاحب نے ان کی ایک نہ سنی۔

130.....راغب احسن حوالہ بالا صفحہ 21

131.....پیپر پرسیول "ہندوستان ' جدید تاریخ" مشی گن سٹیٹ یونیورسٹی 1961ء صفحہ 416

132.....ماونٹ بٹن نے ہندوستان کی تقسیم امور اثاثوں کی بندر بانٹ میں خطرناک حد تک جلد بازی سے کام لیا۔ اس ضمن میں خدشات اس وقت صحیح ثابت ہوئے جب مسلم اکثریت کے علاقے غیر قانونی طور پر بھارت کے سپرد کر دئے گئے اور بنگال کو تقسیم کر دیا گیا۔ ماؤنٹ بٹن نے اس منصوبے پر کانگریس کے چوٹی کے رہنماؤں سے ملی بھگت کر کے عمل کیا اس غدّاری کے صلے میں اسے آزاد ہندوستان کا پہلا گورنر جنرل مقرّر کیا گیا۔

133.....کے۔ احمد ' حوالہ بالا صفحہ 81

134.....ایضاً صفحات 63۔ 78

135.....راغب احسن "عظیم تر بنگال کے منصوبے کی درونِ خانہ تاریخ" (بنگال پیکٹ کا مسودہ) جناح عوامی مسلم لیگ 1951ء (زیرِ نظر کتاب کے مدیر کے پاس جو ٹائپ شدہ نقل ہے ' صفحات اس کی ترتیب سے بیان کئے جا رہے ہیں)

136.....کے۔ احمد ' حوالہ بالا ' صفحات 88۔ 89

137.....تفضّل حسین (مانک میاں) "پاکستانی سیاست کے بیس سال" بنگلہ دیش بکس انٹرنیشنل لمیٹڈ (مرتبہ ' غلام حفیظ) دوسرا ایڈیشن فروری 1984ء صفحہ 28

138.....ہوڈسن نے اپنی کتاب "عظیم تقسیم" میں انکشاف کیا ہے کہ مسٹر جناح بنگالی ہندوؤں کو بھی

رعایت دینے پر تیار ہو گئے تھے۔ ایک مرحلے پر جب یہ تجویز پیش کی گئی کہ بنگال کو متحد رکھا جائے اور پاکستان میں شامل نہ کیا جائے تو انہوں نے جواب دیا "مجھے اس پر خوشی ہوگی۔ آخر کلکتہ کے بغیر بنگال کس کام کا؟ اس سے کہیں بہتر ہے کہ وہ آزاد رہیں اور متحد رہیں" ہوڈسن کا کہنا ہے کہ انتقالِ اقتدار کے اصل منصوبے میں بنگال کے لئے یہ متبادل موجود تھا کہ وہ اپنا وحدت کے طور آزاد ہو سکے لیکن نہرو نے اس تجویز کی مخالفت کی۔ بحوالہ کے۔ احمد حوالہ بالا صفحہ 88 تفضّل حسین حوالہ بالا صفحہ 28

139 ..... راغب احسن حوالہ بالا صفحہ 5

140 ..... ایضاً صفحہ 9

141 ..... کے۔ احمد، حوالہ بالا صفحہ نمبر 63

142 ..... ایضاً

143 ..... یہ تینوں گروپ حسب ذیل تھے۔

گروپ (اے) = مدارس، بمبیے، یوپی، بہار، سنٹرل پراونس اور اڑیسہ۔

گروپ (بی) = پنجاب شمال مغربی سرحدی صوبہ، سندھ

گروپ (سی) = بنگال اور آسام

144 ..... "ملکِ معظم کی حکومت کو سوچنا پڑے گا کہ ہندوستان میں مرکزی اقتدارِ اعلیٰ کی ذمہ داری کسے سونپی جائے، آیا ہندوستان میں برطانوی راج کی جگہ لینے کے لئے مرکزی حکومت جیسا کوئی ادارہ سامنے آسکے گا یا بعض خطّوں میں اقتدارِ اعلیٰ صوبائی حکومتوں کے سپرد کرنا پڑے گا۔" بحوالہ کے۔ احمد، حوالہ بالا صفحہ 78

145 ..... مجوّزہ ریاست کو تین زونوں میں تقسیم کیا جانا تھا۔

(1) مرکزی = چٹاگانگ اور ڈھاکہ کے مسلم اکثریتی اضلاع، پریذیڈنسی، راج شاہی ڈویژن اور ضلع سلہٹ

(2) مشرقی = سلہٹ کے علاوہ پورا صوبہ آسام

(3) مغربی = بردوان اور پورنیہ

146 ..... کے۔ احمد، حوالہ بالا صفحہ 81

147 ..... ایضاً

148 ..... ایضاً

149 ..... تفضّل حسین حوالہ بالا صفحہ 29

150 ..... ایضاً صفحہ 29-30

151 ..... ایضاً

152 ..... کے۔ احمد، حوالہ بالا صفحہ 81

153..... راغب احسن، حوالہ بالا صفحہ 10

154..... ایضاً صفحات 11-12

155..... خاکہ حسب ذیل ہے۔

(1) بنگال میں مسلم لیگ کی حکومت برسرِ اقتدار رہے گی تاہم ہندو وزراء کی جگہ بنگال کانگریس کے نامزد کردہ وزراء لئے جائیں گے۔

(2) بنگال ہندوستان یا پاکستان میں شامل ہونے کی بجائے آزاد رہے گا۔ بنگال کے پاکستان یا ہندوستان میں شامل ہونے یا پھر آزاد رہنے کا فیصلہ بالغ حقِ رائے دہی کی بنیاد پر منتخب ہونے والی دستور ساز اسمبلی کرے گی۔

(3) مسلمانوں، ہندوؤں، شیڈولڈ کاسٹ اور دیگر اقلیتوں کے لئے نشستوں کی تعداد کا تعین آبادی میں ان کے حصے کی بنیاد پر ہو گا۔

(4) وزیر اعظم مسلمان ہو گا۔

(5) وزراء کی کونسل میں اصولِ مساوات کا اطلاق ہو گا۔

156..... پیارے لال "مہاتما گاندھی۔ شام حیات" بحوالہ کے۔ احمد، حوالہ بالا صفحات 81-82

157..... ایضاً صفحہ 82

158..... ایضاً

159..... ایضاً

160..... راغب احسن حوالہ بالا صفحہ 15

161..... راغب احسن حوالہ بالا صفحہ 18

162..... ماؤنٹ بیٹن نے بعد ازاں تقسیمِ بنگال میں اپنے گھناؤنے کردار کا اعتراف کر لیا۔ 6 اکتوبر 1948ء کو لندن میں رائل ایمپائر سوسائٹی سے خطاب کرتے ہوئے ماؤنٹ بیٹن نے کہا "مسٹر جناح نے بنگال اور پنجاب کی تقسیم کے خلاف مضبوط ترین دلائل پیش کئے۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ صوبے قومی خصوصیات کے حامل ہیں اور انہیں تقسیم کرنا تباہ کن ثابت ہو گا۔ میں نے اتفاق کیا مگر مسٹر جناح سے کہا کہ یہی دلائل تو متحدہ ہندوستان کے حق میں بھی پیش کئے جا سکتے ہیں۔ اس پر مسٹر جناح نے تقسیمِ ہند کے حق میں دلائل دینا شروع کر دیئے یوں ہماری گفتگو برہان دوری میں داخل ہو گئی حتیٰ کہ مسٹر جناح نے محسوس کر لیا کہ یا تو انہیں متحدہ ہندوستان قبول کرنا ہو گا ورنہ ہندوستان کی تقسیم کی صورت میں پنجاب اور بنگال بھی تقسیم ہوں گے۔ مسٹر جناح نے موخر الذکر راستے کا انتخاب کر لیا۔" بحوالہ کے۔ احمد حوالہ بالا۔ صفحہ 83

163..... 1905ء میں تقسیمِ بنگال کے نتیجے میں مشرقی بنگال اور آسام پر مشتمل مسلم اکثریتی صوبہ

معرضِ وجود میں آیا۔ اس تقسیم کے پیچھے مندرجہ ذیل عوامل کار فرما تھے۔ (1) برطانوی حکومت کو بنگالی مسلمانوں سے ہونے والی زیادتیوں کا احساس ہو رہا تھا۔ (2) بنگال پریذیڈنسی میں بنگال ' آسام اور اڑیسہ شامل تھے۔ اتنے بڑے علاقے کو ایک ہی صوبائی حکومت کے تحت رکھنے سے انتظامی مشکلات پیدا ہو رہی تھیں۔ دیکھئے نواب سلیم اللہ ' مطبوعات پاکستان ' فروری 1970ء ' کراچی ' پاکستان صفحات 1-2

164 ...... اقلیت (46 ٪) میں ہونے کے باوجود ہندو معاشی اور سیاسی طور پر مسلمانوں سے بہت آگے تھے۔ یقیناً ان لوگوں کو مسلم لیگ حکومت کی تشکیل سے مایوسی ہوئی تھی۔

165 ...... زرعی اراضی کو قومی تحویل میں لینا کرشک پرجا پارٹی کے انتخابی منشور کا حصہ تھا۔

166 ...... " آل انڈیا مسلم لیگ کے صدارتی خطبات۔ 1946ء۔ 1934ء " ادارہ قومی دستاویزات۔ اسلام آباد ' صفحہ 27 ' اے۔ کے فضل الحق مطبوعات پاکستان ' کراچی ' 1970ء صفحہ 3

167 ...... راغب احسن حوالہ بالا صفحہ 21-22
تفضّل حسین حوالہ بالا صفحہ 136

168 ...... راغب احسن حوالہ بالا صفحہ 22

169 ...... ایضاً

170 ...... تقسیم کے مسائل پر کانگریس اور مسلم لیگ کے مذاکرات کے دوران صرف جناح ' لیاقت علی خان اور سردار عبدالرب نشتر مسلم لیگ کی نمائندگی کر رہے تھے۔ مذاکرات کی میز پر کوئی بنگالی موجود نہیں تھا۔ اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھا کر لارڈ ماؤنٹ بٹن نے بنگال اور آسام کے مسلمانوں کے ساتھ عظیم ناانصافیاں کیں، خاص طور پر کلکتہ ' اقلیتی مغربی بنگال کے سپرد کر دیا گیا۔ اگر کلکتہ مغربی بنگال میں شامل نہ کیا جاتا تو کانگریس یا ہندو مہاسبھا کو شہہ نہ ملتی کہ تقسیمِ بنگال کا مطالبہ کریں۔ مسلم لیگ کی اعلیٰ قیادت نے ایک ہی تیر سے دو شکار کرتے ہوئے بنگال مسلم لیگ کے مشرقی بنگال گروپ کو انگیخت کی کہ کلکتہ کو مشرقی بنگال میں شامل کرنے کا مطالبہ ترک کر دے۔ اس سے ایک طرف تو سہروردی الگ تھلگ ہو کر رہ گئے۔ دوسرے یہ خدشہ جاتا رہا کہ مستقبل میں کبھی کلکتہ کو پاکستان کا دارالحکومت بنانے کا مطالبہ کیا جا سکے گا۔ پنجاب کے مسلمانوں کے متفقہ مطالبے پر وائسرائے ہند مجبور ہو گیا تھا کہ لاہور کو مغربی پنجاب میں شامل کر دے در آں حالیکہ پنجاب کو بھی بنگال کی طرح مذہبی بنیادوں پر تقسیم کیا گیا تھا۔

171 ...... تفضّل حسین حوالہ بالا صفحہ 136

172 ...... مجیب الرحمٰن حوالہ بالا صفحہ 143
کے احمد ' حوالہ بالا صفحہ 85
تفضّل حسین ' حوالہ بالا صفحہ 136

173۔۔۔۔۔کے۔ احمد ‘حوالہ بالا صفحہ 85

174۔۔۔۔۔27جون کو مشرقی پاکستان مسلم لیگ کی مجلسِ عاملہ کا ہنگامی اجلاس بلایا گیا۔ اجلاس میں مجلس عاملہ کے صرف چھ ارکان شریک تھے۔ اجلاس نے فیصلہ کیا کہ ڈھاکہ کو عارضی طور پر صوبے کا دارالحکومت بنایا جائے اور اس کے معاوضے کے ضمن میں مرکزی حکومت سے کوئی مطالبہ نہ کیا جائے۔
مجیب الرحمن ‘حوالہ بالا صفحہ 143 ‘تفضّل حسین حوالہ بالا صفحہ 136

175۔۔۔۔۔راغب احسن حوالہ بالا صفحہ 21

176۔۔۔۔۔ایضاً

177۔۔۔۔۔ایضاً

178۔۔۔۔۔"اتفاق" روزنامہ سہروردی ایڈیشن صفحہ 86

179۔۔۔۔۔"یادداشتیں" صفحات 106‘109

181۔۔۔۔۔مجیب الرحمن حوالہ بالا صفحہ 143

182۔۔۔۔۔ایضاً

183۔۔۔۔۔ایضاً

184۔۔۔۔۔تفضّل حسین ‘حوالہ بالا صفحہ 136
مجیب الرحمن ‘حوالہ بالا صفحہ 143

185۔۔۔۔۔جنرل ریس کی قیادت میں 50000 فوجیوں پر مشتمل باؤنڈری فورس تشکیل دی گئی اور اسے مغربی پاکستان میں بھارت کی مغربی سرحدوں پر تعینات کیا گیا۔ بایں ہمہ منقسم ہمدردیوں کے باعث یہ فوج فسادات کے دوران بے کار ثابت ہوئی اور ہلاک شدگان کی تعداد دس لاکھ کے ہندسے کو عبور کر گئی دیکھئے۔ پرسی ول سپیئر حوالہ بالا صفحات 424۔ 422

186۔۔۔۔۔ٹکر نے خونریزی کی قلمی تصویر کشی کرتے ہوئے بتایا ہے کہ انتہاپسند ہندوؤں کے ہجوم ایک کے بعد دوسرے گاؤں کو تاخت و تاراج کر رہے تھے۔ دیکھئے سر فرانسس ٹکر کی تصنیف "جب تک حافظہ قائم ہے" صفحہ 161 مزید دیکھئے سپیئر حوالہ بالا‘ صفحہ 424 اور "یادداشتیں" صفحات 105‘ 108

187۔۔۔۔۔پرسی ول سپیئر ‘حوالہ بالا صفحہ 424

188۔۔۔۔۔روزنامہ "آزاد" ڈھاکہ مورخہ 4جون 1948ء

189۔۔۔۔۔ایضاً

190۔۔۔۔۔روزنامہ "آزاد" ڈھاکہ مورخہ 6جون 1948ء

191۔۔۔۔۔راغب احسن حوالہ بالا صفحہ 19

192..... ایضاً

193..... "یادداشتیں" صفحہ 112

تفضّل حسین حوالہ بالا صفحہ 136

194..... تفضّل حسین حوالہ بالا صفحہ 40-39

195..... ایضاً صفحات 35-42

196..... ایضاً صفحہ 36

197..... ایضاً صفحہ 36

198..... ایضاً صفحہ 36

199..... ایضاً

200..... ایضاً

201..... ایضاً

202..... قمرالدین احمد، حوالہ بالا 93

تفضّل حسین حوالہ بالا 44

203..... تفضّل حسین حوالہ بالا 44

204..... قمرالدین احمد حوالہ بالا 93

205..... پاکستان کی دستور ساز اسمبلی ابتداء میں 69 ارکان پر مشتمل تھی لیکن جب 80 لاکھ مہاجرین ملک میں داخل ہو گئے تو ارکانِ اسمبلی کی تعداد بڑھا کر 79 کر دی گئی۔ مشرقی بنگال کے پاس 79 ارکان کے ایوان میں 44 نشستیں تھیں لیکن جب ناظم الدین نے نصف درجن سے بھی زیادہ نشستیں مغربی پاکستان کی نذر کر دیں تو اسمبلی میں مشرقی بنگال کے نمائندے اقلیت میں رہ گئے۔ ناظم الدین نے یہ قدم وزیرِ اعظم لیاقت علی خان کی درخواست پر اٹھایا تھا جو کہ خود بھی اس قربانی سے فائدہ اٹھانے والوں میں سے تھے۔ لیاقت علی خان مشرقی بنگال سے منتخب ہو کر دستور ساز اسمبلی میں پہنچے تھے۔ دیکھئے "یادداشتیں" صفحہ 79

206..... تفضّل حسین حوالہ بالا صفحات 38 تا 42

207..... ایضاً صفحہ 41

رنگالال سین حوالہ بالا صفحہ 82

راغب احسن حوالہ بالا صفحہ 22

"یادداشتیں" صفحہ 80

208..... تفضّل حسین حوالہ بالا صفحہ 41

209..... "یادداشتیں" صفحہ 80

رنگلال سین ' حوالہ بالا صفحہ 82

قمر الدین احمد ' حوالہ بالا صفحہ 105

راغب احسن ' حوالہ بالا صفحہ 22

210..... قمر الدین احمد ' حوالہ بالا صفحہ 105

211..... سہروردی اور بھاشانی کے علاوہ اجتماع میں مندرجہ ذیل افراد موجود تھے۔ عطاالرحمٰن خان ' عبدالسلام خان ' علی احمد خان ' سید عبدالرحیم مئوکتر ' تفضّل حسین (مانک میاں) ' بیگم انووارہ ' اجمل خان ' مولا جلال الدین ' قربان علی ' ایم اے وحید کھونڈکر ' محمد الیاس ' الماس علی ' حمید چودھری اور غازی غلام مصطفیٰ ' شیخ مجیب الرحمٰن جیل میں تین برس کی سزا کاٹ رہے تھے ' انہیں نو تشکیل کردہ جماعت کا جائنٹ سیکرٹری نامزد کیا گیا جبکہ شمس الرحمٰن جنرل سیکرٹری مقرر ہوئے۔

212..... رنگلال سین ' حوالہ بالا صفحہ 89

213..... میں اس وقت کالج کا طالبِ علم تھا اور میں نے اپنے آبائی قصبے سراج گنج میں ان کے اس جلسے میں شرکت کی۔ انہوں نے زوردار تالیوں کی گونج میں یہ الفاظ ادا کئے تھے۔

214..... احمد حوالہ بالا صفحہ 106

215..... ایضاً

216..... تنگائل کا ضمنی انتخاب اپریل 1949ء میں منعقد ہوا۔ شمس الحق نامی نوجوان سیاسی کارکن نے وزیرِ اعلیٰ کے آبائی ضلع میں مقتدر مسلم لیگ کے امیدوار خرم خان پانی کو شکست دی۔

217..... تفضّل حسین حوالہ بالا صفحہ 16

"یادداشتیں" صفحہ 83

218..... "مردم شماری" پاکستان 1961ء جلد اول ' صفحات 30 تا 35

219..... بی۔ عمر "مشرقی بنگال میں لسانی تحریک اور سیاست حاضرہ" مولا برادرز ' ڈھاکہ نومبر 1970ء حصہ اول صفحہ 50۔ مشرقی بنگال سے برسرِاقتدار مسلم لیگ کے ارکان نے کانگریس کی اس تحریک کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا کہ بنگالی کو پاکستان کی سرکاری زبان قرار دیا جائے۔

220..... ذاتی خط و کتابت۔

221..... عمر ' حوالہ بالا صفحہ 50۔ 51

رنگلال سین حوالہ بالا صفحہ 98

222..... رنگلال سین ' حوالہ بالا صفحہ 99

قمر الدین۔ احمد ' حوالہ بالا صفحات 99۔ 100

223..... عمر ' حوالہ بالا صفحہ 77۔ 78

قمرالدین احمد، حوالہ بالا صفحہ 100

رنگالال سین، حوالہ بالا صفحہ 101

224..... قمرالدین احمد اس مجلسِ عمل کے کنوینئر تھے۔ دیکھئے ان کی کتاب، حوالہ بالا صفحہ 99

225..... ایضاً صفحات 100۔ 101

226..... "قائدِاعظم محمد علی جناح کی تقاریر..... گورنر جنرل پاکستان" جون 1947ء تا اگست 1948ء، کراچی۔ دسمبر 1948ء صفحہ 62

227..... ایضاً صفحہ 67

228..... میرن سٹینلے "مشرقی پاکستان کا مسئلہ"

پیسی فک افیرز جلد 27 جون 1955ء صفحہ 132 میرن ڈھاکہ یونیورسٹی میں فلسفے کے استاد تھے اور انہیں لسانی تحریک کے بارے میں براہِ راست علم حاصل تھا۔

229..... روزنامہ "دی ٹائمز" لندن 27 فروری 1952ء

رنگالال سین، حوالہ بالا صفحہ 108

230..... قمرالدین احمد، حوالہ بالا صفحہ 148

231..... رنگالال سین، حوالہ بالا صفحہ 118

232..... انیل مکرجی، "بنگلہ دیش کی تحریکِ آزادی کا پس منظر" 1979ء صفحات 56۔ 55

233..... عوامی لیگ، کرشک سرامک پارٹی اور نظامِ اسلام پارٹی

234..... رنگالال سین، حوالہ بالا صفحہ 118

235..... "مشرقی پاکستان میں عوامی حکومت کا ایک برس" حکومت مشرقی پاکستان ڈھاکہ 6 ستمبر 1957ء صفحات 15، 16

236۔ "اعداد و شمار کی ائیربک" 1955۔ 1954ء حکومت مشرقی پاکستان، ڈھاکہ۔

(ii) کینتھ کیلارڈ "پاکستان..... ایک سیاسی مطالعہ" 1954ء صفحہ 94

238..... پارک، حوالہ بالا صفحہ 70

"دی ٹائمز" لندن 17 اور 21 مارچ 1954ء

239..... تفضّل حسین، حوالہ بالا صفحہ 50

قمرالدین احمد، حوالہ بالا صفحہ 114

240..... رنگالال سین، حوالہ بالا صفحہ 130

241..... ایضاً

242..... "اہم بات یہ ہے کہ بنگال کے دونوں حصوں کے عوام کو یہ بنیادی حقیقت سمجھ لینی چاہئے کہ

ان کا باہمی تعاون پرامن اور پرمسرت مستقبل کا ضامن ہے۔ سیاست دانوں نے جغرافیے کو تقسیم کر دیا ہے لیکن عوام پرامن بقائے باہمی کو یقینی بنا سکتے ہیں۔ لسانی اشتراک تاریخ میں سب سے مضبوط بندھن ثابت ہوا ہے۔ بنگال کے دونوں حصوں میں بسنے والے عوام ایک ہی زبان کی ڈوری سے بندھے ہیں۔ انہیں سیاسی تلخیوں کو بھلا کر اتحاد اور بھائی چارے کو فروغ دینا چاہئے" دیکھئے جے۔ کے۔ اے "جمہوریت اور قومیت کی آزمائش، مشرقی پاکستان کا مطالعہ" 1968ء صفحہ 98

243...... "دی مارننگ نیوز" ڈھاکہ مورخہ 5 مئی 1954ء

244...... تفضل حسین، حوالہ بالا صفحہ 58

رنگالال سین، حوالہ بالا صفحہ 130

245...... "ڈان" کراچی مورخہ 29 جون 1954ء

246...... فضل الحق نے "اس دعویٰ کی تردید کی کہ اس ضمن میں کمیونسٹ ملوث ہیں بلکہ وزیر اعلیٰ نے کسی تعمیم کے ذریعے کسی پر الزام دھرنے سے احتراز کیا" آر ایل پارک اور آر ایس وہیلر فار ایسٹرن سروے "مشرق بنگال گورنر راج کے سائے میں" جلد 23 شمارہ نومبر 1954ء صفحہ 131

247...... "ڈان" کراچی مورخہ 25 اور 26 مئی 1954ء

248۔ "دی نیویارک ٹائمز" 23 مارچ 1954ء کالمان نے دعویٰ کیا کہ اس نے یہ خبر وزیر اعلیٰ فضل الحق سے گفتگو کے دوران "حاصل" کی تھی۔

249۔ "دی ٹائمز" لندن۔ 30 مئی 1954ء

250...... روزنامہ "ورکر" لندن نے یکم جون 1954ء کی اشاعت میں لکھا کہ "پاک امریکہ دفاعی سمجھوتے کی قربان گاہ پر پہلی بھینٹ فضل الحق، متحدہ محاذ وزارت اور مشرقی بنگال کے عوام کی دی جائے گی۔"

251...... "دی ٹائمز" لندن، مورخہ 5 اور 6 جون 1954ء

252...... غلام محمد کو مشرقی بنگال میں مدد اور حمایت کی ضرورت تھی چنانچہ اس نے پاکستان عوامی لیگ کے مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے سیکرٹری جنرل ایم ایچ عثمانی کے ذریعے مشرقی پاکستان عوامی لیگ کے پارلیمانی قائد عطاالرحمن خان سے رابطہ کیا۔ عثمانی نے عطاالرحمن کو متنبہ کیا کہ اگر بنگال میں غلام محمد کی حمایت نہ کی گئی تو عنانِ اقتدار فوج کے ہاتھوں میں دے دی جائے گی۔ بحوالہ قمرالدین احمد، حوالہ بالا صفحہ 118، تفضل حسین حوالہ بالا صفحہ 62

253...... اس واقعے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے "ڈان" نے 11 اگست 1957ء کی اشاعت میں اداریتی مقالے میں لکھا "اس ملک کی تاریخ میں ایسے موڑ بھی آئے ہیں جب ایک نیم پاگل گورنر جنرل نے اپنے دائیں اور بائیں طرف فوجی جنرلوں کو بٹھا کر ایک محبوس وزیر اعظم پر دستور ساز اسمبلی کی برطرفی مسلط کر دی اور درحقیقت ملک پر نیم آمرانہ مقننہ قائم کر دی۔"

254..... یہ ایلچی عطاالرحمٰن تھے جو اس ضمن میں سہروردی سے بات چیت کی غرض سے سوئٹزرلینڈ پہنچے۔

255..... قمرالدین احمد، حوالہ بالا صفحہ 119

256..... جنرل ایوب خان نے پاکستانی فوج کی قیادت سے الگ ہوئے بغیر کابینہ میں شمولیت اختیار کر لی۔

257..... یہ خدشات اور شکوک اس وقت درست ثابت ہوئے جب سہروردی نے وزیرِ قانون کی حیثیت سے راولپنڈی سازش ٹربیونل آرڈیننس کی توثیق کروانے سے احتراز کیا۔ سپریم کورٹ نے تمام آرڈیننس اور قوانین غیر مؤثر قرار دے دیئے تھے چنانچہ سزا یافتہ جنرلوں کی قبل از وقت رہائی کا راستہ ہموار ہو گیا۔

258..... ایضاً صفحہ 119

259..... ایک ہی برس قبل بوگرہ نے فضل الحق کو "غدار" قرار دیا تھا اب جب اسے فضل الحق کو سہروردی کے خلاف استعمال کرنا تھا تو اس نے فضل الحق کو "محبّ وطنوں کا شہزادہ" قرار دے ڈالا۔ مشرقی پاکستان اسمبلی نے 1952ء میں زمینداری ختم کر ڈالی تو کے پی پی کا نام بدل کر کے ایس پی رکھ دیا گیا۔

260..... قمرالدین احمد، حوالہ بالا صفحہ 119

261..... یادداشتیں صفحہ 87

262..... دستور ساز اسمبلی کے صدر، تمیزالدین خان نے دستور ساز اسمبلی (جو کہ ملک کی قومی اسمبلی بھی تھی) کی برطرفی کے خلاف عدالتِ عالیہ میں رٹ دائر کر دی۔ لمبی چوڑی قانونی کارروائیوں کے بعد بر آمد ہونے والا نتیجہ حسبِ ذیل تھا۔

(i) معمول کے حالات میں گورنر جنرل کو دستور ساز اسمبلی معطل کرنے کا کوئی اختیار نہیں لیکن حکومت کی طرف سے دائر کردہ بیان میں بتائے گئے مخصوص حالات میں گورنر جنرل کو سپریم کورٹ کے مشورے سے ایسا کرنے کا حق حاصل ہے۔

(ii) نئی دستور ساز اسمبلی جلد از جلد قائم کی جائے گی۔ (iii) دستور ساز اسمبلی کے پاس کردہ تمام قوانین غیر مؤثر قرار پاتے ہیں کیونکہ دستور ساز اسمبلی نے گورنر جنرل کو اعتماد میں لئے بغیر قانون سازی کی تھی۔ عدالت عالیہ کے فیصلے کے تیسرے حصے سے خاصی افراتفری پیدا ہوئی بہت سے قوانین اور انتظامی ضوابط کو موثر رکھنے کے لئے ان گنت آرڈیننس جاری کرنا پڑے۔

263..... "یادداشتیں" صفحہ 89

264..... رہنما اصول کمیٹی کی عبوری رپورٹوں سے حزبِ اختلاف اور مسلم لیگی حلقوں میں شدید ردِّ عمل پیدا ہوا۔ دیکھئے جی۔ ڈبلیو۔ چودھری "پاکستان میں آئینی ارتقاء" 1959ء صفحہ 109

265..... "یادداشتیں" صفحہ 88

266..... "قائدِ حزبِ اختلاف کی حیثیت سے دستور ساز اسمبلی میں تقریر" 31 جنوری 1956ء کراچی، بحوالہ "مارننگ نیوز" سہروردی سپلیمنٹ، 5 دسمبر 1969ء بعنوان "میرا تصور: آئین" دستور ساز اسمبلی پاکستان کی مورخہ 31 جنوری 1956ء کی مطبوعہ کارروائی بھی ادارہ قومی دستاویزات اگر گاؤں، ڈھاکہ میں موجود ہے۔

267.....ایضاً

268..... "یادداشتیں" صفحہ 89 تفضّل حسین، حوالہ بالا صفحہ 71

269..... "میرا تصوّرِ آئین" حوالہ بالا صفحات 1 تا 12

270.....ایضاً

271.....ایضاً

272.....ایضاً

273..... تفضّل حسین، حوالہ بالا صفحہ 72

274.....ایضاً

275..... مئی 1954ء میں مشرقی بنگال کی پہلی منتخب حکومت یعنی متحدہ محاذ وزارت کی برطرفی کے بعد پاکستان کی مقتدر اشرافیہ نے "کنٹرولڈ ڈیموکریسی" (جمہوریت پابہ زنجیر) کی راہ اختیار کر لی۔ یہ درفنطنی سکندر مرزا نے چھوڑی تھی۔ اگلے برس یعنی 1955ء میں امریکہ نے اس عجوبۂ روزگار حکومت کو ساڑھے دس کروڑ ڈالر کی امداد دی۔ ڈین فلپ "دی رپورٹر" جلد 12 شمارہ 2، 27 جنوری 1955ء صفحہ نمبر 33، بحوالہ رنگالال سین، حوالہ بالا صفحہ 136

276..... "دستور ساز اسمبلی پاکستان کی کارروائی" مورخہ 10 اکتوبر 1956ء مخلوط انتخابات کی حمایت میں سہروردی کی تقریر کے اقتباسات کے لئے دیکھئے۔ "اتفاق" سہروردی ایڈیشن حوالہ بالا صفحات 74 تا 77

277..دو قومی نظریئے کا لب لباب یہ ہے کہ ہر فرقے کو حق خود ارادیت حاصل ہونا چاہئے۔ چنانچہ برصغیر کے مسلمانوں کو اس اصول کی روشنی میں اپنے لئے آزاد مملکت حاصل کرنے کا حق حاصل ہے۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ دو قومی نظریئے کے بنیادی فلسفے کو درج ذیل مواقع پر تیاگ دیا گیا۔

(i) مسلم اکثریتی صوبوں کے پاکستان یا ہندوستان میں شامل ہونے کا فیصلہ متعلقہ صوبوں کی قانون اسمبلیوں کے مسلم ارکان کی بجائے ہندو مسلم ارکان کے مشترکہ ووٹوں سے کیا گیا۔

(ii) سلہٹ اور شمالی مغربی سرحدی صوبے کے مستقبل کا فیصلہ ان علاقوں کے مسلمان باشندوں کی بجائے ہندو اور مسلمان ووٹروں کی مرضی سے کیا گیا۔

(iii) اس امر پر اتفاق کیا گیا کہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان عمومی انتقال آبادی ناممکن تھا چنانچہ

ہندوستان کے تمام مسلمانوں کو پاکستان میں منتقل نہیں ہونا ہوگا اور جو مسلمان ہندوستان کے حصے میں آنے والے صوبوں کے باشندے ہیں وہ بدستور بھارت کے شہری رہیں گے اسی طرح وہ ہندو جو تقسیم ہند کے وقت پاکستان میں شامل ہونے والے صوبوں کے باشندے

278..... قمرالدین احمد' حوالہ بالا صفحہ 126

279..... عطاالرحمٰن خان کی قیادت میں مشرقی پاکستان کی حکومت سنبھالنے کے بعد عوامی لیگ نے تین دن کے اندر اندر تمام سیاسی قیدی رہا کر دیئے جن کی تعداد 500 کے لگ بھگ تھی۔ بحوالہ تفضّل حسین' حوالہ بالا صفحہ 78

280..... **ابوالمنصور احمد** "قائدِ گم گشتہ" "اتفاق" سہروردی ایڈیشن حوالہ بالا صفحہ 139۔ **ابوالمنصور احمد** سہروردی وزارت میں وزیر تجارت کے عہدے پر فائز تھے۔

281..... ایضاً

282..... ایضاً

283..... ایضاً

284..... **ابوالمنصور احمد**' حوالہ بالا صفحہ 134

285..... عطاالرحمٰن خان "سہروردی کا کردار..... چند جھلکیاں" "اتفاق" سہروردی ایڈیشن' حوالہ بالا صفحہ 141..... عطاالرحمٰن حان 1956ء سے 1958ء تک مشرقی بنگال میں عوامی لیگ کے وزیر اعلیٰ تھے۔ سہروردی کی عظمت کو بیان کرتے ہوئے عطاالرحمٰن نے بتایا ہے کہ وزیر اعظم بننے کے بعد حسین شہید نے اپنے صوبے کا دورہ کیا اور قحط کا **مقابلہ** کرنے کے لئے لاکھوں روپے کی امداد دی۔

286..... **ابوالمنصور احمد**' حوالہ بالا صفحہ 134

287..... ایضاً

288..... "دی پاکستان کوارٹرلی" شمارہ بہار 1957ء' مطبوعات پاکستان کراچی' صفحات 5-12' 43-44' 66-74

289..... **ابوالمنصور احمد** حوالہ بالا صفحہ 44

290- "پاکستان کوارٹرلی" حوالہ بالا صفحہ 44

291..... 1948ء میں روس نے بھی وزیر اعظم لیاقت علی خان کو ایسی ہی دعوت دی تھی جسے ٹھکرا کر وزیر اعظم نے پاک۔ روس تعلقات کو غیر دوستانہ رنگ دیدیا۔

292..... 14 جون 1957ء کو پلٹن میدان میں تقریر سے اقتباس' بحوالہ "اتفاق" سہروردی ایڈیشن حوالہ بالا صفحہ 26

293......... المنصور احمد' حوالہ بالا صفحہ 127

294 -..... "اتفاق" سہروردی ایڈیشن حوالہ بالا صفحات 40 - 56

295..... بنگالی سے ترجمہ' ایضاً

296..... "خارجہ پالیسی پر بحث" (22 تا 25 فروری 1957ء) بحوالہ "اتفاق" سہروردی ایڈیشن۔ حوالہ بالا صفحہ 47

297..... بغداد پیکٹ کے چار مسلمان اراکین کا اجلاس 9 نومبر 1951ء کو تہران میں ہوا۔ شرکاء اجلاس نے برطانیہ اور فرانس پر زور دیا کہ وہ خصوصی انتظامات کے تحت اپنی افواج واپس بلالیں۔ "صغر" کی نمائندہ قوتوں کے اخلاقی دباؤ پر ان عالمی طاقتوں کو بڑی حد تک پسپائی اختیار کرنا پڑی..... خارجہ پالیسی پر بحث (22 - 25 فروری 1957ء) "اتفاق" سہروردی ایڈیشن حوالہ بالا صفحات 48 - 49

298..... ایضاً صفحات 27 - 50

299..... ایضاً صفحہ 50

300..... ایضاً صفحہ 38

301..... ایضاً صفحہ 48

302..... اسلم صدیقی "پاکستان' تحفّظ کی تلاش میں" کراچی

303..... خارجہ پالیسی پر بحث (22 - 25 فروری 1957ء) بحوالہ "اتفاق" سہروردی ایڈیشن حوالہ بالا صفحہ 49

304..... سہروردی کے پیش رو' چودھری محمد علی نے سب سے پہلے بھارت کو "ناجنگ معاہدے" کی پیش کش کی تھی' ایضاً صفحہ 51 - 52

305..... تفضّل حسین' حوالہ بالا صفحات 79 تا 83

306..... "خارجہ پالیسی پر بحث (22 تا 25 فروری 1957ء) بحوالہ "اتفاق" حوالہ بالا صفحات 40 - 55 مزید دیکھئے "دستور ساز اسمبلی پاکستان کی کارروائی" قومی ادارہ دستاویزات اگر گاؤں' ڈھاکہ

307..... "اتفاق" سہروردی ایڈیشن حوالہ بالا صفحات 40 اور 55

308..... ابوالمنصور احمد' حوالہ بالا صفحہ 115

309..... خارجہ پالیسی پر بحث (22 تا 25 فروری 1957ء) بحوالہ "اتفاق" سہروردی ایڈیشن حوالہ بالا صفحات 37 تا 45 اور 46 تا 52

310..... اپریل 1955ء میں منعقد ہونے والی بنڈونگ کانفرنس نے قوموں کے اس انفرادی اور اجتماعی حق کی مکمل توثیق کی کہ وہ اقوامِ متحدہ کے منشور کی قرارداد 51 کی رو سے اپنے دفاع کی غرض سے معاہدات کر سکتی ہیں۔

311..... خارجہ پالیسی پر بحث (22تا25فروری 1957ء) "اتفاق" سہروردی ایڈیشن حوالہ بالا صفحہ 40

312..... مجھے یہ معلومات سہروردی کی اکلوتی نواسی، شاہدہ منی کے توسّط سے ملی ہیں۔

313..... "ڈیلی ٹیلی گراف" لندن 2فروری 1957ء (اداریہ)

314..... "خود بھارت کے اپنے مفادات کے حوالے سے یہ بہت صائب قدم ہو گا کہ دہلی سرکار سہروردی کی اس پیش کش کا خیر مقدم کرے کہ کشمیر میں پاکستانی فوج کی جگہ اقوامِ متحدّہ کی فوج تعینات کر دی جائے اس اقدام سے وہ رکاوٹ دور ہو جائے گی جسے مسٹر مینن مسٹر بخشی، اور ہند سرکار کے دوسرے ترجمان واحد وجۂ نزاع قرار دے چکے ہیں۔ ایسی صورت میں وہ تنازعہ ختم ہونے کے امکانات ابھر سکتے ہیں جس سے روس کے علاوہ کسی اور قوت..... حتیٰ کہ چین کو بھی فائدہ نہیں پہنچ رہا۔" "دی اکنامسٹ" لندن 2فروری 1957ء (اداریہ)

315..... "دی نیو ٹائمز" میگزین شکاگو 4فروری 1957ء

316..... محولہ ذیل کتاب کے مندرجات پر بات کرتے ہوئے تقسیمِ ہند کے دوران وزیر اعظم برطانیہ ارل اٹیلی نے ان الفاظ میں سہروردی کے خیالات کی تائید کی تھی "مجھے مسٹر نہرو کے ساتھ کشمیر کے پیچیدہ مسئلے پر بہت سی ملاقاتیں یاد ہیں بعض ملاقاتوں میں صرف ہم دونوں شریک تھے اور بعض مواقع پر دوسرے وزراء اعظم بھی موجود تھے۔ لیکن ان ملاقاتوں سے کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو سکا۔ ہم نے ایک منصفانہ استصواب رائے کی تجویز میں ہر ممکن تبدیلی کر کے دیکھ لیا لیکن مسٹر نہرو مطمئن نہ ہو سکے۔ میں نے اس معاملے کو ہمیشہ سے ایک بڑے مدبّر کی شخصیت کا تاریک پہلو سمجھا ہے۔ آیا یہ ان کے کشمیری النسل ہونے کا کرشمہ تھا یا کوئی اور وجہ تھی تاہم یہ امر واقعہ ہے کہ مسٹر نہرو جو دیگر معاملات میں ذہنِ رسا کے مالک تھے، کشمیر کے حوالے سے خاصے ہٹ دھرم ثابت ہوئے۔"

کے کتوار سنگھ "نہرو کا ورثہ" وکاس پبلشنگ ہاؤس پرائیویٹ لمیٹڈ 1.948ء اتر پردیش، بھارت صفحہ 2

317..... انہوں نے یہ اعلان 14جون 1957ء کو تاریخی پلٹن میدان میں منعقد ہونے والے جلسۂ عام میں کیا تھا بحوالہ "اتفاق" سہروری ایڈیشن، حوالہ بالا صفحہ 27

318..... ابوالمنصور احمد حوالہ بالا صفحہ 118

319..... ایضاً صفحہ 119-118

320..... "ڈان" کراچی 5مارچ 1957ء

321..... منیر الزمان تلک دار "پاکستانی سیاست میں گروہی مفادات 1958ء- 1947ء" پیسی فک افیرز جلد 39 شمارہ 1اور 2 (بہار اور گرما- 1966ء) صفحات 83تا98 "پاکستان

آبزرور" ڈھاکہ 18 اپریل 1957ء
322۔۔۔ ابوالمنصور احمد' حوالہ بالا صفحہ 132' رنگلال سین حوالہ بالا صفحہ 153
323..... ابوالمنصور احمد حوالہ بالا صفحہ 128
324..... "ڈان" کراچی 15 اکتوبر 1957ء
325 سہروردی کی ذاتی یادداشتیں' حوالہ بالا صفحہ 48
326..... ایضاً صفحہ 48
327..... ایضاً صفحہ 49
328..... راشد سہروردی سے ذاتی خط و کتابت
329..... قمرالدین احمد نے میجر جنرل فضل مقیم خان کی کتاب "پاکستانی فوج کی کہانی" کے حوالے سے لکھا ہے کہ کمانڈر انچیف جنرل ایوب خان نے ملک میں مارشل لاء کے نفاذ کو یکم ستمبر 1958ء کو حتمی منظوری دی تھی' ایوب خان نے اپنی کتاب "جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی" میں اس دعویٰ کی توثیق کی ہے۔ دیکھئے قمرالدین احمد حوالہ بالا صفحہ 144
330..... "پاکستان آبزرور" ڈھاکہ 8 اکتوبر 1957ء
331..... 1958ء کے انقلاب میں بادلِ نخواستہ شریک ہونے والے ایئر مارشل اصغر خان نے بتایا ہے کہ ایوب خان نے کس طرح اپنے پرانے دوست اور انقلاب میں اہم رفیق سکندر مرزا کو نکال باہر کیا۔ انقلاب کے تیسرے ہفتے میں جب ایوب مشرقی پاکستان کے دورے پر تھے' سکندر مرزا نے ہوائی فوج کے چیف آف سٹاف ایئر کموڈور مقبول رب (جو کہ برج کے کھیل میں اکثر سکندر مرزا کے حلیف ہوتے تھے) کو فون کیا کہ بریگیڈیر قیوم شیر کی مدد سے بریگیڈیر یحییٰ خان اور ملک شیر بہادر کو گرفتار کر لیا جائے کراچی کے قریب واقع فوجی اڈے ملیر میں مقیم فوجی گیریژن کے کمانڈر مقبول رب نے بروقت اصغر خان اور دونوں بریگیڈیروں کو اس صورت حال سے آگاہ کر دیا۔

بریگیڈیر یحییٰ خان کے پاس فوج کے خفیہ ادارے کی کمان تھی۔ انہوں نے بھی سید امجد علی (جن کی بیٹی کی شادی سکندر مرزا کے بیٹے سے ہونے والی تھی) کے نام صدر کا ٹیلی فون اچک لیا۔ سکندر مرزا نے امجد علی سے کہا تھا کہ وہ چند روز میں ایوب "کا دماغ درست کر دیں گے" ایوب کو فوراً ان معاملات کی خبر کی گئی اور ایوب نے جوابی کارروائی کر کے "اپنا دماغ درست ہونے" سے پہلے ہی سکندر مرزا کا کانٹا نکال پھینکا۔ دیکھئے۔ "جنرلز ان پالیٹکس 1958ء۔ 1982ء" یونیورسٹی پریس لمیٹڈ ڈھاکہ صفحات 8 اور 9
332..... قمرالدین احمد' حوالہ بالا صفحات 143۔ 144
333..... راشد سہروردی سے ذاتی خط و کتابت
334..... ایضاً

335...... سہروردی نے اپنی یادداشتوں (صفحہ 167) میں اور صدر ایوب کے نام اپنے مکتوب (ضمیمہ اول) میں اسے واحد وجہ قرار دیا ہے۔ تاہم یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جب صدر ایوب نے بھاری معاشی اور فوجی امداد کی درخواست کے ساتھ امریکہ کا دورہ کیا تو انہیں کہا گیا کہ پہلے ملک میں جمہوریت قائم کریں۔ اس دورے سے چند ہفتے قبل سہروردی بھی طبّی معائنے کی غرض سے امریکہ گئے تھے۔ صدر ایوب نے امریکہ میں اپنے ساتھ ہونے والے سلوک کو سہروردی کی کارستانی خیال کیا۔ غیظ و غضب کے عالم میں شواہد کا انتظار کئے بغیر صدر ایوب خان نے ڈھاکہ میں بھارتی یومِ آزادی کی تقریبات میں شرکت سے واپسی پر 26 جنوری کو حکم دیا کہ سہروردی کو گرفتار کر لیا جائے تاہم گورنر اعظم خان نے عوامی ردِّعمل کے خدشے کے پیشِ نظر انہیں گرفتار کرنے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ سہروردی کو 30 جنوری کو امریکی سفیر کی طرف سے دی گئی ایک دعوت سے واپسی پر کراچی میں گرفتار کر لیا گیا اس گرفتاری کے لئے بیان کردہ وجوہات میں ان کا دورۂ امریکہ بھی شامل تھا۔ دیکھئے قمر الدین احمد حوالہ بالا صفحہ 153

336...... راشد سہروردی سے ذاتی خط و کتابت

337...... راغب احسن حوالہ بالا صفحہ 24

338...... "اتفاق" سہروردی ایڈیشن حوالہ بالا صفحہ 90

339...... ایضاً

340...... راشد سہروردی سے ذاتی خط و کتابت

314...... یہ خط "اتفاق" کے سہروردی ایڈیشن میں شاملِ اشاعت تھا۔ صفحہ 118

342...... ابوالفضل، حوالہ بالا صفحہ 134

343...... راشد سہروردی سے ذاتی خط و کتابت

344...... حتیٰ کہ ایبڈو کی غرض سے قائم کئے گئے ٹریبونل نے بھی قیامِ پاکستان میں سہروردی کے کردار کو سراہا۔

345...... قمر الدین احمد، حوالہ بالا صفحہ 139

346...... اے کے بروہی "سہروردی کو خراجِ تحسین" "مارننگ نیوز" کراچی، سہروردی سپلیمنٹ، 5 دسمبر 1969ء صفحہ 5

347...... ابوالہاشم "سہروردی مرحوم۔ میری نظر میں" "اتفاق"، سہروردی ایڈیشن حوالہ بالا صفحہ 138

348...... تفضّل حسین، حوالہ بالا صفحہ 135

349...... ایضاً صفحہ 136، مجیب الرحمٰن، حوالہ بالا صفحہ 144

350...... مجیب الرحمٰن حوالہ بالا صفحہ 144

351...... عطاء الرحمٰن خان حوالہ بالا صفحہ 141

352...... بروہی حوالہ بالا صفحہ 5

353...... راغب احسن حوالہ بالا صفحہ 22

354...... قمرالدین احمد حوالہ بالا صفحہ 2

355...... بروہی حوالہ بالا صفحہ 5

356...... ایضاً

357...... ابوالفضل حوالہ بالا صفحہ 134

358...... قمرالدین احمد حوالہ بالا صفحات 144 - 145

359...... ابوالفضل کا خیال ہے کہ غالباً قومی پرچم اس شرمندگی اور خفّت کا ازالہ کرنے کے لئے سرنگوں کیا گیا تھا جو گزشتہ پانچ برس تک سہروردی جیسے مدبّر سے ہونے والی زیادتیوں 'بغیر مقدمہ چلائے قید و بند اور پھر ایوب آمریت کی اخلاقی شکست کے باعث پیدا ہوئی تھی۔ دیکھئے ابوالفضل حوالہ بالا صفحہ 134

360...... سہروردی نے 17 نومبر 1963ء کو زیورخ سے جو خط تحریر کیا تھا وہ "اتفاق کے سہروردی ایڈیشن میں شاملِ اشاعت تھا صفحہ 117

361...... یہ انتخاب دراصل علیحدگی کے لئے استصواب رائے تھا۔ شیخ مجیب الرحمٰن کی عوامی لیگ نے مشرقی پاکستان کے لئے مکمل خود مختاری کے چھ نکاتی پروگرام کی بنا پر انتخاب لڑا اور کامیابی حاصل کی۔ اسے پارلیمینٹ کی 313 نشستوں میں سے مشرقی پاکستان کے لئے مخصوص 169 نشستوں میں سے 167 نشستیں ملیں جبکہ مغربی پاکستان میں اسے کوئی نشست نہ مل سکی۔ اسی طرح مغربی پاکستان کی کوئی جماعت مشرقی پاکستان میں ایک بھی نشست نہ جیت سکی۔

362...... یہ ایک عجیب تضاد تھا کہ پاکستان کی کل آبادی میں مشرقی پاکستان کا حصہ 56 ٪ تھا لیکن مشرقی پاکستان کے باشندوں کو پاکستان کی طاقتور فوج میں برائے نام نمائندگی حاصل تھی (بری فوج۔ 5 ٪ فضائیہ 16 ٪ اور بحریہ 10 ٪) فوج کے تینوں شعبوں میں کسی بنگالی کو کلیدی حیثیت حاصل نہیں تھی۔ چنانچہ مشرقی پاکستان کے سیاسی لحاظ سے باشعور عوام پر مغربی پاکستان نے فوجی طاقت کے بل پر بالا دستی حاصل کر رکھی تھی۔

حصہ دوم کے حواشی

1...... اگر 1941ء کی مردم شماری میں ہندوؤں نے مصنوعی طور پر اپنی تعداد بڑھا چڑھا کر بیان نہ کی ہوتی تو پریذیڈنسی ڈویژن جس میں مرشد آباد 'ناڈیہ 'کلکتہ اور چوبیس پرگنہ کے مسلم اکثریتی علاقے شامل تھے یقینی طور پر مشرقی بنگال اور پاکستان کا حصہ بنتا۔ یقینی طور پر یہ سب کچھ وزیرِ اعظم فضل الحق کے علم کے بغیر کیا گیا۔ جب انہیں اس دھاندلی کا علم ہوا تو اس وقت کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔

2..... محاذ نے 223 نشستوں پر کامیابی حاصل کی تھی۔ دیکھئے سپرا' صفحہ 44

3..... ون یونٹ کا شوشہ دولتانہ کے ذہنِ رسا کی تخلیق تھا جیسا کہ اس کی مشہور دستاویزات اے' بی' سی اور ایکس سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔ اس نے ہر ممکن کوشش کی کہ مرکز اور لاہور میں موثر اور فعال پنجابی قیادت قائم کی جائے' جدا گانہ انتخابات کے ذریعے مشرقی بنگال کو الگ تھلگ کر دیا جائے۔ بعد ازاں جنرل ایوب خان ایک قدم مزید آگے بڑھ گئے' کرنل محمد احمد کی کتاب "میرا چیف" سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایوب پورے ملک میں اختیارات کے بے پناہ ارتکاز کے ساتھ فوجی حکمرانی قائم کرنے کی فکر میں تھے۔ دیکھئے سپرا' صفحات 77' 78 اور ابوالمنصور احمد حوالہ بالا صفحات 142' 141

4..... خواجہ ناظم الدین نے پٹوا کھلی کے حلقے سے انتخابات لڑا۔ یہ حلقہ ان کی آبائی جاگیر میں واقع تھا۔ مسلم لیگ نے فضل الحق کی اس دھمکی کے پیشِ نظر کہ وہ بنگال کے ہر کونے میں خواجہ ناظم الدین کا مقابلہ کر کے انہیں شکست دیں گے' ناظم الدین کو محفوظ ترین حلقے سے ٹکٹ دیا تھا لیکن ناظم الدین اس محفوظ ترین حلقے میں بھی محفوظ نہ رہ سکے اور انہیں فضل الحق نے 24 ہزار ووٹوں کے فرق سے شکست دی۔ سہروردی نے اپنی دو نشستوں میں سے ایک پر ناظم الدین کو ضمنی انتخاب لڑوایا اور یوں ان کا سیاسی کریئر تباہ ہونے سے بچ گیا۔

بایں ہمہ ہندوستان اور بنگال کی علیحدگی کے بعد جب سہروردی امن مشن پر مشرقی بنگال پہنچے تو ناظم الدین نے انہیں صوبہ بدر کر کے ان کے احسان کا بدلہ چکا دیا۔

5..... اصل صورتِ حال یہ تھی کہ بہت سے ارکان آزاد حیثیت میں منتخب ہو کر مسلم لیگ یا کرشک سرامک پارٹی میں شامل ہو گئے تھے۔ بالآخر اسمبلی میں مسلم لیگ کے ارکان کی تعداد 60 اور کرشک سرامک پارٹی کے ارکان کی تعداد 54 ہو گئی۔ کچھ ارکان نے اپنی آزاد حیثیت برقرار رکھی۔ دیکھئے سپرا' صفحہ 16

6..... سہروردی نے بہار سے آنے والے 72945 پناہ گزینوں کو پناہ دی اور 40 کیمپوں میں ان کی رہائش اور خوراک وغیرہ کا بندوبست کیا ("اتفاق" سہروردی ایڈیشن' حوالہ بالا صفحہ 59) غیر سرکاری طور پر یہ تعداد چار لاکھ کے لگ بھگ بیان کی جاتی تھی۔

7..... لیاقت۔ نہرو سمجھوتے پر 8 اپریل 1950ء کو دستخط ہوئے۔ سہروردی نے اپنے بارہ نکاتی اقلیتی چارٹر میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے لئے جو تجاویز دی تھیں ان میں سے بیشتر کو اس سمجھوتے میں شامل کر لیا گیا۔

8..... سہروردی کو فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے فروغ کے لئے مانک گنج میں ایک جلسے سے خطاب کرنا تھا لیکن وزیرِ اعظم لیاقت علی خان کے اکسانے پر وزیرِ اعلیٰ خواجہ ناظم الدین نے پہلے انہیں گرفتار کیا اور ان پر الزام عائد کیا کہ وہ پاکستان سے غدّاری کرتے ہوئے بنگال کے دونوں حصوں کو ایک کرنے کی کوشش کر رہے تھے اور پھر انہیں ناپسندیدہ ہندوستانی شہری قرار دیکر بنگال سے نکال دیا۔

9۔۔۔ ایسٹ پاکستان میں داخلے پر پابندی لگنے کے بعد سہروردی 5 مارچ کو کراچی ہجرت کر گئے اور کراچی میں اپنے داماد کے پاس رہنے لگے۔

10...... نارمن براؤن لکھتے ہیں "لیاقت علی نے دوسری جماعتوں کی بنیاد رکھنے والوں پر نہایت تند و تیز حملے کئے اور انہیں غدّار، جھوٹے اور منافق قرار دیا۔ خاص طور پر عوامی لیگ اور حسین شہید سہروردی ان کے حملوں کا نشانہ بنے۔" ان کی کتاب دیکھئے "امریکہ، بھارت اور پاکستان" 1963ء صفحات 249-250

11...... سہروردی نے ایک عربی کہاوت بیان کی "جب تمہارا وجود خطرے میں پڑ جائے تو تم مدد کے لئے شیطان کو بھی پکار سکتے ہو"

12...... سہروردی نے بڑی مہارت اور قابلیت سے امریکی حکومت کو یہ اجازت دینے پر آمادہ کر لیا کہ امریکی فوجی امداد کو ہر طرح کی جارحیت کے خلاف استعمال کیا جا سکے گا تاہم سہروردی کے اقتدار سے سبکدوش ہوتے ہی یہ رعایت واپس لے لی گئی۔ دیکھئے سپرا صفحہ 60

13...... سہروردی نے سلیم اللہ مسلم ہال میں ڈھاکہ یونیورسٹی کے طلباء سے خطاب کیا اور طلباء کی درخواست پر خارجہ پالیسی کے بارے میں اپنے خیالات بیان کئے۔

انہوں نے خارجہ پالیسی کی بنیادی مندرجہ ذیل 4 بنیادی اصولوں پر رکھی

(ا) ایمانداری اور سچائی پر مبنی غیر جانبداری

(ب) امنِ عالم کا استحکام اور عالمی کشمکش میں کمی

(ج) اقوامِ متحدہ کی تمام قرار دادوں کی حمایت

(د) قومی یکجہتی اور آزادی کا تحفظ

14...... گگماری کانفرنس 7 اور 8 فروری 1957ء کو منعقد ہوئی۔ دیکھئے سپرا صفحہ 59

15...... اس ضمن میں موعودہ تاریخ 28 نومبر 1957ء تھی۔ بالآخر انہوں نے آئین میں جداگانہ انتخابات کی گنجائش پیدا کرنے میں ناکامی پر استعفیٰ دیدیا کیونکہ ری پبلکن پارٹی نے اپنا فیصلہ بدل کر مخلوط انتخابات کی حمایت کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔

16...... 1935ء کے آئین میں یہ شق 92ءاے کہلاتی تھی۔

17...... دیکھئے سپرا۔ حاشیہ 340 (حصہ اول)

18...... ایوب نے صدر سکندر مرزا سے سبکدوشی کی دستاویز پر دستخط لینے کے لئے مندرجہ ذیل جنرلوں کو روانہ کیا تھا میجر جنرل برکی میجر جنرل اعظم خان، میجر جنرل کے ایم شیخ اور بریگیڈیر شیر بہادر۔

19۔ 19 ستمبر 1960ء کو سندھ طاس کے معاہدے پر دستخط ہوئے اور بھارت اور پاکستان کے درمیان دریائی پانی کی تقسیم کا تنازعہ طے ہو گیا۔ عالمی بینک نے اس ضمن میں ایک ارب ڈالر کی امداد دینا منظور کیا۔

20...... اب اسے "بنگلہ دیش اکادمی برائے دیہی ترقی" کہا جاتا ہے۔

21...... مشرقی بنگال سے تعلق رکھنے والے افسروں کی تعداد بے حد معمولی، غالباً صرف دو تھی۔

22...... سیاسی شعور کی اسی کمی کے باعث مسلم لیگ کو 1946ء کے انتخابات میں ان تمام صوبوں میں ہزیمت اٹھانا پڑی جو آگے چل کر مغربی پاکستان کا حصہ بنے۔ مطالبۂ پاکستان کی بنیاد پر لڑے جانے والے انتخاب میں ان مسلم اکثریتی صوبوں نے مسلم لیگ اور پاکستان کے خلاف رائے دی۔

23...... بعدازاں صدر نے ایک بے حد کامیاب وکیل کو مغربی پاکستان ہائی کورٹ کا چیف جسٹس مقرر کر دیا۔ اس پر پاکستان بھر میں بار ایسوسی ایشنوں نے شدید احتجاج کیا کہ عدلیہ کو سیاسی اثرونفوذ سے الگ رکھا جانا چاہئے اور عدلیہ کے اعلیٰ مناصب کو صدر سے وفاداری کے انعام کے طور نہیں بانٹا جانا چاہئے۔

24...... پہلا جلسہ راولپنڈی میں منعقدہ ہوا۔

25...... دیکھئے سپرا صفحات 68۔ 69

26...... نور ہمناؤں کے بیان پر 24 جون 1962ء کو دستخط کئے گئے۔

27...... صدر نے یہ قانون 15 جولائی 1962ء کو پاس کیا۔

28...... "لاٹھی" بانس کے لمبے سے ٹکڑے کو کہتے ہیں۔ مغربی پاکستان میں دیہاتی اپنی حفاظت کے خیال سے "لاٹھی" ہاتھ میں رکھتے ہیں، عام طور پر ہجوم کو منتشر کرنے کے لئے پولیس لاٹھی استعمال کرتی ہے۔

29...... میجر اسحاق اور میجر اسلم

30...... نوابزادہ نصراللہ خان مغربی پاکستان عوامی لیگ کے صدر تھے۔

31...... بھاشانی نے 22 اگست 1963ء کو صدر ایوب سے ملاقات کی، صدر نے ایوانِ صدر کے دروازے پر بھاشانی کا خیر مقدم کیا۔ کہا جاتا ہے کہ صدر نے بھاشانی سے یہ یقین دہانی حاصل کی کہ وہ مشرقی پاکستان میں سہروردی اور قومی جمہوری محاذ کی مخالفت کریں گے۔

32...... کراچی میں سہروردی کے داماد شاہ احمد سلیمان کی قیام گاہ، سہروردی اس مکان میں ٹھہرا کرتے تھے۔

33...... حق انتخاب کمیشن کی رپورٹ، جس میں بالغ حقِ رائے دہی کی سفارش کی گئی تھی، صدر ایوب نے مسترد کر دی۔